بلراج مین را

بلراج مین را

پہلا لفظ

★

۱۔ قبل مسیح

اور تب سیاہ فام شخص نے اس سے پوچھا: ''کیا تم خداؤں میں یقین رکھتے ہو؟''

''نہیں۔''

''کیا تم یقین رکھتے ہو کہ یہاں ہماری موت کے بعد (ہمارے لیے) کوئی اور دوسری جگہ بھی ہے؟''

''نہیں۔''

''تب تم کس میں یقین رکھتے ہو، اسپارٹکس؟'' سیاہ فام شخص نے پوچھا۔

''میں تم میں یقین رکھتا ہوں اور میں خود میں یقین رکھتا ہوں۔''

★

کیپلر (۱۵۷۱ء—۱۶۳۰ء):

جرمن ماہرِ فلکیات جس نے سیاروں کی حرکت و عمل کے اصول دریافت کیے۔

—اور اس دریافت نے مذہبی نظریۂ کائنات کو شدید چوٹ پہنچائی۔

★

تمھارے محبوب ہیرو؟

(کارل مارکس نے جواب دیا): اسپارٹکس، کیپلر۔

TITLE : Maqtal /
AUTHOR STAT : Balrâj Mainrâ.
IMPRINT : Naī Dihli : Maudarn Pablishing Hā'ūs, 2007
NATURE SCOPE : Short stories.
LANGUAGE : In Urdu
D.K Agencies (P) Ltd. DKURD-4204
www.dkagencies.com

سرورق :

LEGER, Fernand
Sous les arbres (1921)
(Paris)

O

صفحۂ متن :

LEGER, Fernand
Acrobates en gris
(1942/44)
(Paris)

Man cannot survive except through his mind. He comes on earth unarmed. His brain is his only weapon.

— **Howard Roark**

ہاورڈ رورک

اور

جان گالٹ

کے

نام

Man's mind is his basic tool of survival. Life is given to him, survival is not. His body is given to him, its sustenance is not. His mind is given to him, its content is not. To remain alive, he must act, and before he can act he must know the nature and purpose of his action.

— **John Galt**

اشاعت	:	۲۰۰۷ء
قیمت	:	تین سو پچاس روپے
کمپوزنگ	:	نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق	:	انعم آرٹس، نئی دہلی
مطبع	:	ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-2
ناشر	:	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹-گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

ISBN 81-8042-048-5

زیر اہتمام

پریم گوپال متّل

Modern Publishing House
9, Gola Market, Darya Ganj, New Delhi-110002
Phone: 011-23278869

MAQTAL
by Balraj Manra

Year : 2007
Rs. : 350/-

Scanned with CamScanner

ترتیب

Religion is the first enemy of the ability to think. That ability is not used by men to one-tenth of its possibility, yet before they learn to think they are discouraged by being ordered to *take things on faith. Faith is the worst curse of mankind*, as the exact antithesis and enemy of *thought*.

— **Ayn Rand**
(Private Notes; 1934)

●●●

٭ مین را جرنل

•

٭ گوشۂ دیوندر ستیارتھی

•

٭ انتسابات

اُفق

دوغلہ پن بڑا غیر ادبی لفظ ہے۔

وہ کیا چیز ہے جو لفظ کو ادبی یا غیر ادبی بناتی ہے؟ چند بکھرے ہوئے حروف کی یکجائی اور ترکیب یا کچھ اور؟ کیا حروف کی توصیفی ترکیب کی بنا پر کوئی لفظ ادبی یا غیر ادبی ہو سکتا ہے؟ یہ بڑی لمبی بحث ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ جب اُردو ادب کے اُفق کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اس پر الفاظ نہیں بلکہ انسانی ہیولے اپنی تمام تاریکیوں اور اُجالوں کے ساتھ چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بالکل صاف ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ انسان ہی تمام تخلیقی مظاہر کا سرچشمہ ہے۔ یہ مظاہر ادبی ہوں یا 'غیر ادبی' ان کا context سماجی ہوتا ہے۔ یہ سماجی سانچہ یا چوکھٹا، جس میں اور تمام دوسری چیزوں کے ساتھ زبان بھی جنم لیتی ہے اور پروان چڑھتی ہے، وقت کے دباؤ سے ٹوٹتا اور بدلتا رہتا ہے۔ وقت خود بغیر انسان کے ایک مجرّد تصور کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن یہاں مجرّد تصور کی اصطلاح بھی بے معنی ہو جاتی ہے۔ جب انسان نہیں تو وہ شعور و ادراک نہیں، جس کے بغیر کوئی تصور، مجرّد یا غیر مجرّد، جنم نہیں لے سکتا۔ دراصل انسان کے ارتقائی یا انقلابی حرکت و عمل کا تاریخی شعور زندگی کی معنویت کو سمجھنے میں ہی مدد نہیں دیتا بلکہ اس معنویت کے اظہار کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔ اسی قسم کی ایک سماجی معنویت کا اظہار اس لفظ سے ہوتا ہے جس سے اس تحریر کا آغاز ہوا ہے۔ یہ لفظ صرف لفظ نہیں، ایک اصطلاح ہے جس سے ہمارے عہد کی ایک سماجی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ دعویٰ وضاحت طلب ہے۔ اس وضاحت کی ابتدا، بار بار دہرائی ہوئی اس بات سے ہوتی ہے کہ ادبی حقیقت بھی سماجی حقیقت کا ایک اٹوٹ حصہ ہے اور ایک طرح سے اس کی جمالیاتی توسیع۔ اس لیے ادبی حقیقت کی بعض پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے بعض 'غیر ادبی' اصطلاحوں سے، جو بہر حال سماجی اصطلاحیں ہیں، کام لے لیا جائے تو اس پر معذرت خواہ ہونے کی ضرورت نہیں۔

دوغلہ پن یا dichotomy، جو ہمارے عہد کی سماجی خصوصیت ہے، ہماری دانشورانہ زندگی کی خصوصیت بھی ہے۔ اس لیے آج کی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے اپنے عصر، عصری ادب اور

عصری ادیبوں کی اس خصوصیت کا تجزیہ ضروری ہے۔

پچھلے چند برسوں میں، آزاد ہندوستان میں، ادبی زندگی کی رفتار اور رُخ کا تعین اسی سماجی ریٹ ریس نے کیا ہے، جس میں مفاد پرستی، بنیادی اخلاقی قدر کی حیثیت سے، سکہ رائج الوقت بن چکی ہے۔ اگر ایک عام صورتِ حال کی حیثیت سے اس حقیقت کا ذکر ہو تو سبھی اسے تسلیم کریں گے — ڈرائنگ روم، ٹی ہاؤس اور کافی ہاؤس میں، مشاعروں اور مذاکروں میں، ہر جگہ — تسلیم بھی کریں گے اور اس پر لعنت بھی بھیجیں گے۔ اس صورتِ حال کی مضحکہ خیزی کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ تمام لعنت بھیجنے والے یہ کہتے ہیں تو کچھ اس انداز سے، گویا وہ چوہوں کی دوڑ میں شامل نہیں ہیں۔ اگر ان تمام نیک طینت ادیبوں کے خود ساختہ پوز کو حقیقت کی کسوٹی پر نہ پرکھا جائے تو خیر و کن الیوژن کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ لیکن شعور اور الیوژن کی آویزش میں کتنے دن یہ دنیا ان لوگوں کے لیے پناہ گاہ بن سکتی ہے جن کو ان کا ضمیر حقیقت کو حقیقت کی طرح دیکھنے پر مجبور کرتا ہے؟ جو بات اس مضحکہ خیزی کو المناک بناتی ہے وہ یہ ہے کہ الیوژن کی بسائی ہوئی اس جنت میں سب خوش ہیں۔ واحد راہ نجات یہ ہے کہ کانچ کی اس جنت پر پتھراؤ کیا جائے۔ جنت میں بڑا ہجوم ہے اور پتھراؤ ہوا تو کسی کے سر کی خیر نہیں۔ بہت سے کج کلاہ زخمی ہوں گے۔ بڑا کہرام مچے گا۔ اس لیے اچھا تو یہ ہوتا کہ پتھراؤ نہ ہوتا اور زندگی چین کی بنسی بجاتی گزر جاتی۔

اچھا تو ہوتا کہ یوں ہوتا مگر یوں ہوگا نہیں۔

جب تک سماج کے بنیادی قوانین یعنی معاشی رشتے نہیں بدلتے، بالائی عمارت کی لیپا پوتی سے بات نہیں بنے گی۔ فن اور ادب میں کسی حقیقت کے اظہار کے لیے اس حقیقت کی موجودگی ضروری ہے۔ خواہش یا خواب انسان کی زندگی میں قدرِ مطلق نہیں ہے اور نہ اصلیت کا نعم البدل۔ کسی بھی خواہش یا خواب کی اضافیت ہی اسے اجتماعی معنویت عطا کرتی ہے، جو کسی بھی قوم یا گروہ کی جمالیاتی حس کا سرچشمہ بنتی ہے۔ لیکن جس قوم یا گروہ کی جمالیاتی قدروں کا ذکر ہو رہا ہے، اس کی سماجی، معاشی اور سیاسی حقیقت کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اپنی قوم کی سماجی زندگی میں، جو تمام معاشی، سیاسی اور تہذیبی سلسلۂ عمل کا احاطہ کرتی ہے، وقت کے تقاضوں کو طرح طرح سے جُل دینے کی کامیاب کوشش ہے۔ اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ الیوژن کے ایک سلسلے سے دوسرے سلسلے تک قوم کا ذہنی اور جذباتی سفر کبھی ختم نہ ہونے پائے۔ گُر کی بات یہ ہے کہ یہ ان مٹھی بھر لوگوں کی دریافت ہے جن کا مفاد اس بات میں پوشیدہ ہے کہ تمام موجودہ معاشی، سیاسی اور تہذیبی سلسلۂ عمل اپنی جگہ پر قائم رہے۔ یہ مٹھی بھر

لوگ صرف افراد نہیں بلکہ ایک طبقہ ہیں اور یہ سماجی قوانین محض ان کے دریافت کردہ نہیں، بلکہ ان کے وضع کردہ ہیں۔ اس طبقے نے اپنے مفادات کو برقرار رکھنے کے لیے جو بلند بانگ ادارے اور تنظیمیں قائم کی ہیں، ان کی بے پناہ طاقت اور رسائی، پوری قوم کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے کافی ہے۔ ان اداروں میں سماجی عدل وانصاف اور امن وامان کے ادارے ہی نہیں، اخلاقی خوف اور جبر کے صنم خانے بھی شامل ہیں۔ ان ہی صنم خانوں میں تقدیر اور صبر وتحمل کے تصورات جنم لیتے ہیں۔ ان ہی تصورات میں جزا اور سزا کی سماجی معنویت کہیں کھو کر رہ جاتی ہے۔

محض خدائی اور تقدیر کے نام پر آج کے جمہوری ضمیر کو احتجاج سے نہیں روکا جاسکتا۔ اس لیے خدائی اور تقدیر کی جگہ نئے عقیدوں نے لے لی ہے۔ انسان کا نیا ذہن بھی ان عقیدوں سے دھوکا کھاجاتا ہے۔ وہی تمام قوتیں جو سماج کی اخلاقی قدروں اور تصورات کا فیصلہ کرتی ہیں اور زندگی کی سمت طے کرتی ہیں، غالب طبقے کا فلسفۂ حیات بھی مرتب کرتی ہیں۔ اس کاوش کی منطق یہ ہے کہ مغلوب طبقوں کو اپنا باغی فلسفۂ حیات تلاش کرنے سے باز رکھا جائے۔ اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ حریف فلسفۂ حیات کی اصطلاحوں کو احتجاج وعمل کی تحریک سے الگ کر کے غالب طبقے کے معتقدات میں شامل کرلیا جائے۔ یہ تجرید کا عمل ایک بڑے عرصے تک لوگوں کو راستے سے بھٹکانے کے لیے کافی ہے۔ صرف اسی طرح غالب قوتوں کے بوسیدہ سماجی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی اداروں کی خدمت ہوسکتی ہے اور ان کی عمر دراز ہوسکتی ہے۔ صرف اس طرح تاریخ کی رفتار کو، سماجی تبدیلی کے سلسلۂ عمل کو، اگر روکا نہیں جاسکتا تو کم از کم سُست کیا جاسکتا ہے۔ ظلم وجبر کی قوتوں کے لیے، وقت اور تاریخ کے اس سفر میں، سانس لے لینے کی مہلت ہی کیا کم ہے۔ لیکن اس مہلت کی قیمت عام لوگوں کو ہی نہیں، قوم کو ہی نہیں، ان کے دانشوروں کو بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس قیمت کا معجزہ یہ ہے کہ شخصیتیں چکنی اور روشن ہوجاتی ہیں اور ان کی روحیں مسخ اور تاریک۔ یہی اس دور کی سب سے بھیانک خصوصیت ہے اور مہلک بھی۔ اسی خصوصیت کا غیر ادبی نام دوغلہ پن ہے۔

اس خصوصیت کے سوتے، سماجی زندگی کی بنیادوں سے پھوٹتے ہیں۔ اس کا اپنا فلسفۂ حیات ہے: کہو کچھ، اور کرو کچھ۔ اس فلسفے کا سب سے بھونڈا اور مکروہ تماشا سیاست کے اسٹیج پر ہوتا رہتا ہے شب وروز۔ یہ سب سے نمایاں اسٹیج ہے۔ لیکن ہماری سماجی زندگی میں بہت سے اسٹیج ایسے ہیں جو غیر مرئی ہیں۔ اسٹیج دکھائی نہیں دیتے مگر اداکار دکھائی دیتے ہیں۔ سارے اداکار نقاب پوش ہیں۔ جن کے چہروں پر نقابیں نہیں ہیں، اُن کا میک اپ پُرفریب ہے، شاید دلفریب

بھی۔ یہ غیر مرئی اسٹیج خاص طور پر تعلیمی اداروں، ادب اور آرٹ، تھیئٹر اور فلم کے اداروں میں کام کرتا ہے۔ چونکہ یہ اسٹیج revolving stage ہے، اس لیے اداکار نقابیں بدل بدل کر (اسے اپنی زبان میں بھیس بدلنا بھی کہتے ہیں۔ پہلے زبان عام میں اس قسم کے پیشہ ور اداکاروں کو بہروپیا کہتے تھے لیکن اب یہ پیشہ اتنا عام ہو چکا ہے کہ یہ طے کرنا مشکل ہے، کون پیشہ ور اداکار ہے، کون شوقیہ فنکار۔) سامنے آتے رہتے ہیں اور داد طلب کرتے رہتے ہیں اور منہ مانگی قیمت پاتے ہیں۔ سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ لوگ اسے ایک ناگزیر طرز حیات مان کر چپ چاپ قبول کر لیتے ہیں اور خود اس کا حصہ بن جاتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی سماجی مقدر پرستی ہے جس سے نفسیاتی بے بسی اور جذباتی تسلیم و رضا کا رویہ پیدا ہوتا ہے۔

جب ریاکاری قومی زندگی کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتی ہے اور جب فنکار اور ادیب اپنے آپ کو اسی سانچے میں مقید کر لیتے ہیں تو، ظاہر ہے، ادب و فن کا تخلیقی عمل جِلا نہیں پا سکتا۔ اس کا اندازہ آج کے ادب کے رنگ و روغن سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ادب لفظی cosmetics کا ادب ہے اور جو لوگ اس ادب کی تخلیق کر رہے ہیں، وہ موجودہ دور کے ادبی سوداگر ہیں۔ سوداگری کی اپنی منطق ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔

اس ابتذال کا سب سے محفوظ اور شعور سوز مرکز یونیورسٹیاں ہیں۔ جو ادیب و شاعر یونیورسٹیوں میں جلیل القدر شخصیتوں کے مالک ہیں، ان کی ادبی اور سماجی زندگی کا جائزہ روح فرسا نتائج تک پہنچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ادب میں ایک عجیب مُحس قسم کی نصابیت پیدا کر دی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں علمی اور ادبی کام کی فرصت نہیں۔ ان کا سارا وقت کیریئر کو، پرانے جوتوں کی طرح، چمکانے میں صرف ہوتا ہے۔ لکچراری، ریڈری، پروفیسری، نظم و نسق کے عہدے — پوری سیڑھی بنی ہوئی ہے۔ دوسروں کو دھکیلنا اور گرانا اور اوپر پہنچنا، سارا ولولہ اسی میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور عمرِ عزیز کے دن پورے ہو جاتے ہیں۔ اب رہا ادب، تو یہ باعزت مشغلہ ہے۔ اس کے لیے بھی باہر پذیرائی کے بہت سے دروازے کھلے ہوئے ہیں — اب کوئی شعر ہو یا ڈرامہ، افسانہ ہو یا نظم — تو ایک پذیرائی تو اس کی ہوتی ہے عام پڑھنے اور سننے والوں میں۔ لیکن یہ انا اور اعلیٰ مقاصد کی تسکین کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اصحاب حل و عقد کے کانوں میں شہد ٹپکایا جائے۔ یہ کام کیسے ہو۔ تو ظاہر ہے کون سی 'بڑی شخصیت' ہے جس کی انگلیوں میں ڈور نہیں۔ اب ڈور کی تلاش شروع ہوتی ہے۔ ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی مل جاتا ہے، یہ تو ڈور ہی ہے۔ اگر کسی حاکم اور اس کی بیگم کی نظرِ کرم ہو جائے تو ادب کی کشتی بھی کنارے لگ جاتی ہے اور نصابی کیریئر کا

بیڑا بھی پار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی کافی نہیں ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ادب کا اُفق، یونیورسٹی کے اُفق سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ اس پر اپنی شناخت کا پرچم کیسے لہرایا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک اور پوز اختیار کیا جائے۔ مان لیجیے فضا اگر انقلابی ہے اور آپ اس کے ہمنوا ہیں، اور اگر آپ اپنے فن کو اس فضا کے اظہار کے لیے استعمال کر رہے ہیں، گھسے ہوئے ٹھپے کی طرح نہیں، بلکہ معجز نما کی طرح، تو یہ نصابی ادیب کیا کرے، جس کے پاس فن ہے نہ نظریاتی وابستگی کا کھرا خلوص — وہ یہ کرے کہ دوسروں سے زیادہ چیخ چیخ کر بات کرے، فضا جتنی گرم ہے، اس سے زیادہ گرم الفاظ اگلے۔ ہر وقت حکمراں اداروں کے خلاف آتش فشانی کرے اور پردے کے پیچھے جا کر ان کے تفننِ طبع کے لیے نٹ بن جائے، ان کا پھینکا ہوا راتب چاٹے۔ کبھی القاب سے نوازا جائے، کبھی فیلوشپ سے۔ ایک طرف ماؤ ماؤ کرے اور دوسری طرف دو زانو بیٹھ کر معصوموں کا خون نچوڑنے والے جھریوں بھرے ہاتھوں کو بوسہ دے۔ کبھی عرس میں نعت پڑھے، کبھی سرکاری قسم کا سیمینار کرے۔ کبھی ایک شعبے کی صدارت حاصل کرنے کے لیے ضمیر کو بیچ دے، کبھی لوگوں کو سنیاس اور سیدھی سادی زندگی کا سبق پڑھائے — ان ہی ڈھکوسلوں میں زندگی بتا دے — میڈیوکرٹی کے ان مظاہروں اور تماشوں سے ادب کی نہ پہلے خدمت ہوئی ہے، نہ آئندہ کبھی ہوگی۔

دوغلہ پن اس دور کا بہت ہی منافع بخش کاروبار ہے اور اس کے سب سے بڑے کاروباری اب ان اداروں میں رینگ رہے ہیں، جہاں دانشوری کے نام پر میڈیوکرٹی کا بازار گرم رکھا جاتا ہے۔

فنکار اپنی شخصیت کے نقوش کو اُبھارنے کے لیے اپنی پہچان پر زور دیتے ہیں۔ وہ اپنی اس پہچان کو دانشورانہ انفرادیت بھی کہتے ہیں۔ اگر پچھلے چند برسوں کی تحریروں کا تجزیہ کیا جائے اور ادیبوں کے اپنے وعدوں کی روشنی میں ہر 'منفرد' شخصیت کے خط و خال کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ 'انفرادیتیں' ایک دوسرے میں ضم ہو جاتی ہیں۔ اس انضمام کی مشترکہ قدر وہی ہے جس کا اظہار اسی لفظ سے ہوتا ہے جو اس تحریر کا پہلا لفظ ہے۔ کتنی عجیب بات ہے، ایک غیر ادبی لفظ سے ایک ادبی شخصیت کا تعین ہوتا ہے۔ کہتے ہیں، ہر انسان کی طرح، ہر ادیب و فنکار امتحان کی گھڑیوں میں پہچانا جاتا ہے۔ ایسی ہی امتحان کی گھڑی نئے ہندوستان کی تاریخ میں اس وقت آئی، جب سماجی اور سیاسی اقتدار کے اداروں نے خود اپنے بنائے ہوئے سومنات ڈھا دیے۔ جب جمہوری اصولوں اور قدروں کو مصلحت اور جبر کی گہری خندقوں میں سلا دیا گیا — اور جب ایسا ہوا تو ان روشن ضمیر شخصیتوں کا کیا ہوا جو فنی تخلیق پر خود پرستی کی مہر لگا کر ادب کی ابدیت کا قصیدہ پڑھ رہے تھے۔ سب تھوک کے تھوک بک گئے، اپنی ابدیت سمیت۔ تب نہ خود فریب وجودیت کی آزاد معجزہ

کاری کام آئی اور نہ گاؤں سے شہر کی طرف لشکر لے کر نکلنے کے خواب۔ جو لوگ ادب اور تنظیم کی یکجائی کو فن کی موت سمجھتے تھے اور فرد کی آزادی کو اجتماعی خواب اور مقدر سے زیادہ مبارک اور وزنی مانتے تھے، جبر کی پہلی لہر کے ساتھ بہہ گئے اور جمہور دشمن تنظیم کی شاخِ نازک پر اپنا اپنا آشیانہ بنا کر بیٹھ گئے ـــ اب وہ شاخیں کہاں ہیں اور ان پر ٹھہرے ہوئے آشیانے اور ان آشیانوں کے مکیں؟ چند عہدوں، چند صدارتوں، چند مشاعروں کو مرغزار سمجھنے والے یہ مویشی اب کہاں ہیں؟ کائنات کے یہ تنہا مسافر 'زندہ باد' کی کشتیوں میں بیٹھ کر چاند تاروں کے کن ساحلوں پر اُتر گئے؟ بے چارے! لیکن ان کے نظریات، تعصبات اور خواب اب بھی زندہ ہیں۔ یہ اپنے لشکر جمع کر رہے ہیں۔ وقت آنے پر یہ آنکھوں سے اوجھل سرحدوں سے نکل آئیں گے اور یلغار کریں گے ـــ ان کے دوغلے پن نے انھیں جو بے چہرگی عطا کی ہے، وہ الفاظ کی کمیں گاہوں سے اپنے تمام بھیانک پن کے ساتھ نکل آئے گی اور خود فریبیوں کی خواب گاہ میں در آئے گی ـــ تب کیا ہوگا؟

ادب کو اس قید سے نجات دلائے بغیر تخلیقی عمل کو شاندار جمالیاتی تجربہ نہیں بنایا جا سکتا اور شاندار جمالیاتی تجربہ وہی ہے جو آزاد اور بے لاگ تخلیقی عمل سے جنم لیتا ہے۔

OO

('شعور': پہلی کتاب: ۱۹۷۸ء)

کمپوزیشن ایک

سورج کے ساتھ تمھارا کیا سمبندھ ہے؟
میں جاہل، بے بس، بیمار کچھ نہ کہہ پاتا۔
ان دنوں میرے ذہن کی قیدگاہ میں یہی سوال تھا — سورج کے ساتھ تمھارا کیا سمبندھ ہے؟
میرے ذہن کی قیدگاہ کی چابیاں میرے پاس نہ تھیں کہ دروازہ کھول دیتا، سوال کو بھی نجات ملتی اور مجھے بھی۔
چابیاں کس کے پاس ہیں؟
میں جاہل، بے بس، بیمار کس سے پوچھتا؟
ان دنوں عجیب کیفیت تھی۔
اِدھر سورج طلوع ہوتا، اُدھر میری آنکھ کھلتی۔ اِدھر سورج اپنے سفر پر روانہ ہوتا، اُدھر میں اپنے سفر پر روانہ ہوتا۔ ہم منزلیں طے کرتے بڑھتے رہتے اور پھر اِدھر سورج غروب ہوتا اور اُدھر مجھے نیند آ جاتی۔
یہ سب ہوا کیسے؟
یہ سب مجھے معلوم نہیں — میں نے کبھی سورج کو آنکھ بھر کر نہیں دیکھا تھا۔
پہلی بار جب سورج کے غروب ہوتے ہی مجھے نیند آئی، میں سورج کی جانب رُخ کیے ہوئے تھا۔ ٹھنڈی ہوا دھیمے دھیمے بہہ رہی تھی اور سورج نیم کی سرسراتی پتیوں میں مسکرا رہا تھا۔ میں آرام کرسی میں دھنسا ہوا تھا اور رُت کے ہاتھوں ذبح ہو رہا تھا اور ذبح ہوتے ہوئے انجانی لذتیں پا رہا تھا — انجانی لذتیں؟ نیم کی سرسراتی پتیوں میں سورج کی مسکراہٹ! نرم، ٹھنڈی، ہموار کٹی ہوئی سبز گھاس پر نیم کی پتیوں کی پرچھائیوں کا رقص اور میری رگوں میں دوڑتا ہوا ڈپلومیٹ کے تین پیگوں کا سرور۔
اور پھر نیم کی پتیوں میں مسکراتا ہوا سورج دھیمے دھیمے نیچے اُترنے لگا۔

میں کرسی کھینچ کر نیم کے تنے کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔

سبز گھاس پر پیلی دھوپ بچھی ہوئی تھی۔

اور پھر پیلی دھوپ کی چادر دھیمے دھیمے سمٹنے لگی۔

میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے، میری آنکھیں مندنے لگیں۔

اور پھر دھوپ کی آخری کانپ سمٹ گئی اور مجھے نیند آ گئی۔

اور پھر جب میری آنکھ کھلی، زرد، اُداس سورج مشرقی اُفق پر مسکرا رہا تھا۔

اس سے پہلے میں کبھی اتنی لمبی نیند نہیں سویا تھا۔

اور پھر یوں ہوتا کہ اِدھر سورج طلوع ہوتا، اُدھر میری آنکھ کھلتی۔ اِدھر سورج اپنے سفر پر روانہ ہوتا، اُدھر میں اپنے سفر پر روانہ ہوتا۔ ہم منزلیں طے کرتے بڑھتے رہتے اور پھر اِدھر سورج غروب ہوتا، اُدھر مجھے نیند آ جاتی۔

پھر میرے ذہن کی قید گاہ میں سرسراہٹ ہونے لگی۔

میں اس سرسراہٹ سے ناآشنا تھا۔

میں نے اس سرسراہٹ کو معنی دینے کی کوشش کی — میری کوششیں جاری رہیں۔ سورج طلوع ہوتا، میری نیند کھل جاتی۔ سورج غروب ہوتا، مجھے نیند آ جاتی۔ اور ایک جُگ بیت گیا اور میں اس ناآشنا سرسراہٹ کو معنی دے پایا۔

سورج کے ساتھ تمھارا کیا سمبندھ ہے؟

سرسراہٹ کی شکل ایک سوال کی شکل تھی — سوال کہ میرے ذہن کی قید گاہ میں قید تھا۔

سورج کے ساتھ تمھارا کیا سمبندھ ہے؟

میں جاہل، بےبس، بیمار کچھ نہ کہہ پاتا۔

میں جاہل تھا کہ سوال حل نہ کر پایا۔

بےبس تھا کہ نہ میں سورج پر قابو پا سکا نہ اپنے آپ پر — کہ اِدھر سورج طلوع ہوتا، اُدھر میری آنکھ کھلتی۔ اِدھر سورج غروب ہوتا، اُدھر مجھے نیند آ جاتی۔

میں بیمار تھا کہ میری رگیں سورج کی کرنوں کی محتاج ہو گئی تھیں۔

سورج کے ساتھ جاگنا اور سورج کے ساتھ سونا آزار بن گیا کہ سورج کا اور میرا سمبندھ میری سمجھ سے بالاتر تھا اور میں سمبندھ کی نوعیت جانے بنا رہ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہر دم میرے ذہن کی قید گاہ میں سوال چیختا تھا: سورج کے ساتھ تمھارا کیا سمبندھ ہے؟

اور میرے ذہن کی قیدگاہ کی چابیاں میرے پاس نہ تھیں کہ دروازہ کھول دیتا، سوال کو بھی نجات ملتی اور مجھے بھی۔

چابیاں کس کے پاس ہیں؟

میں جاہل، بے بس، بیمار کس سے پوچھتا؟

اور پھر یہی ہوتا کہ مشرقی اُفق پر سورج نمودار ہوتا، میری پلکوں پر بیداری نمودار ہوتی۔ سورج زرد اور اُداس ہوتا، میں پژمردہ اور اُداس ہوتا۔ سورج مجھ سے دُور ہوتا اور مغرب کی جانب پھیلا ہوا میرا سایہ مجھ سے لمبا ہوتا۔ سورج سفر پر روانہ ہوتا، میرا سایہ سفر پر روانہ ہوتا۔ سورج مشرقی اُفق سے دھیمے دھیمے اُٹھتا، میرا سایہ دھیمے دھیمے میرے گرد گھومنا شروع کرتا۔ سورج میرے قریب آتا، میرا سایہ سکڑ جاتا۔ سورج میرے سر پر ہوتا، میرا سایہ میرے قدموں تلے ہوتا۔ سورج مغربی اُفق کی جانب دھیمے دھیمے بڑھتا اور میرا سایہ مشرق کی جانب پھیلنے لگتا اور پھر اِدھر سورج غروب ہوتا، اُدھر مجھے نیند آ جاتی۔

کیا سورج اور میرے سمبندھ کی گرہ میرا سایہ ہے؟

میں سمبندھ کی بنیاد جاننے کا جتن کرتا۔

کیا میرا سایہ، میرا سایہ ہے؟

میں ثابت قدم نہ رہ پاتا۔

کیا میرا سایہ، سورج کا سایہ ہے؟

کیا میں اور سورج جڑواں بھائی ہیں؟

ہر بار میں جان پایا کہ میں جاہل ہوں، بے بس ہوں، بیمار ہوں، لیکن میری جہالت، بے بسی اور بیماری میری مشکلوں کا حل نہ تھی۔

اور پھر ایک دن، کہ سورج محوِ سفر تھا، میرے کان میں اجنبی ہوا نے چپکے سے کہا:

''میرے نادان دوست، تم سورج اور سائے کا مرکز ہو۔ سورج اور سایہ تمھارے گرد گھومتا ہے۔''

اور پھر یوں ہونے لگا کہ اِدھر میری آنکھ کھلتی، اُدھر سورج طلوع ہوتا۔ اِدھر میں سفر پر روانہ ہوتا، اُدھر سورج سفر پر روانہ ہوتا۔ ہم منزلیں طے کرتے بڑھتے رہتے اور پھر اِدھر مجھے نیند آتی، اُدھر سورج غروب ہو جاتا۔

OO

('سویرا'، لاہور: ۱۹۶۳ء)

کمپوزیشن دو

آپ لوگ مجھے جانتے ہیں، پہچانتے نہیں۔ پہچاننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ لوگوں نے مجھے دیکھا نہیں ہے اور آپ مجھے کبھی دیکھیں گے بھی نہیں۔ اگر میں آپ کے سامنے آ جاؤں، ممکن ہے، آپ میں سے کچھ لوگ بھڑک جائیں اور مجھے ادھ موا کر دیں۔ میرا کام ہی ایسا ہے۔ آپ وزارت خارجہ میں کلرک ہیں اور آپ ٹائمز آف انڈیا کے نامہ نگار ہیں۔ آپ کبھی دل سے اور کبھی بددلی سے کام کرتے ہیں۔ آپ ہی کے کچھ بھائی قبریں کھودتے ہیں، کچھ مردے جلاتے ہیں، کچھ پھانسی دیتے ہیں۔ قبریں کھودنا، مردے جلانا اور پھانسی دینا کام ہیں اور یہ کام کسی نہ کسی کو کرنا ہیں، یہ آپ جانتے ہیں اور ان لوگوں کو منہ بنا کر پائیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے، آپ قبول کر لیتے ہیں۔ آپ انھیں پہچانتے ہیں، وہ آپ کے سامنے آ بھی جائیں، آپ بھڑکیں گے نہیں اور انھیں ماریں گے بھی نہیں ممکن ہے، آپ منہ پھیر کر راستہ بدل لیں۔ میری جان بڑی مشکل میں ہے۔ آپ لوگ مجھے جانتے ہیں، پہچانتے نہیں۔ آپ لوگوں کو مجھ پر غصہ ہے لیکن آپ سوچتے کیوں نہیں؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟ میرا کام ہی ایسا ہے۔ بھری برسات میں، جھلستی گرمی میں، ٹھٹھرتی سردی میں اور ہنستے کھیلتے اٹکھیلیاں کرتے موسم میں؛ وادیوں میں، ویرانوں میں؛ جنگ کے میدانوں میں، اسپتالوں میں؛ سونے چاندی کے گھروں میں، گھاس پھوس کی جھونپڑیوں میں: صبح و شام، ہر گھڑی؛ چند لمحوں کی عمر کے بچے کو، سترہ سال کی محو خواب لڑکی کو، پچیس سال کے کڑیل جوان کو، اسّی سال کے بڈھے کھوسٹ کو؛ شرافت کے مجسمے کو، کمینگی کے پتلے کو، بھولے بھالے کو، چالاک کو... میں موت کا فرشتہ ہوں... میں ہر کسی کے پاس جاتا ہوں اور اسے لے آتا ہوں۔ مجھے آپ جانتے ہیں، پہچانتے نہیں۔

زندگی میں جو کام آپ کے ذمے لگا ہے، آپ اس کام میں کچھ نہ کچھ لذّت تو ضرور پاتے ہوں گے! جو کام میرے ذمے ہے، اب کہ آپ سے پہلی بار، اور شاید آخری بار، بات کرنے کا موقع ملا ہے، کہہ دوں، جو کام میرے ذمے ہے، اس میں بے پناہ لذّت ہے۔ اب یہی دیکھیے نا، اس لذّت کا بھلا کوئی انت ہے کہ نازی ڈکٹیٹر ہٹلر ہو یا ہندوستانی جمہوریت پسند نہرو، فلم اسٹار

جیمز ڈین ہو یا کالو بھنگی — سب میرے ساتھ چپ چاپ چل پڑتے ہیں۔

آج پہلی بار میں آپ لوگوں سے بات کر رہا ہوں۔ کیوں؟ آپ میری بات توجہ سے سن رہے ہیں۔ آپ میری بات توجہ سے سننے پر مجبور ہیں۔ کیوں؟ آپ خوفزدہ ہیں۔ آپ کا خوف بے معنی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جتنے لوگ یہاں بیٹھے ہیں، ان میں سے کسی کی موت ابھی قریب نہیں ہے۔ آپ لوگوں میں سے کوئی بھی، بنا کسی خوف کے، میری بات سنے بنا، یہاں سے اُٹھ کر جا سکتا ہے۔ آپ نے ان گنت لوگوں کی بُری بھلی تقریریں سنی ہیں۔ کبھی آپ نے جی سے تقریریں سنی ہیں اور کبھی مجبوراً۔ میں سب جانتا ہوں۔ میں کوئی تقریر نہیں جھاڑنا چاہتا۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میری جان مشکل میں ہے...

آپ لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی آپ کی زبان پر درازیٔ عمر کا کلمہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کا کوئی دوست، عزیز یا رشتہ دار اُٹھ جاتا ہے، آپ لوگ رونے پیٹنے، غم منانے کا اتنا بڑا آڈمبر رچاتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ ایک آدمی عمر بھر بوجھ اُٹھاتا ہے اور پھر ایک سرد رات اکڑ جاتا ہے اور ایک آدمی سترہ سال راج سنگھاسن پر بیٹھتا ہے اور پھر ایک گرم دن لڑھک جاتا ہے۔ ٹھیک ہے، دونوں نے اپنا اپنا کام کیا اور چل دیے۔ اس میں رونے پیٹنے یا جلسے جلوس نکالنے کی کیا بات ہوئی؟ کسی بھی آدمی کی پہچان، اس کا مرنا نہیں، اس کا جینا ہوتی ہے۔ اور یہ کہ آپ لوگوں کو جینے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی، مرنے کا غم ہوتا ہے، میرا کام آسان ہو جاتا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے کام پر شرمسار نہیں ہوتا۔

میری جان مشکل میں ہے۔ بات یہ ہے، آپ لوگ اکثر موت کی آہٹ، موت کے قدموں کی چاپ کی بات کرتے ہیں۔ کیا آپ کو میرے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے؟ یہ آپ کا واہمہ ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ میں دن رات آپ لوگوں کے درمیان گھومتا پھرتا ہوں، آپ کی آنکھ لگی ہو یا کھلی ہو، میں آپ کے پاس بیٹھا رہتا ہوں؛ بعض اوقات آپ کو چھو کر گزر جاتا ہوں۔ نہ تو آپ میرے قدموں کی چاپ سن پاتے ہیں، نہ میرے سانس محسوس کر پاتے ہیں۔ لیکن آپ میری موجودگی سے خائف ۔ بتے ہیں، کیوں؟

میری جان مشکل میں ہے۔ بات یہ ہے... بات یہ ہے کہ اپنی بات کہنے کے لیے کتنا بڑا آڈمبر رچانا پڑتا ہے۔ اب یہی دیکھیے تا کہ مجھے اپنی بات کہنے کے لیے کتنا بڑا آڈمبر رچانا پڑا ہے! بات یہ ہے کہ آپ نے زندگی میں کتنی سیاہی دیکھی ہے؟ میرا کام سیاہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک آدمی میری مشکل بن گیا ہے۔

اس آدمی کی کل کائنات ایک کمرہ ہے — ایک کمرہ۔ کمرہ کیا ہے، اب کیا کہوں؟ ایک کمرہ ہے جس کی دیواریں سیاہ ہیں، چھت سیاہ ہے۔ ایک کھڑکی ہے اور ایک دروازہ۔ کھڑکی اور دروازہ — دونوں کی چوکھٹیں سیاہ ہیں، پٹ بھی سیاہ ہیں اور ان کے شیشے بھی سیاہ ہیں۔ کھڑکی اور دروازے پر موٹے، کھردرے کپڑے کے پردے ٹنگے ہوئے ہیں جو سیاہ ہیں۔ کمرے کے ایک کونے میں دیوار کے ساتھ میز رکھی ہوئی ہے۔ میز سیاہ ہے، میز پوش پر کڑھے ہوئے پھول بھی سیاہ ہیں۔ چند کتابیں میز پر اوپر تلے اوندھی سیدھی پڑی ہوئی ہیں۔ کتابوں کی جلدیں سیاہ ہیں، اوراق سیاہ ہیں، اور اوراق پر پھیلی ہوئی عبارت سیاہ ہے۔ میز پر چند کورے کاغذ بھی پڑے ہوئے ہیں۔ کاغذ سیاہ ہیں۔ قریب رکھی ہوئی قلم سیاہ ہے اور قلم میں روشنائی سیاہ ہے۔ میز کے قریب ایک کرسی پڑی ہے۔ کرسی سیاہ ہے، کرسی کا بید سیاہ ہے اور کرسی کی پشت پر چڑھا ہوا غلاف بھی سیاہ ہے، اور غلاف پر کڑھے ہوئے پھول بھی سیاہ ہیں —

دیواروں پر سات تصویریں آویزاں ہیں۔ تصویروں کے موٹے اور چوڑے چوکھٹے سیاہ ہیں؛ تصویریں سیاہ ہیں۔ چھت کے عین بیچ میں سیاہ کنڈا ہے جس کے ساتھ بجلی کی سیاہ تار بندھی ہوئی ہے۔ فرش کی طرف لٹکتی ہوئی سیاہ تار کے ساتھ سیاہ بلب ٹنگا ہوا ہے۔ بلب کا شیڈ سیاہ ہے۔ ایک دیوار میں سیاہ سوئچ بورڈ ہے۔ سوئچ بھی سیاہ ہے۔ کھڑکی کے عین نیچے تابوت رکھا ہوا ہے۔ وہ کمرہ...

جس آدمی کی کُل کائنات وہ کمرہ ہے، وہ آدمی میری مشکل بن گیا ہے۔

دن بھر آفتاب کی تیز روشنی میں دنیا میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اس کمرے میں — آفتاب کی تیز روشنی کو اب تک وہ کمرہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا ہے! وہ کمرہ، دن بھر، جوں کا توں، سیاہی میں لت پت پڑا رہتا ہے۔ دن ڈوبتا ہے؛ شام کے سائے گہرے ہوتے ہیں، رات دبے پاؤں آتی ہے، دنیا کا کاروبار ٹھپ ہو جاتا ہے؛ رات گہری ہو جاتی ہے، دنیا سو جاتی ہے اور — اس سے سیاہ کمرے میں، سیاہ تابوت کا ڈھکنا اٹھتا ہے اور وہ آدمی جاگتا ہے — وہ آدمی جو میری مشکل بن گیا ہے۔

وہ آدمی جاگتا ہے، انگڑائیاں توڑتا ہے۔ اس کا بدن چٹختا ہے اور پھر وہ سوئچ آن کرتا ہے۔ سیاہ کمرے میں سیاہ بلب سے سیاہ روشنی پھوٹ پڑتی ہے اور کمرے کی سیاہی گہری ہو جاتی ہے۔

اس آدمی کا لباس کیا ہے؟ اس آدمی کا لباس ایک سیاہ چادر ہے جو اس نے سادھوؤں کی طرح اوپر تلے لپیٹ رکھی ہے۔ پاؤں میں سیاہ چپل ہے اور آنکھوں پر سیاہ فریم اور سیاہ شیشوں والی عینک ہے۔

اس آدمی کی کُل کائنات سیاہ ہے۔ وہ چند لمحے ایک تصویر کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، پھر دوسری تصویر کے سامنے، پھر تیسری کے۔ اور اسی طرح تصویریں دیکھ لینے کے بعد کرسی میں دھنس

جاتا ہے اور سیاہ عبارت لکھتا ہے۔ وہ سیاہ عبارت کیا ہے، کیا کہوں؟

بہت رات گئے تک وہ لکھتا رہتا ہے۔ سیاہ کمرے میں، سیاہ روشنی میں، سیاہ لباس میں، سیاہ کرسی میں دھنسا ہوا، سیاہ میز پر جھکا ہوا ایک آدمی، جو سیاہ قلم سے، سیاہ کاغذوں پر، سیاہ عبارت لکھتا ہے، میری مشکل بن گیا ہے— وہ آدمی جس کی کُل کائنات ایک کمرہ ہے جہاں دنیا بھر کی سیاہی سمٹ گئی ہے۔ کمرے کے باہر رات ہے، کمرے کے اندر سیاہی ہے جہاں بہت رات گئے تک وہ لکھتا رہتا ہے، سیاہی میں، خاموشی میں۔

اور جب نپے تلے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے وہ جھکا ہوا سر اٹھاتا ہے، گردن گھما کر دروازے کی جانب دیکھتا ہے۔ دروازہ دھیمے سے کھلتا ہے، پردہ لرزتا ہے اور سیاہ ساری اور سیاہ بلاؤز میں لپٹی ہوئی، لمبے سوکھے گھنے سیاہ بالوں والی لڑکی نظر آتی ہے۔

لڑکی دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی ہے اور بازو بڑھا کر اس کے اٹھے ہوئے سر کو بازوؤں میں باندھ لیتی ہے اور پھر اس کی پیشانی چومتی ہے، پھر گال اور پھر ہونٹ— اور پھر— وہ بے تحاشہ اسے چومتی ہے اور پھر سسکتے سسکتے رونے لگتی ہے۔ اس کے ہاتھ کانپتے کانپتے لڑکی کے لمبے سوکھے گھنے سیاہ بالوں سے کھیلتے رہتے ہیں اور— اور پھر اس سیاہ کمرے میں سیاہ سرگوشیاں ہوتی ہیں:

یہ جیون ہے نا...

اور یہ بدن...

تم...

اور تم...

ایک ہی مٹی...

ہم سکھی ہیں...

ہم دکھی تھے نا اس لیے...

اور ایسی ہی سرگوشیوں کے درمیان، وہ دو سیاہ پرچھائیاں بانہوں میں بانہیں ڈالے کھڑی ہو جاتی ہیں اور سیاہ دیوار پر آویزاں، سیاہ چوکھٹوں میں جڑی ہوئی سیاہ تصویروں پر نظریں گاڑ دیتی ہیں اور— اور...

ہم نہ کہتے تھے کہ دن کا اندھیرا موت ہے...

رات کا اُجالا زندگی ہے...

اور جب رات دم بہ لب ہوتی ہے، سیاہ ساری اور سیاہ بلاؤز میں لپٹی ہوئی، لمبے سوکھے گھنے

سیاہ بالوں والی لڑکی لوٹ جاتی ہے اور وہ — جس کا لباس ایک سیاہ چادر ہے جو اس نے سادھوؤں کی طرح اوپر تلے لپیٹ رکھی ہے — تابوت میں دراز ہو جاتا ہے اور تابوت کا ڈھکنا گر جاتا ہے...

وہ آدمی میری مشکل بن گیا ہے۔ میری مشکل کا حل... لیکن آپ یہ سب کیا جانیں کہ آپ کی زبان پر تو درازیٔ عمر کا کلمہ ہے۔

ہم اس کی آواز کے جادو میں کھو گئے تھے۔

جب اس کی آواز کا جادو ٹوٹا اور ہم ہوش میں آئے، ہم نے دیکھا کہ ہال میں قیامت بپا ہے۔ اس کا لباس، ایک سیاہ چادر تھی جو اس نے سادھوؤں کی طرح اوپر تلے لپیٹ رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ فریم اور سیاہ شیشوں والی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں میں سیاہ چپل تھی اور وہ ہمارے قریب ہی اسٹیج پر، اپنے گھٹنوں کے گرد بازو باندھے، اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا اور ہال میں قیامت بپا تھی۔

''اس کالے آدمی کو باہر نکالو!''

''ہم مریضوں کے افسانے سننے نہیں آئے!''

''مارو!''

''مارو!''

''مارو سالے کو!''

آن کی آن میں پورا ہجوم اسٹیج پر ٹوٹ پڑا اور ہم یہی دیکھ پائے کہ جوتے، گھونسے، چھڑیاں، پتھر برس رہے ہیں۔

اور جب قیامت ٹلی، ہم نے دیکھا، وہ شخص ڈھیر ہوا پڑا ہے۔ اس کی پیشانی، ناک، کان اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

ہمارے دیکھتے دیکھتے اس کے سانس اکھڑ گئے، اور پھر ایک شخص نے اس کی سیاہ چادر کے پلو سے اس کا منہ ڈھک دیا۔

جب ہم اس کے گھر گئے ہم نے دیکھا: ایک کمرہ ہے — ایک کمرہ — کمرہ کیا ہے، اب کیا کہیں؟ ایک کمرہ ہے، جس کی دیواریں سیاہ ہیں، چھت سیاہ ہے۔

OO

('سویرا'، لاہور: ۱۹۶۵ء)

کمپوزیشن تین

جنوری کی اس خوش گوار، خنک صبح میں کافی ہاؤس کے ویران لان میں کرسیاں جوڑے، ٹانگیں پسارے نیم دراز تھا۔ میری بائیں کہنی میز پر ٹکی ہوئی تھی اور بوجھل پلکیں گری ہوئی تھیں۔ سورج میری پشت پر تھا اور خنک، کاٹتی ہوئی ہوا مغرب کی اور سے چلی آ رہی تھی — میز پر کافی رکھی ہوئی تھی۔ گرم کافی، سوندھی سوندھی باس لیے کافی — میں ٹانگیں پسارے، آنکھیں موندے نیم دراز تھا۔ کافی سے لبالب بھری پیالی اُٹھانے کے لیے بایاں ہاتھ بڑھاتا، ہتھیلی کی لپیٹ میں پیالی آ جاتی؛ ہتھیلی تپ جاتی اور میں ہاتھ کھینچ لیتا — وہ صبح ہزار انجانی، بے نام لذتیں لیے ہوئے تھی۔

سورج اُبھرتا اُبھرتا میری گردن تک آ پہنچا اور —

''تم افسانہ نگار ہو....؟''

میں نے بمشکل بوجھل پلکیں اُٹھائیں اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا — خنک کاٹتی ہوئی ہوا کے ایک جھونکے نے سلگتی ہوئی آنکھوں کو راحت بخشی — وہ میرے لیے اجنبی تھا۔

''تم مجھے نہیں جانتے۔ میں تمھیں جانتا ہوں۔ تم افسانہ نگار ہو....!'' اس نے پھر کہا۔

اس نے دو ڈگ بھرے اور برابر کے ٹیبل سے کرسی کھینچ لی۔

''تمھاری کافی ٹھنڈی ہو گئی ہے....!'' اس نے کہا۔

میں نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور دو کافیاں لانے کا اشارہ کیا۔

''میرا نام پالی ہے....!''

میں خاموش رہا — کیا کہتا؟

''تم مجھ پر افسانہ لکھو گے؟'' اس نے پھر کہا۔

مجھے محسوس ہوا، میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی ہے — میں خاموش رہا۔

میں نے سگریٹ سلگایا۔ پھیپھڑوں تک دُھواں کھینچا اور اس کی اور دیکھا۔

''میں اپنا برانڈ پیتا ہوں....!'' اس نے سگریٹ سلگانے کے بعد کہا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے پھر کہا:

''بات یہ ہے کہ... کبھی کبھی جی چاہتا ہے، سب کچھ پھونک ڈالوں... لیکن...''

میں نے اس کے چہرے پر آنکھیں گاڑ دیں۔

اس نے کافی کی دونوں پیالیوں میں ایک ایک چمچ چینی ملائی اور پھر ایک پیالی میری اور بڑھا دی۔

''بات صرف اتنی ہے کہ...''

اس نے میری طرف دیکھا۔

شکل وصورت کے اعتبار سے وہ اچھا خاصا تھا — لیکن کیا کیا جاتا؟

میں خاموش رہا۔

''میں بہت کچھ کر سکتا ہوں لیکن میں کچھ نہیں کرتا... میری صحت اچھی ہے، میری صورت اچھی ہے، میری تعلیمی حیثیت بھی اچھی ہے۔ میں ٹرینڈ میکینک ہوں اور میں انڈیا کی طرف سے بین الاقوامی مقابلوں میں ہاکی کھیل چکا ہوں لیکن... لیکن کوئی مستقبل نہیں۔ نہ نوکری ملتی ہے نہ لڑکی۔ پینتیس سال عمر ہوگئی ہے اور نہ گھر نہ گھاٹ۔ عجیب ملک ہے... اور ذلیل لوگ کہتے ہیں، ملک کو کلرکوں کی نہیں، ٹرینڈ ہینڈز کی ضرورت ہے... میں اس ذلیل ملک کے لیے کچھ نہیں کر سکتا، جہاں چپراسی سے لے کر وزیر تک، بددیانت لوگوں کا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ جانتے ہو میں کیا کیا کرتا ہوں... آئم اے میل پراسٹی ٹیوٹ...''

ادْروہ — یہ جا، وہ جا۔

اور میں —

میں بہت دیر تک مسکراتا رہا۔

اس دن کی شروعات قابلِ قبول تھیں: ایک ناراض آدمی افسانہ نگار کے پاس پہنچتا ہے، اپنی ناراضگی کا بھرپور اظہار کرتا ہے اور اپنے راستے چل دیتا ہے۔

اس دن کی شروعات خوب تھیں۔

صبح صبح میری آنکھ کھل گئی تھی — کمرے میں چڑیاں پھدک رہی تھیں اور چیں چیں کیے جا رہی تھیں۔

میرا کمرہ، موسم سرما میں، ان چڑیوں کا رات بھر کا ٹھکانہ ہے — دن بھر کھڑکی کھلی رہتی ہے۔ شام ڈھلے چڑیاں کمرے میں چلی آتی ہیں اور چھت کے درمیان بیکار پھنسے ہوئے کنڈے

میں بسیرا ڈال دیتی ہیں۔ بہت رات گئے، میں کمرے میں آتا ہوں، کھڑکی بند کرتا ہوں اور سو جاتا ہوں — رات بھر، اس بند کمرے میں، چڑیاں اور میں، آرام کرتے ہیں۔ صبح ہوتی ہے، اور چڑیاں پھدکتی ہیں، چیں چیں کرتی ہیں، میرے لحاف پر بیٹھتی ہیں — ان کی ننھی سی جان جتنا کہرام مچا سکتی ہے، مچاتی ہے۔ مجھے بستر چھوڑ کر اُٹھنا پڑتا ہے اور کھڑکی کھولنا پڑتی ہے — کھڑکی کھلتی ہے اور چڑیاں — یہ جا، وہ جا۔

اُس رات میری آنکھ لگی ہی تھی کہ کھل گئی — کمرے میں چڑیاں پھدک رہی تھیں اور چیں چیں کیے جا رہی تھیں۔

کہاں آن پھنسے؟

ادھر میری زبان سے یہ تین الفاظ پھسلے، اُدھر میری جھکی ہوئی آنکھوں سے نیند اُڑ گئی۔

کہاں آن پھنسے؟

چڑیاں کمرے کے طول و عرض میں پھدک رہی تھیں، چیں چیں کیے جا رہی تھیں۔

چیں چیں، چیں چیں کہاں آن پھنسے چیں چیں کہاں آن پھنسے چیں چیں کہاں آن پھنسے چیں چیں، چیں چیں —

میں نے لحاف سے اچھی طرح منہ سر ڈھک لیا، ٹانگیں پیٹ کے ساتھ باندھ لیں اور سکڑ کر گٹھری بن گیا۔

چیں چیں کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی اور چڑیوں کا پھڑ پھڑانا بھی مجھے سنائی دے رہا تھا۔

نیند کی شدید طلب تھی لیکن نیند میری آنکھوں سے اُڑ چکی تھی۔

کہاں آن پھنسے؟

غیر شعوری طور پر میری زبان سے پھسلے ہوئے اِس سیدھے سادے جملے کے معنی کیا ہیں؟ میں لحاف میں گٹھری بنا سکڑا ہوا تھا اور گٹھری کھولنے کی کوشش میں، چڑیاں لحاف میں چونچیں مار رہی تھیں۔

میں نے ٹانگیں پھیلا لیں اور لحاف اُلٹ دیا۔

چڑیاں چھت کے درمیان بیکار پھنسے ہوئے کنڈے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

میں نے سگریٹ سلگا کر غافل ہونا چاہا کہ یار لوگ کہتے ہیں، میں سگریٹ سلگا کر غافل ہو جاتا ہوں۔

میں نے سگریٹ سلگایا اور پھیپھڑوں تک دُھواں کھینچا۔

مجھے اخبار کی طلب محسوس ہوئی لیکن اخبار بند دروازے کے اُس طرف پڑا ہوا تھا کہ ہمیشہ پڑا ہوتا ہے—اب کون اٹھائے؟

صبح صبح سگریٹ پینے میں بڑی لذت ہے...!

صبح صبح کافی پینے میں بڑی لذت ہے...!

اور پھر میں کافی ہاؤس میں تھا۔

چڑیاں میرے کمرے میں بند تھیں کہ میں نے کپڑے بدلنے کے بعد احتیاط سے دروازہ کھولا تھا اور چڑیوں کو نکل اڑنے کا موقع دیے بنا، باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

پھر مجھے کچھ علم نہیں، وہ کب میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا اور کب مجھ سے مخاطب ہوا تھا—"تم افسانہ نگار ہو؟"

جنوری کا وہ دن خاصا خنک تھا، ہوا کاٹ رہی تھی اور دھوپ بھلی لگ رہی تھی۔ کافی ہاؤس کا لان خالی خالی سا تھا۔ اِکاّ دُکاّ میزیں گھری ہوئی تھیں اور لوگ باگ اخبار پڑھ رہے تھے، کافی پی رہے تھے، نرم و نازک چیز سینڈو چز کھا رہے تھے، سگریٹ پی رہے تھے اور دھواں اڑا رہے تھے— کتنا سکون تھا۔

اور وہ کب میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا، مجھے کچھ علم نہیں—اس نے پوچھا تھا:

"تم افسانہ نگار ہو؟"

اور میں خاموش رہا تھا—میں مسکرا دیا۔

"آج بہت خوش نظر آ رہے ہو...؟"

میں نے دیکھا—ایک جانی پہچانی صورت تھی۔

"کوئی معرکے کا افسانہ لکھا؟"

میں خاموش رہا اور مسکراتا رہا۔

"کوئی بات ضرور ہے؟"

وہ کرسی کھینچ، قریب ہی بیٹھ گیا اور پائپ بھرنے لگا۔

میں مسکراتا رہا۔

"کچھ تو ہے... تمھاری مسکراہٹ معنی لیے ہوئے ہے...!"

میں نے سگریٹ سلگایا اور پھیپھڑوں تک دُھواں کھینچا اور اس کی طرف دیکھا—وہ میری

طرف دیکھ رہا تھا۔

''تو پھر؟''

میں خاموش رہا۔

''کوئی بات ضرور ہے... آج موسم قیامت کا ہے... تم اُجڑے اُجڑے سے لگ رہے ہو اور خوش ہو...!''

میں نے کہا: ''آج مَیں نے دو چڑیاں پکڑی ہیں... آج مَیں انھیں بھون کر کھاؤں گا...!''

یکا یک ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے جھلاّ کر کہا: ''پھر وہی افسانہ نگاری؟''

میں خاموش رہا— کیا کہتا؟

OO

('شب خون'، الٰہ آباد: ۱۹۶۶ء)

کمپوزیشن چار[۱]

میں اِدھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کو بیچوں بیچ چیرتی ہوئی لکیری سڑک کے بائیں کونے سے تیز چمکیلے رنگ کی کار داخل ہو رہی ہے — اُدھر ویران مشرق کی جانب سے دو اجنبی، ایک دوسرے سے بے خبر، کافی فاصلے سے آگے پیچھے، کالی چکنی ہموار کشادہ سڑک کی طرف قدم اُٹھا رہے ہیں اور ان کے بہت پیچھے ننگے پاؤں لڑکا، بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے، تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں اِدھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کو بیچوں بیچ چیرتی ہوئی لکیری سڑک کے بائیں کونے سے تیز چمکیلے رنگ کی کار داخل ہو رہی ہے — اُدھر ویران مشرق کی جانب سے دو اجنبی ایک دوسرے سے بے خبر کافی فاصلے سے آگے پیچھے کالی چکنی ہموار کشادہ سڑک کی طرف قدم اُٹھا رہے ہیں اور ان کے بہت پیچھے ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں اِدھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کو بیچوں بیچ چیرتی ہوئی لکیری سڑک کے بائیں کونے پر تیز چمکیلے رنگ کی کار رفتار میں ہے — اُدھر ویران مشرق کی جانب سے دو اجنبی ایک دوسرے سے بے خبر کافی فاصلے سے آگے پیچھے کالی چکنی ہموار کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اُٹھا رہے ہیں اور ان کے بہت پیچھے ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے تیزی سے اِن کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں اِدھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کو بیچوں بیچ چیرتی ہوئی سڑک

---

[۱] برائے کرم افسانہ کسی خاموش جگہ، قدرے اونچی آواز میں پڑھیے۔

کے بائیں کونے پر تیز چمکیلے رنگ کی کار رفتار میں ہے — اُدھر ویران مشرق کی جانب سے دو اجنبی ایک دوسرے سے بے خبر کافی فاصلے سے آگے پیچھے کالی چکنی ہموار کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اُٹھا رہے ہیں اور ان کے بہت پیچھے ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں اِدھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کو بیچوں بیچ چیرتی ہوئی سڑک کے بائیں کونے پر گہری زرد برق رفتار کار ہے — اُدھر مشرق کی جانب سے دو اجنبی ایک دوسرے سے بے خبر کافی فاصلے سے آگے پیچھے چکنی ہموار کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اُٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔

میں اِدھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ سڑک پر بائیں اور گہری زرد برق رفتار کار ہے — اُدھر مشرق کی جانب سے ایک دوسرے سے بے خبر کافی فاصلے سے آگے پیچھے دو اجنبی چکنی ہموار کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اُٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ سڑک پر بائیں اور گہری زرد برق رفتار کار ہے — مشرق کی جانب سے ایک دوسرے سے بے خبر کافی فاصلے سے آگے پیچھے دو اجنبی چکنی کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اُٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ سڑک پر بائیں اور زرد برق رفتار کار ہے — مشرق کی جانب سے ایک دوسرے سے بے خبر کچھ فاصلے سے آگے پیچھے دو اجنبی چکنی کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اُٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ سڑک پر بائیں اور زرد

برق رفتار کار ہے—مشرق کی جانب سے ایک دوسرے سے بے خبر کچھ فاصلے سے آگے پیچھے دو
اجنبی کشادہ سڑک کی طرف تیز قدم اُٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں
ایوننگ نیوز تھامے تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچ سڑک پر بائیں اور برق رفتار
کار ہے— مشرق کی جانب سے ایک دوسرے سے بے خبر کچھ فاصلے سے آگے پیچھے دو اجنبی
سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے پاؤں لڑکا بغل میں ایوننگ نیوز تھامے
تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں اِدھر ہوں۔ میرے سامنے سڑک پر بائیں اور برق رفتار کار ہے— اُدھر سے ایک
دوسرے سے بے خبر آگے پیچھے دو اجنبی سڑک کی طرف تیز قدم اُٹھا رہے ہیں اور ان کے پیچھے ننگے
پاؤں لڑکا بغل میں ایوننگ نیوز تھامے تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں اِدھر ہوں۔ میرے سامنے سڑک پر بائیں اور برق رفتار کار ہے— اُدھر سے دو اجنبی
آگے پیچھے بے خبر سڑک کی طرف تیز قدم اٹھا رہے ہیں ان کے پیچھے لڑکا بغل میں ایوننگ نیوز
تھامے تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

میں اِدھر میرے سامنے سڑک بائیں اور برق رفتار کار— اُدھر دو اجنبی آگے پیچھے بے خبر
سڑک کی طرف تیز قدم ان کے پیچھے لڑکا بغل میں ایوننگ نیوز تیز تر۔

میں اِدھر میرے سامنے سڑک بائیں اور برق رفتار کار اُدھر دو اجنبی آگے پیچھے بے خبر سڑک
کی طرف تیز قدم ان کے پیچھے تیز تر بڑھتا ہوا لڑکا ایوننگ نیوز۔

میں اِدھر سامنے سڑک بائیں اور برق رفتار کار اُدھر دو اجنبی برابر برابر بے خبر سڑک کی طرف
تیز قدم پیچھے تیز تر لڑکا ایوننگ نیوز۔

میں اِدھر سامنے سڑک بائیں اور برق رفتار کار اُدھر دو اجنبی برابر برابر بے خبر سڑک کی طرف تیز قدم پیچھے ایوننگ نیوز تیز تر لڑکا۔

میں اِدھر سامنے سڑک بائیں اور برق رفتار کار اُدھر دو اجنبی پیچھے آگے بے خبر سڑک پیچھے ایوننگ نیوز لڑکا۔

میں اِدھر سامنے سڑک ذرا بائیں برق رفتار کار اُدھر دو اجنبی پیچھے آگے بے خبر سڑک ایوننگ نیوز لڑکا۔

میں سامنے سڑک ذرا بائیں برق رفتار کار اُدھر دو اجنبی پیچھے آگے بے خبر سڑک ایوننگ نیوز لڑکا۔

سامنے سڑک ذرا بائیں برق رفتار کار دو اجنبی پیچھے آگے بے خبر سڑک ایوننگ نیوز لڑکا۔

برق رفتار کار دو اجنبی پیچھے آگے بے خبر ایوننگ نیوز لڑکا۔

کار دو اجنبی ایوننگ نیوز لڑکا۔

کار دو اجنبی ایوننگ نیوز

کار اجنبی ایوننگ

کار اجنبی

کا جنبی

اجنبی کار

اجنبی چِت کار

ایک اجنبی چِت کار

ایک اجنبی چِت کار دوسرا اجنبی

ایک اجنبی چِت کار دوسرا اجنبی لڑکا

ایک اجنبی چِت کار دوسرا اجنبی لڑکا نیوز

سامنے سڑک دائیں ایک اجنبی چِت کار دوسرا اجنبی لڑکا ایونگ نیوز

میں اِدھر سامنے سڑک دائیں اور ایک اجنبی چِت کار دوسرا اجنبی اُدھر لڑکا ایونگ نیوز تھامے

میں اِدھر سامنے سڑک دائیں اور ایک اجنبی چِت گھسٹتی رکتی کار دوسرا اجنبی اُدھر لڑکا ایونگ نیوز تھامے

میں اِدھر سامنے سڑک ذرا دائیں اور ایک اجنبی چِت گھسٹتی ہوئی رُکتی کار ذرا بائیں دوسرا اجنبی لڑکا ایونگ نیوز تھامے

میں اِدھر ہوں سامنے سڑک ہے ذرا دائیں اور ایک اجنبی چِت پڑا ہے گھسٹتی ہوئی کار رُک گئی ہے ذرا بائیں دوسرا اجنبی ہے لڑکا ایونگ نیوز تھامے ہوئے ہے

میں اِدھر ہوں سامنے کشادہ سڑک ہے ذرا دائیں اور ایک اجنبی چِت پڑا ہے گھسٹتی ہوئی کار

رُک چکی ہے ذرا بائیں اور دوسرا اجنبی بے لڑکا ایوننگ نیوز تھامے ہوئے ہے۔

میں اِدھر ہوں سامنے کشادہ چکنی سڑک ہے ذرا دائیں اور ایک اجنبی چت پڑا ہوا ہے گھسٹتی ہوئی کار رُک چکی ہے ذرا بائیں اور دوسرے اجنبی کا قدم اُٹھنے کو ہے لڑکا بغل میں ایوننگ نیوز تھامے ہوئے ہے۔

میں اِدھر ہوں۔ میرے سامنے کشادہ چکنی سڑک ہے ذرا دائیں اور ایک اجنبی چت پڑا ہوا ہے گھسٹتی ہوئی کار رُک چکی ہے ذرا بائیں اور دوسرے اجنبی کے قدم اُٹھنے لگے ہیں ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے ہوئے ہے۔

میں اِدھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے سامنے کشادہ چکنی ہموار سڑک ہے ذرا دائیں اور ایک اجنبی چت پڑا ہوا ہے گھسٹتی ہوئی کار تھوڑے فاصلے پر رُک چکی ہے ذرا بائیں اور دوسرے اجنبی کے قدم اُٹھ رہے ہیں ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے ہوئے ہے۔

میں اِدھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کے بیچوں بیچ کشادہ چکنی ہموار کالی سڑک ہے ذرا دائیں اور ایک اجنبی چت پڑا ہوا ہے گھسٹتی ہوئی کار تھوڑے فاصلے پر رُک چکی ہے ذرا بائیں اور دوسرے اجنبی کے قدم میری اور اُٹھ رہے ہیں ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے ہوئے ہے۔

میں اِدھر مغرب کی جانب ہوں۔ میری نظروں کے دائرے کو بیچوں بیچ چیرتی ہوئی کشادہ چکنی ہموار کالی سڑک ہے۔ میرے ذرا دائیں اور ایک اجنبی سڑک پر چت پڑا ہوا ہے گھسٹتی ہوئی کار تھوڑے سے فاصلے پر رُک چکی ہے— میرے ذرا بائیں اور ایک دوسرے اجنبی کے قدم میری اور اُٹھ رہے ہیں۔ اور ننگے پاؤں لڑکا بائیں بغل میں ایوننگ نیوز تھامے اس کے پیچھے پیچھے ہے۔

OO

('شب خون' الٰہ آباد: ۱۹۶۹ء)

کمپوزیشن پانچ

میری انگلیاں دُکھ رہی ہیں کہ ایک مدّت سے میں نے کچھ نہیں لکھا ہے۔

دن ڈھول نکلا — خوف زدہ آنکھوں نے دیکھا، شہر کا غرور پاؤں میں پڑا ہے۔
دیو قامت آئفل ٹاور انجر پنجر، پنجر پنجر غائب تھا اور وہ شہر کا شہر عمارت دھواں دھواں تھی جہاں کاکروچ، کیکٹس اور صلیب پناہ گزیں تھے۔
دن ڈھول ہوا — شہر کا غرور ٹھوکر ٹھوکر غلاظت گاہ کی چوکھٹ پر پڑا ہے۔
رات آئی — رات پہلے جیسی نہ تھی — رات جنس زدہ نہ تھی۔
چھیلوں بانکوں کے ہاتھوں میں آئفل ٹاور کی پسلیوں اور رگوں کی غلیلیں تھیں اور ان کی جیبیں وزنی بیچ پرزوں سے بھری ہوئی تھیں اور ان کی تپتی اُبلتی آنکھیں منتظر تھیں — جیسے ہی دھڑکتی رگوں والا وہ ہاتھ اُٹھا، رات کانپنے لگی۔
غلیلیں تن گئیں — اور جب غلیلیں ڈھیلی ہوئیں، تپتی اُبلتی آنکھیں شانت تھیں کہ اَن گنت کھوپڑیاں چکنا چور تھیں۔
لڑکیوں سے کسی نے کچھ نہ کہا — لڑکیوں نے آپو آپ، ہنستے گاتے، گلی گلی، بازار بازار جھاڑ پونچھ ڈالے۔
قطار در قطار بچّوں نے شہر کی سرحد سے کھوپڑیوں کو ٹھوکر لگائی اور ہوا میں اُچھال دیا۔
اُدھر تھکے ہارے لوگ، تھکے ہارے بے سدھ پڑے تھے اور وہ جو بے سدھ نہ تھے، تھکے ہارے نہ تھے، منتظر تھے۔
کھوپڑیاں اونچے مکانوں پر آن پڑیں — اونچے مکان بھک سے اُڑ گئے۔
تھکے ہارے، بے سدھ لوگوں کے بدن ٹوٹے، تھکن ٹوٹی، انگڑائیاں ٹوٹیں اور آنکھیں کھل گئیں (یہ مشرق تھا)۔
اور وہ جو بے سدھ نہ تھے، تھکے ہارے نہ تھے، منتظر تھے — انھوں نے شہروں کی کانٹی بانٹی

درمیانی باڑیں نوچ ڈالیں — وہ دن، گرم تپتا ہوا دن —
گرم، تپتے ہوئے اَن گنت دن —
دن گرم ہو یا خنک ہو یا بھیگا ہوا ہو، اِک لہر ہے —
— اِک لہر ہے کہ آتی ہے اور گزر جاتی ہے۔
سَمے کے کبھی شانت اور کبھی بپھرے ہوئے سمندر کی اِک لہر کے بھلا کیا معنی ہوئے؟ (!)

وہ دن،

وہ دن طلوع ہوا — اِک بے معنی دن تھا۔

اس گرم تپتے ہوئے دن کی دھول اُڑاتی دوپہر، ٹنڈ منڈ پیڑ کے نیچے میں نے سنا: لوگوں نے دیکھا ہے، اُس کی برہنہ رانوں پر جونک نما زرد جیلی چپکی پڑی ہے اور اس نے اپنے کھچڑی بالوں میں پانچ ہزار کے کرنسی نوٹ اڑس رکھے ہیں۔

اُس ہچکیاں لیتی شام بڈھا سُرخ بے وطن یوروپی مجھے اُس ریستوراں میں ملا جس کا پچھلا دروازہ رفتگاں کی پگڈنڈی پر کھلتا ہے۔

اُس گہری کالی کرفیو مقیدرات دستک ہوئی۔

میں نے دروازہ کھولا۔

وہ سیڑھیوں پر گرا پڑا تھا۔

ٹارچ کی روشنی کے دائرے میں — میں نے دیکھا: وہ مَرا پڑا ہے۔

لاش کی چوڑی پیشانی پر کھدا ہوا تھا: گوتم نیلمبر۔

میں کمرے میں لوٹ آیا اور کھڑکی کھول، کرسی کھینچ بیٹھ گیا اور باہر کی اور تکنے لگا، زنگ آلود آسمان کو، لاعلاج دم بہ لب رات کو اور سیڑھیوں پر مردہ پڑے گوتم نیلمبر کو۔

صبح کی پہلی چاپ سنتے ہی میں نے دیکھا، گوتم نیلمبر کا ٹھنڈا گوشت مٹی ہونے لگا ہے۔ صبح کی چاپ تیز ہونے لگی اور ٹھنڈا گوشت اور ہڈیاں مٹی ہونے لگیں اور روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ مٹی مٹی لاش منتشر ہوگئی۔

میں بے تحاشہ ہنسنے لگا۔

— ماضی پرست ہوں یا ڈریکولا، انت ایک ہے۔

اور پھر وہاں کوئی نہ تھا — اور میں تو چاہتا بھی یہی تھا — اور وہ تو چاہتا بھی یہی تھا کہ وہاں کوئی نہ ہو، کہیں کوئی نہ ہو اور جہاں سے وہ آیا تھا، وہاں بھی کوئی نہ تھا لیکن اسے وہاں، بیکار آوارہ گھومتے اتنے دن ہوگئے تھے کہ وہ سنسان اجڑی گلیوں اور خالی بازاروں میں خود اپنے آپ سے

ٹکراجاتا اور گلیوں بازاروں میں زوروں کا دھماکہ ہوتا اور اسے محسوس ہوتا، اگر وہ یونہی خود سے ٹکراتا رہا، غفلت کی نیند سویا ہوا شہر کسی دن بیدار ہو جائے گا۔ خود اپنے آپ سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے کی لذّت کا تو وہ منتظر تھا لیکن یہ اسے منظور نہ تھا کہ غفلت کی نیند سویا ہوا شہر بیدار ہو — وہ جو غفلت کی نیند سو گئے تھے، کہیں بیدار نہ ہو جائیں، اس نے وہ شہر چھوڑ دیا اور پہاڑی پہاڑی اس خوف کے ساتھ، کہیں اُس جیسا کوئی دوسرا وہاں نہ ہو، وہاں پہنچا۔

خوف تو اپنے جیسے کسی دوسرے سے ہوتا ہے (وہاں کوئی نہ تھا) اور وہ جگہ جہاں اپنے جیسے کسی دوسرے سے ملنے کے امکانات نہ ہوں، کہاں تھی، یہ اسے معلوم نہ تھا۔

پہاڑیوں کا وہ سلسلہ اُس کے قدموں تلے ختم ہوا پڑا تھا — نیچے سمندر تھا اور اس کے دائیں ہاتھ پہاڑی کا دامن نم کیے دھیمے دھیمے بہتا دریا سکون کے ساتھ وشال سمندر میں پناہ لے رہا تھا اور بائیں ہاتھ پہاڑی کی ڈھلان پر سیڑھی سیڑھی دراز سبز گھنا جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا — آسمان نیلا تھا اور پگڈنڈی کے بَل واضح تھے۔

پگڈنڈی کے واضح بَل بے معنی تھے کہ اسے لوٹنا نہیں تھا۔ آسمان کی نیلی رنگت بھلی تو تھی، بس بھلی تھی کہ اُس کا رشتہ تو زمین سے تھا، اس نے مزید غور نہ کیا اور دریا تو خود سمندر کی پناہ لے رہا تھا اور جنگل بھی سمندر کنارے تک بڑھ پایا تھا اور پہاڑی بھی بڑھتے بڑھتے یوں اچانک رُک گئی تھی جیسے ڈوب جانے کے خوف نے پاؤں پکڑ لیے ہوں — اور سمندر؟

بہت دن تک وہ وقت کی رفتار سے باخبر رہا لیکن ایک دن آسمان کی بھلی بھلی سی نیلی رنگت اور سمندر کی ابرق سی چمک نے وہ جال بچھایا کہ وہ محویت کے عالم میں وقت سے پیچھے رہ گیا اور جب وقت کی رفتار پہاڑی کے اس آخری نقطے پر اُس کی پہچان کی حدود میں نہ رہی، وہ خود اپنے آپ سے ٹکرا گیا۔

پگڈنڈی، پہاڑی، جنگل، دریا، آسمان، سمندر، کوئی بھی تو غفلت کی نیند نہ سویا ہوا تھا — وہ پہاڑی سے نیچے کود گیا۔

نہ جانے کتنے سورج سمندر ہی سے نکلے، اور نہ جانے کتنے سورج سمندر ہی میں ڈوبے اور نہ جانے کتنے سورج اس کی آنکھوں میں اُترے — وہ ہاتھ پاؤں مارتا لہر لہر سے ٹکراتا رہا۔

دوُر ساحل تھا۔

ساحل سمندر صحرا کا کنارا تھا — سامنے صحرا پھیلا پڑا تھا اور وہاں کوئی نہ تھا۔

— سورج دو ہیں، ایک سر پر ہے اور ایک ریزہ ریزہ صحرا میں پھیلا پڑا ہے۔

اور یوں کہ پاؤں تلے ریت، سر میں ریت، آنکھوں میں ریت، منہ میں ریت — اُس نے

نخلستان میں چشمے کے ٹھنڈے اُجلے پانی سے تن صاف کیا اور قدم بڑھائے۔

اب واحد غائب واحد حاضر کی صورت میرے سامنے کھڑا ہے۔

ہم ریلنگ کا سہارا لیے کھڑے ہیں — دو گھنٹے ہوئے، ہم اتفاقاً ایک دوسرے کے سامنے آ گئے تھے، ہمارے قدم رُکے تھے اور پھر ہم بغل گیر ہوئے تھے — میں آٹھواں سگریٹ پی رہا ہوں اور دو گھنٹوں سے خاموش ہوں کہ وہ دو گھنٹوں سے خاموش ہے۔ میں اس سے بہت ساری باتیں پوچھنا چاہتا ہوں اور یہ نہیں جانتا، وہ مجھ سے بہت ساری باتیں کہنا چاہتا ہے یا نہیں۔

وہ ایک نظر مجھے دیکھتا ہے، مسکراتا ہے اور میں جان لیتا ہوں، وہ کہہ رہا ہے: ''آؤ یار مرے! کافی پئیں — کالی کافی، گرم اور کسیلی۔''

ہم وہیں بیٹھے ہیں، جہاں ہم نے زندگی کے دس برس، جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اہم برس تھے یا غیر اہم برس، گزارے ہیں، کافی پی رہے ہیں اور خاموش ہیں۔ میں اس کی موجودگی میں نواں سگریٹ پی رہا ہوں۔ ایک سگریٹ اور ہے اور میں چند لمحوں میں اسے بھی دُھواں دُھواں اُڑا دوں گا اور پھر اور سگریٹ لینے باہر جاؤں گا اور لوٹنے پر اسے نہ پاؤں گا، ہاں، پیالی تلے ایک پرزہ رکھا ہوگا — ''پھر کبھی —'' ہم ہمیشہ ایسے ہی ملتے ہیں، خاموش رہتے ہیں، میں سگریٹ پیتا رہتا ہوں اور یہ جانے بِنا ہی کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے یا نہیں، اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اور پھر ہمیشہ سگریٹ لینے باہر جاتا ہوں اور لوٹنے پر مجھے ہمیشہ پیالی تلے ایک پرزہ رکھا ہوا ملتا ہے، ''پھر کبھی —''

پھر کبھی — لیکن کب، کہاں؟

آنے والے کل کا شہر، جہاں آج گھنی گہری نیلی آنسو گیس پھیلتی رہتی ہے، جہاں آنکھوں سے لہو بہتا ہے۔

اَن گنت قابلِ فہم اور مانوس آوازوں کا شہر، جہاں ''ہمارا نام تمھارا نام — ویت نام، ویت نام'' بیک آواز، مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک، صبح و شام، آٹھوں پہر، جستجو، جدّ و جہد اور جنگ کا لازوال ہتھیار ہے۔

آنے والے کل کے سرخ شہر کی گلیاں، بازار، چوک، پارک اور کافی ہاؤس روندتا ہوا بڈھا سرخ بے وطن یوروپی جو شمشان گھاٹ، گرجا گھر اور کنچن جنگا کے معنی جانتا ہے۔

وہ کون ہے؟ وہ ایک بے وطن سرخ شہری ہے۔

میں کون ہوں؟ میں وہ ہوں۔

اور وہ (میری) کرسی؟!

لمبی، بہت لمبی ٹانگیں۔ لمبے، بہت لمبے بازو۔ اونچی، بہت اونچی پشت — مغرب کی جانب رُخ کیے ہوئے وہ کرسی۔

کرسی کے لمبے، بہت لمبے بازوؤں پر پڑے ہوئے لمبے بازو؛ گری ہوئی ہتھیلیاں اور گری ہوئی انگلیاں۔ کرسی کی اونچی، بہت اونچی پشت سے جڑی ہوئی اونچی اور اونچی، تنی ہوئی گردن۔ زمین کی جانب سیدھی لٹکی ہوئی لمبی ٹانگیں۔ ننگے پاؤں۔ ذہن خالی۔ دل کی دھڑکن خاموش، نبض کی رفتار تھمی ہوئی۔ مساموں کا کام کاج بند — وہ ساکت، بے جان جسم۔

اور وہ آنکھیں — زندہ آنکھیں، روشن آنکھیں — بڑی بڑی آنکھیں — متحرک پتلیاں اور زندہ آنکھیں — بے جان جسم اور زندہ آنکھیں، زندہ آنکھیں اور بے جان جسم — کون کس کی زندگی اور کون کس کی موت؟

مغرب کی جانب رُخ کیے ہوئے کرسی میں مقید ساکت اور بے جان جسم،
ساکت اور بے جان جسم میں مقید زندہ اور روشن آنکھیں،
آنکھوں کے سامنے — آنکھوں کے سامنے آئینہ (کتاب؟!)،
آئینہ؟!
شمال کی جانب شمال کی آخری حد تک آئینے کی دیوار!
جنوب کی جانب جنوب کی آخری حد تک آئینے کی دیوار!!
آسمان کی جانب آسمان کی انجانی بلندیوں تک آئینے کی دیوار!!!
آنکھوں کے سامنے آئینہ،
آئینہ، اُجلا، صاف، شفاف —
— میں نے سگریٹ سلگایا۔

وہ سرخ شہری ہے اور میں وہ ہوں۔ کہیں گھپلا ہے؟ میں وہ ہوں اور وہ سرخ شہری ہے۔ میں سرخ شہری کیوں نہیں؟ میں — میں سرخ شہری ہوں — نہیں، نہیں، میں سرخ شہری نہیں ہوں۔ یہ تو میری تحریر کے 'میں' کی پرابلم ہے — اور میری تحریر — میں اور میری تحریر کا 'میں' —
— ایک جنگِ ناتمام —

میری انگلیوں کے دُکھ میں کمی آ گئی ہے۔

OO

('سویرا'، لاہور: ۱۹۷۰ء)

آخری کمپوزیشن

(تیسری دُنیا کے دانشوروں کے نام)

اس کے لفظ چھین لو اور اسے چھوڑ دو۔
یہ مجھے منظور نہ تھا اور نہ ہے۔
گزرے ہوئے کل اور آنے والے کل کا یہ درمیانی لمحہ، جسے میرا ایک رفیق آج کہتا ہے، چھ ضرب چھ کا ایک ننگا بُچا سرد کمرہ ہے، جس کی تین دیواریں پتھر کی ہیں اور چوتھی لوہے کی۔
جگ بیتے، اس آج سے پہلے گزرے ہوئے کل، کھلے آسمان تلے، میں انجانے میں اَن گنت لفظ کھو بیٹھا تھا — تاریخ، جغرافیہ، دیومالا، کہاوتیں، خون کے رشتے ناطے اور دل کے معاملات، صبح و شام تھے۔ کبوتروں کا پھڑ پھڑانا بھوک تھی اور لغزشِ پا پیاس۔ ہنستے ہنستے رو دینا شاعری تھی اور روتے روتے ہنس دینا کہانی۔ پَو پھٹنے سے پہلے بدھ ملتا، بعد دوپہر خیّام اور شام ڈھلے دیوداس۔ کبھی قدِ رعنا کو آنکھیں نم کیے غم کی تصویر دیکھتے اور کبھی روکھے سوکھے گھنے لمبے پریشاں سیاہ بالوں میں سورج کے ذرّے۔ بازوؤں پر پستانوں کا ہلکا سا دباؤ، موسم سرما کی صبح کی دھوپ: لبوں کا لمس، الاؤ کی آنچ: بدنوں کا ملاپ، بارش اور بعد بارش کا سکھ — زمان و مکاں کی ایک ایسی سازش کہ جس کا میں شکار تھا، کہ جس میں میں شریک تھا۔
میں، جو بیک وقت سازش کا شکار اور سازش میں شریک تھا، لفظوں کو معنی نہ دے پایا۔ لفظ، جو دن تھے، گرما سرما، خزاں بہار کے گرد چکّر کاٹتے رہتے۔ موسم، جو لفظ تھے، معنی نہ تھے — سازش کا شکار میں یوں تھا کہ لفظوں کے حصار میں تھا اور سازش میں شریک یوں تھا کہ میں نے اس حصار کو توڑنے کی کوشش نہ کی — وہ دن ہوس پرستوں اور شہرت پسندوں کے دن تھے۔
گزرے ہوئے کل کی ایک رات تھی، جسے میرا رفیق آج کہتا ہے۔
اس رات نرم گرم بستر بنے ہوئے بدنوں کے سانسوں کی دھونکنی مدھم پڑ رہی تھی اور تھپکیاں دے رہی تھی کہ پاس ہی کی کوئی سیڑھیاں، کوئی وزنی، غیر مہذب قدم اُترتے سنائی دیے۔ میرا

دایاں ہاتھ، جو نرم گداز بھرے بھرے، لعاب لتھڑے، ماند ہوتے ہوئے پستان پر رکھا ہوا تھا جیسے وہیں کا ہو، آپ سے آپ علیحدہ ہو گیا، دھونکنی سرد پڑ گئی اور میں ابھی کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ مجھے محسوس ہوا، کسی نے سسکی لی ہے۔ ایسی پھیلتی ہوئی، سمٹتی ہوئی سسکی جیسے اِک پل پھیل جائے، سمٹ جائے۔ ایسی بے چارگی، ایسا ضبط۔ جیسے رات نے سسکی لی ہے — کوئی آئے تھے؛ کسی کو لے گئے تھے؛ کوئی ضبط کر رہا تھا۔

اس رات کی آج سی اُجلی صبح ہوئی۔

اِک چہرہ تھا سانولا سا، اُداس اُداس، اُجلی آنکھوں والا، جسے بارہا دوست کہنے کو جی چاہا، ہر صبح نظر پڑتا تھا، کہیں نظر نہ آیا۔

راتیں سسکیاں بن گئیں۔

دن اُجلے ہو گئے۔

بازاروں میں جوان چہرے کم نظر آنے لگے۔

طول و عرض میں اِک ایسی چپ چھائی کہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سنائی دینے لگی۔

گھر سے، ذرا پرے، اس طرف کورے بدن سلگنے لگے۔

کان سے جو سُنا، ناک سے جو سونگھا، سچ تھا اور آنکھ سے جو دیکھا، ابھی جھوٹ تھا۔

لفظوں کی کھال اُدھڑ گئی۔

کورے بدن جھلس رہے تھے — گلیاں، بازار، یونیورسٹیاں، کھیت کھلیان، ندی نالے، پہاڑیاں، بادل، سب اِک سلگتا نعرہ تھے۔ لفظ، معنی۔ آنکھ جو کچھ دیکھ سکتی تھی، معنی تھے۔

ہر حس اِک معنی بن گئی۔

کتابیں حوصلہ؛ کھوپڑیاں ٹائم بم؛ ہاتھ رائفلیں؛ پہاڑیاں پناہ گاہیں۔

دل لبھانے والے لفظوں سے کھینچی گئی جغرافیائی لکیروں کی بھٹیاں جواب تک کورے بدنوں سے سُلگائی جاتی تھیں، کلفٹن، میرین ڈرائیو اور ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کے ایندھن سے دہکنے لگیں۔

لفظ، جو دن تھے اور بے معنی موسموں کے گرد بے کار چکّر کاٹتے تھے، اِک معنی اور اِک موسم بن گئے۔

اس رات گھر لوٹتے سمے میں نے دیکھا، دہکتی بھٹی کی تپش سے لرزاں ندی میں دہکتے بدن بہہ رہے ہیں۔

مجھے محسوس ہوا، میں سازش کا شکار نہیں ہوں، میں سازش میں شریک نہیں ہوں۔

گھر پہنچا، دیکھا، بے معنی کل کے دوست میرے منتظر ہیں — دوستی بے معنی سی شناسائی

محسوس ہوئی۔ ان گنت لفظ کھو دینے کا دکھ ہوا۔

ایک سکوں کے شہر سے لوٹا تھا اور خوش تھا۔ دوسرا تعلقات کی سیڑھیوں کی خرید وفروخت سے مالا مال تھا۔ تیسرا بے حسی کے محکمہ میں ترقیاں کر رہا تھا۔

''اِک زمانہ ہوا، دل کا خوں کیے—''

''بھُنے ہوئے آلو—''

''بہتی آگ—''

میں کیا کہتا؟

میں نے کہا، ''دل خون ہو رہے ہیں، بدن بھن رہے ہیں اور ہمارے چاروں اور آگ ہی آگ ہے۔''

تیسرے نے میری بات کاٹ دی۔

''بند بوتل کی آگ ہی سے آنکھیں چندھیا گئیں؟ میاں! یار اپنا اس شہر سے لوٹا ہے، جہاں گلیوں میں چاندی بہتی ہے—یار کے آسمانی رنگت کے کرتے نے وہاں جادو جگا دیے ہیں—''

دوسرے نے بات بڑھائی۔

''یار کی باتوں کے ہیرے اُسی شہر میں بک سکتے تھے—''

میں نے پہلے کی جانب دیکھا اور پھر تیسرے اور دوسرے کی جانب—وہم وگماں کے کردار۔

میں نے اُسی سے گھر چھوڑ دیا۔

گھر چھوڑا—ہر گھر اپنا ہو گیا—سہمے ہوئے گھر، دل والے گھر، بے حس گھر۔

اور پھر اُس رات وہ آئے؛ مجھے لے گئے؛ ضبط کا کوئی قصہ ہی نہ تھا۔

—تم نے جو سُنا ہے، تم نے جو سونگھا ہے، تم نے جو دیکھا ہے، اسے جھوٹ کہہ دو—ہم تمھیں چھوڑ دیں گے۔

یہ مجھے منظور نہ تھا—میں خاموش رہا۔

میری خاموشی اِک لفظ 'نہیں' تھی—میں نے اب تک اَن گنت لفظ کھوئے تھے، اب میں نے پہلی بار اِک لفظ پایا تھا۔ اگر میں ان کی بات مان لیتا، میں اِک لفظ اور کھو دیتا اور پہلا لفظ کبھی نہ پا سکتا۔

—تم اپنا یہ لفظ ہمیں دے دو، ہم تمھیں چھوڑ دیں گے۔

میرا لفظ میری قوت اور اُن کا خوف تھا۔

میں نے اِک لمبا سانس کھینچا—چند ہی لمحوں میں میں نے کئی لفظ پا لیے تھے۔

—اس کے لفظ اس کے پاس رہنے دو اور اسے بند کر دو۔

یہ اُن کی بھول تھی کہ ان لفظوں کے ساتھ میں آزاد تھا۔ قید بے معنی تھی۔
تین ننگی بُچّی سرد دیواریں پتھر کی اور چوتھی لوہے کی — انھوں نے مجھے بند کر دیا۔
آزادی کے وہ دن سکھ کے پہلے دن تھے — بھنچی ہوئی مٹھیوں کے پسینے کا نمک اس سے پہلے بھلا کب چکھا تھا!
ہر حس اِک معنی تو کب کی بن چکی تھی، تجربہ اب بنی۔
قدموں کو چاپ ملی، آنکھوں کو روشنی — ننگے پاؤں ٹھنڈے فرش پر ٹہلتا تو آنکھوں کو بے پناہ سکون ملتا۔ ٹہلنا اک نشہ تھا۔ تھک جاتا تو جی بھر کر سوتا۔ سوچتا تو خوب سوچتا۔ ایک اور دیکھتا تو دیکھتا ہی رہتا۔
چند ہی دنوں میں میں نے محسوس کیا، میری پتلیوں کی جنبش سے میرے بدن میں زلزلہ آ جاتا ہے۔
ایسے ہی ایک دن لوہے کی دیوار سے پشت جوڑے، ٹانگیں پسارے ننگے فرش پر بیٹھا ہوا تھا اور چھ فٹ کے فاصلے پر سامنے کی پتھر کی دیوار پر آنکھیں گاڑے ہوئے تھا۔
دیوار میں اِک بے صدا لہر اُٹھی اور اِک ہلکے سے ارتعاش کے ساتھ فرش میں اُتر گئی۔
دیکھا، سامنے کوئی بیٹھا ہوا ہے۔
پہلی نظر میں پہچان نہ پایا۔
یکا یک محسوس ہوا، فاصلہ کچھ زیادہ ہے — فاصلہ واقعی زیادہ تھا۔ فاصلہ بارہ فٹ تھا۔
فاصلے کا صحیح اندازہ ہوا تو جان پڑا، دیوار چھ فٹ کے فاصلے پر ہے اور وہ دیوار میں چھ فٹ اندر میری اور رُخ کیے، ٹانگیں پسارے بیٹھا ہوا ہے اور لوہے کی دیوار سے پشت ٹیکے ہوئے ہے۔
پہلی نظر میں پہچان نہ پایا تھا، ذرا سوچا تو مسکرا دیا — میرا رفیق ہے!
مسکرا کر خیر مقدم کیا۔ مسکراہٹ میں شکریہ ملا۔
سامنے چھ فٹ کے فاصلے پر پتھر کی دیوار کے چھ فٹ اندر لوہے کی دیوار تھی، میری دیوار جیسی۔ یخ، مضبوط، رنگ جیسے زنگ۔
وہیں اپنی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہم نے نہ جانے کتنی ان کہی باتیں کیں (وہ سن نہ لیں؟) تھک گئے تو آنکھیں موند لیں — آنکھیں کھولیں، تو پھر وہی تعجب اور پیار بھری آنکھیں۔
ایسے ہی ایک پل اس کی لوہے کی دیوار کی جانب دیکھ رہا تھا کہ پھر دیوار میں اِک بے صدا لہر اُٹھی اور ایک ہلکے سے ارتعاش کے ساتھ فرش میں اُتر گئی۔
دیکھا، اس کی پشت کے ساتھ پشت جوڑے کوئی بیٹھا ہے اور اُدھر دیکھ رہا ہے۔
میں کیسے پہچانتا کہ میری جانب تو اس کی پشت تھی اور بارہ فٹ کی دوری۔

میں نے اس کی جانب دیکھا۔

وہ بھی حیران تھا۔

وہ میری جانب دیکھ رہا تھا اور اس کی پشت کے ساتھ کسی اور کی پشت جڑی ہوئی تھی۔

میں نے پھر اُدھر دیکھا اور چونکا۔

اُس کے تھوڑے اور فاصلے پر کوئی اور بیٹھا ہوا تھا اور پتھر کی دیوار کے چھ فٹ اندر لوہے کی دیوار کے اندر لوہے کی دیوار سے پشت جوڑے میری یا شاید اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

میرا سر گھوم گیا۔

میں نے آنکھیں بھینچ کر ہتھیلیوں سے آنکھیں مسلیں۔

چند لمحوں کے بعد سر کو جھٹکا دے کر آنکھیں کھولیں اور حیرانی بڑھ گئی۔

دیوار کے اندر، دیوار کے اندر، دیواروں کے سلسلوں میں پشت سے پشت جوڑے، آمنے سامنے بیٹھے ہوئے اَن گنت وہ، جو مجھے دیکھ رہے تھے یا ایک دوسرے کو، دوسرا تیسرے کو، تیسرا چوتھے کو، چوتھا پانچویں کو، پانچواں...

حیرانی کو معنی دیے تو مسکراہٹیں ہی خیر مقدم بنیں اور مسکراہٹیں ہی شکریے بنے ــــ سب رفیق ہیں!

لفظ بھی یہاں پائے تھے اور لفظوں کو معنی بھی یہیں ملے تھے ــ اب معنوں کو لفظ دینے کا وقت آ گیا تھا۔

آنکھوں آنکھوں میں وقت بندھ گیا اور جب ـــ جب وہ گھڑی آئی، ایک ساتھ سب ہاتھ اٹھے، ایک ساتھ سب قدم اٹھے، ایک ساتھ سب سر دیواروں سے ٹکرائے۔

دیواریں کرچی کرچی ہوگئیں۔

جب مجھے ہوش آیا، میں نے دیکھا: میں سائیں سائیں کرتے جنگل میں پڑا ہوں۔ قطرہ قطرہ خون میری رگوں میں اتر رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد مجھے خبر دی گئی: ہمارے تین رفیق ہلاک ہوئے ہیں، دو لاپتہ ہیں اور باقی سب محاذ پر ہیں۔

○○

('سویرا'، لاہور: ۱۹۷۱ء)

وہ

جب اس کی آنکھ کھلی، وہ وقت سے بے خبر تھا۔
اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر بیڈ ٹیبل سے سگریٹ کا پیکٹ اُٹھایا اور سگریٹ نکال کر لبوں میں تھام لیا۔
سگریٹ کا پیکٹ پھینک کر اس نے پھر ہاتھ بڑھایا اور ماچس تلاش کی۔
ماچس خالی تھی۔
اس نے خالی ماچس کمرے میں اچھال دی۔
خالی ماچس چھت سے ٹکرائی اور فرش پر آن پڑی۔
اس نے ٹیبل لمپ روشن کیا۔
بیڈ ٹیبل پر چار پانچ ماچسیں اُلٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔
اس نے باری باری سب کو دیکھا۔
سب خالی تھیں۔
اس نے لحاف اُتار پھینکا اور کمرے کی بتی روشن کی۔
دو بج رہے تھے۔
فرش برف ہو رہا تھا۔
ابھی دو بجے ہیں، میں وقت سے بے خبر تھا، میں سمجھ رہا تھا، صبح ہونے کو ہے!
آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی؟
ایک بار آنکھ کھل جائے، پھر آنکھ نہیں لگتی!
اس نے تمام کمرہ چھان مارا۔
کتابوں کی الماری، ویسٹ پیپر باسکٹ، پتلونوں کی جیبیں، جیکٹ کی جیبیں — ماچس کہیں نہ ملی۔

اس نے ایک ایک کتاب الٹ دی — کوئی دیا سلائی نہ ملی۔
کمرے کی بُری حالت ہوگئی تھی۔
کتابیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں، کپڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، ٹرنک کھلا ہوا تھا۔
کوئی آ جائے اس سمے؟
رات کے دو بجے؟ کمرے کی یہ حالت؟
سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔
سلگتے سگریٹ اور دھڑکتے دل میں کتنی مماثلت ہے!
ماچس کہاں ملے گی؟
ماچس نہ ملی تو کہیں...
تو کہیں...
کہیں میرا دھڑکتا دل خاموش نہ ہو جائے!
آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی!
میں وقت سے بے خبر تھا!
ایک بار آنکھ کھل جائے، پھر آنکھ نہیں لگتی!
ماچس کہاں ملے گی؟
اس نے چادر کندھوں پر ڈال لی اور کمرے سے باہر آ گیا۔
دسمبر کی سرد رات تھی، سیاہی کی حکومت اور خاموشی کا پہرہ۔
کسی ایک طرف قدم اٹھانے سے پہلے وہ چند لمحے سڑک کے وسط میں کھڑا رہا۔
جب اس نے قدم اٹھائے، وہ راستے سے بے خبر تھا۔
رات کالی تھی، رات خاموش تھی اور دور دور، تا حد نظر، کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
لمپ پوسٹوں کی مدھم روشنی رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کر رہی تھی اور —
چوراہے پر اس کے قدم رُک گئے۔
یہاں تیز روشنی تھی کہ دودھیا روشنی کی ٹیوبیں چمک رہی تھیں لیکن خاموشی جوں کی توں تھی کہ ساری دکانیں بند تھیں۔
اس نے حلوائی کی دُکان کی جانب قدم بڑھائے۔
ممکن ہے بھٹی میں کوئی کوئلہ مل جائے، دہکتا کوئلہ، دم بہ لب کوئلہ!

حلوائی کی دکان کے چبوترے پر کوئی لحاف میں گٹھری بنا سو رہا تھا۔
وہ بھٹی میں جھانکا ہی تھا کہ چبوترے پر بنی گٹھری کھل گئی۔
کون ہے؟ کیا کر رہے ہو؟
میں بھٹی میں سلگتا ہوا کوئلہ ڈھونڈ رہا ہوں!
پاگل ہو گیا؟ بھٹی ٹھنڈی پڑی ہے!
تو پھر!
پھر کیا! گھر جاؤ!
ماچس ہے آپ کے پاس؟
ماچس؟
ہاں مجھے سگریٹ سلگانا ہے!
تم پاگل ہو! جاؤ، میری نیند خراب مت کرو، جاؤ!
تو ماچس نہیں ہے آپ کے پاس؟
ماچس سیٹھ کے پاس ہوتی ہے۔ وہ آئے گا اور بھٹی گرم ہوگی۔ جاؤ تم!
وہ پھر سڑک پر آ گیا۔
سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔
اس نے قدم بڑھائے۔
چوراہا پیچھے رہ گیا، تیز روشنی پیچھے رہ گئی، کیا کیا کچھ نہ پیچھے رہ گیا۔
اس کے قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔
لمپ پوسٹ، لمپ پوسٹ، لمپ پوسٹ، اَن گنت لمپ پوسٹ پیچھے رہ گئے، دھیمی روشنیوں والے لمپ پوسٹ جو رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کرتے ہیں۔
یکا یک اس کے قدم رُک گئے۔
سامنے سے کوئی آ رہا تھا۔
وہ اس کے قریب آ کر رُک گیا۔
ماچس ہے آپ کے پاس؟
ماچس؟
مجھے سگریٹ سلگانا ہے...

نہیں، میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں اِس علت سے بچا ہوا ہوں...!

میں سمجھا...

کیا سمجھے؟

شاید آپ کے پاس ماچس ہو!

میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں اس علت سے بچا ہوا ہوں اور اپنے گھر جا رہا ہوں۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ!

اس نے قدم بڑھائے۔

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

وہ دھیمے دھیمے قدم اُٹھا رہا تھا کہ تھک گیا تھا۔

وقت سے بے خبر، اس کے تھکے تھکے قدم اُٹھ رہے تھے۔

لمپ پوسٹ آتا، مدھم روشنی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی اور پھر سیاہی۔

پھر لمپ پوسٹ، مدھم روشنی اور پھر سیاہی۔

وہ لبوں میں سگریٹ تھامے، دھیمے دھیمے قدم اُٹھا رہا تھا۔

اس کی پھیپھڑوں تک دُھواں کھینچنے کی طلب شدید ہو گئی تھی۔

اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔

شب خوابی کے لباس اور چادر میں اسے سردی لگ رہی تھی۔

وہ کانپ رہا تھا اور کانپتے قدموں سے دھیمے دھیمے بڑھ رہا تھا، وقت سے بے خبر، لمپ پوسٹوں سے بے خبر۔

ایک بار پھر اس کے قدم رُک گئے۔

اس کی نظروں کے سامنے خطرے کا نشان تھا۔

سامنے پُل تھا، مرمت طلب پُل۔

حادثوں کی روک تھام کے لیے سرخ کپڑے سے لپٹی ہوئی لالٹین سڑک کے بیچوں بیچ ایک تختے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔

اس نے لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانے کے لیے قدم اُٹھایا ہی تھا کہ—

کون ہے؟

وہ خاموش رہا۔

سپاہی کی ایک انجانی تہہ کھول کر سپاہی اس کی طرف لپکا۔

کیا کر رہے تھے؟

کچھ نہیں!

میں کہتا ہوں، کیا کر رہے تھے؟

آپ کے پاس ماچس ہے؟

میں پوچھتا ہوں کیا کر رہے تھے اور تم کہتے ہو، ماچس ہے۔ کون ہو تم؟

مجھے سگریٹ سلگانا ہے، آپ کے پاس ماچس ہو تو...

تم یہاں کچھ کر رہے تھے؟

میں لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانا چاہتا تھا... آپ کے پاس ماچس ہو تو...

تم کون ہو، کہاں رہتے ہو؟

میں...

کہاں رہتے ہو؟

ماڈل ٹاؤن!

اور تمھیں ماچس چاہیے... ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہو... ماڈل ٹاؤن کہاں ہے؟

ماڈل ٹاؤن!

اس نے گھوم کر اشارہ کیا۔

دُور دُور، تا حدِ نظر، سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔

چلو میرے ساتھ تھانے تک... ماڈل ٹاؤن... ؟ ماڈل ٹاؤن یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے... ماچس چاہیے نا — تھانے میں مل جائے گی!

سپاہی نے اس کا بازو تھام لیا۔

وہ سپاہی کے ساتھ چل پڑا۔

تھانہ اسی سڑک پر تھا جو ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔

وہ سپاہی کے ساتھ تھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں کئی آدمی ایک بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

سب سگریٹ پی رہے تھے۔

میز پر سگریٹ کے کئی پیکٹ اور کئی ماچسیں پڑی ہوئی تھیں۔

صاحب! یہ شخص پل کے پاس کھڑا تھا۔ کہتا ہے، ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں اور ماچس ماچس کی رٹ لگائے ہوئے ہے!

کیوں بے؟

اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ماچس استعمال کرلوں۔ مجھے اپنا سگریٹ سلگانا ہے!

کہاں رہتے ہو؟

ماڈل ٹاؤن۔ کیا میں آپ کی ماچس لے سکتا ہوں؟

کیا کرتے ہو؟

میں اجنبی ہوں! کیا میں ماچس...

ماڈل ٹاؤن میں کب سے رہتے ہو؟

تین ماہ سے! ماچس...

ماچس... ماچس کا بچہ... اجنبی... جاؤ اپنے گھر... ورنہ بند کردوں گا... ماچس...؟

جب وہ تھانے سے باہر آیا، وہ بُری طرح تھک چکا تھا۔

اس نے اس نہ ختم ہونے والی سڑک پر دھیمے دھیمے چلنا شروع کردیا۔

اس کی ناک سوں سوں کرنے لگی تھی اور اس کا بدن ٹوٹنے لگا تھا۔

سگریٹ پینا ایک علت ہے!

میں نے یہ علت کیوں پال رکھی ہے؟

ماچس کہاں ملے گی؟

نہ ملی تو؟

وہ وقت سے بے خبر تھا، لمپ پوسٹوں سے بے خبر تھا، سڑک سے بے خبر تھا، اپنے بدن سے بے خبر تھا۔

وہ گرتا پڑتا بڑھ رہا تھا۔

اس کے لغزش زدہ قدموں میں نشے کی کیفیت تھی۔

پو پھٹی اور وہ دم بھر کو رکا—

دم بھر کو رکا اور سنبھلا—

سنبھلا اور اس نے قدم اٹھانا ہی چاہا کہ—

سامنے سے کوئی آ رہا تھا اور اس کے قدم لغزش کھا رہے تھے۔

وہ اس کے قریب آ کر رُکا۔
اس کے لبوں میں سگریٹ کانپ رہا تھا۔
آپ کے پاس ماچس ہے؟
ماچس؟
آپ کے پاس ماچس نہیں ہے!
ماچس کے لیے تو میں...
وہ اس کی بات سنے بنا ہی آگے بڑھ گیا۔
آگے، جدھر سے وہ خود آیا تھا۔
اس نے قدم بڑھایا۔
آگے، جدھر سے وہ آیا تھا۔

OO

('سویرا'، لاہور: ۱۹۶۴ء)

شہر کی رات

ابھی اس نے سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ آخری بس آن دھمکی۔

سگریٹ لبوں میں دبا کر اس نے فٹ بورڈ پر قدم رکھا تو بس چل پڑی۔

جہازی بس خالی پڑی تھی اور کنڈ کٹر ڈرائیور کے پاس سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

کنڈ کٹر اس کی جانب بڑھا تو اس نے ہپ پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر پینتیس نئے پیسوں کے سکے ٹٹولے۔

''ماڈل ٹاؤن!'' سگریٹ اس کے لبوں میں کانپا۔

اس نے سکے کنڈ کٹر کی طرف بڑھائے۔

''مسٹر، بس میں بیڑی سگریٹ پینا منع ہے۔'' کنڈ کٹر نے ٹکٹ پنچ کرتے ہوئے کہا۔

''بس روک دیجیے! I'll get down here...'' سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

کنڈ کٹر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر تیزی سے رسی کھینچی، گھنٹی زور سے بجی اور بس ایک جھٹکے سے رُک گئی۔

''اب کیا مصیبت ہے...؟'' ڈرائیور کی جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔

وہ آخری ٹرپ طے کرتے ہوئے ڈرائیور کی جھنجلاہٹ سے مانوس تھا۔ اس نے اطمینان سے 'Exit' کی طرف قدم بڑھائے۔

''مسٹر، آپ کا ٹکٹ...!'' کنڈ کٹر نے پکارا۔

اس نے کچھ نہ سنا اور بس سے اُتر گیا۔

بس پھر چل پڑی۔

وہ Statesman بلڈنگ کے پاس کھڑا تھا۔

پھیپھڑوں تک سگریٹ کا طویل کش کھینچتے ہوئے اس نے اپنے لیے گھر کا راستہ تجویز کیا، اور جیکٹ کے کالر اُٹھا کر قدم بڑھائے۔

ایکسچینج کی گھڑی میں پونے گیارہ بج رہے تھے۔

شنکر مارکیٹ دن بھر کے ہنگاموں کے بعد خاموش پڑی تھی، مگر'لا بوہیم' میں مدھم مدھم بتیاں جل رہی تھیں اور سامنے گھٹیا قسم کے ہوٹلوں میں گاہکوں سے نبٹنے کے بعد نوکر لوگ کھانا کھارہے تھے۔

کناٹ پلیس کا وہ حصہ، 'لا بوہیم' کی مدھم بتیوں اور گھٹیا قسم کے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہوئے نوکروں کے باوجود ویران پڑا تھا۔

''دسمبر کے وسط میں رات کے گیارہ بجے لوگ گھروں میں بیویوں کے پہلو میں سو رہے ہوتے ہیں!'' اس نے سگریٹ سلگایا۔

''ہم نے تو دن کے گیارہ بجے بھی لوگوں کو یہیں کناٹ پلیس میں سوتے دیکھا ہے...!'' وہ آپ ہی آپ مسکرادیا۔

اس کے قدم بڑھ رہے تھے۔

منٹو برج کے نیچے وہ بے اختیار ہی چلا اٹھا۔

''ہنگ اااااامم...!''

رات کے سناٹے میں اس کی آواز گونجی اور اسی لمحے اس نے گونجتی ہوئی تیز و تند پکار سنی۔

''ہنگ اااااامم...!''

اس کا جی چاہا کہ پکار کا جواب دے۔ ابھی وہ ارادہ باندھ ہی رہا تھا کہ گرڑ گرڑ، گرڑ گرڑ، پل پر سے گاڑی گذرنے لگی۔

پل کے نیچے کہرام مچا ہوا تھا۔

وہ پل کے نیچے سے نکل آیا اور منٹو روڈ کی طرف بڑھنے لگا۔

منٹو روڈ اندھیروں، اُجالوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ دو رویہ کھڑے ہوئے نیم کے پیڑ سو رہے تھے اور پیڑوں کی قطاروں کے پیچھے مرکزی حکومت کے ملازموں کے گھر خاموش پڑے تھے، گہرے خاموش!

''ہجوم کے شور اور ہجوم کی خاموشی میں کتنی مماثلت ہے...!'' اس نے سگریٹ سلگایا۔

ایسی ہی ایک خاموشی رام لیلا گراؤنڈ میں پاؤں پسارے ہوئے تھی، جیسے نجات کے لمحوں سے لطف اندوز ہو رہی ہو۔ دن بھر کے سیاسی ہنگامے، شور و غل، تقریریں، رام لیلا گراؤنڈ کی چوڑی چھاتی میں دفن تھے۔ رام لیلا گراؤنڈ کے پرلے کنارے پر آصف علی روڈ کی اونچی عمارتیں خاموش

کھڑی تھیں۔ان کی چھتوں پر نیون سائن کے جلتے بجھتے اشتہارات روشنی کے آنسو بہا رہے تھے اور ان آنسوؤں کی روشنی میں سنگ مرمر کا چبوترہ اور اس کی طیارے کے پروں کی طرح پھیلی ہوئی چھت اونگھ رہی تھی۔ رات کی خاموشی چبوترے کی روندی ہوئی چھاتی سہلا رہی تھی — بھانت بھانت کی بولیوں والے سیاسی کارکن جانے کہاں سوئے ہوئے تھے۔

اس نے چند قدم اٹھائے اور چبوترے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

غیر محسوس طور پر اس نے سنا۔

''بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ، تقریر سنو!''

''بھائیو اور بہنو، آج ہم یہاں اس لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ ہم پر آفت آن پڑی ہے...!''

اس کے کان بج رہے تھے۔

سانس لینے میں اسے دقت محسوس ہوئی۔اس نے سگریٹ سلگایا۔

''ہجوم، بھیڑ بھاڑ، بھیڑوں کے گلے میں بولتے ہوئے اس شخص کا جی بھی نہیں گھبراتا۔شاید یہ شخص خود بھی اپنے آپ میں ایک ہجوم بن گیا ہے اور اکائی ٹوٹ گئی ہے...!''

اس نے جلدی جلدی لمبے لمبے ڈگ بھرے اور سرکلر روڈ پر آ گیا۔

سرکلر روڈ کے دائیں کنارے پر ارون ہاسپٹل میں بتیاں ٹمٹما رہی تھیں، اکھڑے ہوئے سانسوں کی طرح۔

اس نے Casuality Deptt کی طرف قدم بڑھائے۔

Casuality Deptt کے باہر تین چار ایمبولینس وین کھڑی تھیں اور برآمدے میں چار پانچ آدمی اکڑوں بیٹھے بیڑیاں پی رہے تھے۔اس نے دروازہ اندر کی جانب دھکیلا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

''ارے تم تم! اس سمے؟''

اس نے ہاتھ بڑھایا۔

''بیٹھو... پالی، ایک کپ چائے لانا!''

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیسے آنا ہوا؟''

وہ مسکرایا: ''ایسے ہی... ادھر سے گذر رہا تھا، سوچا، تم سے ملے ایک زمانہ ہو گیا ہے...!''

''تم آج ملنے چلے آئے۔اتفاق کی بات ہے، میں آج ہی نائٹ ڈیوٹی پر آیا ہوں... چائے

پیو!... ٹھنڈی ہو جائے گی...!"

اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔

"تم، اور کیا حال ہے دلِ ناداں کے...!"

"بڑا سکون ہے پیارے! شاید اتنا سکون موت کے بس میں بھی نہیں! دلِ ناداں کے بارے میں سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے... کیا دن تھے اور کیا خواہشیں تھیں... تمھاری طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے سوچا بھی نہیں کہ تم ڈیوٹی پر ہو گے یا آف ہو گے۔ تم مل گئے، ہم مل بیٹھے؛ تم نہ ملتے، میں انھی قدموں سے لوٹ جاتا... کیا ضروری ہے کہ خواہش کی تکمیل خوشی بن جائے اور خواہش پوری نہ ہو تو ماتم۔ ماتم یا خوشی از خود کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ اوّل اور آخر احساس ہے... احساس اپنی ذات کا جو حاصل و محرومی سے بے نیاز ہے، جو نہ ذلت محسوس کرتا ہے، نہ احسان قبول کرتا ہے، جس کے لیے راستے ٹیڑھے ہیں نہ سیدھے... میں بک تو نہیں رہا ڈاکٹر ماتھر میرے!"

ڈاکٹر ماتھر نے کہا۔

"تم بے حسی کی منزل پر پہنچ گئے ہو تم!"

"ممکن ہے، تم صحیح ہو! مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تمھاری رائے کو جھٹلاؤں... میرے لیے تو اب الفاظ اپنے معنی کھو بیٹھے ہیں... ایک دن میں ٹی ہاؤس میں خالی الذہن بیٹھا ہوا تھا۔ میرے پاس ہربنس اور کرشن بیٹھے ہوئے تھے۔ میری نظریں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں اور میرے خالی ذہن میں کوئی جذبہ، کوئی خیال پیدا کرنے کے لیے کوشاں تھیں... دو صوفے چھوڑ کر نول پوری بیٹھا ہوا تھا اور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہربنس کی کسی زیادتی کے پیشِ نظر وہ ہربنس کے ساتھ بیٹھنا اپنی توہین سمجھتا تھا، اس لیے وہ الگ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے کہہ رہی تھیں، ادھر آؤ... تم جانتے ہی ہو میرے اور نول پوری کے تعلقات کو؛ ایک جان دو قالب تھے ہم کبھی... اس دن میرا خالی ذہن میرے لیے نئی زندگی ڈھونڈ لایا... بھئی، میں جہاں بیٹھا ہوں، بیٹھا ہوں۔ نہ ہربنس میری توہین کر سکتا ہے نہ نول پوری میری عزت... نہ ہربنس میرا دشمن ہے اور نہ نول پوری میرا دوست... میں اپنے آپ میں سب کچھ ہوں... لوگ کہتے ہیں، نول پوری کے پاس اچھی نوکری ہے، اچھی بیوی ہے... وہ پانچ بجے آفس سے اٹھتا ہے، ساڑھے پانچ بجے گھر پہنچ جاتا ہے۔ سات بجے ٹی ہاؤس پہنچتا ہے اور پھر ساڑھے نو بجے گھر پہنچ جاتا ہے... اوقات کی یہ ترتیب اس کی domestic harmony قائم کیے ہوئے ہے۔ مجھے پتہ ہی نہیں، میں کب اٹھتا ہوں، کب سوتا ہوں۔ مر گیا تو کوئی رونے والا بھی نہیں۔ میرے لیے نہ تو نول پوری کی زندگی قابلِ رشک ہے اور

نہ ہی میری اپنی زندگی باعث ندامت... میں 'میں' ہوں اور بس۔"

"اور نول پوری؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں... وہ مجھے نائی کہتا ہے... وہ مجھے چاہے نائی کہے یا موچی... کیا فرق پڑتا ہے...! 'میں' نائی بھی ہو سکتا ہے، موچی بھی اور بھنگی بھی۔ اور اگر 'میں' صاحب اختیار ہے تو آئن اسٹائن بھی...! 'وہ' کچھ نہیں ہو سکتا۔ 'وہ' ہجوم ہو سکتا ہے، بھیڑ ہو سکتا ہے... شور و غل، ہنگامہ، مَیں مَیں، چیں چیں... تم مسکرا رہے ہو ماتھر!"

ماتھر نے کہا:

"مجھے تم سے ڈر لگ رہا ہے تم!"

"ارے نہیں بھائی میرے! ایسی کوئی بات نہیں! اگر مجھے سڑک کے پار جانا ہے تو ہری بتی کے سگنل کے سے بھی جانا ہے اور اگر نہیں جانا، تو لال بتی کے سگنل کے سے بھی نہیں جانا...!"

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

ماتھر نے ریسیور اٹھایا۔

"Casuality Deptt... کہاں، کشمیری گیٹ؟ ابھی بھیجتا ہوں... پالی، ڈرائیور کو بلاؤ... تم، تم گھر جا رہے ہو؟... ایمبولینس کشمیری گیٹ تک جا رہی ہے، تم وہاں اتر جانا... پالی، ڈرائیور کو بلاؤ بھئی!"

"اچھا پیارے!"

ڈرائیور کے پاس بیٹھتے ہی اس نے سگریٹ سلگایا۔

"چل پیارے، بہت کروٹیں بدل چکے۔"

ایمبولینس سرپٹ دوڑ رہی تھی۔

فیض بازار ویران پڑا تھا۔ اوپر تلے مخلوق سوئی ہوئی تھی۔ سارا بازار دودھیا روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ اتنی تیز روشنی میں بھی لوگوں کو نیند آ گئی تھی۔

آزاد پارک اور لال قلعہ کا میدان سونا پڑا تھا۔ روشنی کم تھی۔ لال قلعہ کی دیوار بے حسی سے کھڑی تھی۔ خلا میں وائرلیس poles کی سرخ آنکھیں بنا پلک جھپکائے جانے کسے تک رہی تھیں۔

کشمیری گیٹ تک وہی سناٹا تھا۔

کشمیری گیٹ کے چوراہے پر ایمبولینس رکی — قریب ہی ایک شخص اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا اور ذرا فاصلے پر ایک کار کھڑی تھی۔

اس نے ایمبولینس سے اُترتے ہوئے اوندھے منہ پڑے ہوئے شخص کو دیکھا اور سگریٹ سلگایا۔

''چلو، اپنا یارڈاکٹرز مصروف رہے گا۔''

اس کے قدم شہر کی فصیل سے باہر کی طرف اُٹھ رہے تھے—فصیل سے باہر آنے پر اسے سردی لگی۔ اُس نے جیکٹ کا گرا ہوا کالر پھر اُٹھا دیا اور آہستہ آہستہ علی پور روڈ کی جانب بڑھنے لگا۔

اس کے پاؤں سن ہو رہے تھے اور وہ بوجھل قدم اٹھاتا آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ زمین کی ساری ٹھنڈک تلووں سے اس کے جسم میں سرایت کر رہی تھی۔ اس نے جھک کر پاؤں کی جانب دیکھا۔ وہی ایک پٹی والی اس کی محبوب چپل اس کے پاؤں میں تھی۔ مگر چپل کا وجود، عدم وجود میں منتقل ہو گیا تھا۔

اس نے سگریٹ لبوں سے ہٹا کر گہرا طویل سانس کھینچا۔ اس کے پھیپھڑوں میں برف کی ایک لکیر سی کھنچ گئی۔ وہ بھیگے ہوئے پرندے کی طرح پھڑ پھڑایا اور تیزی سے قدم اُٹھانے لگا۔

شہر کا یہ علاقہ—شہر کے اس علاقے کی رات خوب تھی۔

سڑک کالی اور چکنی تھی، روشنیاں مدھم تھیں۔ کنارے پر بنی ہوئی کوٹھیاں اور دفتر پرانی وضع قطع کے تھے اور پیڑ گھنے تھے۔ ہر فرلانگ پر قدرے تیز روشنیوں والے پٹرول پمپ بنے ہوئے تھے۔

دُور دُور تک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

اندر پرستھ کالج کے باہر جہاں دن بھر چڑیاں چہچہاتی رہتی تھیں اور عقاب پر تولے منتظر رہتے تھے، اب وہاں اُلو بھی نہیں بول رہے تھے۔

اس نے سگریٹ سلگایا۔

''شہر بھی خوب ہے... رات کو ہجوم کی خاموشی، شہر کی خاموشی بن جاتی ہے، اور دن کو ہجوم کا شور، شہر کا شور...!''

اولڈ سیکریٹریٹ کے قریب اس کے قدم رُک گئے۔ اس کے کانوں کے پاس سے سائیں سے ایک آواز نکل گئی۔

اس نے چاروں طرف دیکھا۔

فلیگ اسٹاف روڈ کی جانب سے اسے سپاہی کی ٹوپی بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔

''کون ہے وہاں؟''

وہ کھڑا رہا۔

سپاہی قریب آیا۔

''کیا کر رہے ہو؟''

وہ مسکرا دیا۔

''آوارگی!''

سپاہی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''راتوں کو گھومنا جرم ہے!''

وہ پھر مسکرایا:

''تو آوارگی جرم ہے!''

سپاہی نے ذرا بوکھلا کر کہا:

''میرے ساتھ چلو، سول لائنز تھانے تک!''

سپاہی نے اس کا بازو تھام لیا۔

وہ پھر مسکرایا۔

''چلو!''

سپاہی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

اس نے سپاہی کی طرف سگریٹ بڑھایا اور آگے بڑھ گیا۔

علی پور روڈ اس کا ساتھ نہ دے سکی۔

وہ مال روڈ پر پہنچ گیا اور پھر دھیمے دھیمے کنگز وے کیمپ۔

قمقموں کی سیدھی زنجیر خلا میں معلق تھی اور جہاں قمقموں کی زنجیر نیم کے پیڑوں کے جھنڈ کی وجہ سے ٹوٹی تھی، وہاں اس کا گھر تھا۔

اس نے سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ ایک کار اس کے قریب آن رُکی۔

''آپ ماڈل ٹاؤن تک چل رہے ہوں، تو آیئے۔''

اس نے کار کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گیا۔

کار چل پڑی۔

اس نے سگریٹ کا طویل کش کھینچا، کار کے اندر پھیلے ہوئے اندھیرے میں سگریٹ کا شعلہ چمکا۔

''Don't mind... سگریٹ مت پیجیے!''

''کار روک دیجیے! I'll get down here۔''

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

کار ایک جھٹکے سے رُک گئی۔

وہ دروازہ کھول کر اُتر گیا۔

کار ایک جھٹکے سے، تیزی سے چل پڑی۔

اس نے قدم بڑھائے۔

قمقموں کی ٹوٹی ہوئی زنجیر کے پاس، نیم کے پیڑوں کے جھنڈ کے پیچھے، اسے اپنا گھر نظر آ رہا تھا۔

OO

('تلاش' نئی دلی: ۱۹۶۳ء)

مقتل

کئی بار میرے پاؤں پھسلے اور ہر بار یوں ہوا کہ میری پسلیوں کا جال کیلوں میں پھنس گیا، میری آنکھوں کے گہرے گڈھے کیلوں میں اُلجھ گئے اور میں ٹنگ گیا اور منہ کے بل زمین پر گرنے سے بچ گیا۔ اگر میں منہ کے بل زمین پر گر جاتا تو میری موت ہو جاتی۔

مجھے چھت پر پہنچنا تھا — چار آڑی ترچھی دیواریں تھیں، چھت تھی — نہ کوئی دروازہ تھا نہ کھڑکی نہ روشندان۔ دیواریں پتھروں کی تھیں یا اینٹوں کی، کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ ان پر پلستر کی موٹی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ دیواروں پر، اِنچ اِنچ پر ہاتھ بھر لمبی اور نوکیلی کیلیں گڑی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے چاروں طرف ویرانی تھی اور سیاہی۔ ویرانی کہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور سیاہی کہاں تک پھیلی ہوئی تھی، کچھ پتہ نہ چلتا تھا — اور مجھے وہاں کون پھینک گیا تھا اور میں وہاں کب سے بھوکا پیاسا پڑا تھا، نہ میں یہ جانتا تھا اور نہ یہ کہ میں کون ہوں، کیا ہوں اور کہاں سے آیا ہوں اور مجھے کہاں جانا ہے؟ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ پسلیوں کا ایک جال ہے اور آنکھوں کے دو گہرے گڈھے ہیں اور ان میں ایک نا آشنا کہرام برپا ہے — اور پھر میں نے ہاتھ بڑھایا تھا، میرا ہاتھ کیلوں سے ٹکرایا تھا اور میں نے اِنچ اِنچ پر، ہاتھ ہاتھ بھر لمبی اور نوکیلی کیلیں محسوس کی تھیں، جو مضبوط دیواروں میں گڑی ہوئی تھیں اور پھر میں نے ایک پتھر اُچھال دیا تھا اور پتھر چٹاخ کی آواز بلند کرنے کے بعد اوپر ہی رُک گیا تھا — اوپر چھت تھی اور پھر میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھے چھت پر پہنچنا ہے۔

کئی بار میرے پاؤں پھسلے اور ہر بار یوں ہوا کہ پسلیوں کا جال کیلوں میں پھنس گیا، آنکھوں کے گہرے گڈھے کیلوں میں اُلجھ گئے اور میں ٹنگ گیا اور ہر بار میں نے کیلوں میں پھنسا ہوا جال اُتارا، نوکیلی کیلوں میں اُلجھے ہوئے آنکھوں کے گڈھے علیحدہ کیے اور پھر ایک ایک کیل تھامتا، ایک ایک کیل پر پاؤں جماتا چھت کی جانب بڑھا۔ دیواریں کتنی اونچی تھیں اور چھت کون سے آسمان پر تھی، کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ کوئی ستارہ نہ تھا — چھت کی جانب بڑھتے ہوئے کئی بار پھسلا، کیلوں میں ٹنگا، پھر بڑھا اور پھسلا اور یہ نہ پتہ چلا کہ کتنے ہاتھ پھسل جاتا ہوں اور کہ زمین سے کتنا

اوپر ہوں اور آسمان سے کتنا نیچے ہوں اور کہ چھت کون سے آسمان پر ہے۔

پسلیوں کا جال، آنکھوں کے گہرے گڑھے، بھوک، پیاس، ویرانی، سیاہی، دیوار، نوکیلی کیلیں اور وقت ــــ ان کا وجود رہا نہ احساس۔ احساس تھا ایک نا قابلِ بیان لذت کا کہ جس کی طلب بیٹھے بیٹھے ہنسا دے، بیٹھے بیٹھے رلا دے ــــ اور پھر نہ جانے میں کب تک چھت پر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا، ہنستا رہا، روتا رہا۔

ہر سمت، دوٗر، بہت دوٗر، نظروں کی سرحد پر نیم روشن قمقموں کی لکیر دائرے کی صورت کھنچی ہوئی تھی اور چھت مرکزی نقطہ تھی اور مرکزی نقطہ مجھے سمیٹے ہوئے تھا ــــ مرکزی نقطے اور نیم روشن قمقموں کی لکیر کے درمیان ویرانی اور سیاہی کی کتنی تہیں اوپر تلے چڑھی ہوئی تھیں، کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ چھت کی بلندی اور قمقموں کی لکیر کی پستی کے بیچ آوازوں کا کوئی سلسلہ موجود نہ تھا۔

چھت سنگ مرمر کے آڑے ترچھے ٹکڑوں سے جڑی ہوئی تھی ــــ چکنی، یخ، آبدار چھت ــــ سنگ مرمر کے آڑے ترچھے ٹکڑوں کے درمیان ہاتھ بھر لمبا، آڑا ترچھا شیشے کا ایک روشن ٹکڑا جڑا ہوا تھا اور قریب ہی وہ پتھر پڑا ہوا تھا جو میں نے زمین سے اوپر اُچھال دیا تھا اور جو چٹاخ کی آواز بلند کرنے کے بعد اوپر ہی رُک گیا تھا اور میں نے محسوس کیا تھا، مجھے چھت پر پہنچنا ہے۔

میں نے ہاتھ بڑھایا ــــ پتھر میرے ہاتھوں میں تھا ــــ اور پھر میں نے محسوس کیا، پتھر کا سمبندھ ہاتھ بھر لمبے، آڑے ترچھے، شیشے کے روشن ٹکڑے سے ہے۔ شیشے اور پتھر کا سمبندھ؟

پتھر، میں نے شیشے کے ٹکڑے پر پٹخ دیا ــــ شیشہ، کرچ کرچ ٹوٹ گیا اور پتھر؟ اوپر اُچھالی گئی چیز نیچے لوٹ آتی ہے، نیچے پھینکی گئی چیز اوپر لوٹ کر نہیں آتی ــــ جب میں نے پتھر زمین سے اوپر اچھال دیا تھا، چٹاخ کی آواز بلند ہوئی تھی کہ پتھر زمین کی جانب لوٹتے ہوئے چھت پر رُک گیا تھا لیکن شیشہ کرچ کرچ ٹوٹ گیا اور پتھر نہ جانے کون سی پستی کی جانب روانہ ہوا کہ کوئی آواز بلند نہ ہوئی۔

پستی کی آخری حد زمین تھی یا زمین کا قلب، جو چار آڑی ترچھی دیواروں میں قید تھا، کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ آڑا ترچھا، روشن شیشہ ٹوٹنے پر آڑے ترچھے سنگ مرمر کے ٹکڑوں کے درمیان جب چھت نے آسمان کی طرف منہ کھولا، منہ سے نہ جانے کب کی مقید روشنی لپکنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے آسمان کا ایک وسیع آڑا ترچھا ٹکڑا روشن ہو گیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا کہ چھت کون سے آسمان پر ہے اور کون سا آسمان چھت پر جھکا ہوا ہے اور زمین چھت سے کتنے آسمان نیچے ہے کہ آسمانوں کے درمیان اور آسمان اور زمین کے درمیان سیاہی جوں کی توں تھی اور ہر طرف، دوٗر، بہت دوٗر،

نظروں کی سرحد پر، نیم روشن قمقموں کی لکیر دائرے کی صورت کھنچی ہوئی تھی اور چھت مرکزی نقطہ تھی اور مرکزی نقطہ مجھے سمیٹے ہوئے تھا اور مرکزی نقطے اور نیم روشن قمقموں کی لکیر کے درمیان ویرانی اور سیاہی کی کتنی تہیں اوپر تلے چڑھی ہوئی تھیں، کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ بلندی اور قمقموں کی لکیر کی پستی کے بیچ آوازوں کا کوئی سلسلہ موجود نہ تھا — میں نے محسوس کیا، مجھے پستی کی آخری حد پر پہنچنا ہے، جہاں سے کوئی آواز نہیں آتی۔

میں نے ایک نظر آسمان کے وسیع آڑے ترچھے روشن ٹکڑے پر ڈالی، ایک نظر نیم روشن قمقموں کی لکیر کو دیکھا اور چھت کے آسمان کی طرف کھلے ہوئے منہ میں کود پڑا۔

میں پستی کی آخری حد کی جانب گر رہا تھا — گر رہا تھا، مجھے کچھ پتہ نہ چلا، کتنا گر چکا ہوں اور ابھی کتنا گرنا ہے کہ زمین سے چھت کی بلندی کا تعین ہی نہ کر سکا تھا، چھت سے زمین کی پستی کا تعین کیسے کرتا اور یہ بھی تو پتہ نہ تھا، پستی کی آخری حد زمین ہے یا زمین کا قلب۔ زمین پر پاؤں جما کر زمین کے قلب کی پستی جانی جا سکتی ہے، زمین سے اوپر اُٹھ کر، انجانی بلندیوں پر پاؤں جما کر، زمین کے قلب کی پستی کیسے جانی جا سکتی ہے؟

نیم روشن قمقموں کی لکیر، آسمان کا وسیع آڑا ترچھا روشن ٹکڑا، سنگ مرمر کے آڑے ترچھے ٹکڑوں سے جڑی ہوئی چکنی، یخ، آبدار چھت، بھوک، پیاس، ویرانی، سیاہی، پسلیوں کا جال، آنکھوں کے گہرے گڈھے اور وقت... ان کا وجود رہا نہ احساس۔ احساس تھا ایک نا قابلِ بیان لذّت کا کہ جس کی طلب بیٹھے بیٹھے ہنسا دے، بیٹھے بیٹھے رُلا دے — اور پھر نہ جانے میں کب تک پستی کی آخری حد پر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہا، ہنستا رہا، روتا رہا۔

چار آڑی ترچھی دیواریں تھیں، چار مختلف زاویوں کے کونے تھے۔ دیواریں اتنی بلند تھیں کہ ختم ہوتی دکھائی نہ دیتی تھیں اور چھت؟ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ چھت ہے یا آسمان ہے اور چھت کا منہ؟ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ ہے بھی یا نہیں اور پستی کی آخری حد؟ چکنی مٹی سے لپا پتا کچا فرش — وہ کمرہ (؟) نا قابلِ بیان ہے کہ نہ تو وہ مربع تھا، نہ مستطیل اور نہ اس کی دیواریں متوازی تھیں۔

چاروں دیواریں بدی کی روشنی سے چمک رہی تھیں کہ ایک طرف پڑے ہوئے قدیم میز کی چھاتی میں ہاتھ بھر لمبے پھل والا چاقو پیوست تھا اور میز کی چھاتی سے باہر چاقو کے پھل کا جو حصہ رہ گیا تھا، اس سے بدی کی تیز روشنی پھوٹ رہی تھی اور میز کے قریب ہی چکنی مٹی سے لپے پتے کچے فرش پر وہ پتھر پڑا ہوا تھا، جو میں نے ہاتھ بھر لمبے شیشے کے آڑے ترچھے روشن ٹکڑے پر پھینک دیا تھا اور شیشہ کرچ کرچ ٹوٹ گیا تھا اور پتھر نہ جانے کون سی پستی کی جانب روانہ ہوا تھا کہ کوئی آواز

بلند نہ ہوئی تھی — پستی کی آخری حد پر پتھر بھی پڑا ہوا تھا اور میں بھی۔

میز کی چھاتی پر بوسیدہ جلد والی ایک فائل پڑی ہوئی تھی۔

دیواروں پر ایک ایک کینوس بھی آویزاں تھا — ایک دیوار پر آویزاں کینوس، چاندی کے بالوں والے ایک جھرّیاں بھرے چہرے کے آدمی کو قید کیے ہوئے تھا۔ دوسری دیوار پر آویزاں کینوس، چاندی کے بالوں والی ایک جھرّیاں بھرے چہرے کی عورت کو قید کیے ہوئے تھا۔ تیسری دیوار پر آویزاں کینوس میں سیاہ بالوں والی ایک بھرے بھرے چہرے کی عورت قید تھی — چوتھی دیوار سونی تھی۔ میں نے محسوس کیا، اس دیوار کا سونا پن میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

میں نے بوسیدہ جلد والی فائل کھولی۔ ایک خستہ کاغذ بندھا پڑا تھا، جس پر تین کالم کھنچے ہوئے تھے اور کالموں میں نام، جرم اور سزائیں لکھی ہوئی تھیں:

بوڑھا مرد : لاعلمی : گلے میں پھندا ڈال کر موت۔

بوڑھی عورت : معصومیت : دودھ میں زہر ملا کر موت۔

جوان عورت : فریب : سینے میں گولی مار کر موت۔

فائل میں ایک اور کاغذ بھی پڑا ہوا تھا، جو بندھا ہوا نہیں تھا اور اس پر لکھا تھا:

اے کہ تو نے مجرموں سے سمبندھ رکھا، تیری سزا عمر بھر کی قید تنہائی ہے۔

اور پھر میری پسلیوں کے جال میں اور آنکھوں کے دو گہرے گڑھوں میں، ایک نا آشنا کہرام برپا ہوا اور پھر مجھے کچھ محسوس نہ ہوا اور پھر میں نے وہ پتھر اُٹھایا، جو میں نے اُوپر اُچھال دیا تھا اور پھر نیچے پٹخ دیا تھا اور پیشانی پر بھرپور ضرب لگائی۔ وہ پتھر اب بھی میرے پاس ہے۔

○○

('ادبِ لطیف'، لاہور: ۱۹۶۵ء)

حسن کی حیات

''زندگی کتنی کٹھن ہے!'' یہ خوبصورت احساس اسے پہلی بار ہوا تھا۔

تین دن سے وہ اپنے کمرے میں قید تھا۔ اندھیرے، اُجالے میں اور اُجالے، اندھیرے میں جذب ہوتے رہے، مگر وہ میز پر ٹانگیں پھیلائے کرسی میں دھنسا رہا، دنیا سے بے خبر، کمرے سے بے خبر، یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی بے خبر۔ اس کا ذہن ایک خیال کو چند لمحوں کے لیے جنم دیتا اور چند ہی لمحوں کے بعد اس خیال کی موت ہو جاتی۔ خیال کے اس پودے کے پھوٹنے اور مرجھانے سے اسے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ زندگی کتنی کٹھن ہے۔ اس احساس کی شدت سے اس کے ذہن میں یہ خیال بار بار جنم لے رہا تھا:

''اتنی بڑی زندگی یوں اکیلے کیسے گزرے گی!''

اور بار بار یہ خیال مر رہا تھا اور یوں وہ تین دن سے دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ، کمرے میں قریب قریب بے حس پڑا ہوا تھا۔

غیر ارادی طور پر وہ آگے کو جھکا اور میز سے آئینہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔

آئینہ میں اسے اپنا چہرہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ اُلجھے ہوئے روکھے روکھے بال، پیشانی پر جھریاں سی، ڈوبتی آنکھیں، اور بڑھے ہوئے شیو سے ڈانوا ڈول سے خد و خال۔ اسے حیرت ہوئی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ سیما کی موت کے بعد چند ہی دنوں میں وہ یوں اُجڑ جائے گا۔

ایک گھنٹہ بعد اس نے پھر آئینہ دیکھا اور اسے تسکین ہوئی۔ وہ وہی تھا بالکل وہی، سیما کی موت سے پہلے کا جگدیش۔ سیاہ بنے سنورے بال؛ درخشاں، اُجلی تقدیریں سمیٹے ہوئے ماتھا؛ کانپتے ہوئے سے لب جیسے ابھی کسی نے بوسہ لیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں روٹھی ہوئی نیند نے سرخ سرخ ڈورے بچھا دیے تھے، اور ان پر غنودگی کا عالم طاری تھا۔ وہ خود کو نسبتاً زیادہ نکھرا ہوا پا رہا تھا — اسے محسوس ہوا کہ یہ نکھار سیما کی موت کی پہلی بھینٹ ہے۔

موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے سے پیشتر اس نے دن بھر کا پروگرام سوچ لیا۔ دس بج رہے تھے

اور کملا چار بجے ڈیوٹی ختم کر کے آتی تھی۔ دس اور چار کے درمیانی لمحے گذارنے کے لیے کناٹ پلیس سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں تھی — شالامار باغ کی بیرونی سڑک پر وہ موٹر سائیکل اُڑائے لیے جا رہا تھا کہ اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے زور سے بریک لگائی، اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔

سڑک کی چھاتی پر پہیے کے گھسٹنے سے کالی سی چوڑی لکیر ابھر آئی تھی، جس پر ٹائر کے موتی سے دانتوں کے نشان تھے۔ اسے وہ موتی جڑی ہوئی لکیر حسین لگی۔ ماڈل ٹاؤن کی اس خوبصورت سڑک پر، جس کے ایک طرف شالامار باغ اور دوسری طرف کوٹھیوں کی قطار ہے، اسے بریک لگا کر سیاہ سی لکیر ابھارنے میں اتنی ہی لذت ملتی تھی جتنی سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بنانے میں — سیاہ سی لکیر کو جو اس کی اپنی تخلیق تھی، چند لمحے وہ اپنی نگاہوں کا مرکز بنائے گھورتا رہا۔ اور پھر ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

دوسرے ہی لمحے وہ مال روڈ پر تھا۔ سنسان، نیم کے پیڑوں کی گھنی چھاؤں میں اونگھتی ہوئی مال روڈ سے اسے شدید انس تھا۔ وہ چاہتا تھا، مال روڈ پھیلتی جائے، موٹر سائیکل اس کی گرفت میں ہو، اور اس کی پشت سے کوئی حسین چہرہ لپٹا ہو، جس کے گورے گورے ہاتھ اس کی گود میں بندھے ہوں اور وہ دوڑتا، موٹر سائیکل اڑاتا جائے حتیٰ کہ — مال روڈ جلد ہی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس کی پشت بھی ویران تھی، مگر اس کے دل میں ایک بھرپور احساس دھڑک رہا تھا۔

''زندگی کتنی کٹھن ہے؟''

کافی ہاؤس کا جہازی ہال عبور کر کے وہ بالکنی میں کونے کے صوفے میں دھنس گیا۔ بالکنی میں اسے کوئی شناسا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ یہ اس کے لیے سکون کا باعث تھا۔ اس کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحے آتے، جب وہ اکیلا بیٹھنا چاہتا۔ ایسے لمحوں میں کسی کی موجودگی اسے ناگوار گزرتی، اور اس کا اظہار وہ شدید قسم کی سرد مہری سے کیا کرتا۔

اس نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے اور صوفے کی پشت پر سر ٹیکتے ہوئے آنکھیں موند لیں، مگر اس کے ذہن میں ابھی تک ''زندگی کتنی کٹھن ہے'' کی گونج تھی۔

اس نے خود سے سوال کیا:

''زندگی کیوں کٹھن ہے!''

اور خود ہی اس سوال کے جواب کی جستجو کرنے لگا۔ مگر جواب تھا کہ اس کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے زور سے آنکھیں بھینچ لیں۔ اس کی کنپٹیوں پر رگیں اُبھر آئیں، اور اس کا چہرہ خون کی گردش سے سرخ ہو گیا اور اسے دھند میں لپٹا ہوا جواب نظر آیا۔

''زندگی کٹھن ہے کہ—''اب جواب دھند کی چادر سے باہر نکل رہا تھا۔

''زندگی کٹھن ہے کہ ہر سمت بدصورتی ہے، غلاظت ہے، تعفن ہے۔ اور تم اس دنیا میں سانس نہیں لے سکتے۔ تم اپنی دنیا بنانے کی سعی کرتے ہو۔ ایسی دنیا جہاں حسن ہو، بہار ہو، لذت ہو، اور تم ٹھنڈے، گہرے سانس اپنے پھیپھڑوں میں اُتار سکو۔ تم ایسی دنیا کو جنم بھی دیتے ہو، مگر تمھاری یہ دنیا عارضی ہوتی ہے۔ اور چند ہی لمحوں میں ریت کے چمکدار ذروں سے بنے ہوئے گھر کی مانند منتشر ہو جاتی ہے۔ اور تمھیں اپنی تخلیق کے فنا ہونے کا غم ہوتا ہے۔ پہلے تمھیں یہ غم پیارا تھا کہ یہ نیا تھا اور بے پناہ لذت لیے ہوئے تھا۔ مگر اب یہ غم تہ در تہ ایک بہت بڑا احساس بن گیا ہے اور یہ احساس اب تمھارا دامن نہیں چھوڑ رہا ہے۔ زندگی کتنی کٹھن ہے۔ تمھاری زندگی، حسین زندگی، پھولوں اور شبنم، چاند اور سمندر، پہاڑوں کی چوٹیوں کی برف اور خوابوں کی زندگی... زندگی! تم بھول گئے ہو۔ تمھاری زندگی میں ابھی حسن کی تکمیل ہی کہاں ہوئی ہے ابھی تو... ابھی تو...''

آنکھیں کھول کر، اس نے ٹھنڈی کافی کا گھونٹ بھرا، کافی جو اس کی سوچ کے ساتھ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا، جیسے موت کا ٹھنڈا ہاتھ اس کے جسم سے چھو گیا ہو۔ اس کے ذہن میں خیال کے پودے کے پھوٹنے اور مرجھانے کا عمل مکمل ہوا۔ اور اسے تسکین ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سلائس پر ہاف فرائی انڈے کی بہتی ہوئی زردی کو دیکھ کر کہا:

''سوامی! تم ذرا بھی میرا خیال نہیں رکھتے۔ تمھیں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میرے لیے جو کچھ بھی لاؤ ڈھنگ سے لاؤ۔ اسے لے جاؤ اور ایک اور ہاف فرائی انڈا لاؤ، مگر خیال رہے کہ زردی کا بلبلہ پھوٹے نہیں۔''

کافی ہاؤس کے بیرے بھی اس کے اپنے تھے اور اس کے مزاج کا خاص خیال رکھتے تھے، اس لیے نہیں کہ وہ انھیں بڑا ٹپ دیا کرتا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ انھیں کافی ہاؤس میں ایک نیا اور خوبصورت آدمی نظر آتا تھا جس کا ایک ایک جملہ کافی ہاؤس کے Intelligentsia کے شور میں اپنے طور سے اُبھرتا تھا۔

سوامی کے جانے کے بعد وہ پھر آرام سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا اور بھرے کافی ہاؤس کے شور و غل میں اپنی تنہائی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ دھوئیں کا طویل کش کھینچنے کے بعد وہ یکے بعد دیگرے دھوئیں کے حلقے چھوڑنے شروع کر دیتا۔ اس کے منہ سے حلقے ایسے نکلتے جیسے فضا میں طیارے کے کیبن سے چھتری سوار کود رہے ہوں۔ حلقے خلا میں حاملہ عورت کی طرح آہستہ آہستہ بڑھتے اور چند ہی لمحوں میں ان کا اسقاط ہو جاتا۔ کبھی وہ دھوئیں کا بڑا حلقہ دھیمے سے چھوڑتا اور فوراً

ہی زور سے چھوٹا حلقہ دھکیل دیتا۔ چھوٹا حلقہ بڑے حلقے میں سے گزر جاتا۔ اسی چابکدستی سے جس چابکدستی سے سرکس میں تماشہ گر آگ کے حلقے میں سے گزر جاتا ہے— دھوئیں کا یہ کھیل اسے مرغوب تھا۔ اس لیے کہ یہ بہت خوبصورت کھیل تھا۔ اور اس لیے بھی کہ اس کی تمام تر توجہ سمیٹ لیتا تھا اور وہ خالی ذہن کے ساتھ چند گھنٹے بڑے آرام سے گزار لیتا تھا۔

چار بجے کے قریب جگدیش کافی ہاؤس سے بڑے اطمینان کے ساتھ اُٹھا اور دھیمے دھیمے بڑے وقار سے قدم اٹھاتا، موٹر سائیکل کی جانب بڑھا۔ دھوئیں کے کھیل کے بعد اس کے ذہن میں برمن کی بڑی پیاری، چلبلی سی دھن تھرک رہی تھی۔ اور اس کے لبوں پر دھن کی لہروں پر ہچکولے کھاتے ہوئے بول رقص کر رہے تھے:

ہمیں آج کوئی نہ چھیڑیو... چھیڑیو...
ہم نے کسی پہ ڈورے...
کسی پہ ڈورے ڈالنے ہیں...
ہمیں آج کوئی نہ...

جب اس نے نرسنگ ہاسٹل میں کملا کا دروازہ دھیمے سے اندر کو دھکیلا، برمن کی دھن آہستہ آہستہ اس کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی اور سو گئی۔ چند لمحوں کے لیے تو اسے کمرے میں کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ باہر کی چکا چوندھ سے اس کی چندھیائی ہوئی آنکھیں کمرے کی نیم روشن فضا میں کچھ بھی نہ دیکھ سکیں، اور پھر چند لمحوں کے بعد جب نیم روشن کمرے کے خدوخال صاف ہوئے تو اسے قد آدم آئینے کے سامنے کملا دکھائی دی۔ وہ اپنے گیلے بالوں کو جھٹک رہی تھی۔

دو سال پہلے کناٹ پلیس کے ہنگاموں سے بیزار ہو کر جگدیش کا اپنی اُداس شاموں کی شدت سے لطف اندوز ہونے کے لیے ماڈل ٹاؤن کی جھیل سے پرے خاردار جھاڑیوں اور خودرو پودوں سے بھرے میدان میں جس کے بیچ میں چھوٹا سا متعدی بیماریوں کا اسپتال ہے، جانا اور بہت رات گئے تک وہیں زمین پر رومال بچھا کر بیٹھے رہنا شغل تھا۔ وہیں ایک اُداس یخ بستہ رات کو اس کی کملا سے ملاقات ہوئی۔

کملا نے اس سے کہا:

''آپ یہاں کیا کرتے رہتے ہیں؟ میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے آپ کو اکثر دیکھا کرتی ہوں۔ اس وقت تک دیکھتی رہتی ہوں، جب تک کہ آپ اندھیرے میں گم نہیں ہو جاتے۔ ویسے یہ مناسب نہیں کہ میں ایک اجنبی سے یوں گفتگو شروع کر دوں، لیکن آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ

ایک جذباتی لڑکی جس کی پچیس سالہ زندگی کا بہترین دوست تنہائی ہے، ایسی صورت میں اور کر بھی کیا سکتی ہے؟''

کملا جب اس کے پاس آئی تھی، اس کا خیال تھا کہ ایک سراب ہے، جہاں وہ اپنی تشنگی کی شدت میں آگ لگانے جا رہی ہے، مگر جگدیش سراب نہیں، ٹھنڈے پانی کا چشمہ تھا۔

انھی دنوں جگدیش نے کملا کو ہیضے کے پس منظر میں دیکھا۔ ایک مکان اور لگن تھی کہ موت کے ہیضے سے لتھڑے ہوئے ہاتھوں کے شکنجے میں گھڑیاں گنتے ہوئے مریضوں کو دلاسہ دے رہی تھی۔ مرنے والوں کے رشتہ داروں کی چیخ و پکار میں دم توڑتے ہوئے مریضوں کی حسرت بھری نظروں میں اور قے اور دست سے بے حال مریضوں کی لرزش میں ایک سانولی سی، سفید، بے داغ لباس میں ایک تیلی تھی کہ یہاں وہاں تسلیاں بانٹتی پھر رہی تھی۔

اور پھر انھی دنوں ایک رات جگدیش، کملا کے کمرے میں اسے تکنے جا رہا تھا، تھکن سے چور، حریری ساری اور سفید بلاؤز میں لپٹی ہوئی سانولی کملا جو غنودگی کے عالم میں اس کی نگاہوں کا سامنا کر رہی تھی — وہ آگے بڑھا اور اس نے کملا کے تھکے ہوئے جسم کو قید و بند سے آزاد کر دیا۔ اس کی چھاتیوں کے کانٹے اپنی زبان پر چبھتے محسوس کیے، اپنی آنکھوں میں اُترتے دیکھے اور اس کے لانبے بازوؤں کے حلقے میں گھر کر اپنا آپ کھو دیا۔ اپنی دوشیزگی نذر کر دی۔

اور پھر اس نے کملا کی چھاتیوں میں اپنے آپ کو چھپاتے ہوئے کہا:

''کملا! مجھے کبھی ہرجائی نہ کہنا۔ تمھارے حسن کی گرفت اگر ڈھیلی پڑ گئی تو مجھے کوئی اور قید کر لے گا۔''

ڈیڑھ سال بعد اسے سیما نے قید کر لیا اور اب چھ ماہ بعد سیما کی موت کے بعد جب اس نے کملا کے کمرے میں قدم رکھا تو اسے یقین تھا کہ کملا اس کی منتظر ہوگی۔

اس نے دھیمے سے آگے بڑھ کر کملا کے شانوں کے پھلوں کو اپنے ہاتھوں میں محفوظ کرتے ہوئے اس کے گیلے بالوں کو ہٹا کر اس کی گردن پر بوسوں کی بارش کر دی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی کملا کو بازوؤں میں سمیٹا اور پلنگ پر لٹا دیا، اور اس کے اُبھاروں میں اپنا منہ چھپا لیا۔

کملا نے اس کے بالوں میں انگلیاں اُلجھاتے ہوئے پوچھا: ''سیما کہاں ہے؟''

یہ سوال غیر متوقع نہیں تھا۔

جگدیش نے پتلون کی پشت کی پاکٹ سے سیما کا خط نکالا اور کملا کو دے دیا۔

سیما نے لکھا تھا:

''جگدیش ڈیر!

مجھے یاد ہے، جب تم پہلی رات میرے کمرے میں آئے تھے۔ میں کانپ رہی تھی، اس لیے نہیں کہ تم اجنبی تھے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ لمحہ اجنبی تھا۔ تم نے میرے جسم، میری روح کی گہرائیوں میں اُترنے سے پہلے کہا تھا:

'سیما، میں ایک ہرن کی طرح ہوں جو کستوری کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جس کی تلاش میں شکاریوں کی ہوسناک نگاہیں بھٹکتی پھرتی ہیں۔ میں ایک زمانے سے اپنے آپ کو بچائے ہوئے اپنے ہی سے گریزاں ہوں۔ مجھے حسن کی پناہ درکار ہے۔ تمھاری پناہ مجھے زمانہ کی تیز اور زہریلی نظروں سے بچا سکتی ہے۔ تم اپنے حسن کی آگ دہکتی رکھو اور مجھے دھیمے دھیمے سلگنے دو۔ تمھارے شانوں کی رنگت اور ان کا میٹھا رس مجھے بھٹکنے نہیں دے گا۔ تم اپنے حسن کی محافظ رہو گی تو میں تمھارا غلام رہوں گا اور اگر تمھارا حسن میری نظروں سے پہلے ماند پڑ گیا تو میں دیوانہ وار پھر اپنی کستوری کی تلاش میں بھٹکوں گا اور شکاریوں کا نشانہ بن جاؤں گا۔'

چھ ماہ میں، جگدیش، تم نے مجھے زندگی کا وہ حظ دیا ہے، جو چھ جنم میں بھی مشکل سے کسی کو نصیب ہوگا۔ جانے کیوں گذشتہ چار پانچ دن سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں ڈھل رہی ہوں۔ میں یہ تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ میری زندگی میں تم کہیں اور بھٹکو، مگر میں اس احساس سے بھی بچ نہیں پا رہی ہوں کہ میرا زوال تمھیں کھو دے گا۔ بہت سوچ سمجھ کر جا رہی ہوں، کسی پہاڑ پر کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ کسی گھاٹی میں کسی زوال پذیر حسن کی لاش پڑی ہے!

تمھیں کھونا مجھے گوارا نہیں، خود کو کھونا — ہائے اس لذت کو کس طرح لکھوں؟

تمھاری، سیما''

رات کے دس بجے تک دونوں ایک دوسرے کو گم سم دیکھا کیے۔ کملا نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا:

''جگدیش، میں تمھیں کہاں چھپاؤں، کہاں چھپاؤں؟ میری آغوش بھی اس قابل نہیں کہ تم اس میں کھو جاؤ۔ میں کیا کروں؟''

جگدیش نے کہا: ''اچھا کملا!'' اس کے لہجے میں بہت بڑے فیصلے کا تکبّر تھا۔

اس نے موٹر سائیکل کو ہوا کے دوش پر چھوڑ دیا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ مال روڈ پر تھا۔ اُداس، نیم کے پیڑوں کے دستِ شفقت تلے اندھیروں، اُجالوں میں سوئی ہوئی مال روڈ۔ اس کے ذہن میں

صبح کی بات تھی۔

''پہلے یہ غم تمھیں پیارا تھا کہ یہ نیا تھا اور بے پناہ لذت لیے ہوئے تھا... تمھاری زندگی میں ابھی حسن کی تکمیل ہی کہاں ہوئی ہے۔ ابھی تو... ابھی تو....''

اس کے ہاتھوں میں بریک ڈھیلی ہوگئی۔ اور موٹر سائیکل پامبری روڈ سے آتے ہوئے ٹرک کے ساتھ جا ٹکرائی۔

جب جگدیش کی آنکھ کھلی، اس نے خود کو کانٹوں میں گھرا پایا۔ اس کا سر بندھا ہوا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ کی ایک رگ میں سوئی پیوست تھی، جس کی راہ سے اس کے جسم میں قطرہ قطرہ خون اُتر رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ کی ایک رگ کے راستے گلوکوز اس کے خون میں حل ہو رہا تھا۔ اس کو ہوش میں آتے دیکھ کر اس کے چند دوستوں، ڈاکٹر اور نرس کے لبوں پر اُمید افزا مسکراہٹ پھیل گئی، مگر وہ جس کی تلاش میں بھٹک رہا تھا، وہ بھی اس کے قریب ہی کھڑی تھی — اس نے آگے بڑھ کر اس کا دامن پکڑ لیا اور ابدی نیند سو گیا۔

OO

('سات رنگ'، کراچی: ۱۹۶۱ء)

رفتار

اکتوبر کا پہلا ہفتہ بے پناہ گرمی سے جھلس رہا تھا کہ بھولے بھٹکے کالے بادلوں کا پرندہ ادھر آنکلا اور پھڑ پھڑانے لگا۔ کیول گھر کی بالکنی میں کھڑا ابر فزدہ کوکا کولا پی رہا تھا کہ موسم کا رنگ بدل گیا — چند منٹ بعد وہ ٹی ہاؤس میں اپنے مخصوص صوفے پر تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد اس نے ٹی ہاؤس کا جائزہ لیا۔ اس کے برابر کے صوفے پر ایک خوبرو نوجوان بیٹھا اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تک رہا تھا۔ کیول نے اس کی جانب دیکھا تو اس کے ہونٹ ہلکی سی مسکراہٹ سے پھیل گئے مگر کیول نے فوراً ہی آنکھیں پھیرلیں۔ چند منٹ بعد کیول نے پھر کن انکھیوں سے اس خوبرو نوجوان کو ایک لمحے کے لیے دیکھا اور فوراً ہی نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا جیسے اسے جان بوجھ کر پہچانا نہ گیا ہو، اور نظر انداز کیا گیا ہو۔

دوسرے ہی لمحہ وہ نوجوان کیول کی ٹیبل پر سامنے کی کرسی پر تھا۔ کیول نے اس کی جانب بے رُخی سے دیکھا تو اس نے اپنے وقار کو سہارا دیتے ہوئے تحمل سے کہا:

''میرا نام جالی ہے۔''

''بہت اچھا نام ہے۔'' کیول نے بے تعلقی برتتے ہوئے جواب دیا۔

جالی کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور اس کی ہڈیاں چیخ گئیں۔ اس نے بڑے کربناک لہجے میں کہا: ''میں بھی افسانے لکھتا ہوں۔''

''اچھا!'' کیول نے تعجب کا اظہار کیا، جیسے وہ چار پائیاں ٹھونکتا ہو۔

جالی بوکھلا گیا اور ٹوٹے جملے کہنے کی سعی کرنے لگا:

''آپ سے... پچھلے سال... 'تحریک' کے دفتر میں ملاقات...''

سامنے کے دروازے سے جگدیش داخل ہو رہا تھا اور ایک اجنبی کی موجودگی کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتا ہوا کیول کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب جگدیش صوفے کے قریب پہنچا تو جالی کے لرزتے ہوئے وجود سے اسے علم ہو گیا کہ بیچارہ کیول کے ہاتھوں ذبح ہو گیا ہے۔ جگدیش کی

ناپسندیدگی ڈھے گئی اور اس نے جالی کو پانی کا خالی گلاس تھماتے ہوئے کیول سے کہا:

''یار، آج غیر متوقع طور پر پشپا آ گئی۔ تم جانتے ہو گذشتہ دو سال سے پشپا میری نظروں کے سامنے ہے مگر آج تک میرے لب نہیں کھلے۔ میری آنکھیں اس معاملے میں پھکڑ ہیں۔ میں جو نہیں کہنا چاہتا وہ کہہ دیتی ہیں۔ کم و بیش یہی حال پشپا کا ہے۔ آج صبح میں بیئر پی رہا تھا اور بار بار کیدار شرما کا گیت گنگنا رہا تھا 'کہ آج پھر میرا جی چاہتا ہے رونے کو' کہ پردہ اُٹھا۔ میں نے دیکھا، پشپا سامنے تھی۔ گو اس کا آنا غیر متوقع تھا مگر پھر بھی اس کی امید مجھے ہمیشہ سے تھی۔ وہ میرے قریب بیٹھ گئی اور مجھے تکنے لگی۔ سامنے دیوار پر منٹو کا بڑا خوبصورت پورٹریٹ ہے نا، بس میں بیئر پیتا رہا اور منٹو کی بے چین آنکھوں کی گہرائیوں میں اُترنے کی سعی کرتا رہا۔ بہت دیر کے بعد میں نے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اس کی ہتھیلی چوم لی۔ دوسرے ہی لمحہ اس کا چہرہ میری چھاتی میں تھا اور اس کے آنسو میرے دل پر برس رہے تھے۔ اسی سمے ٹھنڈی خوشبودار ہوا کا جھونکا کمرے میں پہنچا اور مجھے یہاں لے آیا۔ پشپا میرے کمرے ہی میں ہوگی۔''

جگدیش اپنی بات کہنے میں محو تھا اور کیول اس کی بات سننے میں۔ جانے کب جالی وہاں سے اٹھا اور جانے کہاں چلا گیا۔ بات ختم ہوئی تو دونوں نے دیکھا کہ سامنے کی کرسی خالی تھی جیسے وہاں کوئی کبھی بھی نہیں تھا۔

کیول نے کہا:

''جگدیش، جانے کیوں تم اپنے گرد رومانی دھندلکوں کے جال بنتے رہتے ہو۔ میں تمھاری جگہ ہوتا تو دو سال پہلے پشپا کے جسم کا مزہ چکھ کر کہیں کا کہیں پہنچ گیا ہوتا۔''

''کیول، تم جسم کی لذت کے عادی ہو، جیسے درندے خون چکھنے کے عادی ہوتے ہیں — جسم کی لذت کیا ہے۔ چند لمحوں کی لذت ہے نا! کمان کے تناؤ کی طرح۔ تیر کمان چھوڑ کر چاہے کہیں گرے — رنڈی کے جسم میں، بیوی کے جسم میں، چاہے اس کے پیٹ میں بچہ ہو، تمھارا یا کسی اور کا — لیکن تم اس لذت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے جو میری فطرت کا ایک حصہ ہے۔ دو سال سے پشپا میری نظروں کے سامنے ہے۔ یہ دو سال سمٹ کر میری آنکھوں میں ایک مجسم بے چینی بن گئے ہیں۔ اس بے چینی کی میٹھی آنچ سے میرے دل اور ذہن کا موم پگھل کر ایک ہو گیا ہے۔ یہی حال کم و بیش دوسری جانب ہے۔ آج پشپا میرے پاس آئی ہے۔ وہ ایک بھرپور جسم کی جگہ نامکمل تمناؤں بھرا سکون لیے آئی ہے۔ اب ہمارے جسم تنی ہوئی کمان نہیں، دو دریا

ہیں جو ایک سمندر بننے کی آرزو کرتے ہیں — چھوڑ یار، کیا بکواس ہے — جب ہم اکٹھے نہیں ہوتے، ہم اپنی اپنی جگہ مسرتوں، محرومیوں، ذلتوں، نفاستوں اور جانے کس کس کے مجسمے ہوتے ہیں اور جب ہم اکٹھے ہوتے ہیں، ہم ایک مجسمہ ہوتے ہیں، آدمی کا مجسمہ جو تمھاری طرح کسی وقت کسی بھی جسم کو چکھنا چاہتا ہے۔ کسی وقت میری طرح وقت کو بھی شکست دیتا ہے اور کسی وقت راج کی طرح... ارے دیکھو کیول، 'Think of the devil and devil is there' مگر اس کی حالت تو دیکھو، سالا ضرور mortuary سے اُٹھ کر آیا ہے... ابے! الو کے چرخے!... یہ کیا بکواس ہے...؟

وہ تینوں، راج، کیول اور جگدیش، زندگی کے جانے کس موڑ پر ایک ہو گئے تھے، مکمل ایک۔

جب وہ تینوں اکٹھے نہ ہوتے، وہ غیر محسوس طور پر اپنی اپنی جگہ چالیس کروڑ صفروں کی طرح کشمکش کرتے اور جیتے۔ جب وہ تینوں اکٹھے ہوتے، وہ مکمل ایک ہوتے۔ ایک حساس دل ہوتا، جسے کسی دنیاوی بات کا احساس نہ ہوتا۔ کار دلّی سے فرید آباد کی جانب ۷۵ میل کی رفتار سے دوڑ رہی ہوتی، دنیا کو پیچھے چھوڑتے ہوئے۔ بیئر کا دور چل رہا ہوتا، دور — پیچھے کراہتی ہوئی دنیا کو بھولتے ہوئے اور قہقہوں میں طوفان لرزتا، دنیا کو غرق کرتے ہوئے۔

وہ ملتے بھی عجیب رنگ میں۔ رات زیادہ کالی ہے اور وہ بھاگے ٹی ہاؤس کی جانب۔ موسم غیر متوقع طور پر خنک ہو گیا ہے اور وہ لپکے ٹی ہاؤس کی جانب۔

راج جب ٹی ہاؤس میں داخل ہوا، موسم خاصا خنک ہو گیا تھا اور اسے سردی لگ رہی تھی۔ وہ سامنے کی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی حالت دگرگوں تھی۔ چہرے پر شدید تھکن کے آثار تھے اور خشک لبوں میں کانپتا ہوا سگریٹ کہہ رہا تھا کہ وہ اُداس ہے، بہت اُداس ہے۔

اس نے شب خوابی کا دھاری دار لباس پہن رکھا تھا جو اس کی دگرگوں حالت کو اور زیادہ نمایاں کر رہا تھا۔

کیول نے کہا:

"جیب خالی ہے یا جی اچھا نہیں۔"

راج کے چہرے پر پھیکی پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"پیارے حالت بہت غیر ہے، اپن تو جیتے جی مارے گئے۔" راج نے دھیمے دھیمے مدھم آواز میں کہنا شروع کیا: "ذہن کے سمندر کی وسعتوں کو جاننے کے لیے جسم کی کاغذی کشتی کی limitations کو بھول بیٹھا تھا۔ اب ذہن کا سمندر سمٹ کر ایک نقطہ بن گیا ہے مگر جسم کی کاغذی

کشتی زمین چھوڑ رہی ہے۔ تم نے دیکھا ہے نا میرا ہاسپٹل — ملکہ گنج سے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی جاتی ہے ہاسپٹل تک، ورنہ پکی سڑک کے راستے پہاڑی پر ڈیڑھ دو میل چڑھنا پڑتا ہے۔ میرا معمول یہ تھا کہ بس سے اُترنے کے بعد اس پگڈنڈی کے راستے ہاسپٹل جاتا۔ چھ سات دن ہوئے، پگڈنڈی کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ خاردار تاروں سے راستہ روک دیا گیا ہے۔ بڑی مشکل سے ہاسپٹل پہنچا۔ شام کو واپسی کے وقت دیکھا کہ لوگ اسی پگڈنڈی کے راستے نیچے اُتر رہے ہیں۔ کسی نے خاردار تاروں کی روک میں سے نچلی تار کو اوپر کی تار سے باندھ کر اس قدر اُٹھا دیا تھا کہ جھک کر نکلا جا سکے — میں جھک کر نکل ہی رہا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور جب آنکھ کھلی تو میل میڈیکل وارڈ کے اسٹاف روم میں پڑا ہوا تھا۔ چھ دن سے حالت بہت غیر ہے۔ ابھی تک بیماری detect نہیں ہو پائی۔ ڈاکٹر ساجن کا کہنا ہے کہ جسم کا کوئی حصہ نارمل حالت میں نہیں ہے۔ اور شاید یہ سب سگریٹ کافی بیئر کی زیادتی اور ہر وقت کی سوچ کی وجہ سے ہے اور اس کا علاج ہے مکمل آرام۔ ذرا سی حرکت بھی جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے... مگر یار! ہائے کیا موسم ہے... میں نے کہا، اب ذہن تو سو نہیں سکتا پھر جسم کا آرام، بات کیا بنی؟ اِدھر ہوا کا ٹھنڈا جھونکا پہنچا، اُدھر میں وارڈ سے چپکے سے کھسک آیا اور پہلا کام میں نے پہاڑی اُترنے کے بعد یہ کیا کہ سگریٹ سلگایا اور اب — کیا مذاق ہے یار، یوں کیا تک رہے ہو! جناب کافی منگوایئے اور چلیے وہیں... وہیں... منگواؤ کافی... جوشی، ایک کپ خوب گرم کافی جو جلا کر خاک کر دے... اور ایک گلاس پانی، خوب ٹھنڈا، جو جنم جنم کی جلن بجھا دے...''

راج نے ایک کپ کافی پی، پھر تینوں نے ایک ایک کپ کافی اور پی۔ تینوں خاموش تھے۔ ٹی ہاؤس میں شور بڑھ رہا تھا کہ 'ٹی ہاؤس کے لوگ باگ' آ رہے تھے، جانے پہچانے، اجنبی چہرے۔

ایک صاحب نے ان کے صوفے کے قریب سے گذرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی سے کہا:

''یہ یہاں کے typical لوگ ہیں!''

تینوں کے کانوں تک یہ بات پہنچی اور بیک وقت تینوں کے منہ سے ایک بھرپور قہقہہ سہ گنا شور سے اٹھا اور چند لمحوں کے لیے قہقہے کی گونج میں سارا ٹی ہاؤس گم سم ہو گیا۔

'ٹی ہاؤس کے لوگ' انھیں man-eater کہتے کہ کوئی وقت تھا اور یہ کوئی بہت پہلے کی بات نہیں جب تینوں شام کو کسی نہ کسی کو ذہنی طور پر torture کرتے۔ کوئی مشکل ہی سے ان کے پاس بیٹھتا، اور کوئی بھول سے پاس کے صوفے پر بھی بیٹھ جاتا تو فوراً ہی اسے اپنی بھول کا احساس ہو جاتا اور وہ بھاگ کھڑا ہوتا — اور وہ سنجیدگی سے سوچتے کہ اسٹیشن پر جا کر شکار کی تلاش کریں۔

پھر انھوں نے خود ہی یہ دھندا چھوڑ دیا۔ اور اپنے آپ ہی میں سمٹ گئے اور صفروں سے **قطع تعلق** کر کے مکمل ایک ہو گئے۔

گے لارڈ وائن شاپ سے انھوں نے دس بوتلیں بیئر کے لیے جب کاؤنٹر کلرک کو ۳۵ روپے دیے تو اس نے مسکراتے ہوئے اتنا کہا: "جگدیش صاحب، آج تو موسم ٹھنڈا ہے، آج سولن کا کچھ اور ہی رنگ ہوگا۔"

"آپ بیئر ہی دیجیے... "جگدیش نے مڑ کر کیول اور راج کی طرف دیکھا۔

"یار یہ منٹوسولن کا رسیا کیوں تھا۔ بس مجھے اس کے سارے کردار میں یہی بات اچھی نہیں لگتی۔"

"پیارے وہ تو ٹھرّا بھی پینے لگا تھا!"

"ہائے افسوس، ہم نہ ہوئے پاکستان میں، ورنہ اسے پیاسا نہ مرنے دیتے — اٹھاؤ کیول یہ تم اور راج، تم صرف دو بوتلیں، یہ بھی وزنی ہوں گی!"

پہلا پڑاؤ انڈیا گیٹ تھا۔ نیشنل اسٹیڈیم کے باہر سڑک سے ایک طرف ہٹ کر جامنوں کے پیڑ کے نیچے، کار میں بیٹھے بیٹھے انھوں نے بیئر کی بوتلوں کے کاگ اُڑائے اور بوتلیں منہ سے لگا لیں۔

"آ ہا ہا... "یخ بیئر سے کانپتے ہوئے راج کو بے پناہ لذت کا احساس ہوا:

"ہائے، میں مر جاؤں، ابھی، اسی وقت، یہیں!"

جگدیش نے ایک ہی گھونٹ میں بوتل ختم کی اور راج کی طرف دیکھا۔

"خوشی کی تکمیل موت کے ہاتھوں میں ہے، نامکمل خوشی کے اظہار کے تو کوئی معنی ہی نہیں... "اور اس نے زور سے خالی بوتل نیشنل اسٹیڈیم کی دیوار پر دے ماری اور چابی گھما کر کار اسٹارٹ کر دی۔

کیول بوتل پر پھیلے شبنم کے ٹھنڈے قطروں کو انگلی سے اپنی آنکھوں کی جھیل میں اُتار رہا تھا۔

اوکھلا موڑ سے پرے پٹرول پمپ پر جگدیش نے کار روکی اور کیول اور راج کی طرف دیکھا۔ تینوں اُترے اور بیئر کی بوتلیں اٹھائے کیبن میں چلے گئے۔ باہر کار میں پٹرول بھرا جانے لگا، اندر انھوں نے کاگ اُڑائے اور بوتلیں منہ سے لگا لیں۔

کیول نے غٹاغٹ آدھی بوتل ختم کرتے ہوئے لب کھولے:

"واقعی نامکمل خوشی کے اظہار کے تو کوئی معنی ہی نہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ خوشی کی تکمیل بھی ہو جائے تو بھی اظہار کی ضرورت نہیں۔ اظہار تو تکمیل کے متوازی ہے۔ ہائے، مزہ تو جب ہے کہ

خوشی کی تکمیل کا وقت آ جائے مگر چند سانسوں کی مہلت نہ ملے..." کیول کی آنکھیں پھیل گئیں اور چند سانسوں کی حسرت کو سمیٹ کر سنجیدہ ہو گئیں۔

راج نے کہا: "یار، عجیب چکر چلا رہے ہو تم! خوبصورت جملے کہنے کی شرط باندھ کر آئے ہو کیا؟ خوشی، تکمیل، اظہار، مہلت ——! کیا بے تکی باتیں ہیں۔ اور غم؟ ابا جان کو تو بھول رہے ہیں آپ!"

جگدیش نے پٹرول کی سلپ پر دستخط کیے، آخری جرعہ اپنے اندر انڈیلا اور کہا:

"چلو، غم کی بات نہ کرو۔ غم پٹرول ہے، بات آگ ہے، جل جاؤ گے!" کار پنجاب کی جانب بھاگنے لگی۔

کیول جگدیش کے پاس فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور راج پچھلی سیٹ پر پاؤں پسارے نیم دراز تھا۔

"جگدیش، آج بڑا مزا آیا یار۔ ہمارے ہاسپٹل میں ایک نرس ہے کملا۔ مجھ میں interested ہے اور جب سے میں بیمار ہوا ہوں، زیادہ مہربان ہے۔ رات بہت دیر تک باتیں کرتی رہی۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ اجمیر کی ہے۔ میں نے کہا، آپ رات کو افیون کی گولی پھانکیے اور دلی سے راجستھان کے کسی بھی شہر کے لیے گاڑی میں بیٹھ جایئے۔ صبح جب آپ کی آنکھ کھلے گی، آپ راجستھان میں ہوں گی، اور آپ کے منہ میں، ناک میں، آنکھوں میں، یہاں تک کہ آپ کے دل میں بھی ریت ہو گی۔ اور اگر آپ پنجاب کے لیے گاڑی میں بیٹھیں گی تو صبح جب آپ کی آنکھ کھلے گی، آپ کو ہرے بھرے کھیت لہلہاتے ہوئے نظر آئیں گے، ٹھنڈی ہوائیں آپ کو چوم رہی ہوں گی اور آپ کے دل میں عشق انگڑائیاں لے رہا ہو گا —— راجستھان بھی کیا علاقہ ہوا یار! بیچاری فنا ہو گئی!"

کیول نے اپنی بات کہی:

"یہ تو مجھے علم نہیں کہ راجستھان کوئی علاقہ ہے یا نہیں، لیکن ادھر کی ایک لڑکی سے میرے تعلقات ضرور رہے ہیں۔ جتنا جسمانی خلوص مجھے وہاں ملا ہے، کہیں اور نہیں ملا۔"

"یعنی جتنا جسمانی خلوص تمھیں وہاں ملا، اس سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے تم نے کئی اور جگہ تعلقات قائم کیے مگر مایوس ہوئے —— خلوص نہ ہوا راشن ہوا۔ کیول صاحب، میں نے صبح ہی عرض کیا تھا کہ آپ جسم کی لذت کے عادی ہیں، جیسے درندے خون چکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔"

جگدیش نے کیول کو پکڑا۔

کار پنجاب کی حد میں داخل ہوئی تو راج نے گہرا سانس لیا اور جگدیش نے رفتار بڑھا دی۔
کیول نے کہا:
''پرتاپ سنگھ کیروں کے راج میں سڑکیں لاجواب ہیں۔ کالی، چکنی، دکن کی پہاڑی لڑکی کی پنڈلیوں کی طرح!''
پہلا سنگ میل آیا تو جگدیش نے کار سڑک کے کنارے روکی۔ سنگ میل کے برابر پیلے سے بورڈ پر بڑے بڑے لفظوں میں لکھا ہوا تھا:

Life is short,

Do not make it shorter.

راج نے بوتل منہ سے ہٹائی اور کہا:
''یار، ایک طرف تو اتنی خوبصورت سڑکیں بنوا کر یہ سردار تیز رفتاری کی ترغیب دیتا ہے اور دوسری طرف ہر سنگ میل پر یہ نیم حکیموں کی طرح کا اشتہار لگا کر زندگی کا قاعدہ پڑھاتا ہے... یہ تضاد کتنا واہیات ہے!''
''واقعی یار، یہ خوب ہے!''
''لکھا یہ ہونا چاہیے:

Life is short,

Make it shorter and beautiful."

راج نے کہا:
''لوگ ہر سے مسلے جانے کا خوف دل میں سنبھالے چیونٹی کی رفتار سے زندگی گزارتے ہیں اور ہر سانس کے ساتھ ان کی درازیِ عمر کی تمنا بھی بڑھتی جاتی ہے۔ خدا کی قسم، زندگی لطیفہ بنتی جا رہی ہے۔ کبھی کسی کے من میں عقاب کی سی تیزی سے آسمانوں کی بلندیوں میں گم ہو کر زندگی گزارنے کی خواہش پیدا ہی نہیں ہوتی — جی چاہتا ہے ساتوں آسمانوں کو چیرتا ہوا خلاؤں میں گم ہو جاؤں اور جب تھک جاؤں تو نڈھال ہو کر گر پڑوں اور پھر نہ اُٹھ پاؤں۔''
''جانِ من، جانتے ہو کہ عقاب آسمانوں کی بلندیاں سر کرنے کے بعد نڈھال ہو کر جب زمین پر گرتا ہے تو کتے اس کی بوٹیاں نوچتے ہیں۔''
راج نے پھر کہا:
''مگر اس سے تک جب تک کہ میرا دل دھڑکتا ہے، میں کتوں کی سوچ کی اُڑان سے بھی

بلندیوں پر بسیرا کرنا چاہتا ہوں۔ ذہن کی موت کے بعد ذہن کی لاش سے زنا بالجبر ممکن نہیں، مگر جسم... یہ المیہ ہے... یہ بھیانک تضاد ہے کہ زندگی میں جو آپ کو touch نہ کر سکے، موت کے بعد آپ کا جسم اسی کا محتاج ہو۔ غالب کی خواہش کہ نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا، ایک متوازن ذہن کی خواہش ہے!''

جگدیش نے اتنا کہا:

''زندگی کی شمع کو دونوں طرف سے روشن کیا جائے تو زندگی محسوس کی جا سکتی ہے، ورنہ تو جیو، جیو، نہ جیو، ایک ہی بات ہے۔'' اور اس نے زور سے کار ہوا کے دوش پر چھوڑ دی۔

کیول نے سنجیدگی سے کہا:

''ہٹاؤ یار، کیا سنجیدہ باتیں لے بیٹھے ہو۔''

راج فوراً بولا:

''کیا کہنے ہیں جناب کیول کرشن ایم. اے. کے۔ یعنی ہم سنجیدہ باتیں کر رہے تھے۔ حضور، جب رات کو موت آپ کا دروازہ کھٹکھٹائے، اسے کہیے گا کہ ابھی میں ۲۵ سال کا ہوں، پانچ سال بعد آنا، اور جب پانچ سال بعد موت آپ کے پڑوس میں جانے لگے، تو بلا کر کہیے گا، بڑی بی، اُدھر کہاں، اِدھر — سنجیدہ باتیں ایسی ہوتی ہیں۔''

جگدیش نے کہا:

''سالو، کچھ نشے کی بات بھی کرو، تین تین بوتلیں چڑھا گئے ہو اور زبان میں لکنت تک کا نشان نہیں!''

فرید آباد سے انھوں نے دس بوتلیں اور خریدیں اور وہیں دُکان پر ایک ایک بیئر اور چڑھائی اور پھر چل پڑے۔

فرید آباد میں غیر آباد سڑک کے کنارے جگدیش نے کار روک دی اور تین بار چند لمحوں کا وقفہ دے کر ہارن بجایا۔

سامنے بہت بڑا بنگلہ تھا جس کی چھت ایسی تھی جیسے عقاب پرواز کے لیے پر تول رہا ہو۔ انھیں اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر وہ جب بھی اس طرف سے گزرے، انھوں نے ہمیشہ اس بنگلے کو جی بھر کر دیکھا اور سراہا — بنگلہ ویران پڑا تھا، صرف چوکیدار تھا جو وہاں رہتا تھا اور جس سے انھیں علم ہو چکا تھا کہ بنگلے کا مالک سان فرانسسکو میں رہتا ہے۔ ان کی تمنا اس شخص سے ملنے کی تھی جس نے زندگی کے لحاتی حسن کو اس بنگلے میں ڈھال کر ان کے تصور کو چھو لیا تھا۔

جگدیش نے کہا:

''اس شاہکار کے خالق کو Howard Roark ہونا چاہیے۔''

ہارن کی آواز سن کر چوکیدار ان کے قریب آیا اور فوراً ہی اس نے کہا:

''بابو جی، ہمارے صاحب آ گئے ہیں اور صرف دو دن کے لیے آئے ہیں اور وہ ابھی اسی سڑک پر کار میں گئے ہیں۔ ان کی کار کا نمبر DLB-1304 ہے۔''

جگدیش نے کار کو تیزی سے سڑک پر چھوڑ دیا۔

کیول اور راج خاموش تھے۔ کیول نے بوتلیں پھر کھولیں اور بانٹ دیں۔

جگدیش نے ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ تھاما اور دوسرے ہاتھ سے بوتل منہ سے لگالی۔ اور یہ بڑا گھونٹ بھرا۔ گھونٹ اس کے حلق سے ٹکرایا اور اس کے پاؤں ایکسیلیٹر پر جم گئے۔ کار سڑک کی چھاتی چھیلتی ہوئی رُک گئی۔

''کیا ہوا؟'' کیول نے پوچھا۔

''یار اندھیرا آگیا سامنے۔''

اور یہ کہہ کر پھر جگدیش نے کار کو ۵۰ کی رفتار سے چھوڑ دیا۔ راج بے خبری سے چسکیاں لے رہا تھا اور مست تھا۔

سامنے کوئی کار نظر نہیں آ رہی تھی۔ اور ہر سنگِ میل پر پرتاپ سنگھ کیروں کے زندگی کے قاعدے کا ایک ورق تنبیہ کے لیے کھڑا تھا، اس لیے جگدیش ہر سنگ میل پر رفتار بڑھا دیتا۔

''جگی۔'' راج نے پوچھا۔

''شٹ اَپ۔''

''پیارے جیمز ڈین۔''

''نہیں، پرنس علی خاں۔''

''نہیں البیئر کامیو۔''

''شٹ اَپ — شٹ اَپ۔''

''جگی!''

''دیکھو... میری نظروں میں اندھیرا چھا رہا ہے اور مجھے وہ کار نظر نہیں آ رہی ہے... کیول! وہ دور کچھ نظر آ رہا ہے تمھیں!''

نہیں، مجھے تو مزا آ رہا ہے۔''

''راج—''

''یار! میں نے یہ کیا کیا...''

''کیا؟''

''کہ آج پھر میرا جی چاہتا ہے رونے کو۔''

''کیول!''

راج نے جگدیش کی جانب دیکھا اور کہا:

''جگی! دیکھو ادھر۔''

کار نوے کی رفتار سے چل رہی تھی۔ جگدیش نے دیکھا اور تینوں مسکرا دیے۔ راج نے کہا:

''یار، ابھی ذہن کی رفتار غالب ہے۔''

کیول نے کہا:

''شٹ اُپ۔''

جگدیش نے کہا:

''اچھا!''

اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، اس کا ذہن پہیوں سے زیادہ تیزی سے گھومنے لگا۔

''رفتار... زندگی... موت... چیونٹی... جسم... آگ...''

''جگد... ی...'' کیول چیخا۔

مگر اُس کی چیخ بھیانک شور میں گم ہوگئی۔ پھر چند لمحوں کے بعد کچھ لوگوں نے سنسان، ویران سڑک پر چکنا چور کار اور دل ٹوٹے ہوئے دیکھے۔

OO

('ہم قلم'، کراچی: ۱۹۶۳ء)

لمحوں کا غلام

موقع پا کر اس کے ماموں نے سنجیدگی سے کہا:
''دُنیا کی تمام وسعتیں تمھارے ذہن میں سمٹی ہوئی ہیں۔ تمھارا دل... تمھارا دل وقت کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکتا ہے اور تمھاری آنکھیں ریا کے دبیز پردے چیر کر حقیقت دیکھ لیتی ہیں۔ مگر دوست! تم پھر بھی منفی کردار سے ہو کر رہ گئے ہو۔ تمھارے پاس ذہانت کے خزانے تو ہیں مگر کردار میں ارادے کی پختگی نہیں۔ تم اَن گنت دوستوں کی اُمید ہو مگر... مگر تم...''

راہی اور اس کا ماموں قریب ہم عمر تھے۔ دونوں میں رشتے کا کوئی تکلّف نہیں تھا۔ ایک زمانے کے بعد دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ راہی کی غیر متوازن حالت اور روز مرّہ کی آوارگی کے پیشِ نظر اس کے ماموں کو یہ سب باتیں کہنی پڑیں جو راہی کی طبیعت کے یکسر خلاف تھیں۔

جب اس کا ماموں جذبات کی رو میں بہہ گیا اور اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا تو راہی کو دھچکا سا لگا۔ اس نے یہ بات شدّت سے محسوس کی کہ اس کے ماموں کی باتیں ریاکاری نہیں ہیں مگر اس کی طبیعت شروع ہی سے جھلائی ہوئی تھی جس کے تیز دھارے کو روکنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

''امر ماموں جان...'' اس نے 'امر' کے ساتھ 'ماموں جان' کو غیر ارادی طور پر جوڑ دیا تھا اور اسی لیے وہ ٹھٹکا بھی مگر فوراً ہی اسے اپنے غیر ارادی فعل سے تسلی ہوگئی کیونکہ وہ ایسی ہی سٹپٹاہٹ ظاہر کرنا چاہتا تھا جس کا حامل لفظ 'ماموں جان' اس وقت ہوا تھا۔ اب اس نے اطمینان سے بات آگے بڑھائی۔

''میں جیسا ہوں ٹھیک ہوں۔ یہ کیا کم ہے کہ جی رہا ہوں۔ تم نے مجھے میری منتظر عظمت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ یہ دراصل تمھارے اپنے کھوکھلے ہونے کا ثبوت ہے۔ عظیم لوگوں کا کردار ہمارے ایسا نہیں ہوتا۔ خیر، اگر ایسا ہو بھی تو میں سمجھتا ہوں، تمھاری بات کے پس پردہ یہ جذبہ کام کر رہا ہے کہ کل میرے ادبی شخصیت ہونے کے بعد تم ڈھنڈورہ پیٹ سکو کہ تم میرے ماموں ہو!''

راہی کے جواب کی تلخی، امر نے شدت سے محسوس کی۔ اسے علم تھا کہ اس کی باتوں سے راہی کو اپنے عمل کے فقدان کا احساس ہوگا اور وہ جھلا کر کڑوی باتیں کرے گا۔ امر نے پھر سنجیدگی سے کہا:

''تم نے میری بات کا جواب جان بوجھ کر اوٹ پٹانگ دیا ہے۔ میں پھر کہوں گا، تم اپنے کردار میں سے ارادے کی کمزوری نوچ پھینکو اور کچھ... کوئی سا بھی... ٹھوس کام کرو...''

راہی پر ماموں کی باتوں کا تو رتی بھر اثر نہ ہوا البتہ اس کے ماموں کے لہجہ میں جو شدید سنجیدگی اور ملال کا بھرپور رچاؤ تھا، اس نے اسے ڈانوا ڈول سا کر دیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ واقعی غلط راہ پر جا رہا ہے اور اس پر اسے پیار کرنے والے دوست تک آوازے کس رہے ہیں۔ اس نے کوشش کی کہ اس کے جذبات کا علم اس کے ماموں کو نہ ہو جائے۔ اس نے بیزاری کا احساس ظاہر کرنے کے لیے تھکی تھکی سی انگڑائی لی اور زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ ماموں سے کہا:

''چھوڑو یار! کیا بکواس لیے بیٹھے ہو۔''

اس رات اس کا ماموں تو چلا گیا مگر راہی کے دل میں چبھن سی چھوڑ گیا۔ اس کی ذہنی اُلجھن بڑھ گئی تھی۔ اسے آنے والے جاں کن لمحات کا بچھا ہوا جال دکھائی دے رہا تھا۔ اسے رات کاٹنی مشکل دکھائی دے رہی تھی۔ جب اسے اور کچھ نہ سوجھا تو اس نے اپنا قلبی سکون متوازن کرنے کے لیے ماموں کی باتوں کا تجزیہ کرنا شروع کر دیا۔

''دنیا کی تمام وسعتیں میرے ذہن میں کھٹی ہوئی ہیں... ہاں، میں عام لوگوں سے ذرا ہٹ کے سوچ سکتا ہوں، رائے قائم کر سکتا ہوں اور فیصلہ بھی کر سکتا ہوں— میرا دل وقت کی دھڑکن کے ساتھ دھڑکتا ہے— ٹھیک ہے، میں نے کبھی کسی سے فریب نہیں کیا، جھوٹ نہیں بولا۔ اس لیے مجھے کسی کا خوف نہیں۔ ماموں کہتا تو سچ ہے۔ میں نے دو تسلی بخش کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ میں اپنی زندگی کو کام میں لا سکتا ہوں— خیر، اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ میرے کردار میں ارادے کی کمزوری ہے، نہیں تو میں، مگر ارادے کی کمزوری کا سبب؟— ہاں میری حد سے بڑھی ہوئی قبولیت کی حس— تو اس حس کی حد مقرر کرنا پڑے گی اور کردار کی مضبوط دیوار کھڑی کرنا پڑے گی— تو کل سے— مگر ابھی یہ گھڑا بھرا نہیں ہے، پھوٹے گا کیسے؟— کل اس گھڑے کو بھر کر زندگی کے چوراہے پر پھوڑ دینا چاہیے۔ تو کل زندگی میں آخری بار جوا، شراب، آوارگی، تمام الو کے پٹھوں کا ساتھ، عیاشی اور پھر کردار کی کمزوری کی موت اور زندگی کا نیا سفر...''

ماموں کی باتوں کے تجزیے نے اس میں نئی اُمنگ پیدا کر دی۔ اسے اپنی لغزشوں کو ٹھکانے

لگانے کا جواز مل گیا تھا اور اب وہ کمر کس چکا تھا کہ اپنی آوارہ طبیعت کا جنازہ دھوم دھام سے اُٹھائے — اور تھوڑی ہی دیر بعد اسے قریب قریب نشے کے عالم میں نیند آ گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی، اس وقت وہ خود کو تازہ دم پا رہا تھا اور اس میں نئے عزم کا خون دوڑ رہا تھا۔ معمول کے خلاف ٹھنڈے پانی سے نہا کر اس نے تنخواہ کے بچے ہوئے ستاون روپوں میں سے پچاس روپے جیب میں ڈالے اور لیبارٹری چل دیا۔ سات روپے وہ تمام مہینے کے لیے چھوڑ گیا تھا اور پچاس روپے وہ اپنی لغزشوں پر صرف کرنے اور نئے عزم کی بھینٹ چڑھانے لے چلا تھا۔ اسے اپنا یہ قدم ایک نیکی کا قدم محسوس ہو رہا تھا۔ مگر اس نے اس خیال پر 'آخری بار' کی مہر لگا کر خود کو تسلی دی۔ اپنے فلیٹ سے لیبارٹری تک اس کے دل میں صرف ایک جذبہ پل رہا تھا۔ ٹی بی اسپتال کے لیے بے پناہ نفرت کا جذبہ۔

''ذلیل جگہ، ذلیل لوگ — سوا سو روپے تنخواہ اور دق کے کیڑوں کے حملے کا ہر وقت خطرہ۔ سوا سو روپے تو صرف دو کہانیوں کا معاوضہ ہیں — خیر، کوئی بات نہیں، دق پر ایک عظیم کہانی لکھوں گا۔ اور اس طرح اسپتال میں گنوائے ہوئے جوانی کے چار سالوں کو کام میں لاؤں گا۔ اور ہاں، دق پر کوئی عظیم کہانی بھی تو نہیں ہے اپنے ہاں اُردو ادب میں۔''

باپ کی موت کے بعد جب اسے غیر متوقع طور پر ٹی بی اسپتال میں لیبارٹری اسسٹنٹ کے طور پر نوکری مل گئی تو اسے اس کے ایک شاعر دوست نے کہا تھا:

''راہی، زندگی دیکھنے اور پرکھنے کے لیے دنیا میں جیل اور سینے ٹوریم سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں۔ تم خوش قسمت ہو۔ تمھاری تحریر میں دھار آ جائے گی۔'' مگر چار سال میں جیسے راہی دق کا مریض ہو گیا ہو۔ بہت سے اور دوسرے دوست اس شاعر دوست سمیت اسے رو پیٹ چکے تھے۔

اب راہی کو احساس ہوا کہ اس نے ٹی بی اسپتال میں واقعی جوانی کے چار سال ضائع کیے ہیں مگر اس نے فوراً ہی خود کو تسلی دی کہ یہ چار سال تو اس بنیاد کے کام آئیں گے جس پر وہ دق پر ایک بہت بڑا افسانہ تعمیر کر سکے گا۔ اس تسلی نے اس کے عزم میں ایک لمحے کے لیے مضبوطی پیدا کر دی مگر دوسرے ہی لمحے اس کے ذہن میں خود اس کے اپنے کردار کا دوسرا رُخ چیخنے لگا کہ یہ محض طفل تسلی ہے اور وہ کانپنے لگا اور اپنے آپ سے پناہ مانگنے لگا۔

جب وہ اپنے ذہن میں متفرق خیالات کے ٹکراؤ سے پاگل پن کی حد تک جا پہنچا، اس وقت اسے اپنے ہی لاشعور میں جگہ ملی۔ یہ اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ جب اسے اپنے آپ سے شکست کا سامنا کرنا پڑتا تھا، اس وقت اس کا لاشعور اس کے آڑے آ جاتا تھا۔ اسے پختہ یقین ہو گیا کہ اس

نے جوانی کے چار سال دق کے اسپتال میں گنوائے نہیں کیونکہ وہ تو دق پر بہت بڑا افسانہ لکھ چکا ہے۔ افسانے کا عنوان ہے 'سینے ٹوریم' اور اس کی نگاہوں کے سامنے سینے ٹوریم کے کردار میک لوڈ، کمپ بل اور ڈاکٹر رقص کرنے لگے۔

ایک زمانے کی بات ہے جب اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کی زندگی کا حاصل ادبی مقام ہے۔ ان دنوں اس میں واقعی نشے کی حد تک جوش تھا اور اس نے دو کہانیاں — ایک نئے ادیب کی کہانیوں سے قطعی مختلف — لکھی بھی تھیں جن کا اچھا خاصا چرچا بھی رہا۔ مگر پھر اس کے بعد اس کا کردار بڑے ادیبوں کی ذاتی زندگی کی لغزشوں کا احاطہ کرنے لگا اور وہ صرف فلاش، سولن، آوارگی اور عیاشی کا ہو کر رہ گیا۔ کبھی کبھی کسی خاص وقت میں جب اس کے ذہن میں متفرق خیالات کے ٹکراؤ کے وقت صحت مند جذبہ حاوی ہو جاتا تو اسے احساس ہوتا کہ وہ اپنی زندگی کو جو اس کی اپنی نہیں بلکہ پورے سماج کی ہے، ذبح کر رہا ہے اور یوں خیانت کر رہا ہے کہ اس کا لاشعور فوراً اس پر نشے کی چادر اوڑھا دیتا تھا اور وہ اپنے محبوب فنکاروں دستوئیفسکی، موپاساں، مام، منٹو — ان سب کی تخلیقات کو اپنی سمجھ کر ذہنی طور پر تخلیق کے جذبے سے غیر حاضر ہو جاتا تھا اور یوں زندہ تھا ورنہ اس قسم کے مختلف اور شدید احساسات کے ساتھ تو ایک جسمانی طور پر ہڈیوں کا ڈھانچہ ریل کی پٹری پر ابدی نیند سو سکتا ہے — لیبارٹری جاتے ہوئے جو تصادم اس کے ذہن میں ہوا تھا اس کی تلخی سے اس کے لاشعور نے مام کی کہانی 'سینے ٹوریم' کو اس کے سامنے رکھ کر اسے بچایا تھا۔

لیبارٹری پہنچتے پہنچتے اس کے من میں 'سینے ٹوریم' کی بے حد مقبولیت نے نشہ طاری کر دیا تھا اور اسپتال کے لیے جو نفرت اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی وہ یہ موڑ مڑ گئی تھی کہ وہ اتنا بڑا عالمی شہرت کا افسانہ نگار اس ذلیل جگہ پر ان ذلیل لوگوں کے درمیان خودکشی کر رہا ہے۔ اس طرح زندگی کے عزم کا جذبہ خودکشی کے احساس سے اور اسپتال سے نفرت کا جذبہ اپنے بڑے افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے قائم رہا۔

لیبارٹری پہنچ کر اس نے سینئر لیبارٹری اسسٹنٹ پرکاش کو کمتر سا آدمی سمجھتے ہوئے روکھے سے لہجے میں پوچھا:

''گھوش کمرے میں ہے؟''

پرکاش کے لیے راہی کا یہ لہجہ بالکل نیا تھا۔ وہ بے چارہ کنوئیں کے مینڈک قسم کا آدمی گھبرا سا گیا۔ اس نے جواب دیا:

''ڈاکٹر صاحب کمرے ہی میں ہیں۔''

پرکاش کو وہیں متحیر سا چھوڑ کر راہی پیتھولوجسٹ کے کمرے میں وقار سے داخل ہوا اور ہر طرح کے دفتری آداب اور لحاظ کو بالائے طاق رکھ کر ڈاکٹر گھوش سے کہنے لگا:

''گھوش! میں آج شام کو نہیں آسکوں گا۔'' اس کے لہجے اور جملے میں گریڈ کی کمی کا احساس نہیں تھا۔ وہاں تو برتری بول رہی تھی۔

اور یہی بات ڈاکٹر گھوش کو کھا گئی۔ مگر گھوش، ٹیگور کا پجاری، اتنا سمجھ گیا کہ راہی غیر معمولی جوش میں ہے۔ اس نے اپنے بنگالی لہجے میں صرف اتنا پوچھا:

''کیوں؟ —'' مگر اتنا پوچھ کر بھی اسے خدشہ محسوس ہوا اور اس کا خدشہ درست تھا۔ راہی کی آنکھیں پھیل کر گھوش کے چہرے پر ٹک گئیں۔

''یہ تمھاری سمجھ سے باہر ہے۔ کیونکہ تم... تم۔'' ایک لمحے کے لیے راہی رُکا۔ پھر بڑی خطرناک مسکراہٹ کے ساتھ کہنے لگا:

''تم گھوش، جون ماسٹرز کو پڑھتے ہو اور سر دھنتے ہو۔ ٹیگور کو تم نے محض صوبائی عقیدت کی وجہ سے پڑھا ہے اور پھر ٹیگور نے کون سا تیر مارا ہے، غریب کھچڑی بن کے رہ گیا تھا۔ تم صفر ہو گھوش۔'' تمام بڑے ادیب راہی کی آواز میں بول رہے تھے۔

گھوش کو اپنے خدشے میں اتنے بڑے بم کے پھٹنے کی توقع نہیں تھی۔ اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اب تک تو وہ راہی کا باس تھا اور پھر ٹیگور کی تضحیک نے اس کے صوبائی تعصب کو ابھار دیا۔ وہ بوکھلا گیا۔

''راہی! تم کو بات کرنا نہیں آتا۔ تم مینرز نہیں جانتا۔ سیدھا ہو اور بات کرو۔ یہ تم زور زور سے ہاتھ کیوں ہلاتے ہو۔'' اس کی بوکھلاہٹ راہی کے شدّت جذبات سے حرکت کرتے ہوئے ہاتھ ہی دیکھ سکی۔

راہی نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور کہا:

''گھوش! تم کو علم نہیں۔ نفسیات کی روشنی میں بات کے ساتھ ہاتھوں کی غیر شعوری حرکت کیا معنی رکھتی ہے — ہمارے کرشنا مینن کے ہاتھ — جنرل اسمبلی میں کشمیر کا کیس رکھتے وقت نہ صرف ہاتھ ہلتے تھے بلکہ اس کا جسم ناچ کی حد تک حرکت کرتا تھا۔''

اور راہی یہ سوچتا ہوا ''چلو آج آخری بار اِس لعنت سے بھی نپٹ لیا'' گھوش کے کمرے سے باہر آ گیا۔

مین لیبارٹری میں پہنچ کر راہی کرسی پر اپنی پہلی فتح پر شاداں سا بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ایک

ساتھی ارجن کو کہا کہ وہ اس کے حصے کا تمام کام کردے کیونکہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ گھوش کی درگت نے ارجن پر اس قدر اثر کیا تھا کہ وہ اس وقت راہی کا کوئی بھی کام ہوتا، ضرور کرتا — بارہ بجے تک راہی اسی کرسی میں دھنسا رہا — وہ سوچ رہا تھا کہ رات تک اس کے کردار کی مٹی سے بنا ہوا کمزور گھڑا اس کی لغزشوں سے لبالب بھر جانا چاہیے اور اسے بہرصورت زندگی کے چوراہے پر پھوڑ بھی دینا چاہیے — بارہ بجے لیبارٹری بند ہوئی تو سبھی لیبارٹری اسسٹنٹ پیتھولوجسٹ کے آرام دہ اور محفوظ کمرے میں بیٹھ گئے اور دل ہی دل میں اپنی محبوبہ فلاش کو پرچانے لگے۔

راہی بھی خاموش سا، فلاش کی سنگینی کا بھرپور تاثر لیے ایک کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ روشن نے تاش پھینٹ کر پتے بانٹ دیے۔ راہی نے بے سدھی کی حالت میں دس کا نوٹ میز کے درمیان پھینک کر اٹھنی کی بلائنڈ چال چل دی۔ اور اپنے ساتھی جواریوں کو چھید کر دینے والی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا — اس کے قریب روشن بیٹھا ہوا تھا، جو فلمی پرچوں میں فلمی تبصرے پڑھ کر فلموں پر اپنی رائے کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کے سامنے 'ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور، کھانے کے اور' کا اشتہار بنواری بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے قریب جاتے ہی بدبو کے بھبکے سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ ایک اور طرف سادھو تھا، رام پور کا غنڈہ جس کی غنڈہ گردی اونچا بولنے اور اپنا گریبان کھلا رکھ کر ریچھ کے سے بالوں کا مظاہرہ کرنے تک محدود تھی۔ اپنے اِرد گرد رہتے ہوئے کیڑوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے انھیں گالی دی جو اس کی زبان تک آ کر ہی رہ گئی:

''سالے خون کے لوتھڑے۔ فلاش کھیل رہے ہیں۔ محض جیتنے کے لیے۔ ان کو علم نہیں کہ فلاش کی عظمت تو اس احساس سے ہے جو پتوں کی آمد سے دل کی دھڑکنوں کی بلندی اور پستی سے ہوتا ہے۔ کبھی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے دل چھاتی چیر کر باہر آ نکلے گا اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی اور زندگی کی گاڑی یہیں کی یہیں رُک جائے گی۔ ان دھڑکنوں کی کوئی قیمت ہے بھلا؟ ان غریبوں کو کیا علم کہ دستوئیفسکی نے جوئے کی لذت کے لیے کرب کے کتنے مراحل طے کیے ہیں —''

جب چال چلنے کی اس کی باری آئی تو پوچھنے پر اسے معلوم ہوا کہ روشن اور سادھو ایک ایک چال چل چکے ہیں۔ اس نے سادھو کی طرف گھور کر دیکھا اور اسے علم ہو گیا کہ سادھو کے پاس زیادہ سے زیادہ دو بادشاہ ہیں۔ کیونکہ اسے، سادھو کی آنکھوں میں پتلیوں کی غیر معمولی حرکت دکھائی دی جو اس کی اطمینان بخش حالت کو کم، غیر اطمینان بخش حالت کو زیادہ عیاں کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر سادھو کے پاس تیسرا بادشاہ بھی ہوتا تو سالے پر فالج گر پڑتا۔ روشن کے پاس اس کے

تجربے کے مطابق سادھو سے بھی چھوٹا جوڑا تھا۔

اس نے اپنے دل کی دھڑکن کو ہتھوڑے کی چوٹ کی طرح محسوس کیا اور آہستہ آہستہ اپنے پتے دیکھنے شروع کیے: ''حکم کا یکہ — غلام اور تیسرا پتا، دھت تیرے کی، اینٹ کی اٹھی — خیر!'' اس نے دل میں کہا اور بڑھ کر ایک روپے کی جھوٹی چال چل دی۔ سادھو نے بھی ایک روپیہ ڈال دیا۔ اور روشن اپنی اوقات کے مطابق بھاگ گیا۔ راہی نے چال دو روپے کی اور سادھو کی بھی اوقات ظاہر ہوگئی — اور راہی نے اپنی جھوٹی چال کے پتے سادھو کے منہ پر دے مارے اور یہ کہتا ہوا کہ تم ذلیل کتوں نے اتنی عظیم گیم کو بدنام کر رکھا ہے، کمرے سے باہر نکل گیا۔ لیبارٹری سے رام لال وارڈ کی طرف جاتے ہوئے اسے اسٹاف نرس جے دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی جے کا رنگ کافور ہوگیا۔ راہی نے بے نیازی سے اس کی طرف دیکھا اور دل میں کہا:

''مجھے بخار ہی تھی اور جب بہت سے لوگ اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے گئے ہیں تو اسے افسوس ہو رہا ہے کہ کاش میں راہی کی سنجیدگی سے نہ کھیلتی۔ اچھا ہے۔ یہ جذبہ اسے زندگی بھر ستائے گا، مگر میں اسے اب گردِ راہ سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔'' یہ سوچتا ہوا وہ رام لال وارڈ کے برآمدے میں سے ہوتا ہوا اسپتال سے باہر نکل گیا۔

اسپتال سے باہر ملک راج کی دُکان تھی۔ راہی نے ملک راج کو بھی گالی دی۔

''ذلیل بنیا...'' ملک راج کو اس نے دس روپے کا نوٹ دیا اور کہا:

''نو روپے جو میں نے تم سے لیے تھے اور نو آنے سُود... باقی کے سات آنے تمھارے جوتوں کی مرمت کے لیے۔''

کنگز وے سے اسکوٹر لے کر وہ چاندنی چوک میں ہما چل ریستوراں میں پہنچا۔ بیرے نے اسے دیکھتے ہی کہا:

''صاحب! ابھی آپ کا کوئی دوست نہیں آیا۔''

''مگر میں ان ذلیل ادیبوں سے کہاں ملنے آیا ہوں۔'' وہ انتہا پسند ہوتا جا رہا تھا — ''مگر میں تو ان ہی سے ملنے... نہیں ان ذلیل ادیبوں سے نپٹنے آیا تھا... اچھا سنو تم...'' اس نے بیرے کو کہا: ''دیکھو! وہ لوگ، وہ لمبا سا، ترقی پسند کلوٹا جو سپاہیوں کا اوورکوٹ پہن کر آتا ہے اور وہ بناوٹی گھنگریالے بالوں والا پہلوان سا اور وہ سب چو ہے... تم ان سے کہنا کہ میں آیا تھا — اور یہ بھی کہنا کہ وہ سب ذلیل ہیں۔ ان میں کسی کو ادب کے ہجے بھی نہیں آتے۔ سالے ایم۔ اسلم کے شاگرد...'' اور راہی کو زور کی ہنسی آ گئی: ''ایم۔ اسلم کے شاگرد! چلو اچھا ہوا یہ علم تو ہوگیا کہ سالوں

کی اڑان ایم. اسلم تک ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ کناٹ پلیس میں تھا، چند لمحوں کے بعد وہ جن پتھ پر کافی ہاؤس میں تھا۔

اب وہ انتہا کی تمام سیڑھیاں چڑھ کر جنون کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ سگریٹوں کا سلسلہ بندھ گیا تھا۔ کافی کی حد سے زیادہ مقدار نے اس کے ذہن کو خشک کر دیا تھا۔ پاؤں شل ہو گئے تھے اور ابھی شراب کی لغزش باقی تھی۔

ابھی وہ سولن کے پوّے کو جیب میں ٹھونس رہا تھا کہ پانٹی نے اس کے کندھے پر زور سے دھپا مارا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی جنونی کیفیت زائل ہو گئی۔

"پانٹی... الّو کے پٹھے... آج میرے راستے میں نہ آؤ۔ تم ذہین آدمی ہو، تمھاری رائے کا میں احترام کرتا ہوں مگر میں آج لغزشوں کے دریا میں بہہ رہا ہوں اور دہانے کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ تم سے کل نئی دنیا میں ملاقات ہو گی۔"

پانٹی حیران تھا مگر یہ سب غیر ممکن نہیں تھا۔

راہی نے شراب اپنے ایک غیر ادیب دوست رام رتن کے کباڑ خانے میں پی۔ شراب پی کر جب اس نے کباڑ خانے کا دروازہ کھولا۔ اس وقت اس کا جسم مفلوج تھا اور اس کی بینائی قریب قریب دھندلی تھی۔ صرف اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں ایک روشنی کی کرن تھی جو اسے لغزش کی حد تک سنبھالے ہوئے تھی۔

رام رتن کی دُکان کے باہر اس کی جگدیش سے بھینٹ ہو گئی۔ جگدیش اس کا سب سے عزیز دوست تھا۔ اس نے جگدیش کو آنکھیں پھاڑ کر پہچانا اور پھر اس کا جنون بکنے لگا:

"دوستی کی لاش کھانے والے گدھ، میری ماں کے علاج کے لیے تمھارے پاس پانچ سو روپے نہیں تھے اور کار خریدنے کے لیے ہزاروں روپے تھے۔ ہٹ جا... ہٹ جا... ہٹ جا میرے راستے سے..." وہ اتنی زور سے چلایا کہ لوگ اکٹھے ہو گئے مگر راہی وہیں بے ہوش ہو کر گر گیا۔

جگدیش نے اسے بازوؤں پر اُٹھایا، کار کی پچھلی سیٹ پر پٹکا اور گھر پہنچا آیا۔

بہت رات گئے راہی کو چارپائی پر نیم بیداری کی حالت میں اپنے کئی رُوپ دکھائی دیے۔ نالی میں اوندھے منہ لیٹا ہوا شرابی، ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا شرابی، آوارہ گردی کرتا ہوا دھوبی کا کتا۔ وہ کرب سے تڑپنے لگا جیسے وہ کیلوں، شیشوں، کانٹوں، ہڈیوں کے بستر پر دراز ہو۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ گھبرا کر اس نے بتی روشن کی۔

وہی کمرہ تھا۔ دیواروں پر اسی طرح دستوئیفسکی کی غمگین سی تصویر تھی۔ منٹو کی بے چین

آنکھیں تھیں۔ بیدی کا زندگی سے چھلکتا ہوا فلک شگاف قہقہہ۔ اسے خیال آیا کہ وہ سب ادیب زیرِ لب کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس کے دل اور دماغ نے متفقہ طور پر اس کی تصدیق کر دی۔ وہ کہہ رہے تھے:

''تم ہمارا سب کا ملا جلا چربہ ہو— ہماری کمزوریوں کو اپنا کر تم کمزوریوں کا پلندہ بن گئے ہو— بے حسی کے خون میں لتھڑا ہوا پلندہ— ہمیں تم سے نفرت ہے۔ تم ذلیل کتے ہو۔''— راہی گھبرا گیا اور زور سے چلا پڑا:

''میں نے اپنے کردار کی کمزوری کا گھڑا پھوڑ دیا ہے... پھوڑ دیا ہے... پھوڑ دیا ہے...''

نئے عزم کے ساتھ وہ رات بھر جاگا کیا۔ اپنی زندگی کے البیلے کو کریدتا رہا اور آخر صبح صبح اپنی نئی زندگی کی بکھری ہوئی ناکامیوں کو ترتیب دے پایا اور اس اُمید پر کہ اب تخلیقی کام کا دور شروع ہو رہا ہے، سو گیا۔

دوپہر کو بارہ بجے کے قریب وہ لیبارٹری گیا۔ بڑے اطمینان کے ساتھ۔

پیتھولوجسٹ کے کمرے میں اس کے ساتھی فلاش کھیل رہے تھے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دماغ ماؤف ہو گیا۔ آنکھیں چندھیا گئیں، پاؤں میں لرزش آ گئی۔ کردار کی کمزوری عود کر آئی اور اس کے لاشعور نے اس کے کان میں چپکے سے کہا:

''پگلے، اپنے احساسات پر پابندیاں لگا کر ارتقا کے راستے روکنا چاہتا ہے...'' اور راہی اپنے آپ سے بے خبر فلاش میں مشغول ہو گیا۔

○○

('تحریک'، دلی: ۱۹۵۹ء)

انٹروورٹ

کوئی کمی تھی کہ نہیں، کون جانے؟ شاید تھی جبھی تو میں اس کے بارے میں سوچتی رہی، سوچتی ہی نہیں رہی، شاید محسوس بھی کرتی رہی۔

پہلی بار جب میں نے اسے دیکھا، وہ لیبارٹری کے لان میں، کرسی کی پشت پر سر ٹیکے، ٹانگیں پسارے، نیم دراز تھا۔ میں اس کے قریب سے گزری مگر وہ پلکیں گرائے، جوں کا توں بے سدھ پڑا رہا۔ اس سے پہلے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

دوسرے دن صبح لیبارٹری کے سامنے سے گزرتے ہوئے یکا یک اس کا خیال آ گیا مگر وہ اِدھر اُدھر کہیں موجود نہ تھا۔ دوپہر کو وہ پھر قریب قریب اسی حالت میں کرسی پر بے سدھ نیم دراز دکھائی دیا۔

میں نے اسے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ میل وارڈ اور لیبارٹری کے طویل برآمدے کے آخر میں لان میں وہ کرسی کی پشت پر سر ٹیکے، ٹانگیں پسارے اور ایک ہاتھ سے سورج سے آنکھیں بچائے نیم دراز تھا۔ میرے ساتھ ڈاکٹر مسز ڈیپک تھیں اور ہم ایک typical case discuss کرتے ہوئے ہمیشہ کی طرح، برآمدے برآمدے اپنے اپنے flats کی جانب بڑھ رہی تھیں جو لیبارٹری کے راستے سے نزدیک پڑتے تھے۔

میل وارڈ کے برآمدے میں داخل ہوتے ہی وہ خاصے فاصلے پر نظر آیا اور میری توجہ ادھر ہو گئی۔ میرے دل میں آیا کہ مسز ڈیپک سے پوچھوں، ''کون ہے وہ؟'' مگر یہ سوچ کر کہ جانے کون ہو، خاموش رہی۔

جب ہم لان میں پہنچے تو یکا یک مسز ڈیپک نے رُک کر کہا: ''دلیپ!''

پہلی بار میں نے اسے حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے پلکیں اٹھائیں اور پھر اُچک کر کھڑا ہو گیا: ''گڈ آفٹرنون ڈاکٹر!''

''کب آئے تم؟'' مسز ڈیپک نے پوچھا۔

''کل!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کہاں رہے؟ باہر گئے تھے؟'' مسز دیپک نے پوچھا۔

''نہیں گھر پر ہی رہا۔'' اس نے پھر مختصر سا جواب دیا۔

''گھر پر؟'' مسز دیپک کو تعجب ہوا۔

اس نے دھیمے سے کہا: ''جی!''

''مگر تم دکھائی نہیں دیے۔ ہم لوگ سوچ رہے تھے کہ تم باہر چلے گئے ہو— تم گھر پر ہی رہے اور پھر بھی ادھر نہیں آئے!''

''بس یونہی...! سوتا رہا اور پڑھتا رہا— پڑھتا رہا اور سوتا رہا اور پل بھر میں چھ ماہ بیت گئے!'' اس نے دھیمے دھیمے سنبھل سنبھل کر کہا۔

مسز دیپک مسکرائیں۔

'تم رہے وہی کے وہی۔ اچھا، گھر آنا...! ارے ہاں، یہ مس مونا ہیں...'' مسز دیپک نے میرا تعارف کرایا: ''اور یہ مسٹر دلیپ، ہمارے لیبارٹری ٹیک نی شین!''

اس نے مسکراتے ہوئے آداب کہا۔

''اچھا تو گھر آنا!'' مسز دیپک آگے بڑھیں۔

راستے میں مسز دیپک نے کہا: ''بڑا اچھا لڑکا ہے! پچھلے پانچ سال سے یہاں ہے، لمبی چھٹی پر تھا، بیمار تھا۔''

اس دن مجھے یہی احساس رہا کہ اس کی دھیمی دھیمی سی سنبھلی سنبھلی آواز میرا تعاقب کر رہی ہے۔

تین دن دلیپ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ نہ لیبارٹری میں نہ کہیں اور، نہ صبح اور نہ دوپہر کو۔ جانے کیوں میں اسے پھر دیکھنا چاہتی تھی، بالکل اسی طرح، پلکیں گرائے، ٹانگیں پسارے، بے سدھ، نیم دراز۔

اور پھر سنیچر کی رات کو وہ مجھے دکھائی دیا۔

میں دریا گنج میں بس کا انتظار کر رہی تھی۔ بس رُکی اور وہ دکھائی دیا۔

جہازی بس میں گنتی کے چند آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور وہ سب سے اگلی سیٹ پر Exit door کے قریب، سیٹ کی پشت پر سر ٹیکے، پلکیں گرائے، بے سدھ، نیم دراز تھا۔

میں چند لمحے ٹھٹکی۔ میرے قدم رُک گئے۔ فاصلہ چند سیٹوں کا تھا۔ پھر جانے کیوں میں آپ سے آپ اس کے ساتھ خالی جگہ پر بیٹھ گئی۔

اسے محسوس ہوا تو اس نے پلکیں اٹھائیں اور اچک کر سیدھا ہو گیا۔

''ارے آپ؟ گڈ ایوننگ!'' اس کے لہجے میں تیزی تھی۔ شاید میری غیر متوقع موجودگی

سے اس کی آواز میں تیزی آ گئی تھی۔

میں نے بات کرنے کو کہا: ''کہاں سے آ رہے ہیں آپ؟''

چند لمحے وہ خاموش رہا، پھر اس کے لب کھلے: ''جی...! کناٹ پلیس تک گیا تھا؟'' اس کی آواز دھیمی تھی اور سنبھلی ہوئی۔

جانے مجھے کیوں محسوس ہوا کہ اس کے ہونٹوں پر الفاظ کچھ دیر سنبھلے رہتے ہیں اور پھر تھم تھم کر ڈھلک جاتے ہیں، آنسوؤں کی طرح۔

بس کے بے ہنگم شور میں مجھے میرے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی: ''مجھے کیا ہو گیا ہے؟'' میں دل ہی دل میں رو دی۔ میں بات کرنا چاہتی تھی مگر کر نہ پا رہی تھی۔ میں نے اس سے ذرا بن کر پوچھا تھا: ''کہاں سے آ رہے ہیں آپ؟'' مگر وہ ''جی کناٹ پلیس تک گیا تھا'' کہہ کر چپ ہو گیا تھا۔ ''میں کیا کروں؟'' میں پھر دل ہی دل میں رو دی۔

''ہاں جی، کہاں تک؟'' کنڈکٹر نے چونکایا۔

میں نے پرس کھولا۔

اس نے کہا: ''پلیز ڈاکٹر صاحب...! ایک ٹکٹ کنگز وے تک، دریا گنج سے...!'' اُس نے کنڈکٹر کی طرف پیسے بڑھا دیے۔

کنڈکٹر نے پیسے تھام کر ٹکٹ پنچ کیا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

''آپ ہاسپٹل flats ہی میں رہتے ہیں کیا؟'' میں بمشکل پوچھ سکی۔

''آپ کے flat سے ذرا پرے، ماڈل ٹاؤن کے قریب!'' اس نے پھر اسی لاتعلقی سے کہا۔

بس کے بے ہنگم شور میں میرا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا، آپ سے آپ رو رہا تھا اور میرے لبوں پر آپ سے آپ مسکراہٹیں پھیل رہی تھیں: ''مجھے کیا ہو گیا ہے؟''

کنگز وے کیمپ آیا اور ہم اجنبی سے اُترے اور اجنبیوں ہی کی طرح مال روڈ کی طرف بڑھے۔

پہلے فرلانگ پر میرا فلیٹ تھا اور دوسرے فرلانگ پر اس کا۔

اپنے فلیٹ کے سامنے رکتے ہوئے میں نے پوچھا: ''مسز ویک کہہ رہی تھیں، آپ بیمار تھے...!''

''جی ہاں...!'' وہ رکا اور پھر مسکرا دیا، ''نروس بریک ڈاؤن کا شکار تھا...!'' وہی لاتعلق سی آواز تھی اور وہی لاتعلق سی مسکراہٹ تھی۔

میں نے کچھ اور کہنا چاہا، کچھ اور پوچھنا چاہا مگر کچھ کہہ نہ پائی، کچھ پوچھ نہ پائی۔

''اچھا!... شب بخیر...!'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

اس رات پہلی بار مجھے پانچ جہازی کمرے کھانے کو دوڑے۔ میرے سانس کمروں میں سائیں سائیں کر رہے تھے اور ایک ہی گونج مجھے سنائی دے رہی تھی، ''نروس بریک ڈاؤن... نروس بریک ڈاؤن... نروس...!''

صبح میری آنکھ کھلی تو دن خاصا چڑھ چکا تھا۔

باہر مسز ڈیپک کی بچیاں شور مچا رہی تھیں۔

''ڈاکٹر آنٹی... ڈاکٹر آنٹی!''

میں نے انگڑائیاں توڑتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''ڈاکٹر آنٹی، آپ ابھی تک سوئی ہوئی تھیں... ہمارے گھر کون آیا ہے، آپ کو پتہ ہے؟''

میں نے بڑی روپا کو بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا:

''میں تو سوئی ہوئی تھی... تم بتاؤ، کون آیا ہے؟''

''ہمارے گھر لیبارٹری والے انکل آئے ہیں...!''

میرے ذہن میں آپ سے آپ کوندہ لپکا: ''اسے آج ہی آنا تھا...!''

''چلو آنٹی، ہمارے گھر چلو... آپ نے کہا تھا، اتوار کو کیرم کھیلیں گے...!'' روپا نے مجھے بازوؤں سے کھینچتے ہوئے کہا۔

''اچھا روپا بیٹی، تم چلو...! میں منہ ہاتھ تو دھولوں...!''

بچیوں کے جانے کے بعد میں نے آئینہ دیکھا۔ میری آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ان میں لال لال ڈورے بچھے ہوئے تھے۔ میرے ہونٹ خشک تھے اور چہرہ بے نور تھا۔ میں ایک ہی رات میں اُجڑ گئی تھی۔

میرا اسکول کا زمانہ، میڈیکل کالج کے دن، جنرل ہاسپٹل کا ایک سال، جب میں ہاؤس سرجن تھی۔ میں کتنی خودسر تھی۔ اور مجھے یہاں اُجڑنا تھا، یہاں بھی آنے کے چھ ماہ بعد اور وہ بھی تین چار دنوں میں نہیں ایک رات میں۔ دل کو جہاں اُجڑنا ہوتا ہے، وہاں آپ سے آپ پہنچ جاتا ہے۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھالا، سنوارا، اور دھڑکتے ہوئے دل سے، دھڑکتے ہوئے قدموں سے، اپنے آپ سے ڈرتی، اپنے آپ کو چھپاتی، مسز ڈیپک کے فلیٹ کی طرف چل دی جو چند قدموں پر تھا۔

وہ اسی طرح پریشان مگر مطمئن سا، ٹانگیں پسارے مگر آنکھیں کھولے، صوفے پر نیم دراز تھا۔ مسٹر ڈیپک اخبار دیکھ رہے تھے، مسز ڈیپک کمرے میں نہیں تھیں۔

مسٹر دیپک نے مجھے دیکھا اور کھڑے ہو گئے۔
"آئیے!"
وہ بھی چونک کر کھڑا ہو گیا۔
"بیٹھیے!" مسٹر دیپک نے کہا۔
مسز دیپک نے کمرے میں آتے ہی کہا: "مونا! آج تم نے بہت دیر لگا دی!"
میں زبردستی مسکرا دی۔
مسز دیپک پھر کچن کی جانب چلی گئیں۔
بچیاں برابر کے کمرے میں شور مچا رہی تھیں۔
میں نے اس کی جانب دیکھا۔

اس نے سفید کرتا اور پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ پاؤں میں انگوٹھے والی چپل تھی اور اوپر اس نے، کندھوں اور چھاتی پر شال اوڑھی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھوں میں بے کراں وسعتیں تھیں، "اور میری آنکھیں؟" میں نے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، میری چھاتیاں کانپ گئیں۔ اس نے شاید سب کچھ پڑھ لیا اور لاتعلق سی مسکراہٹ کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

چائے پینے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں بچیوں کے ساتھ کھیلنے چلا گیا۔ مسٹر دیپک کار لے کر شہر کو نکل گئے اور ہم، میں اور مسز دیپک باتوں میں مشغول ہو گئیں۔

میرے کان برابر، بچوں کے شور اور قہقہوں کے درمیان اس کی اُبھری ہوئی آواز سن رہے تھے۔
ایک بار مسز دیپک نے کہا:
"مونا؟ تم کھوئی کھوئی سی ہو...!"

میں نے کہا: "نہیں تو...!" اور پھر ہم اِدھر اُدھر کی، ہاسپٹل کے typical cases کی باتیں کرتے رہے۔

وقت بیت رہا تھا اور محسوس تک نہیں ہو رہا تھا۔
اور وقت بیت نہیں رہا تھا اور اس کا احساس تھا۔
جانے کب وہ کمرے میں آیا اور میری طرف دیکھے بنا، مسز دیپک سے اجازت لے کر چلا گیا۔

اور وقت جیسے تھم گیا۔

"کیابات ہے موتا؟" یکایک مسز دیپک نے پوچھا۔

میں نے مسز دیپک کی طرف دیکھا۔ میرے لب ایک لمحے کے لیے کانپے، میرے ذہن میں اس ایک لمحے میں ایک جھکڑ اٹھا اور مجھ سے رہا نہ گیا: "کون ہے یہ؟... کون ہے؟... کون؟"

مسز دیپک مسکرانے لگیں: "ارے موتا... یہ بات ہے؟... یہاں کم وبیش سب کی یہی حالت ہے۔ سب دلیپ کو چاہتے ہیں، بڑے صاحب بھی، سارے مریض، سارے سوپر، سارا اسٹاف... میں بھی اسے بہت چاہتی ہوں مگر اس چاہت کو کوئی نام نہیں دے پاتی... کہتے ہیں دلیپ کے باپ کو ٹی بی تھی، اسی لیے اُس نے دلیپ کو اپنے سے دُور رکھا۔ دلیپ اپنے ماموں کے پاس پڑھتا رہا۔ یہ بات اس کے علم میں نہیں تھی کہ اس کے باپ کو ٹی بی ہے۔ جب اس کا باپ مرا تو اسے علم ہوا... اس نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی کہ وہ ماموں کے سر پر بوجھ نہیں بننا چاہتا تھا۔ باپ مر گیا تھا۔ پیسے کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ ایف. ایس. سی. وہ کر چکا تھا۔ stipend لے کر اس نے لیبارٹری ٹیکنیک میں ڈپلومہ حاصل کیا اور یہاں ملازم ہو گیا... وہ باپ کی زندگی میں دیکھ بھال نہ کر پایا تھا کہ اسے موقع ہی نہ ملا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے قلبی سکون کے لیے، یہاں ٹی بی ہاسپٹل میں بڑی جانفشانی سے کام کرتا ہے۔ کسی وقت بھی بلا لو، رات کو یا دن کو، کام، کام کیے جاتا ہے۔ بات ادب سے کرتا ہے، سلیقے سے کرتا ہے اور کم کرتا ہے، اسی لیے سب خوش ہیں، سب اسے چاہتے ہیں... یہاں اس کا ایک دوست تھا، اس کا ہم عمر... وہ!... اس کا نام تھا روشن! روشن یہیں اس کا دوست بنا تھا... روشن خود وارڈ کا بہت کام کرتا تھا... نرس کو پتہ ہو نہ ہو، اسے پتہ ہوتا تھا کہ کس مریض کو کس سمے کیا دینا ہے... کس مریض کی ڈائٹ کیا ہے۔ کس مریض کی حالت کیا ہے۔ دلیپ اور روشن اکیلے بیٹھتے... روشن کے دائیں پھیپھڑے میں اوپر بہت بڑی کیوی ٹی تھی... آپریشن سے دو دن پہلے، دونوں نے مل کر خاصی بڑی پارٹی کا اہتمام کیا۔ روشن کے سب دوست موجود تھے، لیبارٹری کے دوسرے لڑکے موجود تھے... میں نے دلیپ سے پوچھا تو دلیپ نے کہا، ڈاکٹر صاحب! اپنا دوست مورچے پر جا رہا ہے... صبح روشن کو اندر لے گئے۔ آپریشن کامیاب رہا... رات دس بجے تک دلیپ وارڈ ہی میں رہا اور پھر سونے چلا گیا۔ نرس کہتی ہے، صبح، دلیپ، روشن کے کمرے میں داخل ہوا۔ مگر وہاں کچھ نہ تھا... دلیپ بھاگا بھاگا نرس کے پاس گیا... روشن رات ہی کو ہوش میں آنے کے بعد کولیپس ہو گیا تھا... دلیپ کا رنگ سفید ہو گیا تھا... نرس سے رات کی بات جان کر وہ مڑا اور چند قدم چلنے کے بعد گر گیا... نروس بریک ڈاؤن... اب چھ ماہ بعد آیا ہے! بڑے صاحب

نے خوداس کا علاج کیا ہے..."

میرے ذہن میں سیٹیاں بج رہی تھیں اور میرے ذہن میں سیٹیوں نے اس کی اندر سے بند شخصیت کے دروازے کھول دیے تھے۔

چھ ماہ تک میرے اور اس کے تعلقات کی بنیاد وہی، بہت قریب، بہت دور۔

میرے دل کے دروازے اس پر کھلے تھے، اس کے دل کے دروازے مجھ پر بند تھے۔

ایک بار مجھے اس کے فلیٹ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اسے شدید بخار تھا۔ میں اور مسز دیپک اس کے ہاں گئے۔

اس کے کمرے میں ننگی بچی دیواروں پر ایک پینٹنگ ٹنگی ہوئی تھی: صدیوں کی دیمک خوردہ مندمل چوکھٹ پر ایک کافور ہوتی ہوئی عورت، گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ پاس ہی ایک دیا جل رہا تھا... گہرے، اندھیرے کینوس پر صرف دیے کی لو تھی جو درخشاں تھی۔ عورت کی جھکی ہوئی گردن سے پتہ چلتا تھا کہ صدیاں گزر گئی ہیں، اسے انتظار کرتے کرتے۔

میرے ذہن میں سیٹیاں بجنے لگیں اور اس کی اندر سے بند شخصیت کے سینکڑوں دروازے کھل گئے۔ "میں کیسے قدم بڑھاؤں، تم بلاتے نہیں، میں کیسے آؤں، کیسے... کیسے؟"

اور پھر دفتر سے مجھے مزید تعلیم کے لیے انگلستان جانے کی اجازت مل گئی۔

اس خوشی میں چھوٹی سی پارٹی ہوئی۔ وہ بھی شریک ہوا۔ اسی لاتعلقی سے جو میرا بہت بڑا دکھ تھی اور بہت بڑی مسرت تھی کہ وہ ہر صورت میرا اپنا تھا، اپنا۔ بس وہ پل ابھی اپنا نہ ہوا تھا، جب دو جسم اور دو روحیں ایک ہو جاتی ہیں۔

جس شام مجھے جانا تھا، اس دن صبح وہ دکھائی نہ دیا۔ شام کو جانے سے دو گھنٹہ پہلے میں اس کے فلیٹ پر گئی۔

دروازہ دھکیلا تو کھل گیا۔

وہ آرام کرسی میں دھنسا ہوا، پشت پر سر ٹیکے، پلکیں گرائے، ٹانگیں پسارے، نیم دراز تھا۔ اس کا ایک ہاتھ نیچے لٹکا ہوا تھا اور انگلیاں فرش کو چھو رہی تھیں۔ ہتھیلی کے ساتھ ہی کلائی کی موٹی رگیں کٹی ہوئی تھیں اور خون کی لکیر ہتھیلی سے گزرتی ہوئی فرش پر دریا بن گئی تھی۔

اندر باہر کے سارے دروازوں پر تالا لگ گیا تھا۔

OO

(سالنامہ 'ادبِ لطیف'، لاہور: ۱۹۶۳ء)

پَروَرِش

اس نے آخری بار سنبھلنے کی کوشش کی۔ضبط کی پھسلتی ہوئی رسی پر پاؤں جمانے کی اپنی سی سعی کی،مگر وہ سنبھل نہ سکا اور منہ کے بل زمین پر آن پڑا۔

"You idiot ... I ... I ..." انگریزی زبان بھی شاید اس کا غصہ دیکھ کر کہیں دبک گئی۔اسے کچھ نہ سوجھا۔چند لمحے اس کے لب کانپے،پھر وہ پورا زور لگا کر چیخا:

''سؤر کے بچے!ذرا باہر آ!تیری ہڈی پسلی ایک نہ کر دی تو حرامی کہنا...'' وہ پھر چند لمحے رکا اور پھر ہانپتے ہوئے چلایا:

''حرام زادے!تیرے منہ میں ایک دانت بھی رہنے دیا تو اُلّو کا پٹھا کہنا...''

سوہن کی مارے غصّے کے بُری حالت ہو رہی تھی۔اس کی کنپٹیوں پر خوفناک طور پر اُبھری ہوئی رگیں اور کس کر بھنچی ہوئی مٹھیاں،اس کے غصّے کی حدود کو پاگل پن کی حدود سے ملا رہی تھیں۔مگر راجن بڑے آرام سے صوفے کی پشت پر سر ٹیکے نیم دراز تھا۔اس کے لبوں پر پھیلا ہوا ہلکا سا تبسم اور اس کی آنکھوں میں بھری ہوئی غیر معمولی چمک کہہ رہی تھی کہ اسے بے پناہ لذت محسوس ہو رہی ہے۔

جب سوہن چیخ چیخ کر تھک گیا اور خاموشی سے ہونٹ کاٹتا ہوا وحشی نظروں سے راجن کی جانب دیکھنے لگا تو راجن نے دھیمے سے کہا:

''باہر چلوں؟''

''تیری لاش جو فٹ پاتھ پر نظر نہ آئی تو...'' سوہن پھر چیخا۔ابھی وہ جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا کہ راجن نے اسے کاٹ دیا:

''دیکھو،اپنے آپ کو گالی نہ دو... میں باہر چلتا ہوں... ویسے میں چاہتا یہی تھا کہ تمھیں تمھارے صحیح مقام پر پہنچا دوں جہاں سے تم چلّا کر مجھے جسمانی طور پر للکارو... میں جانتا ہوں کہ تمھاری ذہنی سطح اور ایک وحشی کی سطح میں کوئی خاص فرق نہیں ہے... آؤ،باہر چلیں...!'' راجن نے

دھیمے دھیمے اپنے مخصوص لہجے میں آخری وار کیا۔

سوہن کھڑا ہو گیا اور راجن بھی۔ ہم لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی راجن نے اپنے ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال لیے اور ریلنگ کا سہارا لے کر پُرسکون انداز میں کھڑا ہو گیا۔

سوہن دو ہاتھ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ چند لمحے وہ یونہی بت بنا کھڑا رہا اور پھر اس کی دل خراش چیخ سنائی دی:

''کتے...! کتے...!'' اور وہ دھاڑیں مارتا ہوا، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے لوگوں سے ٹکراتا، گرتا پڑتا، ریگل کی طرف بھاگ گیا۔

''آؤ اندر چلیں!'' راجن نے کہا۔

ہم لوگ اپنے مخصوص صوفے پر پھر جم گئے۔

اس سے پہلے بھی ہم نے اسی طرح کے کئی ڈرامے دیکھے تھے اور ہر ڈرامے کا انجام ہماری توقع کے مطابق ہی ہوا تھا۔

چند روز پہلے تین چار دوستوں کی محفل میں، جن میں سوہن بھی شامل تھا، شادی پر بات چل نکلی تھی۔ وہیں راجن نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا تھا:

''آپ شادی کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ خاندان بڑھانے کے لیے! تو صاحب، جب مغلیہ خاندان ہی باقی نہ رہا، تو آپ کی تو اوقات ہی کیا ہے۔ اور اگر آپ گھر بنانے کے لیے شادی کرنا چاہتے ہیں، تو ذرا سوچیے... ہندوستان میں دس کروڑ گھر ہیں جنھیں گھر نہیں چوہوں کی بلیں کہنا چاہیے۔ ایک آپ کی بِل نہ ہوئی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اور اگر جنسی تسکین کا ارادہ ہے تو شادی بے معنی ہوئی۔ شادی نہ ہوئی ایک ڈھونگ ہوا۔ اور اس ڈھونگ میں آگے چل کر کیا ہوتا ہے۔ اُف! میں کانپ کانپ جاتا ہوں سوچ کر!... میں ایک صاحب کو جانتا ہوں جو خود خوبصورت ہیں، ان کی بیوی خوبصورت ہے، ان کا بچّہ خوبصورت ہے... مجھے جب کبھی ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا، میں نے انھیں ایک ہی کام کرتے دیکھا۔ بچّے کو چوم رہے ہیں۔ اگر کبھی بازار میں انھیں دیکھا تب بھی بچّے کو چومتے دیکھا۔ آخر ان کے خیال تک سے مجھے کراہت آنے لگی۔ اور میں نے انھیں اپنی زندگی سے نکال باہر کیا...''

اس سے تو سوہن چپ رہا تھا، مگر جانے کیا ہوا کہ دو دن بعد راجن کی غیر موجودگی میں راجن کا ذکر چلنے پر اس نے دانت پیستے ہوئے کہا: ''وہ مریض... بیمار... کوڑھی...! ایسے لوگوں کو گولی مار

دینی چاہیے!"

اُس دن راجن کو سوہن کی بوکھلاہٹ کا علم ہوا تو وہ قہقہے اُڑانے لگا۔

"بے چارے کی رگ حمیت میری غیر موجودگی میں پھڑکی ہے!"

اور شام کو جب سوہن ہمارے ٹیبل پر آن بیٹھا تو راجن نے اپنے مخصوص انداز میں اِدھر اُدھر کے ذکر کے ساتھ سوہن کو تیکھی باتوں کی چٹکیاں بھرنا شروع کر دیں۔ تیکھی باتوں کی چٹکیوں کے بعد راجن نے جملوں کے چھوٹے چھوٹے پتھر پھینکے اور سوہن کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر نفرت کے زہر میں بجھے ہوئے تیر پھینکنے شروع کر دیے اور پھر یکدم ہی اس کے سر پر آخری کیل گاڑ دی اور سوہن چیخا:

"You idiot! ... I ... I ..."

ہم لوگ ڈرامے کے انجام سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے راجن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی، مگر اس کے چہرے پر گہری اُداسی چھائی ہوئی تھی، جیسے وہ اپنا مشکل رول نبھا کر تھکا ہارا بیٹھا ہو۔

آخر میں نے کہا: "تو پھر!"

راجن نے گھڑی کی جانب نظریں اٹھائیں۔ پونے سات بج رہے تھے۔

"ہاں بھئی، پندرہ منٹ بعد تو ٹکریں مارنا پڑیں گی...!" اس نے جیبیں ٹٹولیں اور میری طرف بیس روپے بڑھا دیے۔

"میرے پاس تو بس یہی کچھ ہے...!"

ہم لپک کر وائن شاپ سے بلیک نائٹ کی ایک بوتل پکڑ لائے۔

راجن نے کڑکڑاتے ہوئے کاغذ میں لپٹی ہوئی بوتل تھامی اور میز پر کھڑی کر دی اور جوشی کو بلا کر کہا:

"جوشی، تین کوکا کولا، اتنے ٹھنڈے کہ دانت بجنے لگیں!" جوشی مسکراتا ہوا چلا گیا۔

"یار، وہسکی سے پہلے کوکا کولا پیا جائے تو وہسکی کی لذّت چوگنی ہو جاتی ہے۔" راجن بولا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا:

"تم اور تمھاری inventions، کوئی ٹھکانہ ہے بھلا!"

"راجن یہ جو تم نے بوتل کا میز پر جھنڈا گاڑ دیا ہے، اس کے معنی کیا ہیں؟"

"اس کے کوئی معنی نہیں۔ لیکن سات بجے کے بعد جب دکانیں بند ہو جائیں گی، لوگوں کی

پیاسی نظریں اسے خود معنی پہنا ئیں گی... مثلاً خوش قسمت ہیں وہ لوگ، یعنی ہم۔ کوئی دوسرا کہے گا، نہیں، دور اندیش ہیں وہ لوگ... اور ممکن ہے، وہ لوگ اختلاف رائے کی وجہ سے ایک دوسرے کا سر پھوڑ دیں..."

"کہیے! کیل کانٹے سے لیس ہو گئے؟" پاس سے گزرتے ہوئے جان پہچان کے ایک کمیونسٹ یکا یک رُک کے اور بولے۔

"جی ہاں، مگر آج ہمارا ارادہ کسی ذہین دشمن سے لڑنے کا ہے، آپ سے نہیں۔"

کمیونسٹ کی بھویں تن گئیں اور وہ بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

کوکا کولا ایک ہی سانس میں غٹا غٹ چڑھا جانے کے بعد راجن نے گہرا لمبا سانس کھینچا اور کہا:

"دیکھا، معنی پیدا ہو گئے نا...!"

تھوڑی دیر بعد ہم تینوں وہاں سے اُٹھے اور پارلیمنٹ اسٹریٹ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔

راجن کے دائیں ہاتھ میں بلیک نائٹ کی بوتل تھی اور وہ اسے نچاتا، دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں، اور بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں تھماتا، بڑے موڈ میں ساگر اور مجھ سے دو قدم آگے چل رہا تھا۔ یکا یک وہ رُکا اور ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"یار بڑا مزا آرہا ہے...!"

میں نے کہا:

"راجن، تم اپنی لذتوں کے لیے سامان مہیا کر لیتے ہو۔ ذرا سوچو! اس غریب سوہن کا کیا حال ہوگا...؟"

"پیارے مین را، تم افسانہ نگار بنے پھرتے ہو اور یہ تک نہیں جانتے کہ بے چارے کا کیا حال ہوگا؟... اگر منطقی نتیجہ نکالا جائے تو یہی ہوگا کہ سوہن گھر جائے گا، اس کی بیوی کھانا چنے گی، اسے کھانے میں نمک زیادہ محسوس ہوگا اور وہ، وہی طمانچہ جو اس نے مجھے جڑا تھا، بیوی کو جڑ دے گا اور بستر میں دبک جائے گا۔ دو گھنٹے بعد اس کی بیوی اس کے پاؤں دبانا شروع کرے گی اور وہ لپک کر بیوی کو دبوچ لے گا... اے مرے افسانہ نگار! نہ تو سوہن کی کوئی پرابلم ہے نہ اس کی بیوی کی... ہو بھی تو صبح تک نہیں رہتی... اور وہ مجھے، میری غیر موجودگی میں، مریض، بیمار، کوڑھی کہتا ہے، ایسے میں اگر میں اسے یا اس جیسے کسی اور social animal کو تنگ کر کے لطف اندوز ہوتا ہوں تو کیا بُرا کرتا ہوں...!"

میری افسانہ نگاری وہیں دھری رہ گئی اور ہم نے پھر کھیم کے گھر کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔
کھیم کے کمرے میں بتی جل رہی تھی۔
راجن نے کہا: ''چلو! چنڈال چوکڑی پوری ہوگئی...!''
کھیم نے ہمیں دیکھتے ہی کہا: ''کیا لائے ہو؟''
راجن نے بلیک نائٹ کی بوتل کھیم کی آنکھوں کے سامنے ہتھیلی پر کھڑی کر دی۔
''لو پیارے کھیم، آج بلیک نائٹ تمھیں خود کہہ رہی ہے کہ آؤ، میرے دودا پہلوان، مجھ سے کشتی لڑو۔''
کھیم نے انگوٹھے اور انگلی کی گولائی میں بلیک نائٹ کی سیل تھامی اور کڑ کڑ توڑ دی۔
ہم سب فرش پر بچھے، کھیم کے بستر پر، کتابوں کے تکیے بنا کر نیم دراز ہو گئے۔
کھیم نے ہمارے سامنے بل کھاتی ہوئی کمر والے صاف شفاف گلاس چن دیے۔ پلیٹ میں مونگ کی تلی ہوئی دال سجا دی اور گلاسوں میں عمودی دیا سلائی بھر وسکی انڈیل کر بھک سے سوڈے کھول دیے، اور کہا:
''سوڈا، According to your taste...'' ہم نے اپنی اپنی طبیعت کے مطابق وسکی میں سوڈا حل کر کے گلاس اُٹھائے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ راجن نے جام تجویز کیا:
''پرانے میکشوں کے نام!''
ایک ایک جرعہ حلق سے نیچے اُتارنے کے بعد سب نے گلاس فرش پر رکھ دیے۔ راجن نے سگریٹ سلگایا اور لمبا کش کھینچ کر دھویں کا چھلہ اچھال دیا اور کہا:
''وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے...''
''کھیم! کیا ہوا تمھاری شادی کا؟'' ساگر نے غیر متوقع طور پر پوچھا۔
''پیارے ہند مہا ساگر، سکھ مجھے اس لیے لڑکی نہیں دیتے، کہ میں کیس کٹوا چکا ہوں۔ ہندو مجھے اس لیے لڑکی نہیں دیتے کہ میں کیس پھر نہ رکھ لوں۔ ماں باپ میری شادی اس لیے نہیں کرتے کہ میں 'کلپنا' جیسی واہیات چیز سے چپکا ہوا ہوں... کوئی لڑکی خود اپنی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہی نہیں... اس پرابلم کے حل کے طور پر اب میں آسکر وائلڈ پڑھ رہا ہوں۔''
میں نے کہا: ''کھیم صاحب، ایڈیٹر 'کلپنا'، آپ ساگر کی طرح میراجی کو کیوں نہیں پڑھتے؟ میرا خیال ہے، میراجی آسکر وائلڈ کے مقابلے میں بہتر حل ہے!''
''کیوں راجن؟''

راجن نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔

''بھیم، شراب تھوڑی رہے گی۔''

''تم فکر نہ کرو پیارے، یہ ایڈیٹر 'کلپنا' کا کمرہ ہے!'' بھیم نے اپنے ذخیرہ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں تو بھائی...!'' راجن نے کہنا شروع کیا: ''آسکر وائلڈ اور میرا جی کو بھول جاؤ مین را ڈیر! مجھے تھوڑی سی انڈیل دو... بس میرا خیال ہے، ہر آدمی نے، کہیں نہ کہیں، بس میں، ٹرین میں، سمندر کے کنارے، ہاسپٹل میں، یا کہیں اور، کبھی نہ کبھی اپنی آرزو کو دیکھا ہوگا... آپ لوگ ماضی کی تنگ و تاریک گلیوں میں گھوم جائیے، کہیں نہ کہیں آرزو کا دیا جھلملا رہا ہوگا... کیا آپ اس ایک لمحے کو سمیٹ نہیں سکتے، ماضی کے اندھیرے میں سے اٹھا نہیں سکتے... اس لمحے کو، آرزو کو اپنے من میں جگہ دیجیے!... یہ حسرت نہ رہے گی... آسکر وائلڈ، میرا جی کی طرف نگاہ بھی نہیں اُٹھے گی... ہائے یار! میرے بس میں نہیں۔ میں بیان نہیں کر سکتا... میری زندگی کی ندی میری آرزو سے کھیلتی یوں رواں ہے کہ... مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں دس سال کا تھا... میں نے rape ہوتے دیکھا تھا... لڑکی آٹھ سال کی تھی، من موہنی سی، بڑی پیاری باتیں کرنے والی... اور اسے ہمارے اسکول کے چوکیدار نے دبوچ لیا تھا، یہ ہٹا کٹا، کالا بھجنگ، سارے جسم پر ریچھ کی طرح بال، خوف کے مارے میرے منہ سے چیخ تک نہ نکل سکی تھی... چوکیدار کے بھاگ جانے کے بعد میں نے لڑکی کو دیکھا تھا، جیسے کبوتری کو نوچ کر پھینک دیا گیا ہو... مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر اسی دن ایک آدمی مر گیا تھا... بہت زمانے کے بعد کی بات ہے، میرے ایک دوست کی نازک سی، گوری چٹی بیوی ارچنا میرے دل میں آرزو بنی۔ میں الفاظ گوندھ کر ارچنا کو پہنا نہیں سکتا کہ وہ بہت ہی نازک ہے... میں زندگی میں کبھی شرمسار نہیں ہوا کہ میں نے کبھی اپنے احساسات پر پابندی نہیں لگائی، لیکن بچپن کے اس واقعے کی غلاظت مجھ پر اس طرح حاوی رہی کہ میں جسمانی طور پر کبھی سوچ نہ پایا... میرا وہی دوست جانے مردانگی کے کس زعم میں ایک دن یہ کہہ بیٹھا... میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اس نے جسمانی تعلقات کے پورے آسن بیان کر دیے تھے... میں دوسری بار مر گیا... چوکیدار اور میرا دوست... تم سوچ نہیں سکتے کہ مجھے دل میں ٹمٹماتے ہوئے آرزو کے دیے کو بچانے کے لیے کتنی راتیں جاگنا پڑا ہے... تم کہو گے کہ شاید بچپن کے اس خوفناک حادثے نے میری جسمانی قوت سلب کر لی ہے... ممکن ہے تمھاری بات صحیح ہو... میں جسم کی زندگی کا صرف اس حد تک قائل ہوں کہ جسم کی دیواریں ہمارے ذہن کی محافظ ہوں... جسم ہمارے ذہن کے تابع ہو... جسم از خود کوئی بڑی چیز نہ ہو... کیا کہتے ہو تم لوگ؟''

راجن نے ہاتھ بڑھا کر بلیک نائٹ کی بوتل اٹھائی۔ چار گلاسوں میں برابر تقسیم کی اور سوڈے کھول کر ہماری طرف بڑھا دیے — پھر اس نے دیا سلائی جلائی اور بلیک نائٹ کی خالی بوتل میں جلتی ہوئی دیا سلائی ڈال دی — 'دردتہ جام' سے نیلی لپٹ بڑی سرعت سے انگڑائی لے کر اُٹھی اور آن کی آن میں او جھل ہوگئی۔

''کتنی مختصر اور کتنی خوبصورت ہے یہ زندگی...!'' راجن نے کہا اور فوراً ہی گلاس اُٹھا کر لبوں سے لگایا اور ایک ہی گھونٹ میں اپنے اندر انڈیل لیا۔

''تم نے اس بڑے ناولسٹ کی زندگی پڑھی ہے، جس نے سمندر کے کنارے اٹھارہ سال کی عمر میں ایک شادی شدہ عورت کو دیکھا اور اسے اپنے من میں اُتار لیا اور گھر لوٹ آیا۔ تمام عمر اس نے اپنے من کی دیوی کے ساتھ گذاری... دوسری مرتبہ اپنے من کی دیوی کو اس نے پھر سمندر کے کنارے دیکھا... جانتے ہو کب؟ ۳۷ سال بعد... کیا اس کی زندگی ایک پچھتاوا ہے؟... میرے نزدیک ایک مندر ہے...!''

راجن نے ہاتھ بڑھایا اور میرا گلاس اُٹھا کر ایک ہی گھونٹ میں خالی کر ڈالا۔

''زندگی بڑی خوبصورت ہے... آرزو کی لہریں اور زندگی کی ندی... اور پھر فنا کا عظیم الشان سمندر... یہ چوکیدار اور یہ... وہ میرا دوست... وہ جو بیوی کو گود میں... اُف!''

ایک لمحے کے لیے راجن نے کھیم اور ساگر کی طرف دیکھا۔ ان کے گلاس خالی پڑے تھے۔ ان کی آنکھیں جذبوں سے بھری ہوئی تھیں۔ راجن کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور نم تھیں۔

کھیم کتابوں کے انبار پر ہتھیلی کا دباؤ ڈال کر سنبھلا اور اٹھا، اور الماری کھول کر آبِ نشاط انگیز اٹھا لایا۔

راجن نے پھر چاروں گلاس اکٹھے کیے۔

ساگر بولا:

"I am off ... !"

کھیم نے کہا: ''مجھے ذرا کم ڈیئر!''

''چلے گا؟'' راجن نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہہ دیا: ''جب تک دم میں دم ہے!''

ہم تینوں نے، کھیم، راجن اور میں نے گلاس اٹھائے۔ راجن نے کہا:

''ساگر کے نام Who died in the way''

گلاس ٹکرا کر ہم نے لبوں سے لگا لیے۔

''کھیم، یہ French Revolution کہاں سے لائے؟''

راجن نے پوچھا۔

کھیم نے جواب دیا: ''سنبھل جاؤ یہ ٹھرا ہے Our National Drink۔''

''تو لو پھر!''

یہ کہہ کر راجن نے گلاس خالی کر ڈالا اور پھر گلاس میں ٹھرا اُنڈیلنے لگا۔ گلاس لبالب بھر گیا تو راجن نے اٹھالیا، شاید سوڈے کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔

''راجن...!''

آدھا گلاس اس کے اندر جا چکا تھا۔

راجن نے خطرناک طور پر آنکھیں پھیلا کر میری طرف دیکھا۔

''ہوں ں ں ں...!''

میں نے پوچھا: ''تم ٹھیک ہو نا!''

''کیا بک ک ک ت ت تے ہووو...؟'' راجن کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

راجن نے پاؤں پسار لیے اور آنکھیں موند لیں۔ آدھے سے قدرے کم بھرا ہوا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور شراب لرز رہی تھی۔

''ہم... خانماں خرابوں...''

اس نے آنکھیں زور سے بھینچ لیں اور گلاس خالی کر ڈالا۔

کھیم اور ساگر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد کھیم اٹھا اور راجن پر کمبل ڈالنے لگا۔

راجن کی آنکھیں بند تھیں اور لب کانپ رہے تھے۔

''ار... چ... نا...!''

OO

('تحریک' دہلی: ۱۹۶۳ء)

اَنا کا زخم

شاید تیسرا دور تھا۔ بہکنے کی منزل تو ابھی بہت دور تھی مگر سرور کا گہرا رنگ سب پر چڑھ چکا تھا۔ خدا جانے کس طرح بات چیت ذاتی پسند اور ناپسند پر رُک گئی۔ میں نے غور سے سنا، راہی کہہ رہا تھا:

''یارو! میں ان بچوں کو پیار کرتا ہوں، بار بار چومتا ہوں، جو ماں باپ سے چار چوٹوں کی مار کھاتے ہیں مگر ان کا کہا پھر بھی نہیں مانتے ہیں۔ جو ہر حادثے سے بے نیاز ہو کر سڑک کے عین بیچ میں گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں اور گلی سے کبھی کبھی کسی کار کا شیشہ بھی توڑ دیتے ہیں۔ جو محلے کے بزرگوں کی موٹے موٹے شیشوں سے ڈھکی ہوئی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے ماہر ہیں۔ جن کی وجہ سے تمام سال اُستاد کی ناک اور کان کی لویں غصّے کے مارے سرخ رہتی ہیں مگر جو تمام سال کھیل کود میں مصروف رہنے کے باوجود بھی ماں باپ اور اُستاد کو شرمسار کرنے کے لیے امتحان میں اچھے نمبر حاصل کرتے ہیں۔ مجھے وہ نوجوان اچھے لگتے ہیں جن پر ہر وقت سنجیدگی مسلط رہتی ہے۔ جو بہت کم بولتے ہیں مگر جن کے سینے میں ایٹم بم چھپا رہتا ہے۔ اور مجھے ان فنکاروں سے عشق ہے جو جوانی کے عالم ہی میں ایک عالم کو روتا چھوڑ گئے ہوں۔ جنھیں زمانے نے کچلا ہو، پاگل خانے بھیجا ہو، عدالتوں میں گھسیٹا ہو مگر جنھوں نے محض اپنی ہمت، اپنی ذہانت کے بل بوتے پر زمانے کو سر کے بل چلنے پر مجبور کیا ہو۔ اور جن کی جوانمرگی پر زمانہ خون کے آنسو رویا ہو۔''

میں گذشتہ دو ماہ سے راہی کی ہر بات ناپ تول رہا تھا۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ کہیں لغزش کھائے اور میں اسے آڑے ہاتھوں لوں۔ میں اس سے چڑ گیا تھا۔ اس کی ہر بات، اس کا ہر عمل اس کی انا کی کیل کو ہم دوستوں کے سروں پر گاڑ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اس سے نفرت سی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میں اس کی انا کے خول کو توڑ دینا چاہتا تھا جو اس نے اپنی ذات کے اوپر چڑھا رکھا تھا۔

ہم سب دوست موڈ میں تھے اور چہک چہک کر وہسکی پی رہے تھے۔ راہی کی آنکھوں کی وسعت بتا رہی تھی کہ وہ سرور میں آ چکا ہے۔ پھر جانے کیا ہوا کہ اس نے اپنی پسند کو، اپنے مخصوص

لہجے میں، ایک ایک لفظ کو انفرادیت بخشتے ہوئے ہماری طرف اچھال دیا۔ اس کی بات سن کر میں نے سب کا بغور جائزہ لیا مگر سب ہلکے سے ردِ عمل سے بھی کوسوں دور تھے۔ میں راہی کے بارے میں حساس تھا، اس لیے مجھ پر سخت ردِ عمل ہوا۔ راہی کی پسند میں اس کا کردار، اس کا بچپن اور اس کی جوانی پوشیدہ تھی۔ اور جوانمرگ فن کاروں سے اس کا عشق اس کے اپنے مستقبل کی طرف اشارہ تھا۔ اس کی پسند اس کے عمل کی تخلیق تھی اور اس کا عمل بچپن ہی سے احترام، آداب، رسم ورواج، غرض ہر بات سے بغاوت رہا تھا۔

میرا موڈ فنا ہو چکا تھا۔ وہسکی کا ہر جرعہ اب کڑوی دوا کے مترادف تھا۔ میں نے چند لمحے غور کرنے کے بعد راہی کی ٹانگ گھسیٹنا چاہی۔ میں نے کہا:

''ایک کردار تو ہر شخص کا ہوتا ہے، دوسرا کردار کچھ لوگ اپنی اہمیت دوسروں پر لادنے کے لیے اوڑھ لیتے ہیں۔ مجھے تو بس یہ دوسری قسم کا کردار ناپسند ہے۔ اور مجھے باقی کی ہر شے پسند ہے۔''

میں نے راہی پر سیدھا حملہ کیا تھا۔ اب سب چونکے۔ راہی مسکرایا اور پھر بے نیازی سے کہنے لگا:

''بلراج ہم سب دوستوں میں سب سے زیادہ ایماندار ہے۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے جو کچھ کہا ہے، اس میں اس نے اپنی ذات کو بھی نہیں بخشا۔ اگر تم سب سوچو، اپنے من کو ٹٹولو، تو بلراج کی بات کی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ اچھا، بلراج ہی کو لو۔ ایک کردار تو یہ ہے کہ تیس دن کی مشقت کے بعد ایک سو چالیس روپے ملتے ہیں۔ اور گھر کے پانچ افراد نمک، پیاز اور روٹی کھا پاتے ہیں اور ایک کردار یہ ہے کہ یہاں وہسکی پی جا رہی ہے۔ اس دوسرے کردار کو نوچ پھینکا جا سکتا ہے مگر بلراج حساس ہے، اس لیے خود فریبی کا سہارا بڑے خلوص سے قبول کرتا ہے... تو یارو، ایک ڈبل پیگ، بلراج کے نام!''

راہی نے اطمینان سے مجھ پر جوابی حملہ کیا تھا۔ اس کے جوابی حملے میں میری زندگی کی بڑی بھیانک حقیقت چھپی ہوئی تھی۔ میں نے خاموشی سے اپنی شکست کے نام معنون ڈبل پیگ ایک ہی گھونٹ میں اپنے اندر لگی ہوئی آگ کو تیز کرنے کے لیے انڈیل لیا اور محفل سے اُٹھ آیا۔

۱۹۵۰ء کی بات ہے، میں سناتن دھرم اسکول میں ہائر سیکنڈری کے فائنل ایئر میں تھا۔ ان دنوں راہی نے کلاس میں داخلہ لیا۔ چھ ماہ تک تو میں اس کی طرف متوجہ ہی نہ ہوا۔ میرا کلاس کے تین چار ذہین طلبہ میں شمار ہوتا تھا۔ اس لیے برتری کا احساس مجھے اپنے ہم جماعتوں کی صحبت سے دُور رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ان دنوں راہی میں کوئی خوبی بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ دُبلا پتلا بیمار سا جسم، گہری سانولی رنگت، گہرے سیاہ حلقوں میں گھری ہوئی اور کچھ بہت ہی زیادہ اندر کو دھنسی

ہوئی آنکھیں، پورے چہرے پر ہڈیوں کی پھیچوں پر منڈھی ہوئی کھال، لباس سے لاپروائی کا اظہار اور پھر کلاس میں اس کا سب سے آخری بنچ پر تن تنہا بیٹھے رہنا۔ میں اس کے قریب کیسے جا سکتا تھا؟ مگر کچھ عرصہ بعد ان احساسات کے باوجود میں نے ہی اس کی صحبت میں رہنے کی جستجو کی۔

سالانہ امتحان کے قریب دو ماہ پہلے ہمارے انگریزی کے استاد کالرہ صاحب نے ڈکنز (Dickens) کا ناول ڈیوڈ کاپر فیلڈ (David Copperfield) پڑھاتے ہوئے اچانک راہی سے ایک سوال پوچھا۔ راہی حسب معمول سب سے آخری بنچ پر بیٹھا ہوا تھا اور کالرہ صاحب اپنی کرسی پر۔ کالرہ صاحب نے سوال پوچھا تو سب لڑکے راہی کی جانب دیکھنے لگے۔ راہی سر جھکائے شاید کچھ گنگنا رہا تھا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ اس سے سوال پوچھا جا رہا ہے۔ کالرہ صاحب اس کی ذہنی غیر حاضری سے بھنا گئے اور زور سے چلائے:

''یو اِڈیٹ! یو!...'' (You idiot! you!...) کلاس کے سناٹے کو کالرہ صاحب کی چیخ نے توڑا تو راہی کو اپنی غفلت کا احساس ہوا۔ فوراً ہی کھڑا ہو کر اس نے کہا:

''جی!''

کالرہ صاحب اور زور سے چلائے:

''یو اِڈیٹ! ویر ور یو؟'' (You idiot! where were you?)

کالرہ صاحب نے اتنی ہی بات کہی تھی کہ راہی کے کمزور ہاتھوں کی گرفت میں دوات آ گئی اور آن کی آن میں دوات کالرہ صاحب کے منہ پر تھی۔ دوات کالرہ صاحب کی آنکھ کے نیچے اُبھرے ہوئے گال پر لگی۔ ان کا منہ لہو سے بھر گیا۔ کپڑے سیاہی سے لت پت ہو گئے۔

اس حادثے کے بعد ایک ہنگامہ ہو گیا۔ پرنسپل صاحب راہی کو اسکول سے نکالنا چاہتے تھے مگر راہی کے والد، جو بہت بڑی فوجی شخصیت تھے، کی یہ دھمکی تھی کہ وہ عدالت میں سب کو قطار میں کھڑا کر دیں گے۔ بات دب گئی۔ راہی اسکول کا ہیرو تھا۔ مگر 'اسی طرح وہی آخری بنچ' لباس سے لاپروائی اور خاموشی۔

اس حادثے سے پیشتر میں راہی کو کلرکوں کے کسی خاندان کا فرد سمجھتا تھا مگر یہ جان کر کہ ایسا نہیں ہے اور اس حادثے سے راہی کے وقار کے اظہار نے مجھے اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کئی دن تک متواتر وہ دن رات میرے ذہن پر سوار رہا، آخر چند دن بعد انٹر اسکول کرکٹ فائنل میں، جس میں ہمارا اسکول داخل ہو چکا تھا، مجھے راہی سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔

راہی تھرمس سے کپ میں بیئر انڈیل رہا تھا۔ میں نے قریب جا کر کہا:

''کیا خیال ہے آپ کا؟ ہم جیت جائیں گے۔''

اس نے میری طرف دیکھا اور میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا:
''بیئر پیو گے؟''
میں نے اچنبھے سے کہا: ''بیئر!''
''ہاں بیئر... "Nothing like beer, nothing like coffee and nothing like cricket."
"Nothing like cricket" کے پیش نظر میں نے کہا: ''تو آپ کرکٹ کا شوق رکھتے ہیں۔''
''نہیں اب نہیں۔ کبھی کبھی میچ دیکھنے چلا جاتا ہوں۔ ایک حادثے کی نذر ہو گیا، یہ جان لیوا شوق...!''

میں اس حادثے کے بارے میں استفسار کرنے ہی والا تھا کہ اس نے خود ہی کہا:
''ہم بنگلور میں تھے ملٹری کیمپ جالا ہلی میں۔ میرا اور روشن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک ہی ٹیم میں تھے۔ جب ہم دونوں کھیلتے تھے تو بڑے بڑے باؤلروں کے پسینے چھوٹ جایا کرتے تھے، ہماری ٹیم کی جیت پتھر کی لکیر کی مانند ہوتی تھی۔ مسلسل جیتتے رہنے نے میرا جان لڑا دینے کا جذبہ سرد کر دیا تھا۔ اس لیے میں مخالف ٹیم میں شامل ہو گیا تا کہ اور کوئی نہیں تو روشن ہی سے دو دو ہاتھ ہو جایا کریں۔ ایک بار کیمپ کرکٹ لیگ کے فائنل میں روشن کی ٹیم اور ہماری ٹیم پہنچ گئی۔ میچ ہو رہا تھا۔ تمام ملٹری افسر، ان کی بیویاں، بچے، سب کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمارے کرکٹ میچ کی واحد دلچسپی تھے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ میں بالنگ کر رہا تھا اور روشن بیٹنگ۔ اسی وقت دور سے روشن کو اس کی محبوبہ رین بو آتی دکھائی دی۔ ایمپائر سے بات کرنے کے بہانے اس نے میرے پاس آ کر مجھے لوز (loose) بال پھینکنے کو کہا کہ وہ اپنی محبوبہ کے سامنے چھکا لگا سکے۔ میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی طرف سے بڑا خطرناک بال پھینکا۔ وہ آگے بڑھا اور بال وکٹوں کے بیچ میں تھی۔ وہ دن اور آج کا دن، میرے اور روشن کے درمیان جو کچھ تھا، سب ختم ہو چکا ہے—''

خدا جانے اس کی اس بات میں کہاں تک صداقت تھی مگر مجھے اس بات نے متاثر کیا۔ اس ملاقات کے بعد ہم کئی بار ملے مگر یہ ملاقاتیں میری کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ سالانہ امتحان کے بعد بھی میرے اصرار کرنے پر وہ مجھے کئی بار کناٹ پلیس میں ملا۔ میں نے کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور اس نے پڑھائی ختم کر دی تھی۔ مجھے تعجب ہوتا تھا کہ اس کے والد نے اسے اور پڑھنے پر کیوں مجبور نہیں کیا۔ میں کئی بار اس کے گھر گیا تھا۔ وہ اور اس کے والد گہرے دوستوں کی طرح بے تکلف تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کے والد نے اس کی زندگی کے دھارے کو آپ سے آپ بہہ نکلنے اور راستہ تلاش کرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ ان کا کام تو صرف راہی کی آسودگی کے لیے ہر شے مہیا کرنا ہے۔

میں پانچ سال میں راہی کو بہت اچھی طرح جان گیا تھا۔ اس کی Nothing like فہرست میں ادب اور پانامہ سگریٹ بھی شامل ہو گئے تھے۔ اسکول کی زندگی تک تو اسے اپنے وجود کا احساس غیر شعوری طور پر تھا مگر اب اسے اپنے وجود کی اہمیت ہر وقت رگوں میں خون کے ہمراہ گردش کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی پسند، اس کا عمل اور اس کا کردار سماج کے سخت اور بھونڈے اصولوں کے مطابق نہ تھا۔ اس کے والد اور اس کے چند دوستوں کے علاوہ اسے قریب قریب ہر شخص نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، اس لیے وہ اپنے اصولوں پر شدت سے عمل کرنے لگا تھا۔ اس کے اصول یہی تھے کہ جسے زمانہ اپنائے، اسے ٹھکرا دو، جس کام کو زمانہ بُرا سمجھے، اسے کر گزرو۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی شادی نہیں ہو پاتی تھی۔ نوکری وہ کرتا نہیں تھا۔ رات کو گھر آتا تو رات رات بھر کمرے کی بتی جلتی رہتی تھی اور وہ ناول پڑھتا رہتا تھا۔ اور اگر وہ گھر نہیں آتا تھا تو ہفتوں نہیں آتا تھا۔

''اب کون نکھٹو، دُبلے پتلے، بیمار سے راہی کو لڑکی دیتا۔''

حالانکہ ایسے خاندان کے لیے لوگ ترستے ہیں۔ میرے سامنے ایک بار اس کے والد نے کہا:

''بیٹا! میجر رام لال کا رویہ انکار کا سا ہے۔ شاید ان کی لڑکی ششی رشتے پر رضامند نہیں۔''

راہی نے ایسی بات کہی کہ مَیں چکرا گیا۔

''ڈیڈی! میجر رام لال کی لڑکی ششی کے بارے میں کہہ رہے ہیں آپ؟ وہ راضی نہیں۔ مگر تعجب ہے ڈیڈی، ابھی تھوڑے دن ہوئے اس نے خوشی سے اپنا جسم مجھے سونپ دیا تھا— یہ پڑھی لکھی لڑکیاں بھی خدا جانے کیا ہوتی ہیں؟''

یہ تھا اس کا کردار اَن گنت رعنائیاں لیے ہوئے۔ ششی نے سماج کے ڈر سے اسے اپنانے سے انکار کر دیا تھا مگر اسے چند لمحوں کے لیے پانے کے لیے اپنے جسم کی دولت لٹانے سے گریز نہیں کیا تھا— یہ راہی کی جیت بھی تھی اور ہار بھی۔ جیت اس کے خون میں شامل ہو جاتی تھی اور ہار وہ سمجھ ہی نہیں پاتا تھا۔

میں نے راہی کو جتنا قریب سے دیکھا، اتنا ہی اس کے بارے میں سوچا اور جتنا اس کے بارے میں سوچا، وہ اتنا ہی میرے قریب آ گیا۔ اور نئے نئے انکشافات مجھ پر ہوئے— ہم دس بارہ دوستوں میں سبھی دوست راہی کی وجہ سے ہی ایک دوسرے سے متعارف ہوئے تھے۔ وہ کہتا

تھا:''میں فوارہ ہوں اور تم سب میری دھاریں!''

ہم میں سے ہر ایک نے خود اپنی اپنی جگہ پر راہی سے راہ ورسم بڑھانے کی پہل کی تھی — اس کی غیر موجودگی میں سب دوست صرف اس کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ ایک چھوٹی سی دنیا میں صرف وہی وہ تھا جہاں اس کی انا کی بادشاہت تھی۔

کوئی دو سال ہوئے، ٹی ہاؤس میں ایک صاحبہ رما واسودیوا کا بہت ذکر ہونے لگا۔ رما جرنلسٹ تھی اور دو سال لندن میں رہ کر واپس دلی آئی تھی۔ ہم لوگوں نے بھی اس کا اچھا خاصا ذکر کیا کہ قیامت ہے، خراماں خراماں چلتی ہے تو دل رُک جاتے ہیں۔ ٹی ہاؤس کا مالک رام سنگھ بات کرتے ہوئے گھگھیاتا ہے۔ آدھا Intelligentsia تڑپ رہا ہے...

راہی نے سب باتیں مشکل ہی سے برداشت کی ہوں گی کیونکہ دو ماہ بعد غیر متوقع طور پر وہ رما کی کمر میں ہاتھ لپیٹے ٹی ہاؤس میں داخل ہوا۔ Intelligentsia کے لبوں سے سگریٹیں چھوٹ کر میبل پر جا گریں۔

اس دن کے بعد ہم نے رما کو اکیلا کبھی نہیں دیکھا۔ وہ اور راہی اکٹھے گھومتے ہوئے نظر آئے۔

مجھ سے انجانے میں صرف ایک بھول ہو گئی تھی جس کی وجہ سے دو ماہ سے ہر محفل میں راہی مجھے نشانہ بنا رہا تھا۔ پہلے پہل تو میں خاموش رہا مگر راہی کے ساتھ اتنے سال اکٹھے رہنے کی وجہ سے مجھے بھی اپنی ذات کا احساس ہو گیا تھا، اسی لیے میں نے بار بار اس کے سامنے ڈٹ جانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

مجھ سے چھوٹی سی یہ بھول ہو گئی تھی کہ میں نے راہی کو تین بجے ٹی ہاؤس پہنچنے کو کہا تھا اور پھر ہمارا ارادہ فلم دیکھنے کا تھا۔ اتفاق سے میں بھول گیا۔ دوسرے دن راہی سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا:

''بلراج! معاف کرنا۔ میں کل تین بجے آ نہ سکا۔''

اس کا لہجہ قدرے تیکھا تھا مگر میں نے غور نہ کیا کیونکہ یہ اس کے موڈ کی وجہ سے بھی ہو سکتا تھا۔ مگر شام کو ٹی ہاؤس کے ویٹر سوامی نے، جو راہی کو بہت پیار کرتا ہے، مجھے کہا:

''کل صاب بہت ویٹ کیا۔ صاب آگ کے مافک تھا جو پاس آ کر بیٹھا جل گیا۔'' — یہ تھی میری چھوٹی سی بھول۔

وہسکی کے سرور میں راہی نے مجھ پر بھیانک حملہ کیا تھا، اس وقت تو میں قریب قریب روتا ہوا اپنی مجروح ذات کو گھر لے آیا۔

مگر میں نے ٹھان لی کہ راہی کو انا کے خول سے باہر نکال کے ہی دم لوں گا — مجھے اپنی بھول کا احساس تھا مگر اسے دوستی کا احساس نہیں تھا۔

میں نے بڑے بڑے پروگرام بنائے، ذہن میں نقشے تیار کیے مگر رد کر دیے۔ آخر دن رات کی مسلسل اور کربناک سوچ سے پتہ چلا کہ راہی کی شخصیت کا راز اس کی اہمیت ہے، جس کا اسے احساس ہے۔ اس کی اہمیت کو نظر انداز کیا جائے تو اس کی انا مجروح ہوگی اور اس کا انا سے تعمیر کردہ کردار گھروندے کی صورت بیٹھ جائے گا۔

میں نے اپنے گھر دعوت کا انتظام کیا۔ سب دوستوں سے مل کر انھیں شمولیت پر آمادہ کر لیا۔ کسی کے خواب میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ میں نے ابھی تک راہی کو دعوت پر نہیں بلایا ہے، جس کی شمولیت از حد ضروری تھی۔ جب سب راضی ہو گئے تو میں نے راہی سے کہا:

''بھائی جان، کل گھر پر مختصر سی صحبت رہے گی۔ سب کو مشکل سے راضی کیا ہے۔ آپ کو پہلے اس لیے نہیں کہا کیونکہ آپ تو اپنے ہی ہیں، اور پھر آپ کو جب چاہیں، جہاں چاہیں پکڑ لے جا سکتے ہیں۔ تو کل شام آپ ضرور آئیے گا۔''

راہی کو فنا کرنے کے لیے میری دانست میں اتنا کافی تھا۔ میں نے بھرپور اور غیر متوقع طمانچہ مارا تھا کہ سب دوست مشکل سے راضی ہوئے ہیں۔ اور وہ، اس کی کوئی بات ہی نہیں، اس کی شمولیت قریب قریب غیر ضروری ہے۔ ہم دس بارہ دوستوں کی دنیا، جہاں اس کی انا کی بادشاہت تھی، میرے انتقام سے لرز گئی تھی۔

راہی تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اُداس، فکر مند، جیسے کوئی بہت بڑا فیصلہ کر رہا ہو۔

آخر اس نے کہا: ''کل شام کس وقت؟''

میں نے فتح سی محسوس کرتے ہوئے جواب دیا: ''سات بجے۔''

اس نے اپنی خطرناک مسکراہٹ کے ساتھ مجھے زندگی بھر کے لیے فنا کر دیا۔

''بھئی معاف کرنا۔ میں کل شام چھ چالیس کی گاڑی سے بمبئی جا رہا ہوں۔''

دوسرے دن سب دوست اسے رخصت کرنے اسٹیشن پر گئے، اس لیے میرے ہاں دعوت پر نہ آ سکے۔

اس کی انا جسے میں انڈے کا خول سمجھتا تھا، قلعہ تھی جس میں وہ زمانہ بھر کی سرد مہری سے محفوظ تھا، زندہ تھا، اور میں، میری انا شدید طور پر مجروح ہو گئی تھی اور وہ زخم اب میری روح کا ناسور بن چکا ہے!

OO

('تحریک'، دلی: ۱۹۶۰ء)

میرا نام مَیں ہے

میرے قدم یکایک رُک گئے اور میری نظروں کے سامنے... اور میں نے دیکھا کہ... کہ ایک نیا... کہ ایک اجنبی... کہ... کہ...

اجنبی زمین، اجنبی آسمان، سب کچھ اجنبی —

دل کی دھڑکن اجنبی، تا حد نظر بکھرے ہوئے رنگ اجنبی —

پھول اجنبی اور بے نام؛ پیڑ بے نام اور اجنبی۔

آسمان صاف شفاف، دھلا ہوا، نیلا، گہرا اور اونچا؛ دور بہت دور، راکھ کی رنگت سی پہاڑی پر جھکا ہوا۔

پہاڑی، راکھ سا رنگ، جن، بھوت پریت سا انگ؛ سوئی ہوئی، محوِ خواب، زمین پر دراز۔

زمین، تا حد نظر، نظروں کے ہر زاویے کی حد میں، اَن گنت رنگوں کے ملبوس میں: سبز لکیریں، پیلے دائرے، گلابی تکونیں، کالے، لال، سفید، جنگنی نقطے — پوجا کے رنگ۔

ہوا، دھیمے دھیمے بہتی ہوئی، سیٹیاں بجاتی ہوئی۔

باس، نا آشنا، سرور انگیز۔

پھول، پیڑ اور پودے، حیراں۔

تنہائی، پریشاں۔

اُداسی، لرزاں۔

کھوئی ہوئی پگڈنڈیاں، بھولے بھٹکے راستے۔

دھوپ، پیلی اور مدھم۔

میں وہ دنیا دیکھا کیا، دیکھا کیا، دیکھا کیا — جگ بیت گئے۔

اور پھر میں نے قدم اٹھائے اور دھیمے دھیمے پگڈنڈیاں روندتا، راستے ناپتا، صدیوں بعد پہاڑی کے دامن میں پہنچا۔ یکایک میرے قدم رک گئے اور میں نے دیکھا... میں نے

پہاڑی کے دامن میں، جھکے ہوئے آسمان کے نیچے، میں نے ایک... سویا ہوا آدمی... دائمی نیند سویا ہوا آدمی... میں نے ایک،
میں نے ایک لاش دیکھی۔
گول پتھر کا تکیہ، پتھریلی سطح کا بستر، ہوا کی چادر۔
نرم، سوکھے، گھنے اور چاندی کی چند تاریں لیے سیاہ بال، ہوا کے پنکھے سے لرزاں۔
چوڑی، اُجلی، شکنوں سے بے نیاز پیشانی۔
تیکھی بھویں، پلکوں کے پردوں سے ڈھکی ہوئی آنکھیں۔
چہرے کی سطح سے کچھ ابھری ہوئی ناک۔
گالوں کی ہڈیاں، گندمی رنگت کے گوشت کی موٹی تہ سے ڈھکی چھپی۔
ہونٹ قدرے پھیلے ہوئے، مقناطیسی مسکراہٹ سمیٹے ہوئے۔
محبتوں، حسرتوں کا درپن۔
جانے کتنی صدیاں میں وہ درپن دیکھا کیا۔
میرے خدوخال میری نظروں کے سامنے واضح ہو گئے۔
میں ہانپتا کانپتا پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا اور پھر چند ہی لمحوں میں دوسری جانب نیچے اُتر گیا۔
درمیان میں پہاڑی تھی۔ میں اُس طرف بھی تھا اور اِس طرف بھی۔ اس طرف دور، چند جھونپڑیاں تھیں۔
میرے قدم بچی کچی قوتیں سمیٹ کر تیزی سے بڑھنے لگے۔

گھاس پھونس کی ایک تنگ سی جھونپڑی میری دنیا ہے اور سمے؟
اب کہ اتنا سمے بیت گیا ہے، سمے کہ دن، مہینے، سال اور صدیاں جسے سمیٹ نہیں سکتیں۔ اب بھی میرے ذہن میں جھکڑ چل رہے ہیں، آوازوں کے جھکڑ۔
تم نہ جانے کس دکھی آتما کا شراپ ہو کہ تمھارا وجود زہر ہے کہ آپ سے آپ رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے۔ جانے کتنے خوبصورت لوگ تمھاری قربت کے زہر سے (اپنے ہاتھوں) مارے گئے۔
پہلے جیت اور موہن گئے کہ انھیں دنیا حقیر دکھائی دیتی تھی اور کیوں نہ حقیر دکھائی دے کہ تم کہتے ہو، اس دنیا میں ذہانت کی کوئی جگہ نہیں۔ جیت اور موہن دغا کھا گئے۔

پھر ارجن دیو گیا کہ تم نے اسے کہا تھا: ارجن دیو، اس پہاڑی پر یہ وکٹری ٹاور کیوں تعمیر کیا گیا ہے، اس لیے کہ اس ٹاور سے ایک چھلانگ اور من کی شانتی نصیب۔

اور پھر باری آئی بنگلے امر کی کہ بیچارہ اپنی محبوبہ کو دو دو ہزار الفاظ کا ٹیلی گرام دیا کرتا تھا اور جواب سے محروم رہتا تھا اور تم نے اسے کہا تھا کہ جواب پانا ہے تو موت کی سرحد سے ٹیلی گرام دو۔

اور دھن راج! تم نے اس نازک اور کمزور لمحے میں اسے کہا تھا کہ ڈبل ڈیکر اس لیے سڑکوں پر دوڑتی ہے کہ کودنے کے لیے قطب نہ جانا پڑے۔

اور ترلوچن — سنگدل محبوبہ کو رام کرنے کے لیے محبوبہ کے سامنے زہر پھانکنا پڑتا ہے۔

اور ترلوچن کی موت پر تم نے کہا تھا کہ میرے دوستوں نے عجیب گورکھ دھندہ اپنا رکھا ہے کہ آئے دن خودکشی کرتے رہتے ہیں اور تم خوش ہو رہے تھے کہ... اور میں نے تمھیں کہا تھا کہ نہ جانے تم کس دکھی آتما کا شراپ ہو۔

اس شراپ کو ٹال دو، اب تمھاری باری ہے، تمھاری اپنی۔

آوازوں کے جھگڑا اتنے شدید ہیں کہ میرے درخشاں خد و خال مٹی مٹی ہو گئے ہیں — دکھی آتما کا شراپ میں نے اپنی ذات تک محدود کر لیا ہے۔

میں کی مندرجہ بالا تحریر پیش کرنے کے بعد اب ایک روزنامے سے خبر نقل کر رہا ہوں:

دھول پور میں خودکشی

(نامہ نگار)

دھول پور: ۸/ دسمبر: کل یہاں ایک جھونپڑی میں ایک انجان آدمی مردہ پایا گیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق موت کی وجہ بھوک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس شخص کے پیٹ میں گذشتہ بیس دن سے چاول کا ایک دانہ تک نہیں پہنچا تھا۔ جھونپڑی میں پانچ ہزار روپے کے کرنسی نوٹ، پھلوں کی دو ٹوکریاں، دودھ کی پانچ بوتلیں اور کئی تنوری پراٹھے ملے۔ خورد و نوش کا سارا سامان گل سڑ چکا تھا۔ آس پاس کے گاؤں میں اس خودکشی کا بہت چرچا ہے۔

اس خبر کے پندرہ دن بعد، یہاں کے ایک پندرہ روزہ پرچے میں سیاہ چوکھٹے میں جڑا ہوا ایک مختصر سا ماتمی نوٹ چھپا، جو یوں ہے:

مرحوم مَیں یہاں کے اِن ٹیلی جنشیا میں ممتاز تھے۔ آپ کو کریم آف ناردرن انڈیا کہا جاتا

تھا۔مَیں کی زندگی چند دوستوں اور کتابوں پر مشتمل تھی۔ گذشتہ تین سالوں میں ان کے تمام دوستوں نے یکے بعد دیگرے خودکشی کی۔ آخری دوست کی خودکشی کے بعد مَیں لاپتہ ہوگئے اور یہاں کافی ہاؤس اور پریس کلب میں اُن کی گمشدگی بات چیت کا موضوع بن گئی۔

ڈھول پور سے جو خبریں موصول ہوئی ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ مَیں صاحب نے بھی اپنے دوستوں کی طرح خودکشی کی۔ انھوں نے گہما گہمی کی دنیا سے بہت دُور، گھاس پھونس کی جھونپڑی کا انتخاب کیا۔ جھونپڑی میں دنیاوی عیش و آرام کا سامان مہیا کیا: پانچ ہزار روپے، پھلوں کی دو ٹوکریاں، دودھ کی پانچ بوتلیں اور تنوری پراٹھے۔ اور ان سب چیزوں کی موجودگی میں بھوکے پیٹ موت کے لیے تپسیا شروع کر دی اور آخر سات دسمبر کو ان کا تپ سماپت ہوا۔

مَیں کو مرنا تھا، مَیں مر گیا۔ بات صرف اتنی سی ہے۔

نوٹ: مَیں کی تحریر، ایک خبر اور ایک ماتمی نوٹ کو ترتیب دے کر، اوپر تلے چند ایک سطریں اپنی طرف سے جوڑ کر میں نے یہ افسانہ 'تیار' کیا اور ایک دوست کے حوالے کیا۔ افسانہ پڑھنے کے بعد میرے دوست نے کہا:

''میں کی تحریر اور تمھاری تحریر کا لب ولہجہ ایک سا ہے اور یہ بات خطرناک ثابت ہوسکتی ہے!''

میں خاموش رہا۔

کافی سے بیتنے کے بعد میں نے صرف اتنا کہا: ''مجھے ابھی کچھ کام کرنا ہیں...''

میرا خیال ہے، میں نے ٹھیک کہا تھا۔ مجھے ابھی افسانے لکھنا ہیں اور... ارے، آپ تو ہنس رہے ہیں!

OO

(سالنامہ 'ادب لطیف'، لاہور: ۱۹۶۸ء)

غم کا موسم[1]

میری جان،

تم شعور، لاشعور اور تحت الشعور کی بھول بھلیوں میں بھی راستہ تلاش کر لیتے ہو۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں۔ مَیں تمھاری ذہانت کا قائل ہوں — لیکن یہ کیا کہ تم اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اپنے یاروں دوستوں کی زندگی سے کھیلو۔ تم میرے عزیز ترین دوست ہو، میری زندگی کا کچّا چٹھا تمھارے علم میں ہے، پھر بھی تم گذشتہ دو ماہ سے میرے صبر کا امتحان لے رہے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میرے صبر کا پیمانہ چھلک جائے اور جو بھید میرے غیر حاضر، اُداس اور کھوئے کھوئے رہنے کے پس پردہ ہے، خود میری زبان سے بہہ نکلے — اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے تم ہر وقت میری طرف تیز اور زہر میں بجھے ہوئے جملے پھینکتے رہتے ہو جن کی تاب، تم سمجھتے ہو، مجھ میں نہیں ہے۔ میں بوکھلا جاؤں گا اور تمھاری مراد برآئے گی۔ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر تم یہ تو جان گئے ہو کہ مَیں کسی وجہ سے اُداس ہوں۔ تم وہ وجہ جاننا چاہتے ہو اور ساتھ ہی تمھیں یہ غم بھی کھائے جا رہا ہے کہ مَیں نے، تمھارے عزیز ترین دوست نے، تم پر اپنی زندگی کا یہ بھید کیوں ظاہر نہیں کیا ہے۔ جہاں تم گزشتہ دو ماہ سے مجھے ذہنی آزار پہنچا کر، میرا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے، چوری چوری لذّت حاصل کر رہے ہو، وہاں میں بھی پہلو بچانے کی کوشش میں اور تمھیں اُلجھانے میں ایک لطف محسوس کر رہا ہوں — لیکن آج ناکامی کے سبب تمھاری زرد زرد آنکھیں اور اُڑی اُڑی رنگت دیکھ کر مجھے اپنی زندگی کا وہ رُخ عُریاں حالت میں تمھارے سامنے لانا پڑ رہا ہے جس کے وجود کے بارے میں اب تک کوئی نہیں جان پایا ہے۔ اب یہ بالکل الگ بات ہے کہ تمھاری ذہانت کسی بھید کی موجودگی کو بھانپ گئی ہے — ہو سکتا ہے، میری بھیانک شکل تمھارے نرم و نازک اعصاب پر گراں گزرے اور تم پاگل ہو جاؤ یا خودکشی کر لو۔ اِن نتائج کے ذمّے دار تم خود ہو گے۔ میں کوئی ذمّہ داری قبول نہیں کروں گا۔

---

[1] ولادیمیر نوبوکوف سے معذرت کے ساتھ۔

میری جان،

تم نے کہیں میرے بارے میں لکھا ہے کہ یہ شخص، جسے ایک بہت بڑا حلقہ ذان نجوان کے نام سے جانتا ہے، بڑا زبردست کردار ہے۔ اِس کی ستائیس سالہ زندگی پر غم کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ یہ ہر گھڑی غم کھاتا ہے، غم پیتا ہے اور غم کے موسم میں گزشتہ ستائیس برسوں سے زرد سی، نازک سی کلی کے مانند کانپ رہا ہے — تمھاری بات افسانوی مبالغہ ہے۔ مَیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میری چھوٹی سی زندگی میں چند ایک زبردست حادثے پیش پیش رہے ہیں جواب مجھے اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ محسوس ہوتے ہیں۔ ان حادثوں کے بنا میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ میری زندگی میں جب کبھی کوئی حادثہ ہوتا ہے تو مَیں سمجھتا ہوں کہ جینے کے سامان بہت — اسے تم غم کا موسم کہو یا کچھ اور، مجھے کوئی اعتراض نہیں، کوئی افسوس نہیں۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اِس موسم میں سانس لینے کا جو لطف ہے، کاش وہ تمھیں دو گھڑی کے لیے نصیب ہو جائے۔ لیکن اِس کی کوئی امید نہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ میری موت بھی، جو یقیناً تمھارے لیے بہت بڑا صدمہ ہو گی، تمھیں اِس جان لیوا لطف سے محروم رکھے گی۔ تمھاری سوچ مشینی دور کی سوچ ہے جس میں جذبات پرستی ممنوع ہے۔

تم بارہا میرے کمرے میں آئے ہو، اور تم نے مِیرا کو بھی دیکھا ہے — مالک مکان کی وہ پیاری سی لڑکی جو ایک بار تمھاری موجودگی میں اپنے نازک ہاتھوں سے چائے بنانے پر بضد تھی اور اُسی ضد میں اپنا ہاتھ جلا بیٹھی تھی۔ تم اُسے غور سے دیکھتے رہے تھے اور پھر تم نے کچھ اس طرح کہا تھا کہ یہ چھوٹی سی دس بارہ سال کی لڑکی مجھے شدید طور پر پیار کرتی ہے۔ تمھارا تجزیہ تھا کہ میرا پیار اُس کے بالغ ہو جانے پر اُس کے لیے مشکل بن جائے گا۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ مَیں نے کب اور کیسے، یا پھر اُس ننھی سی جان نے مجھے کب اور کیسے موہ لیا تھا — مَیں دو برسوں سے مِیرا کا نیچ میں بسا ہوا ہوں اور انھی دو برسوں نے ہمارے پیار کی اَن کہی کہانی کا حسین اور دردناک رُوپ دھارن کر رکھا ہے۔

اب تمھیں کہوں تو کیا کہوں، کیسے کہوں — خیر سنو۔

مِیرا ہر روز صبح سویرے مجھے جگاتی — جب وہ مجھے اپنے ننھے ننھے سے نازک ہاتھوں سے جھنجھوڑتی، مَیں انجان بنا سوتا رہتا۔ جب وہ تھک جاتی، مَیں ایک دھماکے سے اُٹھ بیٹھتا اور لپک کر اُسے اپنی گود میں اُٹھا لیتا اور اُس کی پیشانی چوم لیتا۔

کبھی کبھی مَیں بالکل انجان بنا سوتا رہتا، اُٹھنے کا نام تک نہ لیتا — مِیرا رونی آواز میں کہتی:

''اگر آپ نہیں اُٹھتے تو میں جا رہی ہوں — مجھے اسکول بھی تو جانا ہے!'' اور وہ روٹھ کر چلی جاتی۔

تھوڑی دیر کے بعد مَیں اُٹھتا، اُس کے پاس جاتا اور اپنے لہجے کو قدرے تیکھا بنا کر کہتا: ''میرا، ہم تم سے ناراض ہیں۔ تم نے ہمیں جگایا کیوں نہیں؟''

وہ اپنی ماں سے کہتی: ''دیکھو ماں، اُنکل جھوٹ بھی بولتے ہیں!''

مَیں اُس کی بات سنتے ہی اُسے گود میں اُٹھالیتا اور اپنے کمرے میں بھاگ آتا۔ پھر ہم دونوں ایک ساتھ ناشتہ کرتے — وہ اسکول چلی جاتی اور مَیں دن گنوانے کے عمل میں مصروف ہو جاتا۔

جانتے ہو نا دوست، دن گنوانا کسے کہتے ہیں — وہ جو برجنت نے کہا ہے: ''دن بھر کی باتیں، دن کھو دیں گی... ''بس ایسی ہی کچھ بات۔

ہاں تو سنو۔ اُن دو برسوں میں مِیرا میری زندگی کا اٹوٹ انگ بن گئی تھی — اُس کی من موہنی صورت اور معصوم باتوں سے مجھے ذہنی سکون ملتا تھا۔

میرے دھیان میں دو برسوں میں ایک دن بھی ایسا نہ گزرا جب وہ میرے پاس نہ آئی ہو اور میری گود میں نہ بیٹھی ہو، اُس نے میرے گلے میں اپنی کومل بانہیں نہ ڈالی ہوں اور میرے بالوں میں اپنی نرم و نازک انگلیاں نہ اُلجھائی ہوں۔

اُس کے ماں باپ مجھ سے کہا کرتے: ''مِیرا تو تمھاری ہے۔ اِسے سنبھالو، پالو، بڑا کرو اور بیاہ دو!''

مَیں کہتا: ''کیوں مِیرا؟''

مِیرا کہتی: ''نہیں انکل، ماں مجھے نہیں چھوڑ سکتی۔''

اُس کے ماں باپ بھی اُسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے — اُن کی تمام خوشیوں کا محور بس مِیرا ہی تو تھی۔

کوئی دو ماہ ہوئے، اتوار کا دن تھا۔

بڑے زوروں کی بارش ہو رہی تھی — موسم کی اس شدید شرارت سے مَیں بہت خوش تھا اور پلنگ پر کروٹ لیے ایک بے نام سی لذّت محسوس کر رہا تھا۔

مِیرا کچھ بھیگی سی، میری کمر کے سہارے، مجھ سے جُڑ کر، پلنگ پر میرے ساتھ ترچھی بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے تک رہی تھی — اُس کا بارہواں جنم دن قریب ہی تھا۔

اُس دن مِیرا بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ اُس کا انگ انگ کھل رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

موسم میں یکایک ہی خنکی پیدا ہو گئی تھی اور مَیں مِیرا کے نازک جسم میں ہلکی سی کپکپی محسوس کر رہا

تھا۔

مَیں نے اپنی پھیلی ہوئی ٹانگیں قدرے سمیٹیں، اُن کے حلقے میں میرا کو ذرا باندھا اور اُسے چادر اوڑھاتے ہوئے کہا: ''میرا تمھارے جنم دن پر ہم تمھیں کیا بھینٹ دیں؟''

پہلے تو وہ ذرا کسمسائی، پھر اُس نے اپنا سر میری چھاتی پر ٹیک دیا — تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا: ''انکل، آج موسم کتنا اچھا ہے — بارش رُک جائے تو مجھے پکنک پر لے چلیے۔ ماں تو کہیں لے کر جاتی ہی نہیں — جنم دن پر چاہے کچھ نہ دینا۔ چلیں گے نا پکنک!''

مَیں نے اُسے کندھوں سے تھاما، اُسے ذرا اُٹھایا اور اُس کے گالوں پر ہلکے سے طمانچے لگاتے ہوئے کہا: ''اچھا بھئی، ابھی پورا دن پڑا ہے — بارش تھم گئی تو ضرور چلیں گے!''

اُس دن تو موسم کی جیسے نیت خراب تھی۔ بارش نے رُکنے کا نام تک نہ لیا — نہ بارش تھمی، نہ من مانا اور نہ ہم نے بستر چھوڑا۔

ہم نے بستر ہی پر آسن جمائے اور ناشتہ کیا۔

مَیں نے نیم دراز صورت میں کولہے جمائے، آرام دہ نشست بنائی اور اخبار کی سُرخیوں پر نظریں دوڑانے لگا — وہ مجھ سے لگی بیٹھی پیاری پیاری بچکانہ باتیں کرتی رہی۔

وہ میرے گھٹنوں پر کہنی رکھے بیٹھی ہوئی تھی اور باتیں سنائے چلی جا رہی تھی — مَیں کچھ تو اُس کی باتیں سُن رہا تھا اور کچھ اُسے دیکھ رہا تھا۔ اخبار مَیں نے ایک طرف رکھ دیا تھا اور میرے ہاتھ اب آپ سے آپ اُس کے بالوں سے شرارت کر رہے تھے۔

وہ جانے کیا کہے جا رہی تھی: ''رما کا بھائی بڑا شرارتی ہے۔ وہ اپنی کتابیں بیچ دیتا ہے اور اُن پیسوں سے فلمیں دیکھتا ہے — کل رما کے بابو جی نے اُسے بہت مارا۔ مارتے مارتے ہاکی توڑ دی۔ اُس کی ناک سے خون نکل آیا۔''

میرے ہاتھ اُس کے بالوں سے کھیلتے کھیلتے اُس کی پیٹھ تھپتھپانے لگے تھے۔ چند لمحوں کے بعد مَیں اُس کی پیٹھ سہلانے لگا۔ پھر مَیں نے اُس کے کندھے کے چپوؤں میں اپنی انگلیوں کی کیلیں چبھونا شروع کر دیں۔

وہ بڑے زوروں سے پھڑکی اور اُس نے کندھے جھٹکے — وہ ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مَیں نے پھر ایک کیل چبھوئی تو اُس نے میرا ہاتھ تھام کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا: ''نہیں انکل... ''پھر مدھم لے میں بولی: ''اچھا لگتا ہے پر درد ہوتا ہے!''

میں نے اُس کے گال پر تھپکی نما چانٹا مارا اور اُسے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ پھر مَیں نے اُس کی

پیٹھ پر اپنے بازوؤں کی زنجیر باندھ دی۔ بہت دیر تک وہ میری چھاتی سے لپٹی رہی۔ اُس کے ہاتھ میرے بالوں میں اُلجھتے رہے اور میری بڑھی ہوئی شیو سے چھلتے رہے۔

سرشاری کا عالم تھا یا کیا، کون جانے۔ نہ جانے کب تک ہم اُسی طرح گم سُم پڑے رہے۔

یکا یک اُس کے سانسوں کی حدت سے میں چونکا۔

مَیں نے اُسے کندھوں سے پکڑا اور اُٹھایا۔ اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں بھرتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ یوں لگا جیسے اُس کی آنکھیں نمناک ہیں اور اُس کی رنگت بھی کچھ اُڑی اُڑی سی ہے — وہ آہستگی سے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

مَیں نے اُسے پکارتے ہوئے کہا: "میرا، کیا بات ہے — تم ٹھیک تو ہو!"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی انگلیوں میں میری گردن گھیر لی اور اپنا سر میری چھاتی میں چھپا لیا۔

اُس کا دل میری پسلیوں کے قریب بڑے زوروں سے دھڑک رہا تھا اور اُس فتنہ ساماں موسم میں اُس کی آنکھوں کی نمی اِک مدّھم آنچ کی صورت میری چھاتی کو راحت بخش رہی تھی۔

مَیں نے اُسے پھر اُٹھایا اور اُس کے ننھے ننھے گداز اُبھاروں پر ہتھیلیاں جما کر، ہلکا سا دباؤ ڈال کر اُسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔

اُس کے ننھے اُبھاروں میں سخت نوکیں نکل آئیں اور وہ کانپنے لگی جیسے اندھا دھند بارش میں کوئی ننھا سا پرندہ کسی ننگی شاخ پر بیٹھے بیٹھے کپکپانے لگے۔ اُس کی آنکھوں میں اِک حسرت تھی، اِک چاہت تھی، اِک انجان طلب تھی — میری ہتھیلیوں تلے دبے پڑے اُس کے ننھے ننھے پستان سانسوں کے شدید اُتار چڑھاؤ میں قید ہو کر رہ گئے تھے اور اُس کے دل پر تو جیسے اَن دیکھے ہتھوڑوں کی چوٹ پڑ رہی تھی۔

میری جان،

وہ جو لڑکپن اور معصومیت کی حدود ہوتی ہیں، میرا اُن حدود سے باہر نکل رہی تھی۔ اُس کا جسم اُس خاموش تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا مگر وہ اپنے جسمانی ردِ عمل کو سمجھ نہ پا رہی تھی اور ایک لذت بھرے عذاب میں مبتلا تھی۔

اُس عذاب کا ایک سبب میری ذات تھی — مَیں نادانستہ طور پر میرا کو قبل از وقت جسم کی بھیدوں بھری دنیا میں لے آیا تھا — ہو سکتا ہے، اِس جملے کی صداقت پر تمھیں شک ہو۔

کہنا صرف اتنا ہے کہ ساری کیفیت میری سمجھ کے دائرے میں تھی۔

تو بارہ برس کی ایک بھولی بھالی گڑیا کے جسم میں ایک عورت جنم لے رہی تھی، یا جنم لے چکی

تھی۔اور وہ جنمی کنواری عورت جو میرا کے شعور کی زد میں نہ تھی، میری گود میں، میری چھاتی میں پناہ مانگ رہی تھی۔

وہ مجھے پہلے ہی سے بہت پیار کرتی تھی— تم اسے لڑکپن کی معصوم اور انجان محبت کہہ سکتے ہو— مگر اب اُس کے بارہ سالہ جسم میں ایک اور کردار جاگ اُٹھا تھا جو کم از کم اُس بارش بھرے دن میں، غیر شعوری طور پر، فقط طلب گار تھا۔ اور اُس طلب کی صرف ایک پہچان تھی: میرا وجود۔

مجھے علم تھا کہ میرا کے غیر شعوری احساس اور بے نام ضرورت کا سبب مَیں ہوں، اور مَیں ہی ہوں اُس کی پناہ— وہ تو بس نا آشنا شدتِ جذبات کے مارے مجھ سے لپٹ لپٹ رہی تھی۔

سچ کہوں گا میرے دوست— یوں بھی جھوٹ بولنے کا مطلب ہی کیا ہے۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی شرمندگی کا احساس نہ ہوا۔ اور یہی ہے میری خاموشی، میری آوارگی، میری گمشدگی اور میرے دُکھ کا کارن۔

مَیں میرا کو خود فراموشی کے نشے میں ایک انجانے اور نازک موڑ پر لے آیا تھا اور وہ ایک زبردست اَن دیکھے طوفان کے شکنجے میں پھنس گئی تھی۔ مَیں اُسے اُس نازک وقت پر بچا سکتا تھا، مگر—

تم نے لکھا ہے مَیں ڈان ژوان ہوں۔ میں ڈان ژوان کے بارے میں بس تھوڑا سا جانتا ہوں— یقین جانو، سچ کہوں گا اور سچ کے سوا اور کچھ نہ کہوں گا۔

جسمانی ملاپ نہ میرے دھیان میں تھا اور نہ مَیں ایک کچّی کلی کو مسلنا چاہتا تھا۔ مَیں تو آنے والے فرحت بخش دنوں میں ایک بے خبر جسم کو، قدم قدم، بتدریج، بیداری کی اُس آخری منزل تک اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا جہاں شہوت اور سپردگی اور جسمانی خلوص، مستقل اور بے پناہ کیف و نشاط کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سفر کے دوران، پل پل، ایک مضطرب اور کم سن حسن کا نکھار— ہائے میری یہ کمزوری۔ بس یوں سمجھ لو کہ میری اِسی ناقابلِ تسخیر کمزوری نے مجھے آن جکڑا— ایک معصوم کلی جو دنیا جہان تو کیا، خود اپنے وجود کی بے خبری میں گم تھی، مجھے ایک لذّتِ نا آشنا بخش رہی تھی۔

سنو اور سر ہاتھوں میں تھام لو۔

موسلا دھار بارش سے ڈھکے ہوئے دن کی مدّھم اور قدرے خنک روشنی میں، یوں لگ رہا تھا، میرا اپنے جسم سے باہر نکل رہی ہے— ماحول اجنبیت کا پُراسرار رنگ پکڑ رہا تھا اور جسمانی طور پر میرا کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ اُس کے سانس، مانو، دہکتی بھٹّی سے نکل رہے تھے۔ اُس کے ننھے ننھے بیدار پستان سانسوں کے شدید مدوجزر سے اُبھر رہے تھے، ڈوب رہے تھے۔ اُس کی

آنکھوں میں بے نام چاہت سلگ رہی تھی۔ اُس کی چوڑی اور گوری پیشانی پر نمی کی ایک تہہ دمک رہی تھی۔ اُس کے گھنے اور سوکھے بالوں میں بھیدوں بھرے موسم نے جال بُن رکھا تھا — خود اپنے آپ سے لڑتا ہوا وہ ننھا وجود، آہ...

مَیں اُسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا: ''کتنی جوانیاں، کتنے بھرپور جسم آنچ لیے، کبھی نزاکت کے ساتھ اور کبھی تیزی لیے زندگی میں آئے ہیں، مگر تسکین، ہائے بس ترسا کیے — یہ لڑکی میرا، یہ میری گڑیا، اِن ہاتھوں میں تشکیل پائے، تکمیل کو پہنچے، تسکین بنے...''

تمام دن میرے ہاتھ تشکیل، تکمیل اور تسکین کی اُدھیڑ بن میں اُسے سہلاتے رہے۔ وہ میرے ہاتھوں میں کربناک نشاط کی کیفیت میں پھڑپھڑاتی رہی، چھاتی سے لپٹی رہی — کبھی اندرونی تھکن سے چوُر ہو کر وہ اونگھنے لگتی اور کبھی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتی، انگڑائی لیتی اور پھر بازوؤں کے حلقے میں مجھے سمیٹنے کی کوشش کرتی۔

کون جانے دن کب بیتا اور کیسے بیتا —

کون جانے بارش کب تھمی اور پھر کب برسنے لگی۔

بس اتنا یاد ہے مجھ کو کہ شام ہوتے ہی اُس کی ماں اُسے لینے آئی — وہ سو رہی تھی۔ جاگنے پر اُس نے خمار آلود نظروں سے میری جانب دیکھا اور بہ مشکل کہا: ''ما... ماں، اَن... انکل بہت اچھے ہیں۔ مَیں اِن کے پاس رہوں گی۔'' اُس کی آواز میں اِک سکون تھا، اِک آس تھی۔

اُس کی ماں کچھ بوجھ نہ سکی، کچھ جان نہ سکی — وہ تو خود مجسم خرابی نظر آ رہی تھی۔ مَیں ایک نظر میں بھانپ گیا تھا کہ اُس مستی بھرے موسم میں وہ دن بھر پتی کی سنگت میں قیامت ڈھاتی رہی ہے۔

یوں بھی بات معمولی تھی۔ میرا کی ماں لوٹ گئی۔

میرا نے کوئی بات نہ کی، بس میری گود میں بیٹھی رہی — جانے لذّت کی وہ کون سی حد تھی جو اُس شام کے سکوت میں اُس کی پناہ بن گئی تھی۔

آٹھ بجنے کو تھے یا نو یا پھر دس، مَیں نے میرا کے ننھے پستان بڑے پیار سے مسلے اور اُسے اِک بے نام سرور کی حالت میں چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

مَیں نے سینڈوچ تیار کیے، دودھ گرم کیا — تبھی میرا کی ماں آ گئی۔

میرا نے پھر جانے سے انکار کر دیا۔

اُس کی ماں نے میری طرف دیکھا اور مَیں نے اُس کی طرف۔

اُس کی ماں نے کہا: ''یہ لڑکی گئی اپنے ہاتھ سے۔ اب سنبھالو اِسے!''

مَیں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اُس کی ماں نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا: "دِن تو اِس کے باپ کے کھاتے میں گیا ہی تھا، اب رات بھی اُسی کھاتے میں جائے گی..." اُس کی ماں مجھ سے کھل کر بات کرتی تھی۔ وہ یہ تک کہہ دیتی تھی کہ وہ میرے افسانے پڑھ کر بہک جاتی ہے۔

مَیں نے شرارت سے کہا: "اتنا یاد رکھنا کہ یہ نشیلا دن اور یہ جلتی بھنتی تنہائی میں نے تم لوگوں کو بخشی ہے— بھولو گی تو نہیں!"

اُس نے کہا: "کہانی تو نہ لکھ مارو گے!"

مَیں نے کہا: "دودھ ٹھنڈا ہو رہا ہے اور میرا نیند آ رہی ہے— تم اب جاؤ اور کھانا کھولو!"

مِیرا کی ماں نے قیامت بھری انگڑائی توڑتے ہوئے میری جانب دیکھا، پھر اپنے ڈھیلے لباس تلے تنی ہوئی بھری بھری چھاتیوں میں مِیرا کو بھینچا، ایک بار پھر مجھے دیکھا اور لغزش زدہ قدموں کے ساتھ لوٹ گئی۔

یقین جانو میرے دوست، مِیرا کی ماں تو اِک شہ دے کر، اِک ترغیب اچھال کر لوٹ گئی پر مَیں بڑی مشکل سے اپنے اعصاب پر قابو رکھ سکا۔ تناؤ کا وہ عالم تھا کہ چھپائے بنتا تھا، نہ ٹوٹنے کا نام لیتا تھا— اُس دگرگوں حالت میں بڑی مشکل سے دُودھ اور سینڈوچ مِیرا کے سامنے رکھ پایا۔

ہم سینڈوچ کھا رہے تھے اور دودھ پی رہے تھے۔ مَیں اپنی نشست کا زاویہ بار بار بدل رہا تھا اور اُس کی جانب دیکھ رہا تھا— تم کہہ سکتے ہو کہ اُس کی آنکھوں میں اپنی دگرگوں حالت کو پڑھ رہا تھا۔

مِیرا کو نہ تو سینڈوچ اچھے لگ رہے تھے اور نہ دودھ۔ اُسے میری اور اپنی ذات کے علاوہ کچھ بھی تو اچھا نہ لگ رہا تھا۔

اُس نے ایک دم دودھ ختم کیا، خالی گلاس تقریباً پٹخا اور میری گرم گود میں آن گری— مَیں کانپ کانپ گیا۔ بڑی مشکل سے اُسے الگ کر سکا— اُس کی آنکھوں میں حیرت بھری ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد مَیں نے فولڈنگ چارپائی کھولی اور پلنگ کے برابر بچھا دی۔

اُسے میں نے پلنگ پر سونے کو کہا اور خود چارپائی پر پڑ رہا۔

وہ میرا ہاتھ تھامے پلنگ پر دراز ہوگئی اور میری جانب کروٹ بدل کر مجھے دیکھتی رہی، بالکل بھیگی ہوئی کبوتری کی طرح— وہ میرا ہاتھ سہلاتی رہی۔ پھر اُس نے میرا ہاتھ اپنے ننھے ننھے پستانوں پر رکھ دیا۔ میرا ہاتھ متحرک انگلیوں کے ساتھ اُس کے ابھاروں پر دھرا تھا اور اُس کے ہاتھ میرے ہاتھ پر دباؤ ڈال رہے تھے۔

نہ جانے کب تک اُس کی پیاسی آنکھیں مجھے تکتی رہیں اور تھک گئیں اور نہ جانے کب اُس

کی بوجھل پلکوں کے پردے گر گئے۔

میں کچھ دیر تک اُسے دیکھتا رہا، ترستا رہا، پھر ایک کڑے ضبط کے ساتھ سو گیا۔

میری جان،

آخرِ شب تھی — آخرِ شب کی گھڑی تھی کہ ہلکی ہلکی سسکیوں نے میری نیند کھول دی۔

میرا میری جانب منہ کیے سسکیاں بھر رہی تھی اور کانپ رہی تھی۔ آنسوؤں کی نہریں اُس کے گالوں پر بہہ رہی تھیں۔

میرا دل دہل گیا۔

مَیں نے پیار کے مارے اُس کی پیشانی پر اپنے لب رکھے تو میرے لب جل گئے — اُسے شدید حرارت تھی۔ اُس کا بدن تپ رہا تھا۔

مَیں کانپنے لگا۔

مَیں نے اُس کے ماں باپ کو جگایا — وہ گھبرا گئے۔

ہم نے ٹیکسی منگوائی اور میرا کو ہسپتال لے گئے۔

ایک تو اُس کا بدن تپ رہا تھا، پھر اُسے سانس لینے میں بھی دقت محسوس ہو رہی تھی — آکسیجن کا سہارا لیا گیا مگر گھنٹے بھر میں اُس کے ڈوبتے اُبھرتے سانس بھی گننے کو نہ رہے۔

جب اُس نے آخری سانس لیا تھا، وہ میری جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، سہمی ہوئی کبوتری کی طرح۔

میری جان،

یہ ہے میری زندگی پر غم کے موسم کی ایک اور سیاہ اور دبیز چادر، جس کے المناک وجود کو جاننے کے لیے تم دو ماہ سے پریشان ہو رہے تھے۔

OO

(سالنامہ 'سات رنگ'، کراچی: ۱۹۶۲ء)

ظُلمت

اس نے کندھے جھٹکے — پیازی رنگ کی ساری کا پلو بائیں کندھے سے پھسل گیا اور بازوؤں میں تھم گیا، بازو جو چست بلاؤز میں کسی ہوئی چھاتیوں کے نیچے ننگے پیٹ پر دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں

میری آنکھیں جلنے لگیں — وہ میری اور بڑھ رہی تھی، دھیمے دھیمے، نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی، سفید کیپ، سفید بلاؤز، سفید اسکرٹ، سفید موزے، سفید سینڈل، گورے گال، گورے بازو، گوری پنڈلیاں۔ میرے ہونٹ

میرے ہونٹ سوکھ گئے — پیازی رنگ کی ساری کا پلو اس کے بازوؤں میں تھما ہوا تھا، بازو جو چست بلاؤز میں کسی ہوئی چھاتیوں کے نیچے ننگے پیٹ پر دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ میرے دانت

میرے دانت بھنچ گئے — وہ میری اور بڑھ رہی تھی، دھیمے دھیمے، نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی۔ سفید بلاؤز، سفید اسکرٹ؛ گورے گال، گورے بازو، گوری پنڈلیاں۔ میرا حلق

میرا حلق کانٹا ہو گیا — ننگے پیٹ پر دائیں بائیں پھیلے ہوئے بازو گر گئے تھے؛ پیازی رنگ کی ساڑی کا پلو فرش پر آن پڑا تھا؛ چست بلاؤز میں چھاتیاں کسی پڑی تھیں۔ میرا جسم

میرا جسم پھنکنے لگا — وہ میرے قریب آ گئی تھی۔ نپے تلے قدم، سفید اسکرٹ، گوری پنڈلیاں۔ میرا دم

میرا دم گھٹنے لگا — اس کی گردن تن گئی، بازو انگڑائی کو اُٹھ گئے۔ پیازی رنگ کی ساری کا پلو فرش پر تڑپ رہا تھا؛ ننگا پیٹ دمک رہا تھا؛ چست بلاؤز میں کسی ہوئی چھاتیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں؛ بلاؤز کے اوپر کے دو بٹن کھل گئے تھے۔ میرے سانس

میرے سانس رُکنے لگے — میرے ہاتھ بڑھے۔ میں نے اس کی کمر تھام لی اور میں عقاب کی سی تیزی سے جھپٹا اور

میرے ہاتھ اس کے کولھوں کو نوچ رہے تھے: ''آج تمھیں کیا ہو گیا ہے...''

پیازی رنگ کی ساڑی فرش پر پڑی تھی، بلاؤز دروازے کے قریب پڑا تھا اور میں نے
''... مجھے تمھاری ضرورت ہے۔''اس کے کولھوں کا گوشت سخت تھا۔
میں نے اسے نوچ نوچ لیا؛ گال، ہونٹ، گردن، چھاتیاں۔ اور اس نے مجھے نوچ نوچ لیا — اور
میں نے اس کی اسکرٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
''تم بیمار ہو... اتنی تیزی خطرناک ہے...''
میں اس کی چھاتیوں میں منہ چھپائے ہانپ رہا تھا۔
اس نے میرا سر اپنی چھاتیوں میں چھپالیا اور
اور میرے دائیں بازو میں سوئی اُتر گئی۔

صبح جب میری آنکھ کھلی، تھکن کے مارے میری بُری حالت تھی۔
تھکن کے مارے میری بُری حالت تھی اور میں بیمار تھا — مجھے کیا بیماری تھی، مجھے علم نہیں۔
میرا جسم میرے قابو میں نہیں تھا اور میرے ذہن کی باگ ڈور بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی۔
مجھے شدید احساس تھا کہ میرے جسم اور ذہن کی باگ ڈور میرے ہاتھ سے چھوٹ چکی ہے — شاید یہ احساس ہی میری بیماری تھی جسے ڈاکٹروں نے نہ جانے کیا نام دیا تھا اور کہ ڈاکٹروں نے میرے احساس کو کسی بیماری کا نام دیا تھا، میں جنرل وارڈ کے اسٹاف روم میں کئی دن سے پڑا تھا۔
اسٹاف روم کی مشرقی کھڑکی کے میلے شیشوں کو چیر کر پیلی دھوپ میری تھکی تھکی ٹانگوں پر پڑے ہوئے سرخ کمبل پر پھیل گئی اور ایک مانوس آواز نے کہا،''گڈ مارننگ اسٹاف...''
''گڈ مارننگ...''میں نے اس کی اور دیکھا۔
اب کہ میرے احساس کو بیماری کا نام دے دیا گیا تھا، میں نے آنکھیں میچ کڑوی دوا حلق میں انڈیل لی اور آنکھیں کھول اس کی اور پھر دیکھا۔
''کیسے ہیں آپ...''
''میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے، آپ کی آواز کہیں سنی ہے... آپ کی آواز، میرے ٹھنڈے بدن میں...'' مجھے شدید احساس تھا کہ الفاظ کے پرندے اب میرے جال میں نہیں پھنستے۔
''آپ کو کیا ہوگیا ہے...!''

''میں نے یہ آواز کہاں سنی ہے...اف ف ف...!'' میرے لب کانپنے لگے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ میرا دل ڈوب گیا۔

میری پلکیں گری ہوئی تھیں۔

میری گری ہوئی پلکوں کی اس اور پیلی دھوپ کا ایک تراشہ میرے پاؤں میں سرخ کمبل پر پڑا تھا اور میری گری ہوئی پلکوں کی اس اور میری نظروں کے سامنے ملگجی روشنی میں وہ ننگے بدن ساحل سمندر پر ٹہل رہی تھی۔

سمندر شانت تھا۔

موجیں دھیمے سروں میں اجنبی جزیروں کا گیت گا رہی تھیں۔

وہ مدہوش تھی اور ننگے بدن ساحل سمندر پر ٹہل رہی تھی۔

ساحل سمندر میری نظروں کے سامنے کمان کی طرح پھیلا ہوا تھا۔

وہ میری نظروں کے سامنے یوں کھڑی ہو جاتی کہ ساحل سمندر نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور پھر یوں پلٹتی، دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی کہ ساحل سمندر کے خط واضح ہونا شروع ہوتے اور وہ دور، بہت دُور، ننگے بدن کی ایک مختصر سی لکیر بن جاتی کہ میں اسے اپنی انگلی سے ناپ لیتا۔ وہ پھر پلٹتی، دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی میری اور بڑھتی۔

اس کا ننگا بدن لپٹوں کا سا تھا، بدن کے کچھ انگ کنتھئی تھے، بال سنہری تھے — آنکھیں سمندر تھیں، نظریں شانت موجیں تھی — تنی ہوئی گردن غرور تھی — اور اس کی چھاتیاں —

نہ جانے اسے کیا سوجھا، کیا محسوس ہوا، وہ لپکی اور سمندر میں کود گئی — میری نظروں کے سامنے پھیلے ہوئے ساحل سمندر پر آگ کی بہت بڑی کمان جلنے لگی — میں جل گیا، میری آنکھیں جل گئیں۔

سب پریتوں کی شرارت تھی۔

''آپ کی آنکھیں سرخ ہیں!''

آپ کی آنکھیں بھی تو سوجی ہوئی ہیں!''

''میں صبح سو نہ سکی!''

''آپ صبح سوتی ہیں؟''

''نہیں... رات میں ڈیوٹی پر تھی!''

''آپ کہیں کام کرتی ہیں!''

''آپ نہیں جانتے...؟''

''نہیں!''

''میں اسی ہاسپٹل میں کام کرتی ہوں اور رات میں اسی وارڈ میں ڈیوٹی پر تھی اور...''

''اور؟''

''اور آپ کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا؟''

''مجھے کیا ہو گیا تھا؟''

''آپ مجھے پہچانتے ہیں؟''

''نہیں!''

''آپ نے میری اسکرٹ نوچ ڈالی تھی اور...''

''ذرا دروازہ بند کر دیجیے!''

''آپ بیمار ہیں... تیزی آپ کے لیے خطرناک ہے...!''

''پھر...؟''

''اب آپ نے مجھے پہچانا؟''

''اپنی پنڈلیاں دکھائیے، تب شاید پہچان سکوں...!''

''او وگاڈ...!''

''آپ کون ہیں... جائیے!''

''اچھا... یہ رہیں میری پنڈلیاں...!''

''ہاں! کل رات تم یہیں ڈیوٹی پر تھیں... مجھے تمھاری ضرورت ہے...!''

''تم بیمار ہو، اتنی تیزی خطرناک ہے...!''

''سنو! جن ہوتے ہیں نا، ان کی جان پرندوں میں ہوتی ہے۔ ان ننھے پرندوں کو کھانے پینے کو کچھ نہ ملے تو وہ مر جاتے ہیں اور جن بھی مر جاتے ہیں...!''

''تمھاری باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں...!''

''آپ کی پنڈلیاں بڑی اچھی ہیں...!''
''میں تمھیں پیار کرتی ہوں...!''
''میں آپ کو نہیں جانتا... ہاں! آپ کی پنڈلیاں...''

اس نے میرے ہاتھ اپنے گلابی ہاتھوں میں تھام لیے۔
''تمھارے ہاتھ برف ہو رہے ہیں...!''
اس نے یکے بعد دیگرے میری دائیں بائیں ہتھیلیاں چوم لیں۔
''تمھارے ہاتھوں کی حرارت کہاں گئی...؟''
اس نے مجھے گلابی رنگ کا سوپ گہری پلیٹ میں ڈال کر دیا۔
''تمھیں ٹماٹروں کا سوپ اچھا لگتا ہے نا!''
''ٹماٹروں کے سوپ میں خون کی نمکین لذت ہوتی ہے...''
''کیسی باتیں کرتے ہو...!''
''تمھارے پاس پیازی رنگ کی ساری ہے؟''
''اب یہ کیا بات ہوئی...؟''
''تمھارے پاس پیازی رنگ کی ساری ہے؟''
''نہیں...!''
''پھر یہ سب کیسے ہوا...؟''
''کیا کیسے ہوا...؟''
''یہی کہ تم... کہ تم نے کندھے جھٹکے تھے، تمھاری پیازی رنگ کی ساری کا پلو بائیں کندھے سے پھسل گیا تھا اور تمھارے بازوؤں میں تھم گیا تھا، تمھارے بازو جو تمھارے چست بلاؤز میں کسی ہوئی تمھاری چھاتیوں کے نیچے تمھارے ننگے پیٹ پر دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ میری آنکھیں...''
''... تمھیں کیا ہو گیا ہے؟''
''مجھے کیا ہو گیا ہے؟''
''میں نے پیازی رنگ کی ساری پہن رکھی ہے...!''
''میرے پاس آؤ، میں تمھیں چھونا چاہتا ہوں!''

''نہیں!''

''میں تمھیں چھونا چاہتا ہوں!''

''نہیں! نہیں!! نہیں!!!''

حقیقتیں اور خواب، روشنی اور اندھیرے، ماضی اور حال — سب پگھل گئے۔ پھر پگھلا ہوا مواد ایک آہنی سانچے میں ڈال دیا گیا اور میں کہ میرا ایک ماضی تھا، حال تھا، میری کچھ حقیقتیں تھیں، کچھ خواب تھے، میں روشنی بھی تھا، اندھیرا بھی، یوں مٹ گیا کہ نشان تک نہ رہا۔ اب میں ایک کھلونا تھا، جذبات سے عاری، احساسات سے عاری۔ صبح ہوتی، شام ہوتی اور پھر رات اور پھر نیند۔ پھر صبح، پھر شام اور پھر رات اور پھر نیند — آہستہ آہستہ صبح، شام، رات اور نیند آگے پیچھے ہونے لگے، روشنی اور اندھیرے کی سرحدیں مٹ گئیں اور صرف نیند رہ گئی۔

ہزاروں دن بیت چکے ہیں کہ سال، میں نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ لوگ کہتے ہیں، میرا جسم میرے قابو میں ہے اور میرے ذہن کی باگ ڈور میرے ہاتھوں میں ہے لیکن پیازی رنگ کی ساری والی اور سفید اسکرٹ والی لڑکیاں کہتی ہیں، ''تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم خاموش کیوں رہتے ہو... کیا تمھیں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا!''

OO

('سیپ'، کراچی: ۱۹۶۵ء)

بھاگوتی

بھاگوتی تھکی ماندی گھر پہنچی اور دھڑام سے چارپائی پر گر پڑی۔
دھن پتی دروازے کی جانب پشت کیے الماری میں سے کونین نکال رہی تھی۔ وہ غیر متوقع دھماکے کی آواز سن کر سہم گئی۔ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ میں سے کونین کی شیشی پھسل کر فرش پر جا پڑی اور چکنا چور ہو گئی۔
شیشی کے ٹوٹنے کی آواز سن کر بھاگوتی نے ہانپتے ہوئے کروٹ لی اور الماری کی طرف دیکھا جہاں دھن پتی کھڑی تھی اور اس کی جانب سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
بھاگوتی نے نگاہوں سے دلاسہ دیتے ہوئے دھن پتی سے پوچھا:
''کون ہے بیٹا! کونین کس کو دے رہی ہو۔ لاجو کو؟ لیکن لاجو تو صبح مجھ سے لے گئی تھی۔''
دھن پتی ماں کی بات سن کر کانپ گئی جیسے سرد ہوا کا تیز جھونکا اس کے ننگے بدن کو چھو گیا ہو۔
''ارے ہوا کیا، شیشی ہی تو ٹوٹی ہے نا۔ وہ سامنے جو صندوق رکھا ہوا ہے اس میں ایک اور شیشی رکھی ہوئی ہے۔ اسے نکال کر گولیاں دے دو۔ پھر ٹوٹی ہوئی شیشی کو سمیٹ لینا۔ ہاں مگر یہ گولیاں کس کو دے رہی ہو۔'' بھاگوتی نے بیٹی کو بڑے لاڈ سے دلاسہ دیا۔
دھن پتی نے ماں کی جانب دیکھا۔ بھاگوتی کی آنکھیں جھیل کے پانی کی طرح ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ اوندھی لیٹی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے متزلزل آواز میں جواب دیا:
''ماں... وہ... وہ ہے، نا... وہ۔'' دھن پتی کی آواز ڈوب گئی۔ اس کے جسم میں کپکپی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ ماں کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکی اور فرش پر جھک کر کونین کی گولیاں اور شیشے کے ٹکڑے اکٹھے کرنے لگی۔
بھاگوتی نے دھن پتی کی طرف غور سے دیکھا۔ گولیاں اکٹھی کرتے ہوئے اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ اس کا سر حد درجہ جھکا ہوا تھا جیسے اس کے سر پر بوجھ ہو۔ دھن پتی کی یہ حالت دیکھ کر بھاگوتی یکایک بڑے زور سے چونکی۔ چونکنے کے ساتھ ہی اس کی ٹھہری ہوئی آنکھیں اُبلنے لگیں۔

اس نے عقاب کی سی نظروں کے ساتھ دھن پتی کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ اسے دھن پتی کا کھلا ہوا رنگ زرد دکھائی دینے لگا اور وہ جان گئی۔ دھن پتی کونین کی گولیاں کسی اور کے لیے نہیں، خود اپنے لیے نکال رہی تھی۔

بھاگوتی کا سارا جسم غصّے کے مارے کانپنے لگا۔ وہ اچھے ڈیل ڈول کی عورت تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ فوراً دھن پتی کا خون کر دے گی۔ وہ تھکی ماندی تو تھی ہی، اب اسے ایک اور جھٹکا لگا تھا۔ اسے تمام جسم میں ٹیس اٹھتی محسوس ہونے لگی۔ اس کی تمام قوتیں منتشر ہو رہی تھیں۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ چارپائی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑی مشکل سے اس نے خود پر قابو پایا اور اس نے اپنی تمام منتشر قوتوں کو یکجا کر کے دھن پتی سے کہا: ''دھن پتی، تیرے پیٹ میں بچّہ ہے!''

دھن پتی ماں کو چارپائی سے اُٹھتا دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے کونین کی جمع کی ہوئی گولیاں چھوٹ گئیں۔ ماں کی بات سن کر وہ نادانستہ طور پر کھڑی ہوگئی۔ اس وقت اسے ذلت سے زیادہ ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل بڑے زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کی ہڈیوں میں تھکن بھر گئی تھی۔ وہ گھبرا کر اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔

بھاگوتی کو دھن پتی کی گھبراہٹ پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ بڑے زور سے چلّائی: ''دھن پتی بول، تیرے پیٹ میں کس کا بچّہ ہے؟''

بھاگوتی غصّے سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دھن پتی خاموش رہی۔

بھاگوتی غصّے کی حدود کو تجاوز کر چکی تھی۔ اس کا تھکا ہارا جسم ستار کے تاروں کی طرح تن گیا تھا۔ اس کے بازو اکڑ گئے تھے، مٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔ بھاگوتی نے چاہا کہ وہ بڑھ کر دھن پتی کا منہ نوچ لے مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ اس کے پاؤں سن ہو گئے تھے۔ بھاگوتی نے کرب کی شدت سے چلّا کر کہا: ''کس کا بچّہ ہے؟''

بھاگوتی کی چیخ سن کر دھن پتی کا دم سا نکل گیا۔ اس نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا: ''بنواری کا۔''

بھاگوتی دوسرے لمحے ہی بے جان ہوگئی۔ اس کا کمان کی طرح تنا ہوا جسم ڈھیلا ہو گیا جیسے کمان کی ڈوری ٹوٹ گئی ہو۔ وہ چارپائی پر بے دم سی ہو کر گر پڑی اور اس کے منہ سے ''ذلیل، کمینی، ذلیل، کمینی'' کی آوازیں جھاگ کی طرح نکلنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد بھاگوتی کو محسوس ہوا کہ اس کے کان پھٹ رہے ہیں۔ وہ شدت جذبات سے دھاڑیں مارنے لگی۔ اس کا سر چکرا گیا اور اس کی آنکھوں میں دھندسی چھا گئی جس کے پیچھے اسے محلّے والے منہ پھلائے ہوئے اس پر

تھوکنے کے لیے آتے دکھائی دیے۔ جب اس کا ذہنی کرب اسے جھنجھوڑ چکا تو وہ پسینے میں شرابور ٹانگیں پھیلا کر چارپائی پر دراز ہوگئی اور دنیا کے آئینے میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔

بھاگوتی کو اس محلے میں رہتے ہوئے سات سال ہو گئے تھے۔ اس مدت میں اس کی خاموش طبیعت نے محلے والوں پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ اس کے متعلق سب یہی جانتے تھے کہ بیوہ عورت ہے، اکلوتی بچی کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہے۔ دائی کا کام کرنے سے واجبی پیسے مل جاتے ہیں۔ مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ محلے والوں کے نزدیک قابل رشک زندگی گزار رہی تھی۔ محلے والوں کی نظر میں اس کی عزت اس لیے بھی تھی کہ سات سال کے عرصے کے دوران تقریباً ہر گھر میں بچے کی پیدائش بھاگوتی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کتنے ہی ننھے منے گل گوتھنے پھلے پھولے تھے۔ اس نے اپنی محنت کا معاوضہ محلے والوں سے کبھی نہیں لیا تھا۔ حالانکہ محلے والے زچہ کے بستر سے اٹھنے کے بعد اسے کپڑوں یا حیثیت کے مطابق زیورات کی صورت میں فرض کی ادائیگی کر دیا کرتے تھے۔

جب بھاگوتی اس محلے میں آئی تھی اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا مگر نکھرا ہوا تھا۔ جسم بھرا ابھرا اور تنا ہوا تھا۔ بول چال، چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور اس کے ہاتھ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ بڑی سخت جان اور مضبوط ارادے کی عورت ہے۔ دھن پتی اس وقت دس سال کی تھی۔ اس کی صحت بھی قابلِ رشک تھی۔ سرخی مائل گورا رنگ، لمبے لمبے سیاہ بال، اور آنکھوں میں شرارتوں کے لیے ان تھک عزم۔ دھن پتی جب ہنستی تھی اس کے جسم کا ہر رنگ اس کی ہنسی میں شریک ہوتا تھا۔ دھن پتی خوبصورتی اور معصومیت کا مجسمہ تھی۔ وہ بھاگوتی کی بیوگی کے لیے سب سے بڑا ذہنی سکون تھا۔

بھاگوتی نے جب خود ہوش سنبھالا تھا، اس وقت اس نے اپنے آپ کو نالے کے پاس غلیظ سی جھونپڑیوں کی بستی میں پایا تھا جہاں وہ ایک غلیظ، کریہہ المنظر اور زوال پذیر صحت کی عورت کے ساتھ رہتی تھی جو ٹونے ٹوٹکے کیا کرتی تھی — عمر کے ساتھ ساتھ اس گندی جھونپڑیوں کی بستی میں اس نے اسقاط حمل کے طریقے سیکھے تھے۔ بڑھیا کی موت کے بعد بھاگوتی کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مالی مشکلات سے بچنے کے لیے اس نے اسی بستی کے ایک شخص سے شادی کر لی۔ داداگیری اس کے خاوند کا شعار تھی۔ کبھی وہ پیسے لے کر جلد گھر آ جاتا اور کبھی اس کی صورت دیکھے بھاگوتی کو ہفتے گزر جاتے۔

ابھی وہ حاملہ ہی تھی کہ اس کا خاوند ایک بلوے میں مارا گیا۔ خاوند کی زندگی ہی میں اسے

پیٹ بھر کے روٹی نصیب نہیں ہوئی تھی، اب خاوند کی موت کے بعد اسے روکھی سوکھی روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ اس کے سامنے مالی مشکلات کا پہاڑ کھڑا تھا۔ حمل کے ایام میں اس نے لوگوں کے برتن صاف کر کے پیٹ بھرا۔ دھن پتی کی پیدائش کے بعد اس نے کئی جگہ نوکری کی، مزدوری کی مگر اس نے خود کو کسی جگہ محفوظ نہ پایا۔ اس کی جوانی دیکھ کر بڑے بڑے لوگ عرش سے فرش پر اُتر آتے تھے۔

آخر بھاگوتی کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ بستی میں سیکھے ہوئے طریقوں سے اسقاطِ حمل کا کام شروع کر دے۔ اس کام میں اسے اپنی حفاظت دکھائی دیتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ بدنامی، ذلت اور شرم کے مارے ہوئے لوگ اس کے پاس آیا کریں گے۔ انھیں اس پر نظر اٹھانے کی ہمت ہی نہ ہوگی بلکہ وہ خود اس کے رحم و کرم پر ہوں گے کیونکہ ان کے راز اس کے پاس رہن ہوں گے۔ آخر اس نے اسقاطِ حمل کا کام شروع کر دیا۔

چند ہی دنوں میں اسے ایک دنیا جاننے لگی۔ ہر طبقے کی لغزشوں کے نشانات اس کے ہاتھوں مٹنے لگے۔ اس کے ہاتھوں پر بختیوں کے نشانات جم گئے۔ اس کے ہاتھوں میں مزدور کی سی توانائی آ گئی۔ وہ مزدور ہی کی طرح ان تھک محنت کرتی تھی کیونکہ اس کے سامنے زندگی کے پہاڑ جیسے اَن گنت سال کھڑے تھے اور اس کے ساتھ ایک اور معصوم جان بندھی ہوئی تھی۔

حمل کے اسقاط کا عمل شروع کرنے سے پہلے وہ مریض کو کہہ دیا کرتی تھی کہ جاں بحق ہونے کی صورت میں وہ ذمہ دار ہرگز نہیں ہوگی۔ مگر لوگوں کو اس پر اتنا یقین تھا کہ وہ اسقاط کے دورانِ عمل تمام تکالیف بھول جایا کرتے تھے۔ لوگ اس لیے اس کے پاس آیا کرتے تھے کیونکہ اس کی باتیں اور دلاسے ان کے لیے مرہم کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ لوگوں کے گھروں میں بھی جا کر اسقاط کیا کرتی تھی اور اگر کسی قسمت کی ماری عورت کے پاس اپنے گناہ کا بوجھ اُتارنے تک کی جگہ نہیں ہوتی تھی، بھاگوتی اسے اپنے گھر لے آتی تھی اور اسے دنیا بھر کی رُسوائیوں سے نجات دلا کر واپس بھیج دیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ زیادہ تر لوگ اس کے پاس اس لیے آتے تھے کیونکہ ان کی لغزشوں کے راز بھاگوتی کے پاس محفوظ رہتے تھے۔

بھاگوتی کو کبھی، اپنے دھندے پر شرمندگی کا احساس نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی اسے افسوس ہوتا تھا جب وہ خون کے لوتھڑے کو دیکھا کرتی تھی۔ اس وقت اس کے کانوں میں کئی چھپٹی چیلوں کی چائیں چائیں جیسی آوازیں گونجا کرتی تھیں اور اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ جایا کرتی تھی۔ دراصل اسے لوگوں کی کم ہمتی پر افسوس ہوتا تھا جو گناہ کے گڑھوں میں گرنے کے بعد ان گڑھوں میں سے باہر نکلنے کا یہی ذریعہ سمجھتے تھے کہ وہ گناہ کے نقوش کو مٹا دیں۔ وہ نقوش تو بھاگوتی

کے نزدیک پھول تھے جو گناہ کی بدبو پر فتح پانے کے لیے پھوٹتے تھے مگر جنھیں وقت سے پہلے ہی مسل دیا جاتا تھا۔ مگر وہ پھر بھی اپنا دھندا کیے جاتی تھی۔ جب وہ کسی زردی عورت کو سر جھکائے، پیٹ میں بوجھ لیے دیکھتی تھی تو فوراً اس کی مدد کرنے پر تیار ہو جاتی تھی۔

نئے محلے میں آنے کے بعد اس نے دائی کا کام شروع کر دیا۔ جب اس کے ہاتھوں کسی کے حمل کا اسقاط ہوتا تھا، اس کی اُلجھن اس وقت دور ہو جاتی تھی جب اس کے ہاتھوں کسی بچے کی پیدائش ہوتی تھی۔ ویسے اس کے نزدیک دونوں حالتیں ایک بوجھ تھیں اور وہ اس بوجھ سے چھٹکارا دلانے میں لوگوں کی خاطر خواہ مدد کیا کرتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ سماجی بندھنوں کی وجہ سے ایک حالت میں بوجھ سے جلد چھٹکارا حاصل کر لیا جاتا ہے اور دوسری حالت میں مقررہ وقت پر۔ ہاں اگر کوئی جی والا ہو تو پہلی حالت بھی دوسری بن سکتی ہے۔

چند ہی سالوں میں بھاگوتی کا کام بہت بڑھ گیا۔ انھیں دنوں اس کے پاس بنواری آنے لگا۔ سیاہ رنگ اور واجبی سے خدوخال کا چغد سا نوجوان۔ وہ لوگوں کو بھاگوتی کے پاس لایا کرتا تھا۔ بھاگوتی نے زندگی میں کبھی کسی کو ناپسند نہیں کیا تھا۔ وہ اسے گھر کا ایک فرد ہی سمجھتی تھی اور اس سے اتنی ہی محبت اور شفقت سے پیش آتی تھی جیسے دھن پتی کی طرح وہ بھی اس کی کوکھ سے پیدا ہوا ہو۔ اسے بنواری سے کبھی کسی قسم کے نقصان پہنچنے کا احتمال نہ تھا۔

وقت کی اُڑان کے ساتھ ساتھ بھاگوتی کو دھن پتی کی سوجھ بوجھ کا احساس ہوتا چلا گیا۔ وہ دھن پتی کی ہر بات، ہر حرکت کا خیال رکھتی اور اس کے ذرا اور بالغ نظر ہونے کا انتظار کرنے لگتی۔

دھن پتی جب سولہ سال کی ہوئی تو بھاگوتی نے اسے آہستہ آہستہ اسقاط کے گُر بتانے شروع کیے اور اسے اپنے کام میں شریک کرنے لگی۔

اسقاط کے سارے گُر دھن پتی کو یاد ہو گئے تھے۔ اس نے ماں کی نگرانی میں آزادانہ طور پر کام شروع کر دیا تھا۔ اب ان کے مریضوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ بنواری بہت زیادہ لوگوں کو لانے لگا تھا۔ بھاگوتی جب دھن پتی کو تندہی سے کام کرتے دیکھتی تو خوش ہوتی اور سوچتی کہ کچھ مدّت بعد اس کے آرام کے دن شروع ہوں گے۔ کچھ مدّت بعد اس کے خیال کے مطابق دھن پتی سارا کام سنبھالنے کی اہل ہو جائے گی۔ مگر آرام اس کی قسمت میں نہیں تھا۔

دنیا کے آئینے میں اسے اپنا تمام جسم رستے ہوئے پھوڑوں سے بھرا دکھائی دیا جن کی کوئی شکل نہیں تھی، بالکل خون کے لوتھڑوں کی طرح۔ اسے محسوس ہوا کہ سب پھوڑے خون کے لوتھڑے ہیں جن کی وہ واحد ذمہ دار ہے۔ اسے جھرجھری سی آگئی اور اس نے ڈرتے ڈرتے بڑی

مشکل سے آنکھیں کھولیں، جیسے محلے کے لوگوں کا ہجوم باہر کھڑا ہوا اور اس کوڑھ کی ماری کو محلے سے باہر نکالنے پر بضد ہو۔

صبح کی دھندلی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بھاگوتی نے الماری کی طرف یاس بھری نظروں سے دیکھا جہاں دھن پتی کے ہاتھ سے کونین کی شیشی پھسل کر ٹوٹ گئی تھی، وہاں دھن پتی ایک ہاتھ میں پانی کا گلاس تھامے اور دوسرے ہاتھ میں کونین کی گولیاں لیے، انھیں پھانکنے کو تیار تھی۔

بھاگوتی رات بھر میں آدھی رہ گئی تھی، مگر کسی برقی قوت کی مدد سے وہ عقاب کی مانند جھپٹی اور دھن پتی سے کونین چھین لی۔ دھن پتی کے لیے یہ سب غیر متوقع تھا۔ اس نے حیرت سے ماں کے چہرے کی جانب دیکھا ہی تھا کہ اس کے منہ پر بھرپور طمانچہ پڑا: ''کمینی، جانتی نہیں کہ حمل گرانا کتنا بڑا پاپ ہے۔''

دھن پتی کے کانوں میں طمانچے کی سیٹی گونج رہی تھی اور اب بھاگوتی کے الفاظ بھی اس کے کانوں میں زور زور سے چیخنے لگے۔

○○

('ساقی'، کراچی: ۱۹۵۷ء)

دھن پتی

تمام رات دھن پتی کروٹیں بدلتی رہی۔
نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اُس کا انگ انگ دُکھ رہا تھا اور ایک انجانے خوف کے مارے اُس کا بدن کانپ کانپ جاتا تھا۔
رات اُس نے آنکھوں میں کاٹ دی۔
صبح چار ساڑھے چار بجے اُس نے لکڑی کی دیوار کے دوسری طرف دھرم داس کی آواز سنی:
"رام میرے رام، تو سب کا رکھوالا ہے۔"
دھن پتی جانتی تھی کہ دھرم داس بلا ناغہ صبح چار ساڑھے چار بجے اُٹھتا ہے، رام کا نام لیتا ہے، پھر گلی میں نل پر نہانے چلا جاتا ہے، چاہے مئی جون کی گرمیاں ہوں یا دسمبر جنوری کے جاڑے۔
چند لمحوں تک وہ دھرم داس کے قدموں کی چاپ سنتی رہی جو نل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر ذرا دیر بعد اُس نے پانی کی تیز دھار گرنے کی آواز سنی جو جنوری کی صبح کے منجمد سناٹے کو توڑ رہی تھی۔
وہ تھر تھر کانپی اور اُس نے کروٹ بدلی — یکایک اُس کے ذہن میں ایک بھرپور خیال نے بھیانک انگڑائی لی اور وہ لحاف کی حدت کے باوجود بڑے زوروں سے کانپی جیسے نل کے نیچے دھرم داس نہ بیٹھا ہو، وہ ننگے بدن بیٹھ گئی ہو۔
تھوڑی دیر بعد وہ ڈیوڑھی میں دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی اور گلی میں نل پر نہاتے ہوئے دھرم داس کو دیکھ رہی تھی۔ نہانے کے بعد دھرم داس نے تولیے سے جسم صاف کیا، کمر پر تولیہ باندھا اور رام رام جپتا حویلی کی جانب بڑھا۔
ابھی اُس نے حویلی کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ دھن پتی دروازے کی اوٹ چھوڑ کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔
دھن پتی نے توبہ شکن انگڑائی لی — اُس کا مختصر سا بے ترتیب لباس اُس کی بھری بھری چھاتیوں کو قریب قریب نمایاں کر رہا تھا۔ اُس کے لمبے اور گھنے بال پریشان تھے اور اُس کی رات بھر

کی جاگی آنکھوں میں خمار کی سرخی صاف جھلک رہی تھی۔ اُس کے بے آرام جسم میں تھکن کے مارے ہلکی سی لرزش تھی، ایک ڈھکی چھپی عیاں ترغیب — وہ سراپا نفس دکھائی دے رہی تھی۔

دھرم داس نے دھن پتی کو پانچ برسوں کے بعد غیر متوقع طور پر یوں مجسم دعوتِ نظر وعمل رُوپ میں دیکھا — وہ سیڑھیوں ہی پر ٹھٹکا اور اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اُس کی قوتِ حرکت سلب ہوگئی اور وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکا۔

دھن پتی زیرِ لب مسکرائی اور دھرم داس کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو پڑھنے کے بعد مضبوط قدم اُٹھاتے ہوئے ڈیوڑھی کے اُس طرف، دالان کی دائیں جانب اپنے کمرے میں چلی گئی — وہ دھرم داس کو ڈانواڈول کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

اگلی صبح وہ پھر ڈیوڑھی میں کھڑی ہوگئی۔ سنسان صبح، ویران گلی، خاموش حویلی، روشن ڈیوڑھی — کپکپا دینے والی نمناک سردی کے باوجود اُس نے تن پر بے نیازی سے ایک دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ اُس کا سُرخی مائل گندمی جسم مخروطی اُٹھانوں اور بھری بھری گولائیوں کے ساتھ کوندے کی طرح لپک رہا تھا۔ مہین سی دھوتی میں تو جیسے اک آگ سی لگی تھی — اُس نے دیکھا کہ دھرم داس کی گھنی مونچھیں کانپ رہی ہیں، پیشانی پر کربناک بل پڑ گئے ہیں، آنکھیں پھٹ رہی ہیں...

دھن پتی ابھی سولہ برس ہی کی تھی جب اُس کا بیاہ ہوگیا تھا — وہ دس گیارہ برس کی عمر ہی سے اپنے جسم میں ایک انجانی سی کپکپی محسوس کرنے لگی تھی۔

جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا، اُس نے خود کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں محصور پایا تھا۔ اُسی حبس آلود کمرے میں اُس کا بچپن گزرا تھا اور اُسی گھٹن بھرے ماحول میں اُس نے اپنی ماں اور باپ کو، وقت بے وقت، عجیب وغریب حرکتیں کرتے دیکھا تھا۔ شروع شروع میں وہ اُن حرکتوں کو شعوری طور پر کوئی معنی نہ دے پائی تھی مگر پھر نہ جانے کب سے، جسم کی اُٹھان کے کس برس سے اُس کے معصوم جسم میں سنسناتی سی لہریں دوڑنے لگی تھیں۔

ماں باپ کی جنسی حرکات، اندھیرے اور اُجالے میں دھن پتی کی متحیر آنکھیں اور سلگتے کان اور اُس کے اپنے تھرکتے ہاتھوں میں اُس کا اپنا کانپتا بدن — وہ پندرہ برس کی عمر ہی میں اِک کسک اِک تڑپ لیے جوان ہوگئی تھی۔ اُس کی سخت، گول اور نوکیلی چھاتیاں جو اُس کے اپنے ہاتھوں کے لمس سے بخوبی آشنا تھیں، غیر نظروں کے لیے مستقل دعوتِ نظارہ بن گئی تھیں۔

سولہ برس کی عمر میں وہ غیر ارادی طور پر ایک عجیب حرکت کر بیٹھی — ایک دن وہ کمرے میں بیٹھی اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ہنسی ٹھٹھے میں مصروف تھی۔ اُس کا بھائی، جس کی عمر نو دس برس تھی، اُس کی گود میں بیٹھا اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ کبھی وہ اُس کے اُبھاروں کے درمیان جھولتی چوٹی تھام کر زور سے کھینچتا اور اُس کی گردن جھکا لیتا اور کبھی اُس کے تمتماتے گال تھپتھپانے لگتا۔ کبھی وہ اُس کے بازو مروڑتا اور کبھی اُس کے ساتھ لپٹ لپٹ جاتا۔ تن بدن کے اس معصوم کھیل میں وہ بہک سی گئی۔ اُس نے بھائی کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور اپنے ابھاروں میں چھپا لیا۔ پھر جیسے آپ سے آپ، ایک بے اختیار جنبش سے اُس کی چولی کی گانٹھ کھل گئی اور پھر اُس کا ایک کنوارا پستان چھوٹے بھائی کے پتلے اور نازک ہونٹوں کی گرفت میں تھا — تبھی اُس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی اور چپ چاپ اُلٹے پاؤں لوٹ گئی۔

ٹھیک ساتویں دن دھن پتی کو ڈولی میں بٹھا کر سسرال بھیج دیا گیا۔

سہاگ کی رات دھن پتی کو سخت مایوسی ہوئی۔

اُس کا پتی اوم سترہ برس کا دُبلا پتلا لڑکا تھا جو اپنی عمر سے چھوٹا دکھائی دیتا تھا۔ وہ پتی دھرم کی سمجھ تو رکھتا تھا مگر عمر کے کچے پن کے سبب اُس سے جنسی عمل کی پختگی سنبھل نہ پاتی تھی اور پل دو پل میں بہہ جاتی تھی۔

دھن پتی، برسوں کی تپتی عورت پتی کے ناپختہ جنسی عمل سے حواس باختہ ہوگئی —

یہی وہ مقام تھا، یہی وہ وقت تھا اور یہی وہ موقع تھا جو اوم کے بڑے بھائی دھرم داس کی تلاش تھا۔ وہ گھاگ تھا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا۔

دھن پتی کو جسم کی بھول بھلیوں میں کھونا تھا، اور وہ کھو گئی — دھرم داس اور وہ اُبلتی ہوس بھری جسمانی لذتوں میں گم ہو گئے۔ بس وہ لپٹیں اُٹھیں، وہ آگ بھڑکی کہ تن بدن پھنک پھنک گئے۔

دھن پتی کے نفس کی بھٹی اور دھرم داس کے توانا جسم کا ایندھن...

دھن پتی جنسی تشفی کی منزل تک پہنچی تو سنبھلی اور پھر اپنے آپ میں لوٹ آئی۔

لوٹ آنے کے بعد اُس نے پہلی مرتبہ اپنے پتی کو آنکھ بھر کر دیکھا: دُبلا پتلا معصوم سا ایک لڑکا

جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا۔ میانہ قد، گورا رنگ، چوڑی پیشانی، بھوری رنگت لیے ہر دم مسکراتی آنکھیں، نازک گلابی ہونٹ۔

اوم کی شکل وصورت میں کچھ ایسا اپنا پن تھا جو بچپن کے ساتھی میں ہوتا ہے۔ دھن پتی کانپ کانپ گئی۔

اُس کے اُبال نے اُس کی آنکھیں اندھی کر ڈالی تھیں اور وہ اپنے پتی کی سندرتا دیکھ نہ سکی تھی۔ سندرتا جو اُس کے پتی کی ہر بات میں تھی۔ توازن اور ٹھہراؤ کا ایک حسین نمونہ۔ وہ بہت کم بات کرتا تھا۔ مگر جب وہ بولتا، بڑی نپی تُلی بات کہتا۔ سنجیدگی اور متانت اور ہلکا پھلکا مزاج۔ اُس کی ہر بات، محبت بھری ایک تھپکی — دھن پتی احساسِ گناہ میں ڈوب گئی۔

اُس نے دھرم داس کا ہاتھ بُری طرح جھٹک دیا۔

دھن پتی کی سسرال مختصر تھی۔

ایک تو دھرم داس تھا جو صبح سویرے کام پر نکل جاتا اور سورج سر پر آتے آتے گھر لوٹ آتا۔ دوسری تھی دھرم داس کی پھوہڑسی بیوی راجو جو اکثر بیمار رہتی اور تھکی ماندی سی دن بھر چارپائی پر پڑی رہتی۔ تیسرا تھا اُن کا ایک بچہ جو ماں باپ کی شفقت بنا اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا۔ چوتھا جنا تھا اُس کا پتی اوم جو تمام دن کسی دُکان پر مشقت کرتا رہتا اور شام کو ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھنے چلا جاتا۔

اُن کے پاس ایک بڑا سا کمرہ تھا جس کے عین بیچ میں لکڑی کی ایک عارضی دیوار کھڑی کرنے کے بعد اُسے دو چھوٹے کمروں میں تبدیل کیا گیا تھا — دونوں بھائیوں کے پاس ایک ایک کمرہ تھا۔

دھن پتی اپنے ماں باپ کے تنگ وتاریک کمرے سے بھوکا اور پیاسا جسم لیے سسرال کے غیر صحت مند ماحول میں پہنچی تھی۔ اِسی ماحول میں اُس کی جسمانی بھوک اور پیاس بجھی تھی، اور اسی ماحول میں اُسے احساسِ گناہ نے جکڑ لیا تھا — اب وہ جی جان سے پتی کی خدمت میں لگ گئی۔

دھیرے دھیرے، ہولے ہولے سپردگی کے نئے نئے زاویوں کے ساتھ اُس نے اپنے ناپختہ پتی کو اپنے جسمانی تقاضوں کے مطابق ڈھال لیا۔ اُس نے جسم کے وہ وہ بھید کھولے، وہ وہ فتنے جگائے کہ اُس کا پتی اُس کا ہو گیا اور وہ خود پتی کی ہو گئی — جب وہ ہم بستری کرتے تو اُن کا جسمانی ملاپ انھیں انجانی دنیاؤں میں لے جاتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ دھن پتی کا احساسِ گناہ ماند پڑ گیا، لیکن وہ ہر دم انجانے خوف سے ڈرتی رہی۔

ایک دن ایک معمولی سی بات پر دھن پتی کی جیٹھانی راجو نے اُس کی دنیا میں آگ لگا دی۔
راجو نے کہا: ''میں اپنی سوت کو بھول تو نہیں سکتی — اس لونڈے اوم کو تو پتا نہیں، پر مجھے تو پتا ہے کہ تو میرے مرد کا بستر گرماتی رہی ہے...''
تمام رات دھن پتی کروٹیں بدلتی رہی۔

دھرم داس بُری طرح پریشان تھا۔
اُس سے اپنے جسم کا تناؤ سہا نہ جاتا تھا۔ پچھلے دو دن اُس نے بڑی مشکل سے گزارے تھے، اور اب وہ صبح ہونے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔
اُس کے مضبوط بازوؤں کی گرفت دھن پتی کی ہڈیاں چٹخانے کی دُھن میں تھی — لیکن اب وہ اوم سے ڈرتا بھی تھا۔ اوم اب بچہ نہیں تھا۔
دھن پتی تین مرتبہ پھر اُس کے سامنے اُسی طرح سراپا دعوت بنی ہوئی آئی اور اُسے پھونک کر چلی گئی — وہ سیڑھیوں ہی پر ٹھٹکا رہا، جلتی آنکھوں سے دھن پتی کو دیکھتا رہا، اور منوں بھاری قدم نہ اُٹھا سکا۔
پھر دھن پتی نے اُس کے سامنے آنا بند کر دیا۔
دھرم داس رات رات بھر صبح کے چار بجنے کا انتظار کرتا مگر دھن پتی دکھائی نہ دیتی — وہ چڑ گیا، اُلٹ گیا — اب وہ معمولی سی بات پر اپنے بچے کو پیٹ دیتا، پتنی کو بلاوجہ تھپڑ مار دیتا — وہ پاگل پن کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

کوئی ایک ماہ بعد دھرم داس صبح چار ساڑھے چار بجے معمول کے مطابق نل پر جانے کے لیے ڈیوڑھی تک پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ دھن پتی ململ کی دھوتی میں لپٹی پانی کی تیز دھار کے نیچے

بیٹھی ہے۔ اُس کا گورا بدن عریانی اور نیم عریانی کا کانپتا ہوا لباس دکھائی دیتا تھا۔

جب دھن پتی نہا کر گورے بدن سے چپکی ململ کی دھوتی کے برائے نام پردے میں لپٹی کھڑی ہوئی تو دھرم داس کا سر گھوم گیا۔ وہ ڈیوڑھی میں آنکھیں پھاڑے دھن پتی کو دیکھتا رہا۔

دھن پتی دھیرے دھیرے تینوں سیڑھیاں چڑھی اور دھرم داس کے پاس آن کر رُک گئی۔

دھرم داس اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

دھن پتی نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ کھولے، ڈھیلے کیے اور گرا دیے — اُس کا پلو زمین پر تھا اور اس کی مغرور چھاتیاں بنا بندھن تنی ہوئی تھیں۔

دھن پتی نے ہولے سے دھرم داس کا دایاں ہاتھ تھاما، سہلایا اور پھر اپنی چھاتیوں پر پھرانے لگی۔

دھرم داس صرف اتنا بول سکا: ''دھنو...''

دھن پتی نے اس کا سر جھکایا، اپنی چھاتیوں میں بھینچا اور دھیمے سے پچکارتی آواز میں کہا: ''پہلے اُس چڑیل راجو سے تو نپٹ لو!''

جیسے ہی دھرم داس نے اُس کی چھاتیوں کو اپنے دہکتے ہونٹوں سے چومنا شروع کیا، وہ ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی اور تیزی سے قدم اُٹھاتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

صبح جب راجو چائے لائی تو دھرم داس اپنے آپے میں نہیں تھا — اُس نے چائے کا گلاس دروازے پر دے مارا اور راجو کا گلا دبوچ لیا: ''حرام زادی کو چائے تک بنانی نہیں آتی۔''

بیمار راجو اُس کے وحشی ہاتھوں کی گرفت سے نہ نکل سکی اور تھوڑی ہی دیر میں اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

چھ ماہ بعد ایک دوپہر اوم سوجے ہوئے اور کھنچے ہوئے چہرے کے ساتھ گھر آیا اور اُس نے دھن پتی کو بتایا کہ بڑے بھائی کو عمر قید کی سزا ہو گئی ہے۔

دھن پتی نے ایک گہرا لمبا سانس لیا اور دھرم داس کے روتے ہوئے بچے کو سینے سے لگا کر بولی: ''آج سے میں تیری ماں ہوں...''

OO

('شکم'، جموں: ۱۹۶۲ء)

بیزاری

خودکشی کرنے والوں کی تاریخ مرتب کی جائے تو ان کی خودکشی کا مقام سب سے اہم ہوگا۔ اس لیے نہیں کہ ان کی شخصیت اہم تھی، بلکہ اس لیے کہ انھوں نے جمالیاتی قدروں کا احترام کرتے ہوئے خودکشی نفاست سے کی۔

تین جولائی سن پچپن، چھ بجے شام کا ذکر ہے۔

ہماچل ریستوراں میں معمول کے خلاف خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

جیت اور موہن، بے تکلفی سے ٹانگیں پھیلائے، کونے کے صوفے میں دھنسے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی خلافِ توقع خاموش تھے اور انھیں اس کا شدید احساس تھا۔ شدتِ احساس کی وجہ سے انھیں ہر شے اجنبی لگ رہی تھی۔ ''ہماچل ریستوراں کے بیرے ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شرما جی ہمیں حقارت سے تک رہے ہیں'' — کم از کم وہ سوچ اسی طرح رہے تھے۔

جیت نے تھکی تھکی سی نظروں سے موہن کی طرف دیکھا۔ نگاہیں ملتے ہی دونوں کے من میں بیک وقت یہ خیال اُٹھا: ''دنیا اب ہمیں حقیر سمجھ رہی ہے...''

حقارت کے احساس کو بمشکل ذہن سے پرے دھکیلتے ہوئے موہن نے عجیب سی بات کہی: ''جیت، ٹھیک تین برس بعد ہم دونوں اکٹھے خودکشی کریں تو کیسا رہے!''

جیت نے موہن کی عجیب سی بات کو سنجیدگی سے قبول کرتے ہوئے جواب دیا: ''مذاق تو نہیں کر رہے یار!''

موہن نے اپنی بات رکھتے ہوئے کہا: ''مذاق...؟ تم ہاتھ تو بڑھاؤ۔''

جیت نے موہن کا ہاتھ شدّتِ جذبات سے دباتے ہوئے کہا: ''ٹھیک ہے... یاد رکھو، تین

جولائی سن اٹھاون ہمارے لیے حرام ہے۔''

رات کو دس بجے جب دونوں بچھڑے تو وہ محسوس کر رہے تھے جیسے انھوں نے اپنی منزل کا راستہ پالیا ہو۔

دوسرے دن جیت نے کناٹ پلیس کی ایک مشہور دکان سے ایک بڑی قیمتی اور بڑی خوبصورت نوٹ بک خریدی۔ نوٹ بک کے پہلے صفحے پر اس نے کاتب سے عربی رسم الخط میں عنوان لکھوایا: ''میری آہیں تو چند جھونکے ہیں!''

اس کی زندگی اور موت کے درمیان جو تین برس سانس لے رہے تھے، وہ انھیں نوٹ بک میں محفوظ کر دینا چاہتا تھا، لیکن جیسا کہ عام طور پر عُجلت پسند خلوص کے بندوں کے ساتھ ہوتا ہے، تین برسوں میں اس نے صرف سات صفحے لکھے، اور ہر صفحہ چند لفظوں پر مشتمل ہے، اور یوں ہے:

چار جولائی ۱۹۵۵ء: مجھے اور موہن کو اپنی منزل کا راستہ مل گیا ہے...

سترہ دسمبر ۱۹۵۵ء: آج سے بیس برس قبل مَیں پیدا ہوا تھا اور مَیں نے اُسی دن اپنے خدا کا گلا گھونٹ دیا تھا...

اٹھارہ جنوری ۱۹۵۶ء: منٹو کو مرے ایک برس ہو گیا ہے۔ کاش اُس سے ملاقات ہوئی ہوتی۔ کیا قیامت کا آدمی تھا...

پانچ اکتوبر ۱۹۵۶ء: آج مَیں نے اور موہن نے، جی بی روڈ کی مشہور طوائف تارا کو، غالب کی غزلیں سُنائیں...

اِکیس مئی ۱۹۵۷ء: دستوئیفسکی کہتا ہے: ''دُنیا میں جتنے بڑے آدمی ہوں گے، وہ دُنیا کا بڑے سے بڑا غم اپنے سینے میں دفن کیے ہوں گے...

بارہ نومبر ۱۹۵۷ء: میں نے اپنی تمام جائداد اپنی چھوٹی بہن کے نام منتقل کر دی ہے...

یکم جنوری ۱۹۵۸ء: میری زندگی کے آخری برس کا پہلا دن...

جیت کی نوٹ بک، جو دلّی کے 'سر پھروں' کے حلقے میں بڑی قدر و قیمت رکھتی ہے، نارنگ

کے پاس ہے — اس نوٹ بک کی قیمت، جگدیش پانچ سو روپے ڈال چکا ہے کیونکہ وہ ہر شے کی قیمت ڈال سکتا ہے، مگر نارنگ کو نوٹ بک عزیز ہے۔

نوٹ بک کے سات صفحوں کے علاوہ جیت کا ایک خط جو اُس نے خودکشی سے چند منٹ پیشتر اپنے بہنوئی کو لکھا تھا، قابلِ ذکر ہے:

مہندر بھاپا جی،

آپ کو جب میرا یہ خط ملے گا، اُس سے پیشتر آپ کو میری خودکشی کی خبر مل چکی ہوگی۔

کہتے ہیں، خودکشی کا خیال کوندے کی مانند ذہن میں آتا ہے اور آدمی فوراً ہی ایک شدید تاثر کے تحت خودکشی کا قدم اُٹھالیتا ہے۔ اگر اُس کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی کسی اور طرف منتقل ہو جائے تو وہ خودکشی نہیں کرتا، کیونکہ اِرادے کی شدت میں کمی آ جاتی ہے۔ خودکشی تو صرف ایک لمحے کا مایوس کن ردِعمل ہے۔

آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ مَیں نے موہن کے ساتھ مل کر خودکشی کا قدم اُٹھانے کا پروگرام، تین برس ہوئے، بنایا تھا۔ آپ میری موت کا غم منانے کے بعد سوچیں گے کہ میں نے یہ قدم کیوں اُٹھایا؟ اس سوچ کا جواب مَیں خود ہی دیے دیتا ہوں:

دنیا کی نظروں میں جو حقارت اور بے رُخی نظر آتی ہے، وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے...

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مَیں نے اپنی تمام جائداد اپنی چھوٹی بہن کے نام منتقل کر دی ہے — آپ کے نام مَیں نے جائداد اس لیے منتقل نہیں کی کہ مجھے احساس تھا، یہ آپ کے اُس پیار کی توہین ہوگی جو — آپ نے مجھے دیا ہے۔

اچھا تو اب اجازت دیجیے — موہن، پوٹیشیم سائنائڈ ملی شیمپین کا جام لیے میرا انتظار کر رہا ہے۔

آپ کا

جیت

موہن نے جیت کے ساتھ خودکشی تو کی مگر وہ اس سارے ڈرامے میں گونگے بہرے کا رول ادا کرتا رہا— جیت اور موہن، جسمانی طور پر دو زندگیاں تھیں مگر دراصل جیت کی دوہری شخصیت کا ایک کردار جو منفی تھا، موہن کے جسم میں ڈھل گیا تھا۔ اِس طرح جیت اور موہن، دو ہوتے ہوئے بھی صرف ایک تھے، اور وہ ایک تھا جیت۔

اُن کی خودکشی کا مقام اہم اِس لیے ہے کہ اُنھوں نے خودکشی میں بھی وہی نفاست برتی جو وہ زندگی بھر کپڑوں کے بارے میں، کتابوں کے بارے میں اور اپنے افعال کے بارے میں برتتے رہے تھے۔

خودکشی اُنھوں نے ٹھیک اپنے طے شدہ دن، دو جولائی سن اٹھاون کو کی۔

دو جولائی کی شام تک وہ اپنے لیے ریشمی کفن سلوا چکے تھے۔ چاندی کے گلاس خرید چکے تھے جن میں انھوں نے شیمپین میں پوٹیشیم سائنائڈ ملا کر پیا۔ خودکشی اُنھوں نے دِلّی کے ایک بہترین ہوٹل میں کی۔

ہوٹل کے ایک بیرے کے بیان کے مطابق جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو یکایک جیت نے موہن سے کہا: "بھاپے، میری بشرٹ نہ جانے کس طرح کندھے پر سے پھٹ گئی ہے۔"

موہن نے جیت کی طرف دیکھا اور اپنے دائیں کندھے کو جھٹکا دے کر اپنی بشرٹ بھی اُسی جگہ سے پھاڑ دی جہاں سے جیت کی بشرٹ پھٹی ہوئی تھی اور پھر اُس نے جیت سے کہا: "اب تو ٹھیک ہے نا!"

پولیس جب دوسرے دن دروازہ توڑ کر اُن کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دونوں ایک ہی پلنگ پر، ایک دوسرے کے قریب، چھت کو گھورتے اور مسکراتے ہوئے پائے گئے۔

اُنھوں نے اپنے ریشمی کفن کے چوغے پہن رکھے تھے۔ پلنگ کے پاس ہی میز پر شیمپین کی بوتل پڑی ہوئی تھی، اور پاس ہی شیشے کی چھوٹی سی خوبصورت ڈبیا بھی اوندھی پڑی ہوئی تھی جس

میں وہ پوٹیشیم سائنائڈ حفاظت سے لائے تھے۔

پولیس کو ایک بات نے سخت حیران کیا — پلنگ سے لے کر کمرے سے ملحق غسل خانے تک فرش پر نئے تولیے بچھے ہوئے تھے جن پر نہانے کے بعد اپنے گورے چٹے پاؤں رکھتے ہوئے وہ غسل خانے سے پلنگ تک پہنچے تھے، مبادا موت سے پہلے اُن کے پاؤں پر دھول لگ جائے۔

جیت اور موہن کا خودکشی کے عمل میں اس طرح نفاست برتنا، پولیس کی سرکاری کارروائی کے بالکل برعکس تھا۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں، پولیس نے اُن کی لاشیں ایک نہایت ہی ذلیل سی ریڑھی میں اُٹھوا کر تیس ہزاری کے پاس ایک نہایت ہی ذلیل سی مورچری میں بھیج دیں جہاں چار گھنٹے تک اُن کی لاشیں ڈاکٹر کے انتظار میں سڑتی رہیں۔ چار گھنٹے بعد اُن کا پوسٹ مارٹم کیا گیا — مورچری ہی سے اُن کے جنازے چند ایک رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں کے کندھوں پر اُٹھے۔ نہ تو ہندو رسم و رواج کے مطابق اُن کی مجروح لاشوں کو آخری غسل دیا گیا، اور نہ ہی اُن کی دیرینہ تمنا کے مطابق ہر گام پر اُن کا ماتم ہوا۔

اگر جیت اور موہن کو اِس دُرگتی کا علم ہوتا تو خودکشی کا خیال اُن کے ذہن میں کبھی نہ آتا۔

چار جولائی ۱۹۵۸ء کا دن شرما جی کی غیر اہم زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

صبح نو بجے کے قریب شرما جی ہماچل ریستوراں پہنچے۔ کاؤنٹر پر بیٹھنے سے پہلے اُنھوں نے گوپال کو چائے اور ایک اُبلا ہوا انڈا لانے کو کہا اور پاؤں پھیلا کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ یہی چند لمحے وہ پاؤں پھیلا کر اطمینان سے بیٹھتے تھے اور اخباروں پر سرسری نظر ڈالا کرتے تھے، کیونکہ باقی کا پہاڑ سا دن انھیں کاؤنٹر پر اکڑوں بیٹھ کر گزارنا ہوتا تھا — یہ گذشتہ پانچ سال سے ان کی زندگی کا معمول ہو گیا تھا۔

معمول کے مطابق اُنھوں نے اخبار اٹھایا اور چھوٹی چھوٹی سُرخیوں پر نظریں دوڑانا شروع کر دیں — اخبار کی مرکزی سرخی پر وہ کبھی دھیان نہیں دیتے تھے، کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق وہ سُرخی نہرو کی کسی تقریر سے متعلق ہوتی تھی اور نہرو کی تقریر کا لب لباب ایک ہی ہوتا تھا۔ وہ نہرو سے چڑ چکے تھے۔ ہندوستانی سیاست میں نہرو کی ذات اُنھیں بوریت کا مجسمہ محسوس ہوتی تھی۔ وہ نہرو کی تقریر پر معمولی سی لوکل خبر کو ترجیح دیا کرتے تھے، کیونکہ اُس میں اُنھیں نہرو کی تقریر سے کہیں زیادہ لذت ملتی تھی۔

اخبار کے پہلے صفحے پر پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی سُرخیوں پر اُن کی نظریں سرپٹ دوڑ رہی تھیں کہ یکا یک وہ چونکے — ساتویں اور آٹھویں کالم میں، اخبار کے نچلے دائیں کونے میں اُنھیں یہ دو کالمی سُرخی نظر آئی: ''دِلّی کے دو امیر نوجوانوں کی انوکھی خودکشی۔''

خبر کی تفصیلات میں اُلجھنے سے پہلے اُن کے ذہن میں 'انوکھی خودکشی' نے یہ خیال زور سے اچھال دیا: ''کہیں یہ دونوں اُن میں سے تو نہیں!''

اُن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ بے چینی سے خبر کی تفصیلات سے اُلجھ گئے۔

خبر پڑھ کر وہ گم سم ہو گئے۔

جیت اور موہن کو وہ ذاتی طور پر نہیں جانتے تھے مگر جیت اور موہن اور دوسرے عجیب و غریب نوجوانوں کا حلقہ اُن کی زندگی میں گذشتہ تین برسوں سے ایک غیر مانوس ہلچل سی پیدا کیے ہوئے تھا — اُسی حلقے کے دو نوجوانوں کی خودکشی کی خبر پڑھ کر وہ اُداس ہو گئے۔ موہن نے تو کبھی اُن سے بات بھی نہیں کی تھی، البتہ جیت کبھی کبھی اُن کے پاس آ کر کہا کرتا تھا: ''شرما جی، کیا حال ہے؟''

وہ جواب میں صرف اتنا کہا کرتے تھے: ''ٹھیک ہے۔''

جیت پھر کہا کرتا تھا: ''شرما جی، اور پھر اور کیا حال ہے!''

اور اُس 'اور' میں انھیں لطف آ جاتا تھا۔ بس وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے اپنا سر کھجانے لگ جایا کرتے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ وہ جیت اور موہن کو نہ جانتے ہوئے بھی اتنے اُداس ہیں تو ان کے دوستوں، بھوشن، راہی، شکتی، نارنگ، ارجن دیو اور جگدیش کا کیا حال ہوگا — اُن کی سوچ نے اُنھیں باندھ دیا اور وقت اُنھیں رینگتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

انھیں اُلجھن ہو رہی تھی کہ شام کے سائے کیوں نہیں پھیل رہے ہیں اور جیت اور موہن کے دوست کیوں نہیں آ رہے ہیں — اُن کی اُلجھن نے انھیں، گذشتہ پانچ برسوں میں پہلی مرتبہ، ان کے روزمرّہ کے معمول سے بیزار کر دیا اور لحات کی مدھم رفتار کے احساس نے اُن کے دل میں تیز بھاگنے کی خواہش پیدا کر دی۔ وہ اُس لمحے بہت آگے نکل جانا چاہتے تھے، جہاں تک جیت اور موہن بھی نہ پہنچے ہوں۔

شام کو چھ بجے کے قریب شکتی پال ہماچل ریستوراں میں داخل ہوا — شرما جی نے اُسے غور سے دیکھا۔ وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ اُسے روز دیکھتے تھے۔ وہ مکمل طور پر بندھا ہوا اور سنبھلا ہوا دکھائی دے رہا تھا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔

شرما جی اور زیادہ پریشان ہو گئے۔
شکتی پال سامنے کے صوفے میں دھنس گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔
شرما جی دن بھر سوچ، اُلجھن اور بیزاری میں گرفتار رہے تھے، اب اُن کی دانست میں شکتی پال کی جیت اور موہن کی بے وقت اور دردناک موت سے بے حسی اور لاتعلقی اُنھیں لے ڈوبی:
''عجیب شخص ہے یہ— اِس کے دوست مر گئے ہیں جن کے بنا اِس کی شام اِس کی موت ہوا کرتی تھی۔ دیکھو تو سہی، کیا آرام سے بیٹھا ہے جیسے اسے کوئی غم ہی نہیں— پھر میری موت پر اِسے بھلا کیا غم ہوگا— میری موت؟ آج مرے، کل دوسرا دن۔ لعنت ہے اِس زندگی پر، اِس دن بھر کی مشقت پر، اس...'' وہ سوچتے سوچتے پل بھر کو رکے اور پھر چند لمحوں کے بعد شدّتِ احساس سے بڑبڑانے لگے: ''میں مرنا چاہتا ہوں، مَیں مرنا چاہتا ہوں... مرنا چاہتا ہوں!''

سات بجے تک، راہی اور ارجن دیو کے علاوہ سب دوست ہما چل ریستوراں میں اکٹھے ہو چکے تھے۔ سب غیر متوقع طور پر خاموش تھے مگر کسی کے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ، رنج یا ارتعاش کے آثار نہیں تھے— لگ یوں رہا تھا جیسے وقت تھم گیا ہو۔
یکایک شکتی پال نے پوچھا: ''کیا ارجن دیو کا افسانہ چھپ گیا؟'' اُس کے لہجے میں بڑی حقارت تھی اور یہ حقارت اُس کا خاصہ تھی۔
بھوشن جو ایک ہی گھاگ تھا، بولا: ''نہیں افسانہ تو نہیں چھپا لیکن ایک بات جو اہمیت رکھتی ہے، یہ ہے کہ ارجن دیو نے افسانہ لکھا ہے— میرے لمبے تڑنگے ناتواں دوست، تم تو کچھ لکھتے ہی نہیں، اور حیرت اس بات پر ہے کہ تم ہمیشہ چھپنے پر زور دیتے ہو— ذرا کھوپڑی کھولو اور سنو— ارجن دیو کا افسانہ 'بدرو کا پانی' یوں شروع ہوتا ہے: 'کمار کے عضوِ تناسل پر ایک چھوٹا سا پھوڑا نکل آیا تھا اور وہ بہت پریشان تھا... 'اب اُردو کے مہذب، عینک پوش اور نیم حکیم ایڈیٹر یہ چاہتے ہیں کہ پھوڑا بازو پر، ران پر یا منہ پر نکل آئے۔ بھلا کیوں؟ کیا عضوِ تناسل جسم کا انگ نہیں، اور کیا عضوِ تناسل پر پھوڑا نہیں نکل سکتا؟ کیا عضوِ تناسل لغت میں موجود نہیں ہے؟ یہ وہی ایڈیٹر ہیں جن کے عضوِ تناسل کثرتِ استعمال سے ناکارہ ہو چکے ہیں— جیت اور موہن اگر آج ہوتے تو...''
جیت اور موہن کا نام زبان پر آتے ہی بھوشن یکایک رُک گیا اور اپنی بات مکمل نہ کر سکا— نارنگ، جگدیش اور شکتی پال بھی چونکے۔

ہر کوئی یہ چاہتا تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی، کسی نہ کسی طور پر جیت اور موہن کا ذکر چھیڑ دے، مگر سب کو ایک چپ سے لگی تھی — بھوشن جو جیت اور موہن کے غیر ارادی ذکر سے چونک اٹھا تھا، اُداس ہو گیا۔

پھر ایک غیر متوقع خاموشی چھا گئی۔

آخر بھوشن سے رہا نہ گیا اور اُس نے بوجھ اُتار پھینکا: ''یارو، یہ جیت ہے نا، بڑا عجیب و غریب آدمی ہے — پچھلے ہفتے میں لائبریری میں بیٹھا اپنی نوٹ بک میں ناصر کاظمی کی غزل نقل کر رہا تھا کہ جیت آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ موہن ساتھ نہیں تھا۔ مَیں ذرا کی ذرا حیران ہوا۔ خیر — جیت کے پوچھنے پر مَیں نے کہا کہ ناصر کاظمی کی غزل اُتار رہا ہوں — کہنے لگا: 'ہاں برخوردار، دھنی رام کے کپڑے نہیں اُتار سکتے تو ناصر کاظمی کی غزل ہی اُتار لو... 'ہتھوڑا بس سر پر ہی تو دے مارتا ہے اپنا یار جیت!''

نارنگ جسے سب دوست طنزاً طنز و مزاح نگار کہا کرتے تھے، کہنے لگا: ''ارے بھائی، جیت کی کیا بات ہے — کوئی چار برس ہوئے، جیت اور موہن ایک بار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پاس کی ٹیبل پر وہ میر تھ والے قوال شاعر اپنی بیگم شاعرہ اور چند یاروں دوستوں کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ شاعرہ بیگم جوس سِپ کر رہی تھی۔ اُن کی ٹیبل مختلف اشیا سے بھری ہوئی تھی۔ بس شاعرہ بیگم نے ہاتھ بڑھا کر جوس کا خالی گلاس جیت اور موہن کی ٹیبل پر رکھ دیا — تم جانتے ہی ہو جیت کی جمالیاتی حس کو۔ وہ اُٹھا اور خالی گلاس قوال شاعر کی میز پر پٹختے ہوئے بولا: 'ناگ نظامی، اس پٹاری کو بغل میں سنبھال کر رکھو، ورنہ کسی دن اُٹھا لے جاؤں گا اور پھر تم بین بجاتے مارے مارے پھرو گے... 'خدا کی پناہ، یار کیا دلیر شخص ہے یہ جیت اور اُس کا جگری یار موہن!''

رات گیارہ بجے تک چاروں دوست جیت اور موہن کی باتیں کرتے رہے۔ اُنھیں جیت اور موہن کی وقتی غیر موجودگی کا احساس تھا، دُنیا سے اُٹھ جانے کا نہیں۔ چاروں دوست جیسے اُن دونوں کی جسمانی موت کو بھول گئے تھے۔ اُنھوں نے موت کا ذکر تک نہ کیا تھا۔

رات کو جب وہ ایک دوسرے سے الگ ہوئے، اُن کی حالت معمول کے مطابق ہی تھی۔

راہی کو صبح چائے کی پہلی پیالی کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی جیت اور موہن کی خودکشی کے بارے میں علم ہو گیا تھا — اُس نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور سوچنے لگا مگر وہ کچھ سوچ نہ

پار ہا تھا۔ پاؤں سمیٹ کر وہ اکڑوں بیٹھ گیا اور خالی ذہن کے ساتھ دل کی دھڑکنیں سنتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے دل کی دھڑکنیں گننا شروع کر دیں۔ اُسے دھڑکنوں کی رفتار وقت کی رفتار سے تیز محسوس ہوئی — اِس احساس نے کہ وہ اور اُس کے دوست وقت کی رفتار کے مقابلے تیزی سے دوڑ رہے ہیں، اُسے چونکایا۔ چونکتے ہی اُس کا سمٹا ہوا جسم پھیلا اور اُسے بھوک محسوس ہوئی۔

اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی — پانچ بج رہے تھے۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ یہ اس کے معمول کے خلاف تھا۔

یکایک اسے خیال آیا کہ جیت اور موہن ہر اٹھارہ جنوری کو منٹو کی یاد میں تمام رات شراب پیتے تھے اور ایک دوسرے کو منٹو کی کہانیاں سناتے تھے۔ انھیں منٹو سے زبردست عقیدت تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہندوستان میں منٹو کے سب سے بڑے مداح کہتے تھے۔ ''مجھے بھی تو جیت اور موہن کی ذات سے بڑی عقیدت ہے۔ میں ہر دو جولائی کو شراب میں غرق ہو جایا کروں گا، مگر — مگر اس قسم کی کوری جذباتیت تو بس ایک بچپنا ہے۔ میں — میں ہر دو جولائی کو روزہ رکھا کروں گا۔ ان کی یاد میں تھوڑی سی جسمانی اذیت... '' تمام دن اور رات راہی نے کچھ نہ کھایا۔ اسی طرح کرسی پر بیٹھا رہا۔

آدھی رات کے قریب وہ اٹھا۔ اُس نے تھکن بھری انگڑائی لی اور ماحول سے لاتعلقی برتتے ہوئے چارپائی پر دراز ہو گیا۔

اُسے شدید حرارت تھی۔

ارجن دیو کی حالت دگرگوں تھی۔

جس لمحے اُس نے جیت اور موہن کی خودکشی کی خبر پڑھی تھی، اُس لمحے کے جال میں وہ بُری طرح پھنس گیا تھا۔ اُس کا ذہن خودکشی کی نفسیات سے اُلجھ گیا تھا: ''جنسی ناآسودگی بھی خودکشی کی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ اقتصادی دُشواریاں تو ایک وجہ ہیں ہی — نامراد محبت بھی خودکشی کا راستہ دکھاتی ہے — مگر بیزاری، اکتاہٹ، ٹھہراؤ، یکسانیت، حقارت کا احساس... ''

ارجن دیو خودکشی کی پیچیدگیوں سے اُلجھتا رہا، اور جب وہ مکمل طور پر اُن پیچیدگیوں میں جکڑ گیا تو احساس کا وہ لمحہ جو پھیل کر وسعت اختیار کر گیا تھا، اُسے راستہ دکھانے لگا۔ ارجن دیو کو وہ راستہ بھا گیا — اُس نے غیر ارادی طور پر چارپائی سے رسی الگ کی، چھت کے کنڈے میں سرا

باندھا، پھندا بنایا، گلے میں ڈالا اور پھر بے نیازی سے جھولنے لگا۔

تین مہینے بعد کی بات ہے، راہی کو نریش کمار شاد سرِ راہ مل گیا۔

شاد کی ارجن دیو سے معمولی سی جان پہچان تھی — راہی نے شاد کو ارجن دیو کی خودکشی کے بارے میں اطلاع دی تو شاد چلتے چلتے ٹھٹکا جیسے اُسے ٹھوکر لگی ہو۔

چند لمحے شاد لبِ سڑک رکا رہا اور پھر وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

اُس نے اپنا چرمی بیگ کھولا، کاغذ اور قلم نکالا، چند لمحے سوچا، ذہن میں ردیف قافیے گھڑے اور ایک نظم ''خودکشی'' ٹھوک ڈالی:

... درد کا احساس تھا، اُداسی تھی

... رُوح تیری پیاسی تھی!

شاد پھر وہ نظم، بڑی بیزاری اور اکتاہٹ کے ساتھ، راہی کو سنانے لگا — مگر راہی ذہنی طور پر غیر حاضر تھا۔ وہ شرماجی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو خودکشی کی اُن وارداتوں کے بعد شدید طور پر علیل ہو گئے تھے۔

OO

('لیل و نہار'، لاہور: ۱۹۵۹ء)

جسم کی دیوار

اس کے پاؤں برف ہو رہے تھے، پنڈلیاں دکھ رہی تھیں، زبان کسیلی ہوگئی تھی، حلق میں خراشیں پڑگئی تھیں اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی پیشانی، دائیں کنپٹی سے ناک تک کھوکھلی ہوگئی ہے۔

وسط دسمبر کی اس سرد رات کو اس نے کناٹ پلیس سے ماڈل ٹاؤن تک، تقریباً سات میل کا فاصلہ پیدل طے کیا تھا۔ اسے کوئی تین گھنٹے لگے تھے اور ان تین گھنٹوں میں سگریٹ اس کے لبوں سے پل بھر بھی جدا نہ ہوا تھا۔

تھکن کی وجہ سے اسے جیکٹ، پتلون اور قمیص اُتارنے میں خاصی تکلیف ہوئی لیکن جب اس نے شب خوابی کا ڈھیلا لباس پہن لیا تو اسے قدرے سکون ملا کہ اس کا جکڑا ہوا جسم آزاد ہو گیا تھا۔

بتی گل کر کے وہ صاف، بے داغ بستر پر کندھوں تک لحاف کھینچ کر دراز ہو گیا۔

بستر سرد تھا، کمرہ سرد تھا اور کمرے میں پھیلی ہوئی تاریکی سرد تھی مگر اس کی رگوں میں تھکن کے مارے آگ دوڑ رہی تھی۔ اسے سرد بستر، سرد کمرہ اور سرد تاریکی بھلی لگی کہ اسے تھوڑا سا جسمانی آرام ملا۔

ابھی اس نے چند ہی کروٹیں لی تھیں کہ بستر اس کی تھکن کی انگیٹھی سے سلگنے لگا اور اس کا دم گھٹنے لگا۔

اب اسے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں بھی جل رہی ہیں، جیسے کسی نے ان میں مرچیں جھونک دی ہوں۔

اسے سانس لینے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے کمرے میں دھواں بھر گیا ہو اور بستر میں جیسے آگ لگ گئی ہو۔ اس نے لحاف اُتار پھینکا، لپک کر بتی جلائی، دونوں کھڑکیاں کھول دیں، دونوں دروازے کھول دیے اور رسی کھینچ کر روشندان بھی کھول دیا۔

سردی کی لہر اس کے جسم تک پہنچی، ننگے فرش سے اس کے جلتے ہوئے تلووں میں ٹھنڈک پہنچی

اوراس کے سانس سنبھلے۔اس نے اطمینان سے طویل سانس کھینچااور کرسی میں دھنس گیا۔

رات کے تین بج رہے تھے۔

اس کی نظریں ننگی بچی دیوار پر جم گئیں۔ایک جگہ سفیدی زردی میں تبدیل ہوگئی تھی اور ایک جگہ پلستر اکھڑ چکا تھااور گرنے ہی کو تھا۔

وہ اکھڑے ہوئے پلستر کو گھورتا رہا جونہ جانے کس طرح سنبھلا ہوا تھا۔

کمرہ خ ہوگیا تھااور اسے اچھا لگ رہا تھا کہ اس کا تپتا ہوا جسم پرسکون تھا،صرف اس کی آنکھیں جو اکھڑے ہوئے مگر سنبھلے ہوئے پلستر کے ایک ٹکڑے کو تک رہی تھیں،جل رہی تھیں۔

کافی دیر تک وہ اُکھڑے ہوئے پلستر کو گھورتا رہا جیسے اس کی نظروں کی تاب نہ لاکر پلستر کا وہ سنبھلا ہوا ٹکڑا گر جائے گا۔ٹکڑا جوں کا توں سنبھلا رہا،نہ گرا۔اس کی آنکھوں کی جلن شدید ہوگئی اور اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں اوراس کے سانس رُکنے لگے۔

اس نے کُرسی کے بازوؤں کا سہارا لیا اور کھڑا ہوگیا۔پلکیں گرا کر انگلیوں سے آنکھیں مسلیں اور دھیمے دھیمے غسل خانے کی طرف قدم بڑھائے۔

ہر قدم اٹھاتے ہوئے اسے یہی محسوس ہورہا تھا کہ وہ غسل خانے تک پہنچ نہ پائے گا،راستے ہی میں گر جائے گا۔

غسل خانے میں پانی سے بھری بالٹی رکھی تھی۔اس نے جھک کر،آنکھیں کھول کر،پھیلا کر،بے تحاشا پانی کے چھینٹے مارنے شروع کردیے جیسے آگ لگ گئی ہواور آگ کے پھیل جانے کا اندیشہ ہو۔

پانی کے چھینٹے اُڑنے سےاس کا شب خوابی کا ڈھیلا لباس کسی قدر بھیگ گیااور چھینٹے اس کی چھاتی اور پیٹ تک جا پہنچےاور وہ ذرا کانپااوراس کے چھینٹے اُڑاتے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔

اس کی آنکھوں کی جلن دب گئی،کنپٹیاں بھی ٹھنڈی ہوگئیں اوراس کے سانس بھی درست ہوگئے۔

اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوگئی اوراسے کمر میں ہلکا سا درد محسوس ہوا۔

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے وہ کمرے تک پہنچااور بتی گل کر کے بستر پر دراز ہوگیا۔

بستر سرد تھا،کمرہ سرد تھااور تاریکی سرد تھی۔

رات کے چار بج رہے تھے۔

نیند کی لہریں اس کی آنکھوں کے ساحل پر سر پٹک رہی تھیں۔

اس کے ذہن میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔

''تم، تم طوفان کی سی تیزی سے زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے ہو...! تم بے تحاشہ شراب پیتے ہو، بے تحاشہ سگریٹ پیتے ہو... بے تحاشہ کافی پیتے ہو، بے تحاشہ گھومتے ہو... بے تحاشہ پڑھتے ہو اور ہر حادثے کو، واقعے کو، چاہے اس کا تعلق تمھاری ذات سے ہو یا نہ ہو، بے تحاشہ قبول کر لیتے ہو...! تم دھیمے دھیمے زندگی کیوں نہیں گزارتے تم!... شراب چھوڑ دو، تمھیں یہ راس نہیں آتی، سگریٹ کم پیا کرو، کافی کم پیا کرو، یہ سب تمھاری رگوں کو کھینچے رکھتی ہیں اور تمھاری طبیعت میں شدت پسندی بھر رہی ہیں... اس شدید زندگی سے دُور جا کر آرام کرو، خوب سوؤ، ٹانگیں پسار کر سوؤ میری جان!''

''میرے پیارے ماتھر، سوؤں گا اور خوب سوؤں گا، اور اس قدر سوؤں گا کہ تمھارا دم گھٹ جائے گا، تم بینڈ باجے بجا کر بھی جگانا چاہو گے، تو نہیں جاگوں گا...!''

''تم، اس ڈھنگ سے مت سوچو۔ سوچنے کا یہ ڈھنگ بھی شدید ہے!''

''ماتھر! تم میرے دوست ہو اور تم ڈاکٹر بھی ہو۔ تمھارے اندر کا ڈاکٹر میرے جسم کو بچانا چاہتا ہے۔ میں تمھارے اندر کے ڈاکٹر کے دکھ کو جانتا ہوں... تمھارے اندر کے ڈاکٹر پر میرا دوست غالب آ جائے تو اس سے کہوں... میرا دادا بتیس سال کی عمر میں سو گیا تھا، جانتے ہو کہاں؟... جلیاں والا باغ میں۔ اس سے میرا باپ چار سال کا تھا...! میرا باپ اٹھائیس سال کی عمر میں سو گیا تھا۔ جانتے ہو کب؟ ۱۹۴۲ء میں! اس سے میں تین سال کا تھا...! اب میں چوبیس سال کا ہوں... میری جوانی وہی لوگ لوٹ رہے ہیں جو آج میرے دادا اور میرے باپ کی جوانمرگی کے صدقے ارباب اقتدار ہیں، جو آج عیش کر رہے ہیں، عیش...! میری رگوں میں خون نہیں دوڑتا، مضطرب لہریں دوڑتی ہیں... میرے ذہن میں نفرت کے آتش فشاں پہاڑ اُبھر آئے ہیں اور میرے دل میں غم کا سمندر موجیں مار رہا ہے... اب میں کہیں کا نہیں رہا... کہیں کا نہیں رہا... مجھے نیند نہیں آتی...!''

آخرکار نیند نے اسے دبوچ لیا۔

پو پھٹنے ہی کو تھی۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی، اس کا سر گھوم رہا تھا، آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا اور جسم تپ رہا تھا۔

چارپائی سے اٹھتے ہوئے اس نے بھرپور انگڑائی لی، اس کی ہڈیاں چیخ گئیں اور اس کے

لبوں پر تبسم کی معدوم سی لکیر آپ سے آپ کھنچ گئی۔

اس نے آئینہ دیکھا۔

اسے اپنا چہرہ بھلا لگا — خشک، بکھرے ہوئے، گھنے، سیاہ بال جن میں چند ایک چاندی کی تاریں کنپٹیوں کے قریب چمک رہی تھیں۔ چوڑا ماتھا، گھنی بھویں اور نیند کو ترستی ہوئی بے نام سی چمک لیے زرد آنکھیں جن پر بوجھل پلکیں بار بار گر رہی تھیں۔ سیدھی سی ناک اور سوکھے سوکھے ہونٹ اور گندمی رنگ۔

اسے اپنا چہرہ بھلا لگ رہا تھا جیسے وہ آئینے میں صدیوں پرانی، شکستہ، اجڑی ہوئی عمارت دیکھ رہا ہو اور ماضی کی عظمت کے باقی نشان اسے بھلے لگ رہے ہوں۔

اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ آئینے میں اس کی صدیوں پرانی، شکستہ، اجڑی ہوئی عمارت جو اسے بھلی لگ رہی تھی، کانپنے لگی۔ اس نے آئینہ رکھ دیا اور دھیمے دھیمے غسل خانے کی جانب بڑھا۔

دس بج رہے تھے۔

گیارہ بجے کے قریب جب وہ ریلنگ کا سہارا لیے، ہونٹوں میں سگریٹ دبائے، دھیمے دھیمے، کانپتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں اُتر رہا تھا تو اسے یہی احساس تھا کہ وہ اگلے پل آخری سیڑھی پر منہ کے بل پڑا ہوگا۔

نیچے لان میں بچے کھیل رہے تھے۔ اس نے دو ایک کے گال تھپتھپائے اور مین گیٹ سے باہر آ گیا۔

اس کا سر گھوم رہا تھا۔

اس نے سگریٹ کا طویل کش کھینچا ہی تھا کہ کھانسی کا زلزلہ آن پہنچا اور اس کا پورا وجود ہل گیا۔ اس نے تھوکا تو بلغم کا یہ بڑا دھبہ سڑک پر دکھائی دیا۔ اسے متلی آ گئی، کلیجہ حلق تک آ گیا مگر قے نہ ہوئی کہ پیٹ خالی تھا۔

کھانسی کے زلزلے کے بعد اس کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں اور پیٹ کی بھٹی جل اُٹھی۔ اس نے رومال سے آنکھیں اچھی طرح مانجھیں جیسے قلعی گر برتن مانجھتے ہیں اور پیٹ کی بھٹی کو جلنے دیا کہ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

مین گیٹ کے باہر وہ کافی دیر اسکوٹر کا انتظار کرتا رہا، اس احساس کے ساتھ کہ ابھی اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی۔

بارہ بج رہے تھے۔

خالی اسکوٹر دیکھ کر اس نے بڑی مشکل سے ہاتھ اٹھایا اور اسکوٹر روکنے کا اشارہ کیا۔
ڈرائیور نے بریک لگائی اور اسکوٹر دس قدم کے فاصلے پر بے ہنگم سے شور کے ساتھ رُکا۔
اس نے دھیمے دھیمے، بڑی مشکل سے قدم اُٹھائے۔
اسکوٹر تک پہنچتے پہنچتے اسے ایک جگ بیت جانے کا احساس ہوا۔
اس نے لب کھولے ہی تھے کہ ڈرائیور نے پوچھا: ''ہندو راؤ ہاسپٹل یا ارون ہاسپٹل؟''
اس کا دل ڈوب گیا، اس کے لب کانپے۔
''نہیں... ! کناٹ پلیس... ریگل بلڈنگ... ٹی ہاؤس... !'' اس نے بڑے ضبط سے لبوں کو دانتوں میں دبالیا۔
ڈرائیور کو تعجب ہوا۔ چند لمحے وہ اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہا اور پھر اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے بریک کھول دی۔
''کون جانے یہ شخص ٹی ہاؤس پہنچ بھی پاتا ہے یا نہیں...''

OO

('نصرت'، لاہور: ۱۹۶۳ء)

کمپوزیشن موسمِ سرما ۶۴ء

تمھاری آوارگی کا کوئی انت ہے؟

؟؟؟

بات یہ ہے کہ تم... تم نے آئینہ دیکھا ہے... تم نے اپنا چہرہ دیکھا ہے؟

؟؟؟ ؟؟؟

میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم... تم جلد مر جاؤ گے!

....

تم خاموش ہو؟

( )

تم خاموش کیوں ہو؟

مَیں، تم اور وہ۔ میں تم بھی ہے اور وہ بھی ہے، تم میں بھی ہے اور وہ بھی ہے، وہ میں بھی ہے اور تم بھی ہے اور... اور کتنا گھپلا ہے (ہاہاہاہا)۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں، بات چیت کر رہے ہیں، شام کا سمے ہے، کافی ہاؤس کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، ہم نے کافی کے لیے کہا ہے۔ کافی کے آنے سے پہلے ہی ہم میں سے ایک، میں، تم یا وہ اُٹھ جاتا ہے، چاندنی چوک چلا جاتا ہے، لاہور چلا جاتا ہے، سان فرانسسکو چلا جاتا ہے یا مر جاتا ہے۔ ہم، یہاں، اسی کافی ہاؤس میں، اسی صوفے پر بیٹھے رہیں گے اور کافی پئیں گے۔ کتنا گھپلا ہے۔ میں، تم اور وہ۔ یہ تکون؟ کون جانے کہاں، کب تم مل جاؤ، وہ مل جائے۔ جب میں، تم اور وہ ملتے ہیں تنہائی اور انتظار کی دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ تنہائی اور انتظار کی دیواروں سے سر پھوڑنا ہزار لذتیں لیے ہوئے ہے۔ کون جانے کہاں، کب کب کب ب ب ب ت ت ت ت تم تم تم اُداس ہو کہ بہت دُور جا رہے ہو، تم احمق ہو، تم کہاں جا رہے ہو، وقت اور فاصلہ...

''ہیلو!''

''کیا حال ہے بھئی؟''
''آج اکیلے کیسے بیٹھے ہو؟''
''اب اکیلا ہوں!''
''ہوں ں ں ں؟''
''کافی پیو گے؟''
''بلیک کافی... تم نے پہچانا نہیں مجھے؟''
''تم تم... تم... معافی چاہتا ہوں!''
''بھئی میں ہوں سرجیت، سرجیت!''
''سرجیت سر جی جی ت... ارے سرجیت؟ مارگریٹ کیسی ہے؟ کہاں ہے؟ تمھارے پاس ہے؟''
''میرے پاس تھی!''
''اب؟''
''اب میرے پاس سوسن ہے!''
''مارگریٹ کہاں گئی؟ کس کے پاس ہے؟''
''مارگریٹ مرگئی! خدا کے پاس ہے!''
''نہیں... نہیں... ''
''مارگریٹ مرگئی اور اسے مرے ہوئے بہت دن ہو گئے!''
''وہ تمھارے پاس تھی، تم نے اسے مرنے کیوں دیا؟''
''میں کیا کر سکتا تھا؟''
''ہاں، تم کیا کر سکتے تھے؟''
''تمھیں مارگریٹ سے عشق تھا... تھا نا؟''
''مجھے علم نہیں... مجھے علم نہیں... میں جا رہا ہوں... جا رہا ہوں!''
وہ تمھارے پاس تھی، تم نے اسے مرنے کیوں دیا؟
میں کیا کر سکتا تھا؟
ہاں، تم کیا کر سکتے تھے، تم کیا کر سکتے تھے۔ تم تم...
''بابو جی... بابو جی!''

''ہوں ں ں...''

''بابو جی! وہ کتابیں آ گئی ہیں!''

''کتابیں؟''

''جی ہاں، ہٹلر: اے اسٹڈی ان ٹائرنی اور پارٹیشن ٹریجڈی!''

''باندھ دو!''

......

......

......

اسٹالین روزویلٹ چرچل صاحب! آپ نے ہٹلر کے ہاتھوں ساٹھ لاکھ جیوز کو کیوں مرنے دیا؟

ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے؟

گاندھی جناح نہرو لیاقت صاحب، آپ نے لاکھوں لوگوں کو فسادات کی بھینٹ کیوں چڑھنے دیا؟

ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے!

جی ہاں، آپ کچھ نہیں کر سکتے تھے!

کتنا گھپلا ہے؟

مارگریٹ مر گئی ہے، خدا کے پاس ہے۔ مارگریٹ کو مرے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ ایکس ٹرمنیشن آف جیوز کو بہت دن ہو گئے ہیں۔ پارٹیشن ٹریجڈی ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔

کتنا گھپلا ہے؟

خواب وہ خواب کہ ہائے مارگریٹ، انت یہی ہے۔ اظہار کو لب تک پہنچنے میں ایک جگ بیت گیا ہے اور اب تم کہتی ہو: میں وہ نہیں ہوں جو تم ہو۔ تم میری بات کیوں نہیں سمجھتیں! میں تم بھی ہوں اور وہ بھی ہوں، وقت اور فاصلہ...

''سنیے!''

''جی! آپ نے مجھ سے کہا!''

''آپ کو تکلیف دے رہا ہوں... میرے ساتھ چند دوست ہیں... ہم سب آپ کے مداح ہیں۔ حال ہی میں ہم نے آپ کا افسانہ پڑھا ہے، دن رات ہانٹ کر رہا ہے۔ زندگی سے بھرپور،

اِک سعیِ رائگاں... آج آپ ہمارے ساتھ چائے پیجیے! پلیز!''

''کسی افسانہ نگار کی اتنی تعریف اس کا دماغ خراب کر دیتی ہے... چلیے! چائے کہاں پلائیے گا؟''

''چلیے، ٹی ہاؤس چلتے ہیں... ان سے ملیے، یہ اندر ہیں اور یہ ہیں آکاش اور یہ ہیں کامنی... اور انھیں تو آپ جانتے ہی ہیں!''

یہ لڑکی کامنی اچھی ہے۔ رنگ بھی خوب ہے، شام کے پھیلتے ہوئے سائے۔ جسم بھی خوب ہے، تنی ہوئی کمان... کسی لڑکی کے جسم کو چھوئے جگ بیت گئے ہیں... کیا یہ لڑکی اپنا جسم میرے حوالے نہیں کر سکتی...؟ مارگریٹ کیوں مر گئی؟

مارگریٹ! میں نے عورت کو بازار میں چلتے پھرتے ہی دیکھا ہے!

اوہ مارگریٹ! تم کیا ہو اور کیا نہیں ہو اور تمھارا جسم... میں جنت میں ہوں!

مارگریٹ... مارگریٹ تم کہاں ہو؟ مارگریٹ تم کیوں مر گئیں؟ مارگریٹ مارگریٹ کامنی۔

''کامنی...؟''

''جی! آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟''

''ہوں ں ں... نہیں تو... مجھے اپنی ایک دوست یاد آ گئی... مجھے آج ہی پتہ چلا ہے کہ وہ مر گئی ہے... مارگریٹ... وہ عظیم تھی... عظیم!''

''مارگریٹ... میں نے آپ کے افسانے میں یہ نام پڑھا ہے...''

''یہ مسٹر اندر اور آکاش اور وہ تیسرے صاحب کون ہیں...؟''

''تیسرے صاحب موہن میرے بھائی ہیں اور اندر اور آکاش میرے دوست ہیں...''

''آپ مسکرا رہی ہیں...؟''

''نہیں تو... آپ کمال کرتے ہیں...!''

''آپ میری باتوں پر مسکرا رہی ہیں...؟''

''نہیں تو... آپ...''

جو ہوگا، دیکھا جائے گا... پڑھی لکھی لڑکی ہے، بھرے بازار میں تھپڑ نہیں مارے گی... زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ قدم بڑھا کر بھائی اور دوستوں کے پاس پہنچ جائے گی اور میں... میں پیچھے سے کھسک جاؤں گا... میں...

''آپ کس سوچ میں پڑ گئے...؟''

"دیکھیے نا... بات یہ ہے کہ... دیکھیے نا! ہٹلر نے ساٹھ لاکھ جیوز قتل کر دیے اور چرچل روز ویلٹ اسٹالین کچھ نہ کر سکے اور لاکھوں معصوم آدمی فسادات کی بھینٹ چڑھ گئے اور گاندھی جناح نہرو لیاقت کچھ نہ کر سکے اور... اور مارگریٹ... مارگریٹ...!"

"یہ یکایک آپ کو کیا ہو گیا ہے...؟"

"ہوں ں ں...!"

"یہ یکایک آپ کو کیا ہو گیا...؟"

مجھے کیا ہو گیا ہے...؟ جو ہو گا، دیکھا جائے گا...

"کامنی!... I need you"

"کیا ہو گیا ہے آپ کو...؟"

"کامنی!... I like you"

"آپ ٹھیک تو ہیں...؟"

"کامنی!... I love you"

کیا ہونا تھا...؟ یہ تو خاموش ہو گئی... میرے ساتھ چل رہی ہے۔ کیا ہونا تھا... انت یہی تھا مارگریٹ: تم مرنے سے پہلے بچھڑ کیوں گئیں؟ اوو مارگریٹ...

"مس کامنی! مجھے اجازت دیجیے، میری طرف سے اپنے بھائی اور دوستوں سے معافی مانگ لیجیے گا... میرا جی اچھا نہیں ہے... آپ بہت اچھے لوگ ہیں..."

"Please! don't go ..."

آواز ہے یا اِک التجا ہے... یہ اس نے میرا ہاتھ کیوں تھام لیا ہے... یہ لمس میری جان لے لے گا... یہ ٹھنڈی ٹھنڈی سی آگ... اف ف ف ف...!

"کیا ہوا...؟"

"کچھ نہیں...!"

"میں کسی کی محبت میں گرفتار ہونے کی منتظر ہوں...!"

"میں منتظر تھا... میں گرفتار ہو چکا ہوں اور میں... میں صرف اپنی ذات کے بارے میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ آج اگر تم راستے میں نہ آتیں، کوئی اور آتا، میں اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا..."

"میں کیا کروں...! میں اپنی ذات کے بارے میں نہیں جانتی... میں کچھ سوچ نہیں پاتی...

میں فیصلہ نہیں کرسکتی... میں... بہت کمزور ہوں... میں... I love you ... I love you"

میں مر جاؤں، ابھی، اسی وقت، یہیں...

"تمھارے ہاتھ ٹھنڈے ہیں...!"

"I love you ...!"

"تم بہت دُبلے ہو...!"

"I need you ...!"

"آج موسم بے پناہ ہے...!"

"تمھارا بھائی اور تمھارے دوست کہاں گئے!"

"وہ لوگ کہاں گئے؟"

"وہ ہم سے بچھڑ گئے!"

"نہیں! ہم ان سے بچھڑ گئے!"

"ٹی ہاؤس چلیں...؟ وہ لوگ وہیں ہوں گے؟"

"جو بچھڑ گئے، سو بچھڑ گئے...!"

"I love you ...!"

"کہاں چلیں؟"

"جہاں تم کہو!"

"آؤ...! مجھے اپنا ہاتھ دو... آوارہ گھومیں گے!"

"اس آوارگی کا کوئی انت ہے؟"

؟؟؟

"بات یہ ہے کہ تم..."

"تم خاموش کیوں ہوگئیں؟"

؟؟؟ ؟؟؟

"تم خاموش ہو!"

( )

"تم خاموش کیوں ہو؟"

"I love you ...!"

"I love you..."

''اوو کامنی...!''

''میں منتظر تھی... جانے کب سے منتظر تھی... میرا انتظار ختم ہوا... میری ذات ختم ہوئی... میں اپنے آپ کو... اپنا جسم، اپنی روح، اپنا سب کچھ تمھاری ذات میں مدغم کر دینا چاہتی ہوں... میں بھول جانا چاہتی ہوں کہ تمھارے علاوہ میرا اپنا کوئی وجود ہے... اوو... میں...''

ہائے کس بت کی محبت میں گرفتار ہوئے... زندگی درد بنی...

''تم خاموش کیوں ہو...؟ میں مرجاؤں گی...!''

"I love you ..."

تمھارے ہاتھوں کا لمس میری جان لے لےگا...

''چلو... چلو، جہاں تم رہتے ہو... جہاں میں رہتی ہوں... جہاں ہم رہتے ہیں...!''

اوو مارگریٹ!... I' ll die ... I won't let you die

میری آوارگی کا کوئی انت ہے؟

؟؟؟

میں خاموش کیوں ہوں؟

میں خاموش نہیں!

میری آوارگی کا کوئی انت ہے؟

میری آوارگی کا کوئی انت نہیں!

میری آوارگی کا کوئی انت نہیں!!

میری آوارگی کا کوئی انت نہیں!!!

OO

('سویرا'، لاہور: ۱۹۶۳ء)

کمپوزیشن دسمبر ۶۴ء

اے دل بیقرار جھوم، اے دل
بیقرار جھوم... فصل بہار
آ گیا، دور خزاں چلا گیا،
عشق مراد پا گیا... وغیرہ!
ایک بلیک کافی، دو ویں ایگ
سینڈوچز... حسن کی چھری
بے جھوم... اے دل ل ل بیقرار...

اپنے اس فن کی قدر نہیں ہے، اپنے
اس فن کی قدر ہے لیکن فن کے
معنی کچھ اور ہیں... چلو!

روم... وہی چکنی نرم و نازک
لڑکیاں... ہائے! کہاں
پھنس گیا... اچھا بھلا نکل
گیا تھا... ماں... ماں
یہ مری آخری کو شفٹ ہے،
میں یہاں نہیں رہوں گا... سالے
آدمی سے زیادہ قلم کاٹ دیتے
ہیں...

ماں کب مرے گی، ذلیل لوگ
آدمی سے زیادہ قلم کاٹ دیتے
ہیں... یوروپ... میں کب...
اس جہنم سے نکلوں گا...
میں... میں... کب کب...
... میں انتظار نہیں
کر سکتا۔

('سیپ'، کراچی: ۱۹۶۳ء)

کوئی روشنی، کوئی روشنی

مَیں شہیدِ ظلمتِ شب سہی، مری خاک کو یہی آرزو
کوئی روشنی کوئی روشنی، کوئی روشنی کوئی روشنی

—— خلیل الرحمان اعظمی

روشنی کے لیے

(۱)

نام : گیان

عمر : ۲۷سال

کام : جسم کی زندگی کے لیے ایک سو ساٹھ روپے کی نوکری اور ذہن کی زندگی کے لیے افسانہ نگاری۔

ہمیں، مجھے اور آپ کو، گیان کے اندر باہر جھانکنے کے لیے چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہنا ہے اور حد درجہ محتاط ہو کر کہ وہ بھارت کے چالیس کروڑ — (اِس ڈیش میں آپ جانور، احمق یا سوئے ہوئے آدمی، کچھ بھی بھر سکتے ہیں) میں سے ایک ہے لیکن وہ ان چند سو (اگر سو کم ہیں تو ہزار سہی) اکائیوں میں سے بھی ایک ہے جو اپنی منزل، اپنی زندگی کو پہچاننے کی جستجو کر رہے ہیں۔

آیئے، گیان کے پاس چلیں۔

دیکھیے، گیان سو رہا ہے۔ ابھی صبح کے چار بجے ہیں اور ابھی اس کے جاگنے میں تھوڑی دیر باقی ہے۔ دیواروں پر آپ صرف ایک تصویر دیکھ رہے ہیں اور ایک کیلنڈر — تصویر البیر کامیو کی ہے۔ کامیو ہمیں اور گیان کو گھور رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں یاسیت جھلک رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خودکشی کی پیچیدگیوں میں کھو گیا ہے — کیلنڈر بہت معمولی ہے مگر گیان کو، کیلنڈر معمولی ہوں یا غیر معمولی، سب اچھے لگتے ہیں کہ اسے صرف تاریخ اور دن دیکھنا ہوتے ہیں — مگر ایسا بھی نہیں ہے جن کیلنڈروں پر اوتاروں یا سیاسی لیڈروں کی تصویریں ہوں، وہ اسے اچھے نہیں لگتے — اس کی میز پر بہت سی کتابیں ہیں اور بہت سی فائلیں، جن میں اس کے مطبوعہ، غیر مطبوعہ افسانے رکھے ہوئے ہیں اور بہت سے تراشے۔

یہ گیان اُٹھا۔ اس نے تھکن بھری انگڑائی لی ہے اور آنکھیں زور سے بھینچ کر پھر کھولی ہیں —

گیان بہت دُبلا ہے، اس کے چہرے پر ہڈیاں سرکش چٹانوں کی طرح اُبھی ہوئی ہیں، اس کی کشادہ پیشانی چمک رہی ہے اور اس کی آنکھیں، اُٹھتی گرتی پلکوں کے پیچھے دیے کی طرح ٹمٹما رہی ہیں۔ اس کے ہونٹ خشک ہیں اور کالے ہیں جیسے ہلکے کالے ربڑ کے دو ٹکڑے ہوں اور پھیلتے، سکڑتے رہتے ہوں۔ اس کے دانت نہ سفید ہیں اور نہ پیلے، زرد سفیدی کی طرح چمکیلے ہیں — اس کا قد میانہ ہے اور اس کی جسمانی شخصیت کا مجموعی تاثر ایک شہوت زدہ آدمی کا ہے۔

ہم گیان کے جسم کا احاطہ کر رہے تھے اور اس نے اس دوران اسٹوو جلا دیا ہے اور صبح کی چائے کے لیے پانی کیتلی میں رکھ دیا ہے اور میز پر ٹانگیں پھیلا کر کرسی میں دھنس گیا ہے — پانی کی سوں سوں اور اسٹوو کی ش ش آ آ آ ں ں کی آواز آ رہی ہے — اس کا ذہن بھی ان آوازوں کے متوازی سوچتا ہوا بھاگ رہا ہے، تعاقب میں، ابھی اسے بھی علم نہیں، کس کے تعاقب میں؟

اس نے چائے ایک ہی گھونٹ میں اپنے اندر انڈیل لی ہے اور سگریٹ کا کش کھینچ کر ایش ٹرے میں کچل دیا ہے۔ شاید اس کے ذہن کی گرفت میں کوئی آ گیا ہے — اس کی گرفت میں ایک دبلا سا، زرد سا، بظاہر ستم زدہ آدمی ہے جو عدالت میں نحیف اور متزلزل آواز میں بیان دے رہا ہے:

''مجھے بچپن سے موت کا ساتھ ملا ہے... میں بیمار ہوتا ہوں تو علاج کے لیے
ہاسپٹل موجود ہیں۔ نوکری درکار ہے تو ایمپلائمنٹ ایکسچینج کی خدمات حاضر ہیں...
اگر کوئی مرنا چاہے، وہ کیا کرے۔ مرنے کے لیے بس کے سامنے آنا پڑتا ہے...
بس کے سامنے آنا پڑتا ہے... بس کے سامنے...''

انصاف کی ترازو کی تصویر کے نیچے مجرم کی سزا تجویز ہو رہی ہے۔ افسانہ نگار ہجوم کو چیرتا ہوا مجرم سے اس کے جرم کے بارے میں پوچھتا ہے۔ مجرم کہتا ہے:
''میں اتفاقاً بس کے نیچے آ گیا تھا۔ یہ کہتے ہیں، میں نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔
میں بھی کہتا ہوں، میں نے خودکشی کی کوشش کی ہے...''

گیان کا چہرہ تمتمانے لگا ہے، اس کے ذہن کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے — اس نے اپنی گرفت کو ڈائری میں منتقل کر دیا ہے اور اطمینان سے سگریٹ سلگا کر دھواں اُڑا رہا ہے۔

سات بجنے کو ہیں — گیان آفس کے لیے تیار ہو رہا ہے — اس کا لباس ہلکے پیلے رنگ کی قمیض، پورے بازو کی بند گلے کی کالی سویٹر جس کے بیچ میں چھاتی اور کندھوں کے اوپر زرد رنگ کی

تقریباً دو انچ چوڑی دھاری کھنچی ہوئی ہے اور راکھ کی رنگت کی پتلون پر مشتمل ہے۔ اس کے پاؤں میں ایک چوڑی پٹی پر مشتمل انگوٹھے والی چپل ہے — اس کا لباس اس کے جسم کے مطابق ہے، اس کے ذہن کے مطابق نہیں۔ اس کا پاؤ بھر گوشت کا جسم بھی اس کے ذہن کے لیے مناسب لباس محسوس نہیں ہوتا (کپڑوں سے جسم ڈھانپا جاتا ہے، ذہن نہیں۔ مگر جسم سے بھی تو ذہن ڈھانپا جاتا ہے، کیا نہیں؟)

سیڑھیاں چڑھنے کی آواز آ رہی ہے۔

''اخبار...!''

''سنیے...! گیان پکارتا ہے۔

پردہ ہٹتا ہے۔ اخبار والا چوکھٹ میں کھڑا ہے۔

گیان کہتا ہے: ''حضور، اگر آپ ہر ماہ مجھ سے اخبار کے پیسے لے لیا کریں تو عنایت ہوگی۔ سال بھر بعد آپ نے پورے سال کے پیسے مانگے تو مشکل ہوگی اور ممکن ہے، اس مشکل کے حل کے لیے رشوت لینی پڑے...!''

اخبار والا ہنستا ہے: ''جی بہتر...!''

گیان اخبار دیکھ رہا ہے — الٹی سیدھی خبریں — وہ بیزاری سے اخبار پھینک دیتا ہے۔

گیان کے کمرے سے کنگز وے کا بس اسٹاپ کوئی دو فرلانگ ہے جسے وہ کوئی دس منٹ میں خالی ذہن کے ساتھ طے کرتا ہے۔ کونے کی دکان سے دن بھر کا کوٹا ایک پیکٹ پانامہ سگریٹ لیتا ہے، لاہور ہوٹل پر دو توسوں اور ایک چائے پر مشتمل ناشتہ کرتا ہے۔ دس نمبر بس پر چڑھ کر ملک گنج جاتا ہے اور وہاں سے پیدل پہاڑی چڑھتا ہوا اپنے ہاسپٹل پہنچتا ہے۔

ہاسپٹل کے دروازے پر مانگے کہتا ہے: ''نمستے صاحب۔''

''کہو کیسے ہو!'' گیان آگے بڑھتا ہے۔

''گڈ مارننگ اسٹاف!'' کیوولٹی ڈپارٹمنٹ میں ایک نرس کہتی ہے۔ وہ مسکرا کر جواب دیتا ہے، حاضری لگاتا ہے اور لیبارٹری کی جانب بڑھتا ہے۔

''اسٹاف! کون ہے یہ؟ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے، بات تو کرتا ہی نہیں...'' اسٹوڈنٹ نرس کی آواز اسے سنائی دیتی ہے۔ وہ پھر مسکراتا ہے۔

''اقبال! تم لیبارٹری کھولو، میں ذرا ڈاک دیکھ آؤں...!'' وہ اقبال کو چابیاں دیتا ہے اور دفتر کی جانب بڑھتا ہے۔

ایک لفافے پر پاکستانی ٹکٹ دیکھ کر گیان لفافہ اٹھاتا ہے (پاکستان سے صرف اسے خط آتے ہیں، پاکستان کے علاوہ اسے اور کہیں سے خط نہیں آتے) چاک کرتا ہے، پڑھتا ہے:

''اب تمھیں تمھاری تساہلی اور کاہلی کی سزا دینے کے بعد ضروری سمجھتا ہوں کہ تمھیں خط لکھ دوں...''

(باقی دوست بھی سزا دے رہے ہیں کیا؟) وہ مسکراتا ہے۔

لیبارٹری میں۔

ایک مریض کے بازو پر کہنیوں سے اوپر ربڑ کی نلی کستے ہوئے گیان کہتا ہے:

''آپ بیکار ہی نروس ہو رہی ہیں۔ یہ ہاتھ جہاں سوئی رکھ دیں، خون کھنچا چلا آئے گا۔ کسی سوتے ہوئے بچے کو ''پرک'' کروں گا تو یقین جانیے، اسے خواب میں کانٹے کی سی چبھن کا احساس ہوگا۔ بس! دیکھیے ادھر! محسوس ہوا کچھ آپ کو... اقبال، بلاؤ اگلے مریض کو...!''

''گیان صاحب! آپ کو بڑے صاحب بلا رہے ہیں...!''

''گڈ مارننگ سر!''

''بھئی گیان!'' ڈاکٹر پرمانک کہتا ہے، ''بات بہت ہی کونفیڈنشل ہے مگر تمھیں انفارم کر رہا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے سی آئی ڈی کے دفتر سے کوئی آیا تھا، تمھارے بارے میں پوچھ رہا تھا، کیا چکر ہے...؟''

گیان کہتا ہے: ''سر، ان لوگوں کو جب کوئی کام نہیں ہوتا، بیکار کی خانہ پری کے لیے چکر لگاتے رہتے ہیں... میں پاکستان گیا تھا نا، شاید یہی چکر ہے... اب ان سے کوئی پوچھے، بھلا شہر کی صفائی کے محکمۂ صحت کے ایک ملازم کے پاکستان جانے سے انھیں کس قسم کا خدشہ ہو سکتا ہے...؟''

ڈاکٹر پرمانک ہنستا ہے۔ ''احمق لوگ...''

''میں اندر آ سکتی ہوں...؟''

گیان پلٹ کر دیکھتا ہے۔ ''آؤ سوسن، یہ آخری سلائیڈ ہے، ذرا اپنٹ لوں!''

گیان خوردبین پر جھک جاتا ہے، اس کی آنکھیں سیلز تلاش کرتی ہیں — رپورٹ لکھنے کے بعد وہ سوسن کی طرف دیکھتا ہے۔

''پھر؟''

''تم وارڈ میں نہیں آئے، سو چلی آئی!''

وہ مسکراتا ہے: ''تم جو کچھ کہنا چاہتی ہو، کہہ دو!''

''تم نے کچھ سوچا؟''

وہ کہتا ہے: ''سوچنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں اور یہی میں تمھیں پہلے کہہ چکا ہوں... شادی ایک بندھن ہے، جو میرے بس کا نہیں... میری اپنی زندگی میرے لیے ایک لائبلٹی ہے جس سے نباہ نہیں کر پا رہا ہوں... شادی کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہوں؟''

''کیا یہ ممکن ہے کہ میں تمام زندگی یونہی تمھارے ساتھ گزار دوں؟''

''مگر یہ میں نے تم سے کب کہا ہے؟''

سوسن تیکھی آواز میں کہتی ہے: ''گیان! تم اپنے کو بہت کچھ سمجھتے ہو!''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں... ایک بات مجھے نہیں بھاتی، وہ میں نہیں کرتا، اتنا میں اپنے آپ کو سمجھتا ہوں...!''

دونوں خاموش ہیں۔

گیان سگریٹ سلگاتا ہے۔ سوسن اسے تکتی ہے اور بات کیے بنا چلی جاتی ہے— گیان رپورٹیں ڈسپیچ کرتا ہے اور لیبارٹری بند کر دیتا ہے۔

شام کے چھ بجے ہیں۔

گیان ٹی ہاؤس میں اپنے مخصوص صوفے کی جانب بڑھتا ہے، جہاں اس کے دوست بیٹھے ہیں۔

"آج تم لیٹ ہو گئے!"

"یار، آج کام زیادہ تھا۔"

"ہم سمجھے کہ تم نہرو کی تقریر سننے گئے ہو!"

گیان تعجب سے کہتا ہے: "نہرو کی تقریر!"

"ہاں، باہر ایل. آئی. سی. پلاٹ پر ہو رہی ہے...!"

گیان اٹھتا ہے— سامنے ایل. آئی. سی. پلاٹ پر مختصر سے ہجوم میں پنڈت نہرو کی آواز ابھر رہی ہے:

"مینن کو نشانہ بنانے والے سیاسی مچھندر ہیں..."

گیان اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہتا ہے: "یار یہ شخص اپنا علاقہ بھی contaminate کر رہا ہے...!"

تینوں مسکراتے ہیں۔

پارلیمنٹ اسٹریٹ ڈور سے درد داخل ہوتا ہے— تینوں چلاتے ہیں:

"درد صاحب کہ درد صاحب...!"

دردان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہتا ہے: "کیا حال ہے بچو؟"

گیان منہ بنا کر کہتا ہے: "درد صاحب، کل آپ کشتیاں دیکھنے چلے گئے اور آج آپ لیٹ آئے ہیں، یہ اچھی بات نہیں...!"

درد بھی منہ بنا کر کہتا ہے: "اچھے بچے روٹھا نہیں کرتے... میں نہرو کی تقریر سن رہا تھا...!"

"تقریر؟"

"ہاں بچو، ابھی تمھاری عمر سیکھنے کی ہے... اپنے عہد کی ہر حماقت کو ونس کرو...!"

چاروں بھرپور قہقہے کا پٹاخہ چھوڑتے ہیں۔

درد پھر کہتا ہے: ''میں صبح دو گھنٹے ورزش کرتا ہوں... گیان، تم میرے بازو دیکھو اور راکیش، تم ذرا میری ران چھوؤ... بے نالو یا... دیوار میں گھونسا مار کر دیوار نہ گرا دی تو نام نہیں...!''

گیان کہتا ہے: ''تو آپ 'تخلیق' چھوڑنے کے بعد پہلوان بن رہے ہیں... ہم نے تو سوچا تھا کہ جب آپ چت ہوں گے، ہم آپ کا جنازہ دھوم دھام سے اٹھائیں گے لیکن آپ تو ہم سب کو ٹھکانے لگا کر ٹھنڈے ہوں گے...!''

''اللہ قسم درد صاحب،'' راکیش کہتا ہے،'' آپ کی صحت دیکھ کر مجھے تو شرم آتی ہے... آپ ۳۸،۳۷ سال کی عمر میں دارا سنگھ! اور ہم لوگ ہیں کہ ۲۶، ۲۷ سال میں ہڈیوں کے ڈھانچے...!''

گیان کہتا ہے: ''درد صاحب، آخر یہ چکر کیا ہے...؟''

''گیان! تم سمجھتے کیوں نہیں؟... سنو!...'' گیان کے کان میں درد کہتا ہے: ''جن کے ہاں بچے نہیں ہوتے، انھیں بچے بانٹ رہا ہوں... کیوں؟''

''واہ درد صاحب، مزا آ گیا... اور بیس سال بعد حرامیوں کا لشکر انقلاب لائے گا... زندہ باد... جوشی!'' گیان چلاتا ہے اور درد کے بازو کو زور سے دباتے ہوئے جوشی سے کہتا ہے:

''جوشی، ہمارے لیے پلین کافی، درد صاحب کے لیے دو انڈوں کا آملیٹ اور کریم کافی...!''

رات کے دس بجے ہیں۔

گیان، درد کے کندھوں کا سہارا لیے سندھیا ہاؤس کراسنگ کی ریلنگ پر جھکا ہوا ہے— دونوں خاموش ہیں اور اِکا دُکا موٹروں کو لال اور ہری بتی کے سگنلوں کے اشاروں پر رُکتے بڑھتے دیکھ رہے ہیں۔

''گیان، تم نے بہت دنوں سے کچھ لکھا نہیں!''

''درد صاحب، آج رات ارادہ ہے... کبھی کبھی بہت بیزار پاتا ہوں خود کو اور اس جانے پہچانے اجنبیوں کے شہر سے دور، بہت دور، اجنبی دوستوں کے شہر میں جانا چاہتا ہوں، ایسا شہر کہاں ہے، یہ مجھے معلوم نہیں... مگر تسکین بھی ہے... کمزور لمحے تو کبھی کبھی آتے ہیں...!''

ساڑھے گیارہ بج رہے ہیں۔

گیان کے قلم سے سفید، بے داغ، کنوارے کاغذ پر چھوٹے چھوٹے متناسب الفاظ جنم لے رہے ہیں، وسعت اختیار کررہے ہیں (اس کے ذہن میں سیاہی اُبل رہی ہے اور پیٹ میں بھوک)۔

دو بجنے کی آواز آرہی ہے۔ گیان کی تخلیق کورے کاغذوں پر ابھر آئی ہے اور اس سے مخاطب ہے۔

(شکریہ...!شکریہ...!)

گیان مسکراتا ہے۔اس کے لب تھکن سے کانپ رہے ہیں۔

گیان سورہا ہے (اس کا اندر اور باہر ایک دوسرے کی آغوش میں مدغم ہیں)—— وہ ایسے سانس کھینچ رہا ہے جیسے اسے آکسیجن لگی ہوئی ہو۔

آیئے! دبے پاؤں نکل چلیں۔

OO

(روشنی کے لیے(۱): 'سات رنگ'، کراچی: ۱۹۶۲ء)

روشنی کا سیلاب

(۲)

وہ گاؤں سے، بہت پرے اونچے ٹیلے پر اکیلا کھڑا تھا۔

دور مشرقی اُفق سے سنہری بادل اُمڈ رہے تھے کہ مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں لپک لپک کر انھیں اپنے رنگ میں رنگ رہی تھیں۔

اس کے دل میں غیر مانوس سی کسک بادلوں کی طرح اٹھی۔

''میں کہاں ہوں... ؟اس ویرانی کا نام کیا ہے... ؟''

سورج ڈوب چکا تھا۔ سنہری کرنیں بادلوں میں تحلیل ہو چکی تھیں اور راکھ کی رنگت کے بادل چاروں طرف تا حد نظر پھیل چکے تھے۔ اس کے دل میں غیر مانوس سی کسک نے پھر تو بہ شکن انگڑائی لی۔

''میں کہاں ہوں... ؟اس ویرانی کا نام کیا ہے... ؟

بادل گرجے۔

''آبادیوں کے نام ہوتے ہیں... ویرانیوں کے نہیں... ؟''

''اف ف ف... !''

اس نے ٹیلے کی اُجلی پتھریلی سطح پر رکھا ہوا چمڑے کا تھیلا تیزی سے اُٹھایا، گلاس، سوڈا اور بلیک نائٹ کی بوتل نکالی، تھرمس کھولی، مرکب بنایا اور مشینی تیزی سے اپنے اندر انڈیل لیا— اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کھوئے ہوئے سورج کی کھوئی ہوئی کرنوں کی آنچ اس کے خون میں حل ہو گئی ہے۔

اس کا خون کھول رہا تھا اور بادل گرج رہے تھے۔ چند ہی لمحوں میں بادلوں کی شدید گرج کے ساتھ بجلی اس کی جانب لپکی اور اس کی اندھیروں میں کھوئی ہوئی دنیا ایک لحظہ کے لیے روشن ہو گئی۔

وہ اکیلا، تن تنہا...

بجلی پھر چمکی اور بادل پھر گرجے۔

ایک ہجوم تھا اور تنہائی تھی... ایک تنہائی تھی اور ہجوم تھا... وہ اکیلا، تن تنہا... اکیلا...

بجلی پھر چمکی اور اس کی کھوئی ہوئی زندگی پھر ایک لمحے کے لیے روشن ہوگئی۔ اس نے اس ایک روشن لمحے کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ لیا اور دیکھا۔

گرد و غبار سے اٹی ہوئی ایک آدمی کی دنیا — گرد و غبار تہ در تہ اس کی دنیا پر جم چکے تھے اور وہ — ایک آدمی — ایک اکائی جو واضح ہوتے ہوئے بھی غیر واضح تھی۔

بارش کا پہلا آنسو دھرتی کے دامن میں کھونے کی بجائے اس کے گالوں پر پھیل گیا — اس نے پھر برق رفتاری سے مرکب بنایا اور اپنے خون کی حرارت کو زندہ رکھا۔

بارش بتدریج بڑھنے لگی اور وشال دھرتی کے ساتھ اس کے خدوخال بھی سنوارنے لگی۔ دھرتی پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی جو بوچھاڑ کی تاب نہ لا سکی اور بہہ گئی۔ دھرتی کے خدوخال واضح ہو گئے اور اس کی سوندھی سوندھی باس اس بے نام سی ویرانی میں پھیل گئی۔

اس کے خدوخال تہ در تہ گرد کی اَن گنت سوکھی لہروں کے نیچے دبے پڑے تھے جنھیں ایک بوچھاڑ کی قوت سنوارنے کی اہل نہیں تھی — ایک طوفان آن پہنچا، اس نے بھی طوفان کی سی تیزی سے اپنے خون کی حرارت کو بڑھایا — باہر بارش تھی، طوفان تھا، اندر آگ تھی، خون تھا — تصادم ہوا اور ایک جھناکے سے اس کی زندگی، اس کی ذات برہنہ حالت میں، وادی میں، اس کی مندی ہوئی آنکھوں کے سامنے دنیاوی طوفان سے ٹکر لینے کا کھیل کھیلنے لگی۔

غلیظ ترین نالے کے کنارے پر زمین سے دو فٹ اُبھرے ہوئے کچے اور مکروہ چبوتروں کی قطار ہے۔ ایک چبوترے پر پھیلی ہوئی راکھ کو گیان کرید رہا ہے اور جلی ہوئی ہڈیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہا ہے۔ جب اس کا دامن بھر جاتا ہے، وہ بھرا ہوا دامن نالے میں خالی کر دیتا ہے۔

"چل پیارے! تو مقدم ہے میرے لیے کہ تو نے اپنے دل کی دھرتی سے مجھے پیدا کیا ہے اور اپنی آنکھ کی روشنی سے مجھے سینچا ہے... تیری دائمی جدائی ایک منزل ہے جہاں مجھے نئے راستے نظر آ رہے ہیں۔ اب میں ہوں اور میری نظر انتخاب...!"

لمحے گرد راہ کی طرح گزر رہے ہیں، گیان منجمد ہے۔

لمحے جھکڑوں کی صورت گزر رہے ہیں، گیان بے حس ہے۔

گیان بے حس نہیں ہے۔ اس کے دل کا ساحل کٹا پھٹا ہے اور یادوں کے جہازوں میں اس کا خالق نت نئے لباس میں اُترتا ہے، اس سے باتیں کرتا ہے، وہ سنتا ہے اور اپنے آپ میں سکڑتا جاتا ہے۔

گیان بے حس ہے اپنی محبوبہ کے لیے جو اسے برحاتی ہے اور یوں اسے اس کے خالق سے

دور رکھنا چاہتی ہے۔ محبوبہ کی یہ کوشش گیان کو خود اس سے دور لیے جارہی ہے۔

اس کی محبوبہ کے جسم کے انگارے اب اس کے لیے بجھے ہوئے کوئلے ہیں — اب اسے محبوبہ نہیں بھاتی، ہاتھوں کا ترانہ بھاتا ہے۔

ہاتھوں کا ترانہ، جس کی لے سمندر کی لہروں کے سنگیت میں جذب ہو جاتی ہے، لہروں کا دودھیا جھاگ جونت نئے پیکر بناتا ہے۔

کھلے ہوئے اور کندھوں پر پھیلے ہوئے سنہری سیاہ بال، صاف شفاف پیشانی، سیدھی سادی بھویں، نیم خوابیدہ آنکھیں جیسے نیلی جھیلوں میں دیے لودے رہے ہوں، دبے دبے سے گلابی ہونٹ اور چہرے کی سلگتی ہوئی رنگت جیسے لپٹوں کو ڈھال کر شبیہہ کی تشکیل کی گئی ہو اور لپٹوں ہی سے ڈھالا گیا اس بے نام ہستی کا بدن، شہد سے بھری ہوئی، جوان، پکی ہوئی گول چھاتیاں اور ان کی گلابی منہ بند کلیاں جو صرف ہوا اور پانی کے لمس ہی سے مانوس ہیں... سکوت کے پروں پر اڑتی ہوئی آواز دل کی دھڑکن کی طرح محسوس ہوتی ہے... جس کی تصویر لفظوں کی محتاج ہے نہ رنگوں کی... تصور کی محتاج ہے... دیوانے کے خواب کی محتاج ہے...

''میں خالق ہوں، دیوانے کے خوابوں کا... خدا...''

''خدا...''

طوفان اُمنگ میں آ گیا تھا اور وہ بھی — اس کے اندر دوجہاں کی آگ لپک رہی تھی۔

لمحے آواز کی رفتار سے بھاگ رہے ہیں۔

گیان ہجوم میں تنہا ہے — خالق کی تنہائی — خدا کی تنہائی —

''تم مٹی کے مادھو ہو، شطرنج کے مہرے ہو... جاؤ یہاں سے... کیا رکھا ہے یہاں... کہیں تمھاری بیوی انتقاماً کسی کے ساتھ نہ سو جائے... میری قربت کی لذت شہادت کے بعد نصیب ہوتی ہے...''

کھلونے ٹوٹ رہے ہیں، بن رہے ہیں۔

''بیوی کو غازی آباد جا کر ریسیو کرنا چاہتے ہو کہ وہ تمھارے پیار کے اظہار سے چکرا جائے۔ تم اسے آج کے زمانے کی ''گفٹ آف مے جائی (Gift of Magi) سمجھتے ہو... مت جانا غازی آباد... ہوسکتا ہے، تمھاری بیوی کا کوئی دیرینہ یار اسے غازی آباد تک چھوڑنے آئے...''

نئے کھلونے آ رہے ہیں۔

"میں کسی کا محتاج نہیں... مجھے کسی کا سہارا درکار نہیں... مجھے جینا آتا ہے اور مرنا بھی..."

"یہاں سے وہاں تک پانچ سال پھیلے ہوئے ہیں... اور وہاں تک جانے کے لیے میرے پاس سب کچھ ہے... میں اپنے طور پر جیوں گا...!"

ایک کھلونا چیختا ہے۔

"گیان، تم خود ہی تماشا ہو اور خود ہی تماشائی اور... تماشاگر بھی... تمھیں اپنی ذات کے سوا کسی اور سے دلچسپی نہیں... تمھارا یہ وہم ہے کہ تمھاری ذات سے لوگوں کو دلچسپی ہے... تم اپنی محفل سے لوگوں کو اٹھاتے نہیں، لوگ اُٹھ جاتے ہیں... تمھارا یہ وہم... یہ پستول دیکھ رہے ہو... یہ گولیاں میں تمھارے سینے میں اُتار سکتا ہوں... چلو تم خالق سہی... مگر یہ بھول جاؤ کہ تمھاری مخلوق کی موت بھی تمھارے ہاتھوں میں ہے... یہ گولیاں میں اپنے دل میں اُتاروں گا اور تم... تم روؤ گے... ہنسو گے...!"

"آ ہا ہا ہا... آ ہا ہا ہا...!"

طوفان تھم گیا۔

اس کے اندر آگ شانت ہوئی۔

بادل چھائے ہوئے تھے مگر شانت تھے۔ بجلی بھی تھک کر سوگئی تھی۔ دور تک، تا حد نظر، اس کے دل کی دھڑکن سے لرزتی ہوئی خاموشی پھیلی ہوئی تھی اور بڑے طوفان کی آمد کا اشارہ کر رہی تھی۔

اس نے مرکب بنانا چاہا مگر کچھ بھی باقی نہ رہا تھا — وہ تھا اور کالے، گھنے، انتشار پسند بادلوں سے سہمی ہوئی ویرانی۔

بادل آہستہ سے گرجے، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

بادلوں نے چنگھاڑنا شروع کیا، اس کا دل بیٹھنے لگا۔

اور پھر اچانک بجلی تڑپ کر اس پر لپکی اور اسے ڈس گئی۔

صبح سورج کی پہلی کرن نے گاؤں سے بہت پرے اونچے ٹیلے پر حسرت بھری نظروں سے ایک سنہری لاش دیکھی۔

OO

('روشنی کا سیلاب' (۲): 'نصرت'، لاہور: ۱۹۶۳ء)

تصویر یار کی

(۳)

سنیچر کی رات تھی۔

کیلاش کالونی بس اسٹینڈ پر راکیش کے قدم ایک بار پھر رُک گئے۔ اس نے سوچا کہ لوٹ جائے۔ مگر اُس نے ہمت باندھی، مضبوطی سے قدم اٹھائے اور سندھیا کے خوبصورت بنگلے 'افسانہ' کی جانب چل پڑا۔

سندھیا اسے دروازے ہی پر ملی۔ اس نے آگے بڑھ کر راکیش کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا: ''ہم لوگ تمھارا انتظار کر رہے تھے...!''

راکیش نے سندھیا کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا: ''جانِ من! بہت مشکل سے پہنچ پایا ہوں، جی اچھا نہیں ہے...!''

ڈرائنگ روم میں سب موجود تھے، سندھیا کا شوہر گوپال، نول اور منوہر۔

منوہر نے راکیش کو دیکھتے ہی کہا: ''اے میرے مفکر، آج تم متفکر نظر آ رہے ہو!''

نہ جانے راکیش کو کیا ہوا، اس نے آگے بڑھ کر منوہر کا ماتھا چوم لیا۔

گوپال بولا: ''بھئی واہ! خیر تو ہے...!''

راکیش نے ایک نظر کمرے کو دیکھا — سبز بجھی بجھی دیواریں، چمکتی ہوئی سفید چھت، کھڑکیوں پر موٹے کھردرے، سبز پردے جن میں سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں اور ہلکی سبز روشنی۔ دائیں دیوار میں ایک بہت بڑی الماری میں، شیلفوں میں کتابیں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں، الماری کے ایک کونے میں ایک تصویر ماؤنٹ کٹ فریم کی قید سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور بائیں دیوار میں انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے۔

گوپال سے نہ رہا گیا۔ ''راکیش...!'' اس کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

راکیش کی نظر تصویر سے ہٹ گئی۔ اس نے فوراً ہی خود کو سمیٹا۔ ''ہاں تو یارو! دیکھا میرا نیا

جادو! کیسے تم سب لوگوں کو نروس کر دیا۔ ارے! تم تو سب گھبرا گئے۔ مَیں تو.... میں تو.... '' مگر بات ٹوٹ گئی اور وہ پھر تصویر دیکھنے لگا۔

پیڑ کے تنے کے سہارے کھڑی ہوئی، دبلی پتلی، روشن آنکھوں والی شخصیت، پورے بازو کی سوئیٹر پہنے جس کی عین بیچ میں چھاتی اور بازوؤں کے اوپر دھاری کھنچی ہوئی تھی۔ اور پتلون کی جیب میں شان بے نیازی سے ہاتھ ڈالے اور لبوں سے مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے۔

''راکیش....!'' گوپال قریب قریب چیخ پڑا۔

راکیش نے تصویر سے نظریں ہٹائیں۔ سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''راکیش، کیا بات ہے؟'' نول نے پہلی بار لب کھولے۔ اس کے لہجے میں، اس کی مخصوص دھیمے دھیمے بہتی ہوئی ندی کی سی روانی تھی۔

سندھیا نے راکیش کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''تم تو کچھ بھی دل میں رکھنے کے عادی نہیں ہو۔ بتاؤ، کیا بات ہے؟ گیان کے بارے میں کچھ پتہ چلا ہے؟'' سندھیا کی نظریں تصویر کی جانب اُٹھ گئیں۔

راکیش بمشکل کہہ سکا: ''گیان مر گیا!'' اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

کمرے میں پھیلی ہوئی ہلکی سبز روشنی میں خاموشی حل ہو گئی۔

پانچ دل دھڑک رہے تھے، ایک دل کے لیے جو خاموش ہو چکا تھا۔

''جب دل خاموش ہو جاتے ہیں، تصویریں کہانیاں کہتی ہیں.... '' نول نے گیان کی تصویر کی جانب دیکھا جہاں خاموش مسکراہٹوں کے بھنور بن بن کر ٹوٹ رہے تھے۔

نول نے گوپال کو دیکھا — گوپال کی نظریں پردوں کی سلوٹوں میں اُلجھی ہوئی تھیں، منوہر گیان کی تصویر دیکھ رہا تھا، راکیش سر جھکائے ہوئے تھا، سندھیا کی پلکوں میں دو آنسو پھنسے ہوئے تھے اور اس کے لب کانپ رہے تھے۔

''دوست کی موت کا ماتم بھی ڈرامہ ہے اور ہم سب اپنا اپنا رول خوش اسلوبی سے نبھا رہے ہیں.... '' نول نے پھر گیان کی تصویر کی جانب دیکھا جیسے کہنا چاہتا ہو:

''کیوں ٹھیک ہے نا!'' تصویر مسکراہٹیں لیے ہوئے تھی، تصویر کا دل خاموش ہو چکا تھا۔

''اف یہ خاموشی اور یہ تصویر....!'' نول کا سر گھوم گیا۔

''.... کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے اے میرے احمق دوست، ہم یونہی اُداس ہو جاتے ہیں۔ بات کچھ بھی نہیں، پھر بھی اُداس ہیں اور پھر یہ احساس شدت پکڑتا جاتا ہے، ہم بے چارگی سے

دیکھتے رہتے ہیں، کچھ سوجھتا نہیں اور پھر ہم گھبرا کر خودکشی کر لیتے ہیں اور اس پر لوگ کہتے ہیں کہ مقروض تھا، گھبرا کر خودکشی کر لی...''

''... یہ لوگ... یہ ملک... یہ اَن وانٹڈ اومینیشن... زندگی ہے کہ لطیفہ... اور تو اور موت بھی اِک لطیفہ ہے... اور یہ لطیفہ بھی چند روز بھونڈے اور بھنبھناتے ہوئے لہجوں میں سرکولیٹ ہوتا ہے اور پھر ہمیں اس سے گھن آنے لگتی ہے...''

نول کا سر زوروں سے گھوم رہا تھا اور ماضی کے جھروکوں میں سے گیان کی لیکی ہوئی آواز کے بھنور میں ڈوب رہا تھا۔

''... یہ پیشہ ور لیڈروں کا ملک، یہ گورنریاں، یہ پرموشنیں، یہ ہم تم... میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جو چاہتا ہے کہ اس کی بیوی سبھی رہے اور اسے پیار کرتی رہے۔ اس لیے وہ بہانے بناتا ہے۔ کہتا ہے کہ ٹی بی ہوگئی ہے، بیوی بیچاری روتی ہے اور تمام عمر سیوا کرنے کی قسمیں کھاتی ہے اور وہ مسکرا دیتا ہے۔ حالانکہ بیوی بے چاری نے سیوا کرنا سیکھا ہے، ساتھ سونا سیکھا ہے... یہ جینے کے لیے بہانے، مکروہ، کانے سڑے ہوئے بہانے... میں پاگلوں کی طرح بول رہا ہوں... تم سوچ رہے ہو گے کہ بے ربط، مہمل، واہیات جملے، یہی کچھ میری زندگی میں باقی رہ گیا ہے... پیارے، یہ میری زبان ہے جو میری روح بھی ہے۔ میں نے اس زبان میں کھایا ہے، پیا ہے، اس زبان میں سوچا ہے... میری زبان کے گلے پر چھری چل رہی ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتا، بس اپنی نظروں میں گرتا چلا جا رہا ہوں... میں پاگل ہوں، مگر مجھے اپنا پاگل پن اچھا لگتا ہے کہ یہ میں نے مستعار نہیں لیا ہے۔ میں نے اسے جنم دیا ہے...''

''گیان...!'' نول کی چیخ نکل گئی جیسے اس کی آواز کی دھیمے دھیمے بہتی ہوئی ندی پہاڑ سے پھسل گئی ہو— سب چونک کر اپنے اپنے غم کے گھروں سے باہر نکل آئے۔

سندھیا اٹھی اور نول کے پاس کرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ ''نول...'' سندھیا نے بڑے ضبط سے کہا: ''گیان کی موت اتنی غیر متوقع تو نہیں ہے...!''

گوپال نے راکیش کی طرف دیکھا اور پھر منوہر کی طرف۔ دونوں گم سم تھے۔

''گیان نے دلّی چھوڑتے سے کہا تھا کہ اب ہم لوگ اسے پھر کبھی نہیں دیکھ پائیں گے!''

''مگر میں یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی جلدی مر جائے گا۔ ذلیل شخص کو جینے کی بھی جلدی تھی اور مرنے کی بھی...'' منوہر نے قدرے بیزاری سے کہا۔ وہ گیان کی تصویر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہی بکھرتی ہوئی مسکراہٹیں کہہ رہی تھیں، ''منوہر، بے پناہ غم میں آدمی چڑچڑا بھی ہو جاتا ہے!''

گوپال نے سندھیا سے کہا: ''سندھیا، تم چائے کے لیے کہو!''
چائے آئی تو سب بے دلی سے پینے لگے۔
نول نے پھر گیان کی تصویر کی جانب دیکھا۔ ''چائے ہے یا پگھلا ہوا سونا...!''
نول کے ہونٹوں پر بات آتے آتے رہ گئی۔
''کمبخت! ہم نے تو ٹی ہاؤس جانا چھوڑ دیا ہے... تیرے بغیر ٹی ہاؤس کچھ بھی نہیں...!''
''راکیش تمھیں کس نے کہا کہ گیان کی موت ہوگئی ہے... اور وہ مرا کہاں ہے؟''
راکیش نے جیب سے خط نکالا اور بنا کچھ کہے پڑھنا شروع کردیا:

راکیش صاحب!

میں آپ کے لیے اجنبی ہوں اور اتفاق سے میرے ذمے ایک بہت ہی ناخوشگوار فرض آن پڑا ہے جسے نبھاتے ہوئے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔

یہاں ہمارے گاؤں میں گزشتہ پانچ ماہ سے آپ کے دوست گیان ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں یہاں کوئی کچھ نہیں جانتا کہ انھوں نے اپنے قیام کے دوران کسی سے کوئی بات نہیں کی —— وہ روز شام ڈھلے گاؤں سے بہت پرے اونچے ٹیلے پر چلے جاتے اور بہت رات گئے تک شراب پیتے رہتے۔ اس حد تک وہ اس گاؤں کی گنتی کی آبادی کے لیے دلچسپی کا باعث تھے کہ یہ بات بڑی انوکھی تھی۔ ۵ر دسمبر کو وہ معمول کے مطابق شام ڈھلے ٹیلے پر پہنچے۔ اس رات بڑا بھیانک طوفان آیا۔ جانے کیوں وہ واپس نہیں آئے، صبح ان کی لاش پائی گئی۔ گاؤں والوں نے ہندو رسم و رواج کے مطابق ان کا انتم سنسکار کیا ہے اور یہ ناخوشگوار فرض میرے ذمے آن پڑا ہے کہ آپ کو اطلاع دوں —— گیان صاحب کے کمرے سے آپ کا ایڈریس ملا تھا۔ ان کی ڈائری بھیج رہا ہوں۔ اگر آپ یہاں آسکیں تو عنایت ہوگی کہ ان کے کپڑے اور ڈھیر ساری کتابیں یہاں رکھی ہوئی ہیں —— مجھے گیان صاحب کی موت کا واقعی افسوس ہے۔

آپ کا
سوہن سنگھ

راکیش نے خط پڑھنے کے بعد کہا: ''خط گرنا صاحب گاؤں سے لکھا گیا ہے!''
''اور ڈائری؟'' سندھیا نے پوچھا۔

''تو آخری پانچ ماہ اس نے ڈائری میں قید کرر کھے ہیں...!'' نول کی آواز کی ندی پُرسکون تھی۔
راکیش نے ڈائری نکالی اور منوہر کی طرف بڑھادی۔

۵راگست: ریل کی پٹری کے مغرب میں میرا گاؤں جھنگڑ کلاں ہے اور مشرق میں گرنا صاحب جہاں ہر سال بیساکھی کا میلہ لگتا ہے اور ضلع ہوشیار پور کے کونے کونے سے لوگ آتے ہیں— ابھی ابھی یہاں پہنچا ہوں۔ کیوں پہنچا ہوں، یہ نہیں جانتا، شاید دلّی سے جی گھبرانے لگا ہے— دلّی اسٹیشن پر سندھیا، گوپال، منوہر اور نول، سب موجود تھے۔ جانے میں نے ان سے کیوں کہا،''اب تم لوگ مجھے پھر کبھی نہ دیکھ پاؤ گے!''
اُس بیمار شہر میں، جسے دلّی کہتے ہیں، پانچ تو ہیں جو میرا دُکھ درد سمجھتے ہیں۔ انھیں بھی چھوڑ آیا ہوں۔ میں نے بہت سوچا ہے مگر کچھ سوجھا نہیں۔ آخر میں نے دلّی کیوں چھوڑی ہے؟ کیا یہ کم ہے کہ مجھے پانچ غم خوار ملے ہیں؟ شاید ان کے پیار نے مجھے کمزور کردیا ہے اور میں بحیثیت 'میں' کمزور ہورہا ہوں اور بھاگ آیا ہوں— کیا یہاں میں اپنے 'میں' کو پاسکوں گا۔

۱۰راگست: گاؤں سے بہت پرے اونچے ٹیلے پر اکیلا بیٹھا ہوں اور مغربی اُفق پر ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہا ہوں۔ اسی طرح اگر آدمی ڈوبے اور کوئی اسے دیکھے تو لطف آجائے— بلیک نائٹ کی بوتل میرے پاس ہے اور میرے دوستوں کی یادیں۔ کتنی بڑی نعمت ہے یہ! ہر کسی کو کہاں نصیب!

۱۸راگست: اخبار کی صورت دیکھے بہت دن ہوگئے ہیں۔ جانے کون سے صوبے کی گورنری کس کو ملی ہے اور کس کو نہیں ملی ہے— اِس کو نہیں تو اُس کو ملی ہوگی اور اگر اُس کو نہیں تو اِس کو...

۳۰راگست: گرنا صاحب میں عجیب و غریب حادثہ ہوا ہے— ایک شادی شدہ عورت ہرنام کور اپنے عاشق حکم سنگھ کے ساتھ مردہ پائی گئی۔ دونوں زندگی میں ایک ساتھ سانس نہیں لے سکتے تھے، اس لیے دونوں نے

اکٹھے مرجانا مناسب سمجھا — پوسٹ مارٹم کے بعد حکم سنگھ کی لاش اس کا باپ لے گیا لیکن ہرنام کور کی لاش نہ تو اس کے خاوند نے قبول کی اور نہ اس کے ماں باپ نے کہ ہرنام کور نے ان کا منہ کالا کیا ہے — مجبوراً ہرنام کور کی لاش لاوارث قرار دے کر سیوا سمتی کو سونپ دی گئی — یوں ہرنام کور کے خاوند اور ماں باپ نے ہرنام کور کی لاش سے انتقام لیا ہے — کیا یہ زنا سے بھی زیادہ گھناؤنا فعل نہیں؟

۱۷ را کتوبر: گذشتہ ایک ماہ سے جی اچھا نہیں ہے۔ دلّی کے ہنگاموں سے دُور، یہاں تنہائی میں بھی جی نہیں لگتا۔ شاید ایسے مقام پر پہنچ گیا ہوں، جہاں ہنگامے اور تنہائیاں از خود کچھ حقیقت نہیں رکھتے — پھر یہ بھاگتا کیوں پھر رہا ہوں۔

۱۸ رنومبر: میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میری 'خود ساختہ' اُلجھنیں اس وجہ سے ہیں کہ میں نے ہجوم کی آنکھ سے دنیا دیکھنے کی کوشش نہیں کی، اپنی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ مجھے نظر آیا ہے، وہ کچھ اور ہے، وہ نہیں، جو میں نے سنا تھا اور اب میں بھٹک رہا ہوں — ہزار ناکامیوں، اور نامرادیوں اور اُداسیوں کے باوجود دل دھڑک رہا ہے اور درد کی میٹھی راگنی گا رہا ہے۔

۴ ردسمبر: میری زندگی کا خاکہ:

پیدائش: ایک ناخوشگوار حادثہ۔

تعلیم: صدیوں کی اُگلی ہوئی قے کا ایک حصّہ مجھے بھی ملا۔

پیشہ: قلیوں کی طرح مشقت کر کے پیٹ بھرنا چاہا مگر کچھ نصیب نہ ہوا۔ پھر باپ کی چھوڑی ہوئی پونجی سے جسمانی اور ذہنی ضروریات پوری کیں اور اپنے 'میں' کو جنم دیا۔

دوست: پانچ دوست ملے مگر باوجود بے پناہ پیار اور خلوص کے میری تسکین کا باعث نہ بن سکے۔

خواہش: پاگل ہونے کی خواہش بڑی شدید ہے کہ بازاروں میں الف ننگا پھروں اور پتھر کھاؤں۔

گناہ: ایک بار ایک شخص کو ذہنی طور پر اتنا ٹورچر کیا کہ اس نے خودکشی کرلی۔ اس دن سے اپنی نظروں میں اور اونچی مسند پر بیٹھا ہوا ہوں۔
پسند: خودکشی — کہ آج تک کی حیاتِ انساں طویل تاریخِ خودکشی ہے۔

منوہر نے ڈائری راکیش کی طرف بڑھا دی اور بیزاری سے کہا: "بھئی سندھیا، کھانے کے لیے کہو، بھوک لگی ہے!"

"ہاں سندھیا، دس بج رہے ہیں!" گوپال نے بھی ہاں میں ہاں ملائی جیسے وہ اس کا منتظر تھا۔

کھانا شروع کرنے سے پہلے راکیش نے نول کی طرف دیکھا۔ نول، گیان کی تصویر دیکھ رہا تھا۔

"نول!" راکیش بولا۔

"ہوں!" نول چونکا۔

سب نے کھانا شروع کر دیا۔

کھانے کے بعد کافی پیتے ہوئے سب باتیں کرتے رہے جیسے ایک دوسرے کو پرچار رہے ہوں — بس نول خاموش تھا۔ اس نے گیان کی تصویر کو پھر دیکھا۔ مسکراہٹوں کے بھنور کہہ رہے تھے:

"روشنی بڑی چیز ہے۔ دل کا اندھیرا دور کرنے کے لیے جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ میں جان ہار دوں، اور مجھے یہ تسکین ہو کہ میری موت پر ایک لمحے کے لیے کوئی اُداس ہو جائے گا، تو مجھے جان ہارنے کا کوئی غم نہیں...!"

نول کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے بھی باتوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔

○○

('تصویر یار کی' (۳): 'تلاش'، نئی دلی: ۱۹۶۲ء)

(تینوں حصے ایک ساتھ، بعنوان 'کوئی روشنی، کوئی روشنی': 'فنون'، لاہور: ۱۹۶۲ء)

ایک مہمل کہانی

لوہے کا صدر دروازہ پھولوں سے لدا ہوا تھا — پھول، گندھے ہوئے، مرجھائے ہوئے، شبنم سے بھیگے ہوئے۔

پھولوں کی پتیاں سرخ بجری پر جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں۔

(جب کوئی مریض ڈسچارج ہوتا ہے — نئی زندگی پاتا ہے — تو وارڈ کے باقی تمام مریض اُسے پھولوں سے لاد دیتے ہیں اور اُسے صدر دروازے تک چھوڑنے آتے ہیں۔ نئی زندگی پانے والا خوش نصیب ہاسپٹل سے باہر پہلا قدم رکھتا ہے، روایت کے مطابق پھول لوہے کے صدر دروازے کی بھینٹ کرتا ہے، اور گھر — نئی دنیا — لوٹ جاتا ہے۔)

"تو کل پھر کسی نے نئی زندگی پائی!"

بجری اُس کے پاؤں کے نیچے چُرمرا رہی تھی۔

ایک فرلانگ پرے، مورچری کے باہر، بجری پر پھولوں کی اَن گنت پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔

(جب کوئی مریض مرجاتا ہے — نجات پاتا ہے — تو وارڈ کے باقی تمام مریض، اسٹریچر پر سفید چادر سے ڈھکی ہوئی لاش، پھولوں کی پتیوں سے لاد دیتے ہیں اور روایت کے مطابق اُسے مورچری تک چھوڑنے آتے ہیں۔)

"تو کل پھر کوئی اُٹھ گیا!"

سرخ بجری اس کے دھیمے دھیمے اُٹھتے ہوئے قدموں کے نیچے چُرمرا رہی تھی۔

(جب کوئی مریض ڈسچارج ہوتا ہے یا مرجاتا ہے تو اُس کا پلنگ، وارڈ سے باہر لان میں — نرم گرم دھوپ میں، کھلی چاندنی میں، بھیگتے اندھیروں میں — چوبیس گھنٹوں کے لیے رکھ دیا جاتا ہے۔)

"کسی نے نئی زندگی پائی یا... کوئی اُٹھ گیا!"

اُس کے لرزتے ہوئے لبوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اُس نے مڑ کر دیکھا۔

''اشوک، کُلدیپ سے ملاقات ہوئی؟''

''نہیں۔'' اُس نے دھیمے سے کہا۔

''کُلدیپ مورچری میں پڑا تمھارا انتظار کر رہا ہے۔''

''ڈونٹ بی سِلی!''

''کُلدیپ واقعی مورچری میں پڑا ہے۔''

(مورچری آرام گاہ ہے۔)

اُس نے دھیمے دھیمے اِنفرمری وارڈ کی جانب قدم بڑھائے۔

''اِسٹاف، ذرا مورچری کی چابی دیجیے۔'' اُس نے نرس سے کہا۔

''مسٹر اشوک، کُلدیپ آپ کا گہرا دوست تھا نا!'' نرس نے چابی اُس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''اسٹاف، کُلدیپ میرا دوست ہے، تھا نہیں...!''

(ہائے یہ نظروں کے سامنے چلتے پھرتے جسموں کی دوستی — کیا بس یہی دوستی ہے!)

اُس نے مورچری کا دروازہ کھولا — صاف شفاف، دُھلی ہوئی مورچری، ٹھنڈی مورچری۔

کُلدیپ، چپس کے سلیب پر چپ چاپ پڑا تھا۔

اُس نے سفید چادر ہٹائی — کُلدیپ کا منہ ننگا کیا — یخ ماتھے پر ہاتھ رکھا — کُلدیپ سویا رہا۔

(نیند کا موہ جان لے لیتا ہے۔)

اُس نے چادر سے کُلدیپ کا منہ ڈھک دیا اور باہر آ گیا۔

(کچھ لوگوں کے لیے زندگی جونک ہے، کچھ کے لیے کمبل اور کچھ کے لیے — ہم پی بھی گئے، چھلکا بھی گئے۔)

سُرخ بجری اُس کے قدموں کے نیچے چُرمرا رہی تھی۔

اُسے دھوپ اچھی لگ رہی تھی — دسمبر کا مہینہ، دھیمے دھیمے بہتی ہوئی خنک ہوا اور اُجلی پیلی دھوپ — موسم کا حسین ظلم۔

(موسم نے مار ڈالا، رُت نے چھری چلائی!)

لیبارٹری تک پہنچنے کے لیے، جلد پہنچنے کے لیے — (بے کار کی عجلت پسندی) — وہ میل وارڈ نمبر دو میں داخل ہو گیا۔

"اشوک صاحب، نمسکار۔"

"آداب عرض، اشوک صاحب۔"

"گڈ مارننگ، مسٹر اشوک۔"

"اشوک بابو، کل مورچے پر جا رہا ہوں...!"

(آوازیں — پرچھائیاں — آوازیں اور پرچھائیاں — لوہے کا صدر دروازہ اور پھول، مورچہ پی اور پھولوں کی پتیاں!)

"اشوک بابو، کل مورچے پر جا رہا ہوں...!"

"گھبرا رہے ہو کیا؟" اُس نے کہا۔

"نہیں تو!"

"پھر!"

"کچھ نہیں۔"

"گھبراؤ نہیں۔ آپریشن کامیاب رہے گا... تم مورچے سے صحیح سلامت لوٹو گے۔"

(مورچے سے صحیح سلامت لوٹو تو لوہے کا صدر دروازہ اور پھول — مورچے پر دم توڑ دو تو مورچہ پی اور پھولوں کی پتیاں۔)

میل وارڈ نمبر دو میں آوازیں لپکتی رہیں، وہ باہر آ گیا۔

سامنے لیبارٹری تھی۔

(زندگی کے — جوانی کے آٹھ سال، لیبارٹری میں، ایک جار میں، سولیوشن نمبر تین میں، بحفاظت رکھے ہوئے ہیں، رکھے رہیں گے۔)

"گڈ مارننگ، ایوری باڈی۔"

"گڈ مار—"

"گڈ—"

"—ننگ—"

"مارننگ... گڈ مارننگ۔" آوازیں یکدم گیند کی طرح اُچھلیں۔

"اشوک، وہ..."

''میں اُس سے مل چکا ہوں۔''

''نہیں اشوک، وہ...''

''وہ مورچری میں ہے... پڑا سو رہا ہے۔ مَیں نے اُسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ آؤ چائے پئیں۔''

میڈیا سیکشن میں چائے بن رہی تھی۔

چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ایک نے کہا: ''کل دیکھتے دیکھتے کلدیپ کا دم اُکھڑ گیا۔''

''یا ہوا، جو مر گیا ہے، اُس کی بات مت کرو۔ جو زندہ ہے، اُس کی بات کرو۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چائے گرم ہے، لذیذ ہے۔''

(جسم گرم ہے اور جسم کی لذّت معلوم — جسم ٹھنڈا بھی ہوتا ہے اور ٹھنڈے جسم کی لذّت نامعلوم۔)

''آؤ دُھوپ کھائیں۔''

''تم دُھوپ کھاؤ، مَیں وارڈ میں جا رہا ہوں۔''

اُس نے ایک ہی گھونٹ میں چائے ختم کر ڈالی اور پرائیویٹ کاٹیج کی طرف چل پڑا۔

پرائیویٹ کاٹیج کے لان میں لوہے کا پلنگ پڑا ہوا تھا — کلدیپ کا پلنگ۔

اُس نے لوہے کا پلنگ چھوا۔

(پلنگ دو دن خالی رہتا ہے اور پھر بھر جاتا ہے — دُنیا میں کسی کی جگہ خالی نہیں رہتی۔ تاریخ میں جگہیں خالی رہتی ہیں۔)

اُس نے ڈیوٹی رُوم کی طرف قدم بڑھائے۔

''ہیلو اسٹاف۔'' اُس نے تانبے کی طرح دمکتے بدن والی نرس سے کہا۔

''کیسے ہیں مسٹر اشوک آپ!'' نرس کی آواز دُھلی ہوئی تھی اور دُھوپ کی طرح مہربان اور گرم تھی۔

(زندگی اور موت کے بیچ فاصلے — زندگی اور زندگی کے بیچ فاصلے — اب کہاں جائے گی زندگی — سالی سمٹنے نہیں پھنستی تھی۔)

''ہی اِز ڈیڈ۔''

''یس آئی نو۔''

''غم منانے کی شام...''

''ہاں، غم منانے کی شام آ گئی آخر۔''

''تو آج کی شام...''

''پانچ بجے۔''

(ہی اِز ڈیڈ— کسی کی منزل، موت— کسی کی منزل، زندگی)

''ریگل۔''

''ٹھیک پانچ بجے۔''

(ہی اِز ڈیڈ— یس ہی اِز ڈیڈ— اور یہ تانبے سا دمکتا بدن— کس کی حسرت، کس کی مُراد— یہ بھرا بھرا سا چھلکتا ہوا بدن— اُس کی حسرت، میری مُراد— اُف اُف— آج کی رات، سازِ دلِ پُردرد کی رات نہ ہو، میرے رب...!)

وہ پھر لیبارٹری میں آ گیا۔

''اشوک، کُلدیپ کے گھر والے مورچری کی طرف گئے ہیں... تم جاؤ گے نگم بودھ گھاٹ؟''

''نہیں جو مر گیا، سو مر گیا۔''

(جب کوئی مر جاتا ہے— دوست، یار، رشتہ دار اُسے کندھوں پر اُٹھا کر نگم بودھ گھاٹ لے جاتے ہیں، اور پھر پھونک دیتے ہیں۔)

اُس نے کہا: ''اچھا بھئی، اَپن چلے... کوئی اہم اور ارجنٹ کام آ جائے تو نپٹا لینا!''

(وقت کاٹے نہیں کٹتا— بات بنتے نہیں بنتی۔)

(زندگی کیا ہے؟)

(موت کیا ہے؟)

لوہے کے صدر دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے اُس نے محسوس کیا، لوہے کا صدر دروازہ، زندگی ہے اور مورچری، موت ہے۔

(کُلدیپ، موت ہے اور اشوک، زندگی۔)

(کل شام تک کلدیپ، زندگی تھا۔)

(کل شام تک اشوک، موت ہو سکتا ہے۔)

اِکیس نمبر بس کی سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہی اُس کا سر گھوم گیا۔

(وہ بدن، اُس کی چمک، اُس کی حرارت، اُس کی گرفت— وہ بدن، وہ لپٹیں، وہ جادو—

اب کہاں جائے گی زندگی، حرافہ....)

بس تیزی سے بھاگ رہی تھی، اور ــــ

(اور ــــ اُف ف، ہی اِز ڈیڈ ــــ چاندی کی تھالی میں سونے کی کٹوری، کٹوری میں دودھ، دودھ میں چالیس فیصدی مقدار پانی کی، پانی میں ٹی بی بیکٹیریا ــــ ہی اِز ڈیڈ ــــ ہوائی جہاز گر پڑا، ایک سو اٹھاون لوگ ہلاک ہو گئے ــــ شادی پور میں بھائی نے بھائی کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا ــــ ماں، شیر خوار بچّے کو گود میں لیے کنویں میں کود گئی ــــ ڈی. ایم. کے. کی شدید اَیجی ٹیشن ــــ ہی اِز ڈیڈ ــــ فٹ بال اسٹیڈیم میں تماشائیوں نے بے ایمان ریفری کا سر پھوڑ دیا ــــ اُف چھاتیوں کا وہ اُبھار، آج کی رات ــــ جو وہ نہ مرتا، جو میں مر جاتا ــــ کس نے سوچا، کس نے جانا ــــ وہ اُس کا بدن بے جان، یہ میرا بدن حیران ــــ انتظار۔ وقت کی وہ حد، کتنی دُور مُرادوں کے تپتے لمحے....)

بس تیزی سے بھاگ رہی تھی، اور ــــ

(کتنا کمزور ہے آدمی، موت کے سامنے اکڑفوں نہیں چلتی ــــ کتنی کشش ہے بدن میں۔ بدن کو بدن کھینچتا ہے....)

اُس کے برابر کی سیٹ خالی ہوئی۔ پل بھر بھی نہ لگا اور فوراً کوئی اور بیٹھ گیا۔

وہ بھرپور جوانی تھی۔ کسا ہوا جسم تھا۔ لال لال آنکھیں تھیں۔ سوکھے سوکھے لب تھے۔

(تو تو پھنک جائے گا، چِتا کی اگنی میں ــــ برسوں کی رفاقت ہو جائے گی راکھ ــــ دیکھ کمبخت دیکھ، زندگی کا یہ حسن ــــ یہ اجنبی بدن کی مانوس آنچ ــــ ایک لذتِ ناتمام....)

اُس نے کندھے جھٹکے ــــ کہنی کی نوک سے اُس کا بایاں پستان ٹٹولا۔

بھرپور جوانی زیرِ لب کانپی ــــ پھنسی پھنسی سی سِکی نے اُس کے کانوں کی لویں گرم اور سرخ کر ڈالیں۔

(وقت تھم جائے یہیں، بس ٹکرا جائے کہیں ــــ لہو میں لہو گھل جائے....)

اس کی کہنی تھی۔ پستان سے بہتی آنچ تھی، کانپتے ہونٹوں کی دھڑکن تھی، اور بس کی رفتار۔

(دی باسٹرڈ اِز ڈیڈ ــــ کیوں؟)

بس ایک جھٹکے سے رُک گئی۔

(بس کیوں رُک گئی ــــ کیا زندگی سلامتی چاہتی ہے....)

''پلازہ، بابو پلازہ!''

وہ اُتر پڑا کہ اُسے اُترنا تھا — زندگی، بس ہی میں رہ گئی اور وقت کا پہاڑ سامنے کھڑا تھا۔
اُس نے کناٹ پلیس کے برآمدوں کا چکر کاٹنا شروع کر دیا — دھیمے دھیمے اُٹھتے پاؤں، بے خبری کا عالم، تلووں میں دھڑکنیں دل کی، ذہن میں غبارِ عالم، آنکھوں میں سلگتی بجھیاں۔
(جانے کب پانچ بجیں گے — چار کب بجے، کیسے بجے — کب اور کیسے...)
اس نے آپ سے آپ ایوننگ نیوز خریدا — سرسری نظروں سے اخبار دیکھا — وہی بجھی بجھی سی باسی خبریں — یہاں مرنا، وہاں مرنا...
(ہُو اِز ڈیڈ، پر برآمدے وہی ہیں — میں زندہ ہوں، پر برآمدے وہی ہیں — اِن برآمدوں پر تیسرا ایٹم بم تو گرائے کوئی — اخبار کی سُرخیوں میں بہار تو لائے کوئی...)
پانچ بجے کے قریب اُس نے ریگل کا رُخ کیا۔
وہ موجود تھی۔
اُس نے پوچھا: ''وٹ ڈُ یو ہیو اِن مائنڈ؟''
اُس نے جواب دیا: ''آئی تھنک یو نو وٹ آئی ہیو اِن مائنڈ!''
''تم نے کہا تھا، غم منانے کی شام آ گئی آخر!''
''تو پھر؟''
''آؤ چکّر لگائیں، سلگیں اور سلگائیں!''
(کون کہتا ہے، وقت کاٹے نہیں کٹتا — زندگی کی ایک لاش جل رہی ہوگی — زندگی کا ایک حسن ہم قدم ہے اب میرا...)
''لیٹس گو ٹو مائی روم۔'' اُس نے دھیمے سے کہا۔
''یس۔'' وہ بولی: ''او ہ یس۔''
اِرون روڈ پر اُس کا کمرہ تھا۔
اندھیری سیڑھیاں اور طویل برآمدہ ویران تھا۔
اُس کی کمر کے گرد اُس کا بازو لپٹا ہوا تھا — بیک وقت اُن کے قدم رُکے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ان کے ہونٹ مل گئے، جل اُٹھے۔
اُس نے دروازہ کھولا — اندر داخل ہوئے — اُس نے چٹخنی لگائی اور ٹیبل لیمپ روشن کیا۔
وہ پلنگ پر بیٹھ گیا — وہ سامنے رکھی کرسی میں دھنس گئی۔
سرد، ویران، نیم روشن کمرہ اور دھڑکنیں دو دلوں کی۔

سانسوں کے جھکڑوں کے درمیان وہ اُٹھی اور اُس سے لپٹ گئی۔ اُسے اپنے بازوؤں میں بھینچتے ہوئے سسکیاں بھرنے لگی: ''ہی اِز نو مور... اب کوئی دیوار نہیں... وفاؤں کے بندھن ٹوٹ گئے۔ ہماری زندگی اب ہماری اپنی ہے... '' اُس نے کانپتے ہوئے اُس کا ماتھا چوما، آنکھیں چومیں، کانوں کی لووں کو پیار سے دانتوں تلے دبایا — اُس نے اُس کے بدن سے جیکٹ الگ کی۔ پتلون کے تنگ اور چست گھیرے میں سے قمیص کھینچ باہر کی اور پھر گردن جھکا کر دانتوں سے اُس کی قمیص کا ایک بٹن کھولا۔ قمیص اور پھر بنیان اُتار پھینکی۔ اُس کی بالوں بھری چھاتی پر پے در پے گرم گرم بوسے داغ دیے: ''تم کتنے زندہ ہو، کتنے حسین ہو... اُتار ڈالو یہ ٹانگوں میں پھنسی پردہ داری... اور میری طرف دیکھو۔ زندگی کا یہ رُوپ ہمارے دم سے ہے... ''

وہ مجسم برہنگی اور مجسم تپش بنا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ ذرا آگے بڑھا تو وہ بول اُٹھی: ''رُکو، مجھے آنکھ بھر کر دیکھ تو لو... زندگی کو پہچان تو لو!''

اُس کے ہاتھوں کی حرکت میں اِک لے تھی اور وہ لے اُس کے جسم کی عریانی کے بھید کھول رہی تھی — اور نیم روشن کمرہ دہکنے لگا تھا۔

اُس کے پستانوں کے اُبھار اُس کی آنکھوں میں کھب گئے۔

وحشت اور ضبط کے تصادم میں اُس کی گرفتاری، زندگی کی سزا تھی۔

وہ بمشکل آگے بڑھا۔

(زندگی، پھنس گئی آخر — زندگی، اب کہاں جائے گی تو...)

اُس نے اُسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

(زندگی، ایک لعنت ہے تو...)

اُس نے اُس کے ہونٹ چوم چوم ڈالے۔

(وحشت کی یہ حد زندگی ہے — وہ کہاں جانے جو راکھ کا ڈھیر ہے — ہی اِز نو مور...)

اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں جل اُٹھیں۔

(زندگی، ایک حرافہ ہے تو...)

اُس نے اُس کے منہ پر بھرپور طمانچہ جڑ دیا: ''گیٹ آؤٹ!''

اُس کا چہرہ خوفناک ہو گیا — اور پھر ایک دلخراش چیخ سنائی دی: ''آئی وانٹ ٹو ڈائی... ''

کمرے میں گہرا سناٹا تھا اور دو عریاں بدن کانپ رہے تھے۔

○○

('نقوش'، لاہور: ۱۹۶۳ء)

آتمارام

''عمر بھر جینے کے لیے مرتے رہے اور جب مرے تو ایسی ذلت کی موت — آدمی کی اس سے بڑی توہین اور کیا ہو سکتی ہے۔'' انسپکٹر بخشی کی تسلی بھری باتوں کا جواب بلدیو نے اس ایک جملے میں دیا اور کوتوالی سے باہر آ گیا۔

چاندنی چوک میں وہی ریل پیل تھی، وہی شور و غل تھا جس سے بلدیو مانوس تھا مگر اس وقت اس کے گرد خوفناک سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اسے اپنے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دل زور زور سے دھڑکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے دل پر غم کا بوجھ تھا جس کے دباؤ سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ دہاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا۔ اور اس طرح اپنے گرد پھیلے ہوئے سناٹے کو توڑنا چاہتا تھا، مگر ہمیشہ کی طرح اس کے دل اور ذہن میں جنگ ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ یہ خیال بھی شدت کے ساتھ گونج رہا تھا: ''کیوں بن رہے ہو۔ رونا چاہتے ہو! یہ باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔'' اس کے آنسو پلکوں میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ اس کے سامنے اس کے ذہن نے پلکوں کی دیوار چن دی تھی۔ یہ اس کا ذہن ہی تھا جس نے اتنے بڑے حادثے کی خبر پا کر بھی انسپکٹر بخشی کو متوازن جواب دیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا شمشان بھومی کی جانب بڑھ رہا تھا جیسے وہ ہر قدم سوچ کر اٹھا رہا ہو۔ اسے اپنی رفتار کا احساس بھی تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک مدت سے اسی طرح چل رہا ہے اور ایک مدت کے بعد وہ شمشان بھومی پہنچے گا جہاں اسے زندگی کا سب سے بڑا تماشہ دیکھنا ہے۔

شمشان بھومی پہنچتے پہنچتے اس کی حرکت کرنے کی تمام قوت ختم ہو چکی تھی۔ وہ تھکن سے چور شمشان بھومی کے لان میں پیپل کے پیڑ کے سائے میں پتھر کے چبوترے پر بیٹھ گیا اور بجھی بجھی سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تھکن سے اس کی رنگت زرد ہو گئی تھی اور غم سے اس کی آنکھیں قریب المرگ مریض کی آنکھوں کی طرح بے چین، اُداس اور موت کی منتظر دکھائی دیتی تھیں۔

شمشان بھومی میں زمین کی سطح سے دو دو فٹ اُبھرے ہوئے چبوتروں پر کہیں چتائیں

ٹھنڈی ہورہی تھیں، کہیں ان کی لپٹیں لاشوں کے ایندھن سے غیر مطمئن ہوکر آسمان تک کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے اُٹھ رہی تھیں۔قریب قریب باقی کے ہر چبوترے پر ٹھنڈی یا گرم راکھ کے بچھونے سے بچھے ہوئے تھے—شمشان بھومی بلدیو کو اپنی طبیعت کے مطابق محسوس نہ ہوئی۔اس نے سوچا کہ ایک چبوترہ مدتوں سے بنا ہوا ہے، ہر دوسرے دن ایک لاش لائی جاتی ہے اور اس چبوترے پر سپرد آتش کردی جاتی ہے۔چبوترہ اہم ہے مگر گوشت پوست سے راکھ میں تبدیل ہونے والوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

وہ بہت دیر تک اسی طرح گم سم بیٹھا رہا اور آدمی کے آخری نشان کو آگ کی آغوش میں راکھ ہوتے دیکھتا رہا۔جب اسے وحشت سی ہونے لگی تو اس کے جسم میں کپکپی کی لہر سی دوڑ گئی اور وہ کانپتے ہوئے ان چبوتروں کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا جن پر ٹھنڈی راکھ کے بچھونے بچھے ہوئے تھے۔اس نے پھر سوچا: ''ان میں سے کوئی ایک ہوگا۔''

وہ یہ سوچ نہیں پارہا تھا کہ کس سے پوچھے اور کیا پوچھے۔اس کے ذہن میں کئی سوال اُبھر رہے تھے مگر جب وہ انھیں زبان پر لانے کی کوشش کرتا، اسے زندگی کی تذلیل کا کسیلا پن محسوس ہونے لگتا اور وہ سوچنے لگ جاتا۔

وہ چبوتروں کی قطار کے آخر میں ایک چبوترے کے پاس کھڑا تھا اور اس پر مٹھی بھر پھیلی ہوئی راکھ کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔راکھ میں کہیں کہیں کوئی جلی ہوئی ہڈی بھی دکھائی دے رہی تھی۔اس کے ذہن میں اچانک کوندے کی طرح بیدی کی بات لپکی، ''آدمی کی جیتے جی تو ہڈیاں ہوتی ہیں مگر مرنے کے بعد پھول!''

اس پر بیدی کی بات نے ملال کی چادر ڈال دی۔وہ ان پھولوں کو اپنی نگاہوں کا مرکز بنائے دیکھتا رہا۔اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال چکر لگانے لگا: ''کاش ان پھولوں کو گوندھ کر مرنے والے کی شبیہ بنائی جاسکے۔''

وہ بہت دیر وہیں بت بنا کھڑا رہا۔اسے بہت دیر تک اسی حالت میں کھڑا دیکھ کر شمشان بھومی کا ایک پنڈا اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا اور چبوترے کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا: ''بابو جی، کل شام سپاہی رام سنگھ سیوا کمیتی کے ایک آدمی کے ساتھ یہاں ایک لاش لایا تھا۔وہ کہہ رہا تھا کہ لاش کسی بہت بڑے آدمی کی دکھائی دیتی ہے مگر اس کے گھر کا پتہ معلوم نہیں ہوسکا ہے۔بابو جی، وہ شخص، وہ جس کی لاش سپاہی رام سنگھ لایا تھا، صبح کمپنی باغ میں سیر کررہا تھا۔اچانک وہ گر گیا۔لوگوں نے سنبھالا مگر وہ مرچکا تھا۔پولیس نے چیر پھاڑ کروانے کے بعد لاش کو ریزھی میں

لدوا کر کمپنی باغ کے پاس کے سب محلوں میں گھمایا مگر اس کے گھر والوں کا پتہ ٹھکانہ معلوم نہ ہو سکا
شام کو پولیس نے لاش سیوا کمیٹی کے حوالے کر دی اور سیوا کمیٹی نے لاوارث سمجھ کر انتم سنسکار کیا
میں نے لاش کا منہ دیکھا تھا۔ بابو جی، بڑا خوبصورت آدمی تھا۔ سانولا رنگ، چوڑا ماتھا، بڑ
پیاری آنکھیں، چھوٹے چھوٹے ملائم بال۔ بابو جی، مرا ہوا بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ تو ہنس ر
تھا۔ سپاہی رام سنگھ کہہ رہا تھا کہ ضرور کوئی بڑا آدمی ہے کیونکہ سیر کرتے وقت اس کے ہاتھ میں
سانپ کی طرح کی بڑی قیمتی چھڑی تھی اور اس کی کلائی پر بڑی قیمتی گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس لیے
رام سنگھ کو ترس آ رہا تھا۔ اس نے لاش کا منہ کھول کر اپنی جیب سے تانبے کا پیسہ نکال کر ڈالا او
ہندوؤں کی یہ آخری رسم پوری کی۔ وہ کہتا تھا کہ اگر اس کے گھر والوں کا ٹھکانہ معلوم ہو جاتا تو اس
کا جنازہ دھوم دھام سے اٹھتا۔ بابو جی، بڑا خوبصورت آدمی تھا۔ شاید پچاس سال کا ہوگا مگر بڑا دبل
تھا۔ اس لیے صرف سات من لکڑیاں ہی کافی ہوئیں۔ دیکھیے، ہڈیاں تک راکھ ہو گئی ہیں۔ جانے
بیچارے کے گھر والوں کو پتہ چلا ہے کہ نہیں۔ ابھی تک تو کوئی پھول چننے کے بارے میں پوچھنے
نہیں آیا۔''

بلدیو پنڈے کی باتیں بڑے ضبط سے سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد اندھیرا چھا رہا
تھا۔ پاؤں لرز رہے تھے۔ اس نے بڑے کرب سے کہا:

''میں پھول چننے آیا ہوں۔''

پنڈا حیران ہو گیا۔ اس نے بلدیو کو اس چبوترے کے پاس ساکت دیکھ کر اپنے جذبات سے
مغلوب ہو کر وہ سب باتیں کہی تھیں اور یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی باتیں سننے والا
پھول چننے آیا ہے۔ اس نے اُداس سی آواز میں کہا:

''بابو جی، آپ پھول چننے آئے ہیں!''

''ہاں، یہ میرے — میرے والد ہیں۔'' بلدیو نے مٹھی بھر راکھ کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے لرزتی ہوئی، رُکتی ہوئی آواز میں کہا۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر پنڈے نے دھیمے سے کہا

''بابو جی، پھول تیسرے دن چنتے ہیں۔ آپ کل سویرے آ جائیں۔''

پنڈے کی بات سن کر بلدیو تھوڑی دیر خاموش رہا اور چبوترے پر پھیلی ہوئی راکھ کو گھورتا رہا
کچھ دیر بعد اس نے نظر اٹھائی اور شمشان بھومی کو اپنی آنکھوں میں بیزاری اور حقارت سے جذب
کرتے ہوئے بولا:

''نہیں، پھول میں آج ہی چننا چاہتا ہوں۔ اس جگہ اب میں جیتے جی دوسری بار آنا نہیں

چاہتا اور نہ ہی اب کوئی میرا عزیز، دوست یا رشتہ دار رہا ہے۔ جس کی موت پر مجھے یہاں آنا پڑے گا۔ یہ بڑی ذلیل جگہ ہے۔''

''بابو جی، جیسا آپ چاہیں مگر یہ ہمارے دھرم کے انوسار نہیں ہے۔''

تھوڑی دیر بعد پنڈا پیتل کی تھالی میں گلاب کی پنکھڑیاں اور پیتل کے لوٹے میں دودھ لے کر آ گیا۔ اس کے ساتھ دس بارہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا جس نے خالی بالٹی اٹھائی ہوئی تھی۔ سب سامان چبوترے کے پاس رکھنے کے بعد پنڈے نے بلدیو سے کہا:

''آپ جوتے اُتار دیجیے۔''

بلدیو نے خاموشی سے جوتے اُتار دیے اور پنڈے کے کہنے کے مطابق ہندوؤں کی رسوم ادا کرنے لگا۔ پنڈے کے پیچھے پیچھے اس نے چبوترے کے تین چکّر لگائے۔ چکر لگانے کے بعد دونوں مستطیل چبوترے کی دائیں جانب بیٹھ گئے جدھر لاش کا سر لکڑیوں پر چنا جاتا ہے۔ پنڈا شلوک پڑھتا رہا جو بلدیو کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ بلدیو پنڈے کے اشارے پر دودھ کے چھینٹے راکھ پر برساتا رہا۔

جب وہ سات بار دودھ کے چھینٹے راکھ پر برسا چکا تو پنڈے نے شلوک پڑھنے بند کیے اور اس سے مخاطب ہوا:

''اب آپ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے راکھ کو کریدیے اور جو بھی پھول آپ کو ملے، تھالی میں رکھتے جائیے۔''

بلدیو نے پنڈے کی طرح راکھ کو کریدنا شروع کیا اور جو بھی پھول اسے ملا، وہ زور زور سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ تھالی میں رکھتا گیا۔ ہندوؤں کی ان رسوم کو ادا کرنے کا عمل اسے ذلت آمیز محسوس ہو رہا تھا اور اس کے باپ کے پھول جو محض ہڈیوں کے چھلکے تھے، اس کی آنکھوں میں چبھنے لگے تھے مگر وہ ان احساسات کے باوجود غم کی شدت سے، جس نے اس کی آنکھوں کے آنسو بھی خشک کر دیے تھے، پنڈے کی ہدایت کی ڈوری پر پتلی کی طرح ناچ رہا تھا۔ یکا یک پنڈے نے کہا:

''بابو جی۔'' ''یہ دیکھیے آتما رام!''

اس نے پنڈے کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی راکھ میں لپٹی ہوئی ہڈی تھی جو ساٹھ کے زاویے میں خم کھائے ہوئے تھی۔ پنڈے نے کہا:

''یہ آتما رام ہے۔ دیکھیے کیسے سمادھی لگائے بیٹھا ہے۔ بابو جی، آپ کے والد بڑے

بھاگیہ وان ہیں۔ مرنے کے بعد ان کی آتما کو شانتی مل گئی ہے۔ جن لوگوں کا آتمارام سادھی لگا کر بیٹھا ہوتا ہے ان کی آتما کو شانتی ملتی ہے۔ ان کی آتما دکھی نہیں ہوتی۔"

بلدیو نے آتمارام کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور غور سے دیکھا — جیسے گیلی دیوار پر جھینگر مٹی کے گھر بناتے ہیں، ویسا ہی تھا آتمارام۔ اس نے دل میں کہا:

"مرنے والے کو دُکھ ہو سکتا ہے کیا؟"

تھالی جب راکھ سے آلودہ پھولوں سے بھر گئی تو پنڈے نے بالٹی میں تین بار راکھ بھری اور جمنا میں جا کر بہادی، چبوترے سے راکھ کا بچھونا جیسے کسی نے سمیٹ لیا ہو۔ بلدیو نے محسوس کیا جیسے اس کا باپ ہوا میں کافور کی مانند تحلیل ہو گیا ہے۔

پنڈے نے پھولوں سے بھری ہوئی تھالی کے ساتھ لڑکے کو باقی سامان اٹھانے کو کہا اور بلدیو کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ گھاٹ کے پانی سے باہر جو پہلی سیڑھی تھی، وہاں وہ بیٹھ گئے پنڈے نے اسے دودھ میں گلاب کی پنکھڑیاں ڈال کر پھولوں کو دھونے کے لیے کہا اور خود شلوک پڑھنے لگا۔

پھول دھونے کے بعد بلدیو نے پنڈے کے کہنے کے مطابق پھولوں کو ماتھا ٹیکا اور آنکھیں موند کر دل میں باپ کو یاد کیا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو پنڈے نے کہا:

"بابو جی، پھول کو ہری دوار لے جائیں گے یا یہیں جمنا میں بہائیں گے۔"

بلدیو نے پنڈے کی بات کا جواب دیے بنا دودھ میں دُھلے ہوئے پھولوں سے بھری تھالی اُٹھائی، پھولوں کو آنکھوں سے لگایا اور پھول جمنا میں بہا دیے۔ پھول جمنا کی نذر کرنے کے بعد اس نے اپنے باپ کی آخری آرام گاہ جمنا کی روانی اور جمنا کے پاٹ پر نگاہ ڈالی۔ جمنا کا مٹیالا پانی گھاٹ کے قریب دھیمے دھیمے بہہ رہا تھا۔ دور تک ریت ہی ریت دکھائی دے رہی تھی اور ریت پر دوسرے کنارے کے قریب کوڑے کے بے شمار ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اس نے دل میں کہا:

"پوتر گٹر!"

پنڈے کو جو کچھ اس کے ہاتھ میں آیا، اس نے دیا اور شمشان بھومی سے باہر آ گیا۔

تمام دن بلدیو گم سم بازار میں گھومتا رہا۔ نہ اسے کھانے کا ہوش تھا نہ آرام کا۔ اس کے ذہن میں بہت سے دھاگے اُلجھ گئے تھے اور وہ کسی ایک بات کے بارے میں سوچ نہیں پا رہا تھا گھومتے گھومتے اس کے پاؤں شل ہو گئے۔ جب اس میں چلنے کی سکت نہیں رہی تو وہ بس اسٹینڈ پر ریلنگ کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیٹ میں بھوک کی زبردست لہر اٹھی اور اس کے سکر۔

ہوئے جسم کو جھنجھوڑ گئی۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھوں سے دو تین ضربیں لگائیں اور خود کو سنبھالا۔ اچانک ہی اس کے ذہن میں اُلجھے ہوئے دھاگوں کا ایک سرا سامنے آ گیا۔

ایک آدمی جس نے پچاس سال کشمکش کی زندگی بسر کی ہو، جس نے عمر بھر اپنے گھر، گاؤں اور ملک کی خدمت کی ہو، جس سے اَن گنت لوگ پیار کرتے ہوں، جس کے بے شمار دوست، عزیز، رشتے دار اور جس کا ایک بیٹا بھی ہو، کیا وہ لاوارث ہے؟ — یا پھر شاید یوں ہو کہ جو آدمی زندگی بھر کسی کا محتاج نہ رہا ہو، وہ مرتے وقت بھی اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور اپنے بیٹے سے کفن، لکڑیوں اور کندھے کے سہارے کا محتاج نہ ہونا چاہتا ہو کیونکہ یہ اس کی کشمکش سے تعمیر کی ہوئی کامیاب زندگی کی تذلیل ہو سکتی ہے، اس لیے وہ صرف سیوا کمیٹی کی سات من لکڑیوں اور سپاہی رام سنگھ کے تانبے کے پیسے ہی پر زندگی کے حاصل کے طور پر مطمئن ہو...

بلدیو نے زور سے اپنی آنکھوں کو بھینچا اور دھاگے کے نمایاں سرے کو ذہن کے دوسرے اُلجھے ہوئے دھاگوں میں اُلجھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آنکھوں کو شدت سے بھینچنے سے اس کی کنپٹیوں پر رگیں اُبھر آئیں اور ان میں آگ دوڑنے لگی اور اس کے ذہن میں باپ کی پچاس سالہ زندگی کے نقوش واضح ہونے لگے۔

اس نے دیکھا...

دادا گنگا رام کے یہاں جو اولاد پیدا ہوتی ہے، سال بھر میں مر جاتی ہے۔ گنگا رام کو کوئی کہتا ہے: ''اب جو بچہ پیدا ہو اس کا کان اور ناک چھید دو۔ بچہ زندہ رہے گا'' اس کا باپ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے ناک اور کان چھید دیے جاتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس کا نام نتھو رام رکھا جاتا ہے۔

نتھو رام کے بعد چار لڑکے اور گنگا رام کے ہاں پیدا ہوتے ہیں۔

گنگا رام کا دانہ پانی اُٹھ جاتا ہے۔ نتھو رام پندرہ برس کا ہے۔ نتھو رام ہے اور چار چھوٹے بھائی، بیوہ ماں اور کھانے کو کچھ نہیں۔

وہ مزدوری کرتا ہے، چھابڑی لگاتا ہے، روکھی سوکھی روٹی پیدا کرتا ہے اور رات رات بھر پڑھتا ہے۔

پہلی عالم گیر جنگ چھڑ جاتی ہے۔

میٹرک کا امتحان پاس کرتا ہے۔ گاؤں جھینگڑ کلاں سے پیدل جموں جا کر فوج میں بھرتی ہوتا ہے۔

پہلی عالم گیر جنگ کا محاذ۔

عہدے میں ترقی۔

بھائیوں کی تعلیم۔

شادی۔

پہلا بچہ بلدیو۔

بیوی کی موت۔

اور

دوسری عالم گیر جنگ۔

نتھورام، انتھک زندگی، اَن گنت پڑاؤ۔

قدم بڑھ رہے ہیں۔

دوسری عالم گیر جنگ اور برما کا محاذ ہے۔

شدید طور پر زخمی ہوتا ہے۔

اور اب بہت بڑا عہدہ ہے۔

آرڈر آف برٹش انڈیا درجہ اوّل کا تمغہ ہے۔

بھائی بس جاتے ہیں۔ ماں خوشی سے چل بسی ہے۔

۱۹۴۷ء

آزادی

پاکستان

فیروز پور بارڈر سے فوجی ریکارڈ ونگ کی روانگی۔

بنگلور

نتھورام اور بلدیو

پہلی بار قریب آ رہے ہیں۔

نتھورام ایک فوجی شخصیت، مثالی کردار، کم گوئی کی شہرت، مہاتما کا لقب۔

بلدیو، کمزور، دبلا پتلا بیمار، باپ کی سماجی حیثیت اس کا کامپلیکس اور فرار — مارکس، بدھ، دستوئیفسکی، بلزاک، ایک راہ کی تلاش۔

اور پھر

دلّی

نتھو رام کو حکومت کی طرف سے ڈیفنس کالونی میں زمین کا نذرانہ۔

اور...

اور...

اور...

''اور... کیا میں رشتہ داروں اور دوستوں کو آگاہ کروں کہ والد رخصت ہو گئے ہیں۔
... نہیں!... نہیں... میں یہ مصیبت مول نہیں لے سکتا۔ ہجوم کا تانتا بندھ جائے گا۔ لوگ والد کے مثالی کردار کے گن گائیں گے اور میں آوارہ، بیکار، صفر... صرف ذلّت محسوس کروں گا... صرف ذلّت... ذلّت...''

بلدیو کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔ عجیب عجیب خیالات اسے گھیرے ہوئے تھے۔

''سماج میں انقلاب آ چکا ہے... کھوکھلی قدریں مٹ چکی ہیں... نئی قدریں دل اور دماغ کو ٹھنڈک پہنچا رہی ہیں۔ اب کتے لاوارث لاشیں نہیں کھاتے... اب سیوا کمیٹی سات من لکڑیوں میں پچاس سال کی جدوجہد کی زندگی پھونک دیتی ہے... سپاہی رام سنگھ تانبے کا پیسہ منہ میں ڈال کر آخری رسم پوری کرتا ہے... بھکاری ہو یا بڑی شخصیت، انتم سنسکار کے لیے چبوترے بنے ہوئے ہیں...''

بلدیو کے پیٹ میں بھوک کی زبردست لہر اٹھی۔ اس کے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی۔ کنپٹیوں پر رگیں بُری طرح اُبھر آئیں۔ کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اور اس کے ذہن میں تلوار کی دھار سے تیز یہ خیال ابھرا:

''اور والد کی آتما سکھی ہے اور... اور میں...''

اور تیز دھار نے اس کے دماغ کی رگوں کا کاٹ دیا۔

تیسرے دن شمشان بھومی میں پنڈے کو بلدیو کے پھول چنتے ہوئے آتما رام کرب کی حالت میں کھڑا ملا۔ پنڈے نے دل میں کہا: ''بابو جی کو باپ کے مرنے کا کتنا دکھ تھا۔ مرنے کے بعد بھی ان کی آتما دکھی ہے۔''

OO

('ادبِ لطیف'، لاہور: ۱۹۵۹ء)

ہوس کی اولاد

شادی کے قریب قریب گیارہ ماہ بعد ہمارے ہاں پہلا بچّہ ہوا تھا اور کچھ دن بعد ہی راہی کا خط آیا تھا۔ خط آپ کے روبرو رکھنے سے پہلے میں راہی کے بارے میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ وہ میرا سب سے عزیز دوست ہے اور عجیب وغریب دوست ہے — خط یوں تھا:

کرشن، میرے دوست!

تو تم باپ بن گئے ہو۔ میرے خیال میں کچھ بننے میں سب سے آسان باپ بننا ہے — ایک شخص اولاد پیدا کرنے کے ناقابل ہے۔ اپنی بیوی کا کسی اور سے ٹانکا جوڑ کر وہ باپ بن سکتا ہے۔ میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو بناسپتی باپ ہیں مگر تعجب ہے، وہ اپنی اولاد سے بے حد پیار کرتے ہیں۔

اچھا ایک بات بتاؤ — تمھیں اپنے بچّے سے بہت پیار ہے۔ یہ بات میں آج تک سمجھ نہیں پایا — اگر میری شادی ہو جاتی ہے اور میں بھی تمھاری طرح چند ماہ بعد باپ بن جاتا ہوں تو مجھے اپنی اولاد سے سخت نفرت ہوگی کیونکہ وہ میری نہیں، ہوس کی اولاد ہوگی — مجھ میں ہوس ہے۔ اس ہوس کو مٹانے کے لیے میں شادی کا ڈھونگ رچاتا ہوں کیونکہ ہوس کی پیاس بجھانے کا کوئی اور ذریعہ نہیں، اور اگر ہے بھی تو مجھ میں ہمت نہیں۔ اور پھر مَیں باپ بن جاتا ہوں۔ کر رہا تھا میں اپنی ہوس کا مداوا مگر بن گیا باپ۔ اب وہ بچّہ میری اولاد ہے۔ نہیں صاحب، مَیں آپ سے اتفاق نہیں کرتا — اولاد، یعنی افزائشِ نسل بڑا مقدس جذبہ ہے جسے ہوس سے کوئی علاقہ نہیں۔ مجھ میں ہوس ہے۔ پہلے میں اُس پر قابو پاؤں گا۔ پھر جب مجھ پر افزائشِ نسل کا مقدس جذبہ پوری صحت سے حاوی ہو جائے گا، میں باپ بنوں گا اور اپنی اولاد کو باپ کا بھرپور پیار دُوں گا۔

یاد رکھو کرشن، ہوس کی راہ میں پڑا ہوا بچّہ، میرا بچّہ نہیں ہے۔

اب یہ مجھے معلوم نہیں کہ ہوس کی بنیادوں پر لرزے ہوئے اِس معاشرے کی
عمارت کب گرے گی اور میری ہوس کب ختم ہوگی — یاد رہے، میری ہوس اور
معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

تمھارا اپنا

راہی

مَیں راہی کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتا مگر یہ بھی عجب ہے کہ مَیں آج تک اُس کی کسی بات کو کاٹ نہیں پایا — اگر وہ محض باتیں ہی کرتا اور عملی طور پر عام دُنیاوی آدمیوں کی طرح رہتا تو مَیں اُسے گدّی سے پکڑ لیتا مگر وہ رہتا بھی اپنے خیالات پر استوار کی گئی دنیا میں ہے۔

راہی سے میری ملاقات قریب پندرہ برس پہلے ایک ریستوراں میں ہوئی تھی۔ اُس دن وہ موڈ میں تھا۔ اُسے بات بات میں نشہ آ رہا تھا اور وہ بات بات پر تباہ ہو رہا تھا۔ کبھی وہ ہربنس کو ٹہوکا دیتا، کبھی پریم کے چٹکی لے لیتا — ہم پانچ چھ دوست تھے اور خوب زور و شور سے گپیں ہانک رہے تھے۔ راہی گپیں ہانکنے کے ساتھ ساتھ ریستوراں میں آتے جاتے لوگوں پر بڑے دلچسپ فقرے چست کر رہا تھا۔

ہمارے سامنے کی میز پر ایک کھدر پوش مہاشے، اپنی توند کو مشکل سے سنبھالے، آ کر بیٹھ گئے۔ اُن کے تیل میں چپڑے ہوئے سیاہ گچھے دار بال اُن کی گردن پر جھول رہے تھے۔ میرا خیال ہے، اُن کی شبیہ کے بارے میں کچھ لکھنے سے بہتر یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ وہ جسمانی طور پر دوسرے سمپورنانند تھے۔

راہی کی نظروں میں وہ شبیہ کھپ نہ سکی۔ کوئی فقرہ چست کرنے سے پہلے اُس نے ہربنس سے پوچھا: ''کون ہے یہ گردھر گوپال؟''

ہربنس نے کہا: ''ہوگا کوئی تیلی واڑے کا حلوائی!''

تب راہی نے فقرہ چست کیا: ''حلوائی ہوتا تو دریبے میں جلیبیاں بیچ رہا ہوتا... اپنی راشٹریہ بھاشا کے مہاکوی کو نہیں پہچانتے!''

'مہاکوی' کے لقب پر اِس زور سے قہقہہ اُٹھا کہ ہال میں بیٹھے ہوئے سب لوگ ہماری طرف تعجب اور غیر پسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

'مہاکوی' والی بات ہربنس کو کھا گئی، اِس لیے کہ وہ ہندی میں کہانیاں لکھتا تھا۔ وہ قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ راہی کو آڑے ہاتھوں لینے کے لیے موقع دیکھ رہا ہے۔

بہت دیر تک ہم اِسی طرح لطف لیتے رہے، اور جب کچھ دیر بعد ہم سب خاموش ہوئے تو ہربنس نے یکایک راہی سے پوچھا: ''بھئی ایک بات تم نے آج تک نہیں بتائی... تمھارا اچھا خاصا ماں باپ کا رکھا ہوا نام ہے، پھر تم نے یہ 'راہی' کا فراڈ کیوں رچایا ہوا ہے؟''

ایک لمحے کے لیے راہی کی آنکھیں سُکڑ گئیں۔ مَیں نے غور سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں سُکڑ کر بہت چھوٹی ہو گئی تھیں اور اندر کو دھنس گئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اُبھر آئے تھے۔ کوئی چبھتی سی بات سُن کر اُس پر اس طرح کا ردِ عمل میرے لیے حیران کُن تھا— دوسرے لمحے ہی اُس کے لبوں پر وہی تیکھی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کی آنکھیں پھر باہر کو نکل کر جھانکنے لگیں اور اُس کے لبوں کی طرح متوازن ہنسی ہنسنے لگیں— میں نے یونہی سوچا، اِس شخص کے ذہن کے نہاں خانوں میں ہلکی پھلکی، تیکھی تیز طرار اور زہر میں بجھی ہوئی باتوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ بوقتِ ضرورت اِس کی آنکھیں اُن نہاں خانوں میں غوطہ زن ہوتی ہیں اور کوئی مناسب جواب ڈھونڈ لاتی ہیں جو جواب کے طور پر یہ دوسرے کے منہ پر دے مارتا ہے۔

راہی نے اطمینان سے جواب دیا: ''یار، یہ سب بچپن اور جوانی کی غلط کاریوں کا نتیجہ ہے...''

'غلط کاریوں' کے استعمال پر مجھے ہنسی آ گئی۔

راہی کہہ رہا تھا: ''اسکول اور کالج کے زمانے میں ہر نوجوان کی طرح مجھے بھی شاعری کے کیڑے چپک گئے اور میں راہی بن گیا... ویسے میں نے کئی بار سنجیدگی سے ہربنس کی طرح کئی خاندانی شفاخانوں سے علاج کروایا ہے۔''

اُس دن واقعی وہ زبردست موڈ میں تھا۔

ہربنس نے میرے کان میں کہا: ''اگر اب اِس کا موڈ کسی وجہ سے فنا ہو گیا تو خدا کی قسم، اس کی باتوں سے سب کے موڈ کا اسقاط ہو جائے گا۔''

ہربنس کی بات سن کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ راہی کا موڈ کسی طرح فنا ہو جائے۔ میں اُسے بکھرا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ اب اِسے اتفاق ہی کہیے، یا یوں کہیے کہ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے، راہی کا موڈ فنا ہو گیا۔

میں راہی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اُس کی ہر بات، ہر حرکت، ہر ردِ عمل کو غور سے دیکھ رہا تھا— یکایک راہی کی ہنستی ہوئی آنکھیں بجھ گئیں۔ اُس کے لب مرجھا گئے اور اُس کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ اُس کی آنکھیں سکڑ کر پھر اندر کو دھنس گئیں۔ اُس کی کشادہ پیشانی پر بل پڑ گئے،

جیسے کسی نے تانبے کے تاروں کو بل دے دیا ہو۔ اُس کی پیشانی کی شکنوں پر بڑا بھیانک تناؤ تھا — اُس کی نگاہیں ہم سب کو چیرتی ہوئی میری پشت کی کسی میز پر مرکوز تھیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں، اگر میں اُس وقت راہی کی نگاہوں کا مرکز ہوتا تو فوراً وہاں سے بھاگ جاتا۔ اُس کی نگاہیں آگ تھیں جن کی زد سے بچنا ناممکن تھا۔

میں نے اپنی پشت کی جانب منہ پھیر کر دیکھا۔

راہی کے سامنے کی سیٹ پر ایک بڑی حسین عورت آن بیٹھی تھی۔ گہنے پاتوں سے لدی اور سہاگ کا جوڑا زیب تن کیے وہ نئی نئی بیاہی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ حاملہ تھی اور تقریباً پورے دنوں سے تھی۔ ساڑی کو ڈھنگ سے باندھنے کے باوجود اُس کا اُبھرا ہوا پیٹ اِس بات کی چغلی کھا رہا تھا۔ اُس کا چست اور باریک بلاؤز اُس کی بھری بھری چھاتیوں کو سنبھال نہ پا رہا تھا۔ اُس کا جوبن قدرے ڈھلک رہا تھا اور اُبھرے ہوئے پیٹ کے سہارے تھما ہوا تھا۔

میں نے راہی کی طرف پھر غور سے دیکھا — وہ بیمار سا دکھائی دے رہا تھا اور منہ بنا رہا تھا۔ جیسے ابھی اس نے کونین یا کوئی اور کڑوی دوا حلق سے نیچے اُتاری ہو اور اس کی زبان کا ذائقہ کسیلا ہو گیا ہو اور وہ تھوکنا چاہ رہا ہو۔

مَیں اُس کی کرب ناک صورت دیکھ رہا تھا۔

جب وہ برداشت نہ کر سکا تو پھٹ پڑا: "خدا کرے، یہ عورت یہیں ریستوراں میں ماں بن جائے اور اسے ماں بننے کے عمل کی تکلیف سے زیادہ شرم سے گڑ جانے کا احساس زندگی بھر ستائے۔ پیٹ میں ہوا بھر کر ڈھنڈورا پیٹنے سے بہتر تو یہ ہے کہ یہ باقاعدگی سے اپنے خاوند کے گلے میں ڈھول باندھ دیتی اور اُسے کہتی کہ ڈھول بجاؤ اور لوگوں کو بتاؤ کہ میں ہوس کی اولاد کو جنم دینے والی ہوں... میں اگر فرانس میں ہوتا تو اِس عورت کو عدالت میں گھسیٹ کر لے جاتا اور چلاّ کر انصاف مانگتا کہ اِس عورت کو میری جمالیاتی حس پر بار بننے کی جرأت کیسے ہوئی... پوچھو اِس سے۔ اِس کی شادی کو مشکل سے نو ماہ ہوئے ہوں گے، اور جب نو ماہ پہلے یہ اپنے خاوند کے لحاف میں گھسی تھی اُس وقت کیا اس کے یا اس کے خاوند کے تصوّر میں کوئی بچہ رینگ رہا تھا۔ اُس وقت تو دونوں کا جسمانی تناؤ ہوس کے کیڑے لیے منتظر بہ عمل تھا۔ اور اب یہ اُس ہوس کی اولاد کو پیٹ میں بھر کر، گھر گھر گلی گلی نعرے لگا رہی ہے کہ میرا خاوند نامرد نہیں ہے اور میں بانجھ نہیں ہوں... لعنت ہے اِس سماج پر جہاں جمالیاتی حس کا رَتی بھر احساس نہیں... اٹھارہ سال کی لڑکی اور ماں، اور پھر چند سال بعد پیٹ ہے تو بیاری اولاد کے پنجوں کی کُھرسوں سے مجروح ہے۔ چھاتیاں ہیں تو سوکھی

سڑی ٹہنیوں کی طرح ہل رہی ہیں یا پھر ڈ بے کی بوجھل چکتی کی طرح لٹک رہی ہیں، گالوں پر ہڈیاں ہیں، اور خاوند رات رات بھر رنڈیوں کے پاس پڑا رہتا ہے... اور اب دیکھو، اپنے حسن پر ظلم ڈھا رہی ہے۔ دیکھو سالی کی چھاتیاں، جیسے اوندھے گھڑے پر اوندھا لوٹا رکھا ہو۔ تھو...!''

اُس وقت، مجھے اچھی طرح یاد ہے، میرے من میں خیال آیا تھا کہ اگر راہی کی کڑوی اور کانٹے دار باتیں وہ حاملہ عورت سُن لیتی تو اُس کے پورے دِنوں کے حمل کا اسقاط بھی ہو جاتا۔

راہی کی آواز میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اُس کے الفاظ کانٹے تھے اور اُس کی آواز کراہ تھی۔ اُس کے ہاتھ شدت سے ہل رہے تھے، آنکھوں کی پتلیاں ناچ رہی تھیں اور وہ اپنے ہونٹ بُری طرح کاٹ رہا تھا — اُس وقت اُسے دیکھ کر مَیں نے یہ تاثر قبول کیا کہ کیا حوصلہ ہے، خود اپنی ذات کے گرد کرب کی دیواریں کھڑی کر کے اُن میں رہنا کتنا مشکل ہے — میں راہی کے خیالات سے اس وقت بھی اتفاق نہیں کر پایا تھا مگر مجھے اُن خیالات کی صحت پر وِشواس ہو رہا تھا۔ ہو سکتا ہے، اِس کی وجہ راہی کی بگڑی ہوئی حالت ہو جس نے مجھے متاثر کیا تھا۔

ہم فوراً ہی ریستوراں سے باہر اُٹھ آئے۔

ہر بنس نے میرے کان میں کہا: ''بے نااوندھی کھوپڑی!''

تھوڑی دیر بعد سب بجھے بجھے سے چلے گئے۔

مجھے راہی کی ذات میں زبردست دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اِس لیے میں اُس کے ساتھ رہا — وہ خاموش تھا۔ کبھی اُس کے ماتھے پر بل پڑ جاتے اور کبھی اُس کے ماتھے پر شکنوں کے ہلکے سے نشانات خون کی گردش میں دکھائی دیتے۔

ہم کناٹ پلیس کے اندرونی برآمدوں کا طواف کر رہے تھے — اِسی طرح بے مقصد گھومتے جب بہت دیر ہو گئی تو مَیں نے ہمت سے کام لے کر اُس سے پوچھا: ''راہی کیا تم مجرّد ہو؟''

وہ بڑے زور سے چونکا اور پھر ایک دم ٹھنڈا ہو گیا جیسے اُسے اپنا نقطۂ نظر سنجیدگی سے بیان کرنے کا موقع اتفاقاً مل گیا ہو۔

اُس نے جواب دیا: ''نہیں... مجھ میں شدید حرارت ہے۔''

میں نے ہر لحاظ اور آداب کو بالائے طاق رکھ کر پھر پوچھا: ''تو یہ حرارت کہاں خارج ہوگی... کیا تم رنڈی کے پاس جانے کے قائل ہو؟''

''نہیں... رنڈی کے بارے میں سوچتے ہی مجھے سوگندھی یاد آ جاتی ہے۔''

''تو پھر؟'' میں نے اُس کے اندر جھانکنے کی ٹھان لی تھی۔

''بات یہ ہے کہ میں ابھی کچھ طے نہیں کر پایا۔ مجھے دلّی کی آب وہوا راس نہیں آ رہی ہے۔ کوئی جگہ ہے یہ۔ گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی۔ رگیں ہیں کہ ہر وقت تنی رہتی ہیں... میں کسی معتدل آب وہوا کے علاقے میں جانا چاہوں گا۔ میرا ارادہ بنگلور جانے کا ہے۔ پھر میں کوشش کروں گا کہ مجھے کسی بڑے اسپتال میں جگہ مل جائے۔ میری جنسی تسکین اسپتال کی تیزابی فضا میں، ممکن ہے، ہو جائے!''

''اسپتال میں جنسی تسکین؟ میں سمجھا نہیں!'' میں نے اُسے کریدا مگر وہ میری دانستہ کرید کو جان گیا تھا۔

''لو تو صاف صاف سنو۔ میرا ارادہ ڈاکٹروں سے اور نرسوں سے تعلقات قائم کرنے کا ہے... اُن کا جنسی علم تسلی بخش ہوتا ہے۔''

میں نے کہا: ''یہ تو بڑا ذلیل نظریہ ہے... تم ایک جاں کن پیشے کے افراد کے بارے میں بڑی غلط رائے رکھتے ہو۔'' مجھے واقعی دُکھ ہوا تھا۔

راہی نے میرے جذبات کا اندازہ لگانے کے بعد کہا: ''نہیں دوست، تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ اس بیمار سماج میں تعلقات کہاں قائم نہیں کیے جا سکتے... اُن کے ہاں تو حفاظت اور سمجھ کا بڑا پیارا امتزاج ہوتا ہے۔''

ہم بہت رات گئے تک آوارہ گھومتے رہے — اُس پہلی ملاقات میں مجھے ایک بڑے زبردست شخص کا قرب حاصل ہوا تھا، اِس لیے میں اُس سے بچھڑنا نہیں چاہتا تھا۔

اُس پہلی یادگار ملاقات کے بعد راہی کے ساتھ چند اور ملاقاتیں ہوئیں جن میں کبھی زندگی سے بھرپور قہقہے تھے اور کبھی دل کا خون لیے ہوئے آنسو — پھر پہلی ملاقات کے قریب چھ ماہ بعد راہی اپنے ماموں کے پاس بنگلور چلا گیا۔

میری شادی اور پھر میرے یہاں بچّہ ہونے اور راہی کے بنگلور جانے کے درمیان کوئی تین برس کی مدت حائل ہے۔ ان تین برسوں میں راہی کے ساتھ خط کتابت رہی۔ اُس نے مجھے بہت سے خط لکھے جن میں سے دو خطوں کے کچھ حصّے آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں، کیونکہ اُن کا اس کہانی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

پہلا خط اُس نے بنگلور پہنچنے کے قریب چھ ماہ بعد لکھا تھا — وہ لکھتا ہے: ''بنگلور بڑا پیارا شہر ہے۔ دن بھر ہلکی ہلکی گرمی رہتی ہے۔ تمام دن قمیص پتلون پہنے گھومتا رہتا ہوں اور بیئر پیتا رہتا ہوں — رات کو فضا میں ہلکی سی خنکی پیدا ہو جاتی ہے اور طبیعت کھل جاتی ہے۔ وہسکی کے دو پیگ پی

کر ماموں کے بنگلے کے دالان میں آرام کرسی پر نیم دراز ہو جاتا ہوں اور چے خف کو پڑھتا رہتا ہوں۔ موپاساں نے میری رگیں اینٹھ دی تھیں۔ چے خف میرے دماغ پر بڑی پیاری اور بڑی خنک شبنم برسا رہا ہے — مجھے بھوک خوب لگتی ہے اور میری صحت بھی اے ون ہے۔ ہاں کبھی کبھی کوئی رات کروٹیں بدلتے ہی گزرتی ہے۔ جس آگ میں جل رہا ہوں، وہ اس طرح تو ختم نہیں ہوتی نا — ماموں کوشش کر رہے ہیں، شاید میں جلد ہی اسپتال میں ملازم ہو جاؤں۔ ڈپلوما ان لیبارٹری ٹکنیک تو میرے پاس ہے ہی...''

دوسرا خط اُس نے قریب دو برس بعد لکھا تھا — لکھتا ہے: ''پہاڑوں میں بسا بڑا خوبصورت اسپتال ہے۔ شام کو کبھی ڈولی کے ساتھ، کبھی پریما اور کبھی مارگریٹ کے ساتھ کسی پہاڑی کے دامن میں سمٹی ہوئی جھیل پر چلا جاتا ہوں۔ میرے جسم کی طنابیں بتدریج ڈھیلی ہو رہی ہیں۔ کون جانے، یہ جوانیاں میرے لیے اینڈ حسن کا کام دے رہی ہیں، یا میں اِن کے لیے — کوئی ہوس کی اولاد، راہ میں حائل نہیں۔ جسمانی تقاضے اور سمجھداری، تسکین کا رُوپ ہیں — جب انھیں چومتا ہوں، جب ان کی چولی میں ہاتھ ڈال کر ان کی چھاتیاں مسلتا ہوں، جب ان کی صندلی پنڈلیاں سہلاتا ہوں تو ان کی سپردگی کے عالم میں زندگی کی انجانی لذتیں پھوٹ پڑتی ہیں — بس یوں سمجھ لو، میری بے چین طبیعت متوازن ہوتی چلی جا رہی ہے...''

اِس خط کے بہت دنوں بعد راہی نے مجھے وہ خط لکھا جو میں نے کہانی کے شروع میں آپ کے روبرو رکھا ہے — ابھی تک راہی کے خیالات میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

اس طرح قریب پندرہ برس گزر گئے — راہی کے خط آتے رہے۔ بہتر ہے میں یوں کہوں کہ حوصلہ افزا خط آتے رہے — ان خطوط سے میں جو کچھ جان پایا ہوں، مختصراً اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔

راہی، بنگلور میں، ڈولی اور پریما اور دوسری بہت سی ڈاکٹروں اور نرسوں سے ناتا جوڑے دن گزار رہا تھا۔ اُس کی طبیعت میں اب وہ اُلجھاؤ نہیں رہا تھا جو پہلے اُس کی طبیعت کا خاصہ تھا اور جس کی وجہ سے وہ ذہنی کرب میں مبتلا رہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اُسے بنگلور میں من مطابق جنسی آسودگی میسر تھی۔ پھر اُس کی صحت بھی بن گئی تھی جو کبھی اُس کے لیے احساس کمتری کا باعث تھی — اُس کے ماموں کی جیپ اس کے پاس تھی۔ اکثر وہ اپنا وقت گھومنے میں گزارتا تھا۔ اس طرح اُس کے ذہن میں جو گرد تھی، وہ بیٹھ گئی تھی — پہاڑوں پر، باغوں میں، جھرنوں پر، اور آبشاروں پر وہ اپنا کھویا ہوا قلبی سکون پا چکا تھا۔ اُس کے چہرے کی رنگت نکھر گئی تھی۔ اس کے بال

کنپٹیوں پر سفید ہو گئے تھے اور اُس کے توانا چہرے پر بھلے لگتے تھے — اِس طرح قریب چالیس برس کی عمر میں وہ اپنی طبیعت کے عین مطابق خارجی حالات سے اور اپنی حسین اور مکمل جنسی آسودگی سے ایک صحت منداور متوازن آدمی بن پایا تھا — اب اُس کی صحت مند زندگی میں ایک کسک پیدا ہوئی۔ نتیجے کے طور پر وہ اسپتال کی ایک مریضہ سنتوش کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔ سنتوش دُبلی پتلی، نازک مزاج، تعلیم کے زیور سے آراستہ، اِکیس سالہ خوبصورت لڑکی تھی۔ سنتوش کا حسن بیمار، راہی کے لیے باعثِ ٹھنڈک تھا۔ جب وہ حریری ملبوس میں ہسپتال کی روش پر خراماں خراماں چہل قدمی کرتی تو راہی کے من میں، پہاڑ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹی پر، ویران سے ڈاک بنگلے میں رہنے کی خواہش پیدا ہوتی، جہاں نرم نرم بستر پر وہ سنتوش کو آغوش میں لیے بیٹھا ہو، اُس کے ٹھنڈے جسم کی مدھم آنچ محسوس کر رہا ہو اور زیرِ لب فراق کی رباعیاں گنگنا رہا ہو — اسی جذبے نے شدّت پکڑ کر اُسے ازدواجی زندگی کے راستے پر کھڑا کر دیا۔ اُس کے من میں بچّے کی آوازیں، چیخیں، مسکراہٹیں، دُکھ سُکھ اُبھرنے لگے —

اُس نے سنتوش سے شادی کر لی اور مجھے لکھا: ''میں انتقاماً ہنی مُون منانے دِلّی آ رہا ہوں۔ میں تمھاری دِلّی میں پہلا نارمل آدمی ہوں گا جو بچّے کی تمنا کی پرورش اپنے دل کی دھڑکنوں سے کرتا ہے۔''

دِلّی میں راہی ہمارے ہاں ٹھہرا، شاید انتقامی جذبے کے تحت۔

اُس کی بیوی سنتوش کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا، وہ گلابی رنگت کی گڑیا سی تھی۔

پہلی رات گزارنے کے بعد راہی صبح صبح میرے کمرے میں آیا۔ وہ بہت حسین دکھائی دے رہا تھا، مگر بیمار سا بھی۔

میں نے پوچھا: ''کیوں، بیمار ہو گیا!''

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اُس نے کہا: ''نہیں یار... سُنو، ایک زندگی سے بھرپور لطیفہ سُنو... وہ رات بہت دیر تک میری گود میں بیٹھی رہی، اور جب میں اُسے گود میں لیے بستر کی طرف بڑھا: وہ جھینپی اور پھر دھیمے سے کہنے لگی: 'مجھے... مجھے بچّوں میں کوئی دلچسپی نہیں!''

راہی کی آواز لرز سی گئی۔ پھر اُس نے بڑی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ''یار، اس حسین شکست کے سہارے میری زندگی کے باقی دن خوبصورتی سے گزر جائیں گے... کیا خیال ہے تمھارا؟''

مجھے رشک آ رہا تھا۔

OO

('سویرا'، لاہور: ۱۹۵۹ء)

ریپ

ہمارے ہاں کہتے ہیں، جس نے لاہور نہیں دیکھا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ خیر! میں پیدا ہو چکا ہوں۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ لاہور کی ساری رونق مال کے دم سے ہے۔ مال لاہور میں نہ ہوتی تو لاہور کم از کم میری نظروں میں کبھی بس نہ پاتا — کم وبیش یہی میں شملہ کے بارے میں محسوس کرتا ہوں کہ مال شملہ میں نہ ہوتی تو شملہ میرے نزدیک ایک بور پہاڑی شہر ہوتا جہاں نہ حسن ہوتا، نہ رنگینی۔

ایک کم بخت یہ شہر ہے جہاں مال موجود ہے مگر یہ بات اس کے علم میں ہی نہیں۔ میرے نزدیک اس شہر کی، مال کے وجود سے لاعلمی تعجب کی بات ہے کہ مال کا حسن وعشق سے چھلکتا ہوا تصور کسی بھی شہر کی رونق بڑھا سکتا ہے۔ اس شہر کی اسی لاعلمی کے کارن مجھے یہاں کی مال سے، ایک جگ بیتا، موہ ہو گیا اور اب میں محسوس کرتا ہوں، اس موہ پر غیر محسوس سی محبت غالب آ گئی ہے اور یوں میں مال کو جان پایا ہوں، پہچان پایا ہوں اور اس حد تک کہ اب کچھ کہہ بھی سکتا ہوں۔

یہاں کی مال فصیل سے باہر کوئی تین میل کے فاصلے پر ہے — مال کے ایک اور نیو پولیس لائن کی بکھری ہوئی بارکیں ہیں۔ دوسری اور دق کے ہاسپٹل کے بکھرے ہوئے وارڈ — مال کشادہ ہے، چکنی ہے، ہموار ہے اور کالی ہے۔ دونوں اور، دس دس قدم کے فاصلے پر، نیم کے پیڑ قطار میں کھڑے ہیں اور ہرے مال پر گھنا سایہ کیے رہتے ہیں۔ مال کے عین بیچ، اوپر، کوئی سو سوفٹ کے فاصلے پر دودھیا روشنی کے بلب نیم کی گھنی شاخوں میں قریب قریب پوشیدہ ہیں۔ رات کو دودھیا روشنی چھنتی ہے تو نیم کی سبز اور کومل پتیاں پیلی ہو جاتی ہیں اور مال کی گود میں روشنی اور اندھیرے آنکھ مچولی کھیلنے لگتے ہیں۔

کوئی موسم، کوئی سے ہو، مال پر ہُو کا عالم ہوتا ہے جیسے وہ گہری نیند سو رہی ہو اور رات کو تو یہ نیند اور بھی گہری ہو جاتی ہے — اِدھر آنکھ اٹھاؤ، نیو پولیس لائن کی بارکوں میں مدھم مدھم روشنیاں آنکھیں جھپکتی محسوس ہوتی ہیں؛ اُدھر دیکھو، دِق کے ہاسپٹل کے بکھرے ہوئے وارڈ جگمگانے لگتے ہیں اور ان سے پرے، دور خلا میں، ریڈیو کالونی کے اونچے وائرلیس پولوں پر ٹنگے سرخ ستارے

زمانے کی بے مہری کی علامت نظر آتے ہیں — بہت رات گئے اِدھر نیو پولیس لائن کی بارکوں کو اندھیرا کھا جاتا ہے، اُدھر دِق کے ہاسپٹل کے وارڈ اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں اور اس سے وائرلیس پولوں پر ٹنگے سرخ ستاروں کا دل دھڑکنے لگتا ہے کہ مال دودھیا روشنی میں محوِ غسل ہوتی ہے — ایک گہری خاموشی، نیم کی پتیوں کی سرسراہٹ، دل کی دھڑکن کی ڈوبتی اُبھرتی لے یا پھر کبھی کبھی پنجاب کی اور لپکتی ہوئی کسی برق رفتار کار کا پل، دو پل کا شور — اس شہر کی مال کو اب کیا کہیے...!

مال سے موہ مجھے دِق کے ہاسپٹل میں آنے کے تین دن بعد ہوا۔

تین دن میں اُداس رہا۔ کوئی اُداسی تھی بھلا! چاروں اور سیاہی نظر آ رہی تھی۔ دل کی بے چینی کا یہ عالم تھا کہ ہر سمے یہی احساس غالب رہتا، پھیپھڑے تو جب دغا دیں گے، دیں گے ہی، دل نے دغا دیا کہ دیا...

پہلے دو دن میں بستر ہی پر رہا۔ تیسرے دن مجھے ڈاکٹر چکرورتی نے صبح و شام ٹہلنے کی اجازت دے دی کہ ایکس رے کے مطابق میرے پھیپھڑوں میں چند دھبے تھے، کیوی ٹی نہیں تھی اور لیبارٹری رپورٹ کے مطابق میرے بلغم میں دِق کے جراثیم بھی نہیں تھے۔ میں اپنے طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بستر ہی کا ہو کر رہ گیا تھا مگر یہ جان کر میرے بجھے ہوئے دل کو ذرا تسکین ملی کہ میں ابھی ٹہلنے کے قابل ہوں۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد میں نے اپنا محبوب لباس، پاپلین کا کرتہ اور لٹھے کا پاجامہ پہنا، کندھوں پر شال جمائی اور وارڈ سے باہر آ گیا —

فروری کے آخری دنوں کی شام خنکی لیے ہوئے تھی، آسمان نیلا تھا، ہوا دھیمے دھیمے بہہ رہی تھی اور من بے بات اُداس تھا۔

گھومتے گھومتے میرے قدم ایک انجان پگڈنڈی کی اور اُٹھ گئے اور میں مال پر پہنچ گیا — اس سے پہلے مجھے مال کے وجود کا علم نہیں تھا۔

شام گہری ہو چکی تھی، آسمان کی نیلاہٹ بھی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ دھیمے دھیمے بہتی ہوئی ہوا کے ساتھ نیم کی پتیاں سرگوشیوں میں مشغول تھیں۔

سرگوشیوں کی زبان کچھ عجیب سی تھی — میں اس زبان کو صرف محسوس کر سکا، سمجھ نہ سکا۔

دونوں کناروں پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی اور نیم کی پتیوں کے جال میں سے چھنتی ہوئی دودھیا روشنی میں کشادہ، چکنی، ہموار اور کالی مال سکون سے دراز تھی۔

مجھے اِکا دُکا لوگوں کی چہل قدمی کے باوجود بے پناہ ویرانی کا احساس تھا اور میرا دل جو دو دن سے ٹوٹ رہا تھا، آپ سے آپ اِک بے نام نشے میں ٹھہر سا گیا۔

میں بہت دیر تک گھومتا رہا اور پھر یونہی نیم کے پیڑ کے تنے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ کبھی مسکرا دیتا، کبھی آسمان کو تکنے لگتا۔ کہہ نہیں سکتا، کب تک کھڑا رہا۔ جب چلنے لگا، زبان پر آپ سے آپ آ گیا:

—کوئی ویرانی سی ویرانی ہے...

اور پاس سے آواز آئی:

—دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا۔

میں نے مڑ کر تعجب سے دیکھا۔

—سعید۔

ایک اجنبی ہاتھ میری جانب بڑھا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا۔

—کلدیپ۔

مجھے محسوس ہوا، ہمارے ہاتھ گرم جوشی سے ملے ہیں۔ یہ مال کا جادو تھا یا میرا احساس، یہ میں کبھی جان نہ پایا— اور پھر ہم یوں بچھڑے جیسے کبھی ملنا نہ ہو۔ ہم نے کوئی بات نہ کی۔ اسی انجان پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلتے ہوئے اپنے اپنے وارڈوں میں پہنچ گئے۔

بہت رات گئے تک میں جاگتا رہا۔ میرے دل میں اِک جوت سی جل اُٹھی تھی— نہ جانے میں نے کیا پا لیا تھا، کیا کھو دیا تھا— میری آنکھیں نم ہو گئیں اور نیند میں ڈوب گئیں۔

صبح اُٹھا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ رات بھر خوابوں میں ایک دُبلی پتلی، سانولی، روشن آنکھوں والی لڑکی ناچتی رہی تھی— میں مسکرا دیا۔

شام کو سعید اسی نیم کے پیڑ تلے ملا۔

—چلو! سنتری بادشاہ کے پاس چلتے ہیں۔

اس دن میں نے مال کا انگ انگ دیکھا۔

نیو پولیس لائن اور دق کے ہاسپٹل کی آمنے سامنے پھیلی ہوئی بارکوں اور وارڈوں کے بعد، کچھ فرلانگ پرے ماڈل ٹاؤن کی کوٹھیاں اور بنگلے تھے۔ کوٹھیوں کے سامنے، مال کی دوسری اور جامنوں کا گھنا باغ تھا۔ ذرا اور پرے، مال کی دونوں اور، دُور دُور تک کھیت تھے اور مال کنارے، مال کے متوازی، ایک کمرے اور برآمدے پر مشتمل چھوٹا سا ویران سا پوسٹ آفس تھا۔ پوسٹ آفس

کے سامنے اونچے قد والا لیٹر بکس تھا جس کی تینوں ٹانگیں سرخ بجری میں دھنسی ہوئی تھیں، گول سرخ جسم اور یہ بڑی گول سرخ ٹوپی اس ویرانی میں جیسے سنتری بادشاہ کے وجود کی علامت تھی۔

— یہ ہمارا سنتری بادشاہ ہے۔ مال تو ہر دم مستی کے عالم میں رہتی ہے، کچھ نہیں جانتی، کچھ نہیں دیکھتی، معصوم اتنی کہ اللہ کیا کہوں۔ ہر دم دھڑ کا لگا رہتا ہے، کوئی لوٹ نہ لے... مگر ہمارا یہ سنتری بادشاہ بھی خوب ہے، کس کی مجال، کوئی بُری نظر اٹھائے اور پھر یہ مال تک اپنا پیغام بھی پہنچاتا ہے کہ مہربان ہے۔

سعید نے جیب میں سے خط نکالا اور پوسٹ کر دیا۔

— صبح مال سے ملاقات ہوتی ہے، شام کو بھی، رات کو بھی — پھر بھی ڈھیر ساری باتیں دل ہی میں رہ جاتی ہیں — دوپہر کو ساری ان کہی باتیں لکھ کر سنتری بادشاہ کے حوالے کر دیتا ہوں۔

میرے سر کے بال جڑوں سے کھڑے ہو گئے۔ عاشقی کی یہ حد میری سوچ سے بہت پرے تھی۔

— کلد یپ! میں مال سے جدا نہیں ہو سکتا۔ جب میرے پھیپھڑے تندرست ہو جائیں گے، میں ماڈل ٹاؤن میں رہوں گا — کسی کو چاہے جانا، بس چاہے جانا، اُف میرے اللہ! کتنی بڑی دولت ہے۔

سعید نے شدّتِ جذبات سے میرا ہاتھ تھام لیا — ہم دھیمے دھیمے واپس ہو لیے۔

وہ دے، میں بھولے نہیں بھولتا — اس دے میں نے پہلی مرتبہ دل کی دھڑکن قدموں کی چاپ میں سنی۔

شام راکھ ہو گئی — مال نے وہ سنگھار کیا تھا، جسم پر راکھ ملے ہوئے جوگیوں کی طرح کہ جامنوں کا باغ بھی سائیں سائیں کر رہا تھا۔

راستے میں ڈاکٹر چکرورتی دکھائی دیے۔ ان کی بغل میں نہ جانے کون تھی۔ حریری ساری، حریری بلاؤز میں لپٹا ہوا دُبلا سا سانولا جسم۔ جسم کے تناسب سے ذرا بڑی، بھری بھری چھاتیاں، اونچی گردن، بڑی بڑی آنکھیں اور مانگ سے بے نیاز، جوڑے میں گندھے ہوئے سیاہ بال۔

ڈاکٹر صاحب ہمیں دیکھ کر مسکرا دیے اور آگے بڑھ گئے۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ مال ہی کا کوئی اور روپ ان کی بغل میں تھا۔

مال جوں کی توں خاموش تھی، نیم کی پتیوں کی باتیں سن رہی تھی، ہمارے قدموں کی چاپ سن رہی تھی اور شاید ہمارے دل کی دھڑکن بھی۔

سعید خاموش تھا۔

ہم ہاسپٹل کی آخری حد پر پہنچ گئے۔

مال کنارے انگریزی حرف 'ٹی' کا ہم شکل سفید سائن بورڈ ایک ٹانگ پر کھڑا تھا اور اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں پر سیدھے سادے، متناسب اور کالے الفاظ میں لکھا تھا: دی مال۔

میری زبان پر دھیمے سے آیا۔

— دی مال —

ہوا میری آواز لے اُڑی اور مجھے محسوس ہوا، پتیاں سروں میں گا رہی ہیں:

— دی مال —

دی مال —

دی مال!

سعید سفید سائن بورڈ کو گھورتا رہا اور پھر کچھ دیر بعد ہم خوش خوش سے، اُداس اُداس سے لوٹ آئے...

اور پھر ہم روز ملتے، منہ اندھیرے، شام ڈھلے۔

گلابی جاڑوں میں ملتے، جھلستی گرمیوں میں ملتے اور بھری برسات میں ملتے۔

ہماری زندگی کا ایک ایک پل، ایک ایک سانس مال سے وابستہ ہو گیا تھا۔ ہم بھول گئے، غم کیا ہے، محرومی کیا ہے، مراد کیا ہے، چاہت کیا ہے— ایک نشہ تھا، بس ایک نشہ، جینے کا نشہ، چاہے جانے سے بے نیاز چاہنے کا نشہ۔

سعید کی آواز پتیوں کی سرسراہٹ کے ساتھ اُبھرتی:

— میری محبوب

میری جان

جانِ من

میری پیاری مال!

میرا دل ایک ایسا ستار ہے جس کے سینے میں سینکڑوں راگنیاں بسی ہیں۔ تم سوتے سوتے روز کوئی نہ کوئی راگنی چھیڑ دیتی ہو، میری کسی نہ کسی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتی ہو— میں جی رہا ہوں— مجھے اپنے غیر فانی ہونے کا احساس ہو رہا ہے۔

— تم کیا ہو، اللہ ہی جانتا ہے۔

— تم کیا نہیں ہو، اللہ ہی جانتا ہے۔
— تم مَیں ہو کہ مَیں تم ہوں، اللہ ہی جانتا ہے۔
ہم نے اَن گنت خطوط سنتری بادشاہ کے حوالے کیے اور جیے اور خوب جیے۔
اور پھر وہ دن، قیامت کا دن، مجھے تیز بخار نے آ دبوچا۔ میں بستر ہی میں دبکا پڑا اکڑ ھتا رہا۔
رات کو سعید میرے پاس آیا۔ اس کا رنگ زرد تھا، آنکھیں سرخ تھیں اور لب کانپ رہے تھے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ سکا اور گرتے پڑتے قدموں سے اپنے وارڈ کی اور چلا گیا۔
رات بھر میں سو نہ سکا۔ ڈرتا رہا، سعید سے، اپنے آپ سے۔
صبح اُڑتے اُڑتے یہ خبر وارڈ میں پہنچی اور پھر مجھ تک آن پہنچی کہ سعید نے رات کو خودکشی کر لی۔
میرا دل ڈوب گیا، میں کچھ سوچ نہ سکا۔
بخار سے چھٹکارا ملا تو اگلی شام، یا شاید اس سے اگلی شام بوجھل دل اور بوجھل قدموں سے مال پر گیا۔
سفید سائن بورڈ کے پاس پہنچا تو سر گھوم گیا، ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میں نے اندھیرا کھاتی ہوئی آنکھوں کو پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ لکھا تھا: 'گوجرل روڈ'۔
آسمان سرخ ہو گیا تھا۔ مال کے جسم پر خون کے دھبے دکھائی دے رہے تھے اور نیم کی پتیوں کے بین میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ میں نے اپنے منوں بھاری پاؤں اٹھانے کی کوشش کی مگر اٹھا نہ سکا۔
اس کے بعد کیا ہوا، یہ میرے ہوش کی بات نہیں۔
جب میری آنکھ کھلی تھی، میں نے اپنی ناک میں آکسیجن کی نلی لگی ہوئی دیکھی تھی۔

OO

('ادبِ لطیف'، لاہور: ۱۹۶۳ء)

ساحل کی ذلّت

گلزار اور بھوشن بن مالی کے لیے

میں نے کہا تھا، اس نے کہا تھا — کس نے کہا تھا: یہ سکّوں کا شہر ہے، یہاں گلیوں میں چاندی بہتی ہے۔

میں نے سنا تھا اور اس نے بھی سنا تھا لیکن کس نے کہا تھا؟

اگر میں نے کہا تھا تو اس نے سنا تھا اور میں نے بھی۔

اگر اس نے کہا تھا تو میں نے سنا تھا اور اس نے بھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا 'وہ' تھے، ایک دوسرے کا 'تم' کبھی نہ بن سکے کہ وہ ننگا تھا۔

اس کا سب کچھ اس کا اپنا تھا — صرف اس کے ہاتھ اس کے اپنے نہ تھے۔

اس کی رانوں کی جیبیں جن کا لکیر سامنہ کولھوں سے ذرا نیچے تھا، گھٹنوں تک گہری تھیں اور بجتے ہوئے چھوٹے بڑے مستطیل کاغذوں سے بھری ہوئی تھیں جو سونے اور چربی سے مہنگے تھے۔

اس کارن کہ اس کی جیبیں بھری ہوئی تھیں، اس کی رانوں پر مجھے ارٹی کیریا کا میرے دل برابر دھبہ نظر آ رہا تھا۔

میں جو ہمیشہ اپنے اسی پرانے، سرسراتے ہوئے اور راہگیروں سے اُلجھتے ہوئے لباس میں رہتا ہوں، اس کے ساتھ اس لیے لگا ہوا تھا کہ اسے کھنکتی دھاتوں کے چھوٹے بڑے آبلوں سے نفرت تھی۔

اس کی نفرت نے میرا پیٹ بھرا تھا جو برسوں پہلے اسی شہر میں میری رانوں اور پنڈلیوں کی مچھلیاں تک چبا چکا تھا۔

میں اور وہ — وہ میرا وہ اور میں اس کا وہ — میرا سب کچھ میرا نہ تھا، اس کا سب کچھ اس کا اپنا تھا — صرف اس کے ہاتھ اس کے اپنے نہ تھے۔

اس کے ہاتھ اس کے اپنے نہ تھے کہ نہ رگیں تھیں، نہ بال تھے، نہ مسام تھے، نہ لکیریں

تھیں — نہ انگلیاں چٹختی تھیں، نہ ناخن اُگتے تھے — وہ واحد ہاتھ تھے، وہ واحد انگلیاں تھیں جو کہیں بھی، کوئی بھی نشان نہ چھوڑتی تھیں۔

اور میری اور اس کی آواز میں صرف اتنا فرق تھا کہ اس کی آواز میری آواز سے پہلے سنی جاتی تھی — اور سننے والے کانوں کی کہانی بھی صرف اتنی تھی کہ وہ میری آواز سننے سے پہلے اس کی آواز سننے کے عادی ہو چکے تھے۔

وہ کہ اس شہر میں مجھ سے پہلے پہنچا تھا، اس نے ایک نظر میں بھانپ لیا، میرا سب کچھ میرا نہیں ہے، صرف میرے ہاتھ میرے ہیں۔ وہ جانتا تھا، میرے ہاتھ اگر میرے رہے تو وہ سب کچھ جو میرا نہیں ہے، میرا ہو جائے گا اور اس کا سب کچھ جو اس کا اپنا ہے، اس کا نہ رہے گا۔

میں کہ اس شہر کی بسوں کی کھڑکیوں سے دمکتے چمکتے ابرق کی کٹی پھٹی لرزاں سی چادر کو تکا کرتا تھا اور روتا رہتا تھا اور جانتا تھا کہ میری آنکھوں کا رونا، میرا رونا، میرا نہیں ہے، ایک دن میں نے اسے دیکھا۔

وہ ننگا تھا۔

اس نے اپنی دائیں ران کی جیب میں ہاتھ ڈالا، بجتے ہوئے چند چھوٹے بڑے مستطیل کاغذ نکالے، ایک نظر مجھے دیکھا — مجھے یوں محسوس ہوا — اور کاغذوں کے ٹکڑے ہوا میں اچھال دیے۔

وہ سب کچھ کہ میرا نہیں تھا، اب امکانات کی حدود سے دور کا قصہ ہو گیا جہاں ابرق کی کٹی پھٹی چادر تانبے کے بوجھ تلے دب رہی تھی — ہوا صرف اتنا تھا کہ ہوا میں اُڑتے ہوئے مستطیل کاغذ میری نگاہ کا مرکز بن گئے اور مجھے مربع شکل نظر آنے لگے۔

بات یہاں تک رہتی تو کوئی بات ہی نہ ہوتی کہ میری نگاہوں کی لغزش اس کے لبوں کی مسکان مشکل ہی سے بنتی۔

ہوا بہت کچھ تھا — جیسے ہی مربع شکل کاغذ مجھے دکھائی دیے، میرے ہاتھ آپ سے آپ ان کی سمت اُٹھے اور پھر میرے بازو میری مفلس سوچ بن کر اتنے لمبے ہو گئے کہ بجتے کاغذ میری گرفت میں آ گئے اور اس سے کہ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا، یہ نہ دیکھ سکا، ابرق کی مٹی مٹی سی کھنکھنی چمک میں میرے ہاتھ میرے لمبے ہاتھوں سے کہیں لمبے ہو گئے ہیں اور یہ اس نے دیکھ لیا کہ اس کے ہاتھ اس کے اپنے نہ تھے اور یوں اس کے میرے اور میرے اس کے تعلقات کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو زوال کی داستانوں میں بھی لکھا نہیں گیا۔

اس تعلق میں اوّل و آخر وہ تھا اور میں اوّل و آخر کی کاغذی چڑیا جو اس کے بجتے کاغذوں کا

گوشت پوست تھی۔

میں جس کی کل کائنات پچکا ہوا پیٹ سمیٹے ہوئے تھے، جس کی نگاہ بس کی کھڑکی کی وسعت سے باہر کی بات نہ تھی اور جس کے ہاتھ اس کے پیٹ اور نگاہ کے پابند تھے، یکایک لذتوں کی اونچی عمارتوں کے بیچ پہنچ گیا۔

ہوش گم ہونا غیر فطری نہیں تھا، ہوش گم ہو گئے۔

میری زندگی کے وہ دن جواَن گنت تھے اور جن کی نامعلوم تعداد مجھے حیرت زدہ کیا کرتی تھی، اب میرا انگوٹھا ان دنوں کا حساب میری انگلیوں کی پوریں ٹٹولنے سے لگالیتا۔

کیا یہ لذّتوں کی اونچی عمارتوں کا کرشمہ تھا؟

لذّتوں کی اسیری، کانچ کی اونچی عمارتوں کی برہنگی تھی۔

ننگے کو ننگا دیکھا تو ننگا ہونے کی خواہش جان کو آگئی — کپڑے اُتارتا، ننگا ہوتا لیکن ننگا نہ ہو پاتا کہ وہ اس شہر میں مجھ سے پہلے پہنچا تھا اور اس کے ہاتھ اس کے اپنے نہ تھے اور وہ ننگا تھا — میں کپڑے پہن لیتا۔

اور جب پستہ قد کرسیوں میں پھنسے ہوئے، کسے ہوئے جسموں اور چھوٹی میزوں پر رکھے ہوئے پندرہ سے چالیس برس تک کی عمر کے گول پستانوں کو چھونے کی خواہش میرے جبڑے کا کرب بنی — یہ ایک اجنبی کا کرب، ایک اجنبی کا ردِعمل تھا — تو کانچ کی دیوار کی اس اور سے اس کی صاف شفاف چتلیوں کی ایک جنبش نے میرے دانتوں کو دھار، زبان کو زہر اور لعاب کو خوشبو اور جبڑے کو سکون بخشتا۔

یہ مجھے بہت دیر بعد معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھ اور اس کی انگلیاں کہیں بھی، کوئی بھی نشان نہ چھوڑتی تھیں — ڈھلے ڈھلائے جسم جن کی شناخت میری مشکل تھی، یوں آسانی سے حل ہو گئی کہ کہے نہیں بنتی۔

اگر کہنا صرف اتنا ہو کہ وہ چوبیس برس کا الف تھا اور اس کے ہاتھ اس کے اپنے تھے اور وہ چالیس برس کا جنگل تھی یا اُبلتی دلدل تھی تو بات نہیں بنتی اور بات کا بننا یوں ضروری ہے کہ وہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچا تھا۔

اس کی رگوں میں ابھی ماں کا دودھ خون نہیں بنا تھا اور... اور وہ ایک ایسی ماں تھی جس کی رگوں میں چونا، کتھا اور تمبا کو، لذتوں کی عمارتوں کی بلندی، عشق کے کاغذی گھر، فنونِ لطیفہ کا بھرم اور کروڑوں تماش بینوں کی حسرتوں کا نشہ کھنچا رہتا تھا — جب وہ اسے چھوڑ گئی، وہ ٹوٹا — اس کے

بھائی نے ایک اور عشق میں شہرت حاصل کی اور خودکشی کر لی — وہ ٹوٹا اور جب اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا — دل کی دھڑکن غائب تھی۔

یہ بھی اسے ایک مدت کے بعد پتہ چلا کہ وہ اس کے ہاتھ اپنے ساتھ لے گئی ہے اور اسے ایسے ہاتھ دے گئی ہے جو خود اس کے اپنے دل کی دھڑکن محسوس نہیں کر سکتے۔

یہ وہی ہاتھ تھے جو اس کے اپنے نہ تھے اور یہ وہی ہاتھ تھے، وہی انگلیاں تھیں جو کہیں بھی، کوئی بھی نشان نہ چھوڑتی تھیں اور انہیں ہاتھوں نے اس کے جانے کے بعد اس کے لیے وہ کام کیا تھا جو خود اس کے اپنے ہاتھ نہ کر پائے تھے۔

اور جب وہ بستر سے لگ گئی اور کہ اب وہ اس کی ماں تھی، وہ اسے ملنے گیا — اس کی چھاتی میں منہ چھپا کر روتا رہا اور پھر اس کے دیے ہوئے ہاتھوں سے اس کے پستان سہلاتا رہا — وہ دیکھ سکتا تھا، محسوس نہ کر سکتا تھا اور تب وہ آخری بار رو دیا اور سمجھ گیا کہ وہ کیا ہے؟ کون ہے؟ اور اسے کیا کرنا ہے؟

کنوارا جسم ہوتا یا لذتوں کی اونچی عمارت — وہ تالا کھولتا، کسی کو کچھ پتہ نہ چلتا۔

وہ شہر جو اس جیسے کئی لوگوں کا تھا، اب صرف اس کا تھا اور میں یہ راز جان چکا تھا کہ وہ شہر صرف اس وجہ سے اس کا ہے کہ وہ مجھ سے پہلے وہاں پہنچا تھا۔

اور اس شہر پر حکم اس کا چلتا تھا جس کے ہاتھ اس کے اپنے نہ ہوں۔

میں کہ اس کی نفرت میرا پیٹ بھرتی تھی، اس کا سراغ پا چکا تھا اور اس بات کا یقین مجھے تب ہوا جب اس نے اس کا دیا ہوا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا — وہ ننگا تھا — میرا سر سراتا ہوا لباس اس سے لپٹ رہا تھا — مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ میں سمجھ گیا، وہ سب کچھ سمجھ رہا ہے!

میں نے اسے دھوکہ دیا — میں چپ رہا — میں خاموش رہا — ہونٹ کاٹتا رہا — حالانکہ میں مسکرانا چاہتا تھا۔ میں اس بڑھیا کے گھر گیا جو اس کی انگلیوں کا کھلونا تھی، جو اس کے الف کا نرم گرم پیار تھی اور جو اس کے منہ چھپانے اور رونے کا تکیہ تھی — میں جان گیا تھا کہ اس شہر کے دستور کے مطابق اب یہی سب میرے ساتھ ہونے والا ہے — اور میری خواہش بھی تو یہی تھی۔

میں نے اس کی گردن توڑ دی۔

اس کے ہاتھ جو اس نے چھپا رکھے تھے، ڈھونڈنا شروع کیے۔

لحاف اُٹھایا — دیکھا — دو کٹے ہوئے ہاتھ اس کی رانوں کو اپنے شکنجے میں لیے ہوئے ہیں۔

میں نے دونوں ہاتھ اپنے سفید رومال میں باندھ لیے اور اس اونچی عمارت کی جانب چل پڑا جو بلند تھی، لذت تھی، کانچ تھی — اس عمارت میں بار ہا جانے کے باوجود، یہ میرا پہلا قدم تھا۔

اس نے مجھے دیکھا — صرف دیکھا — کیا کچھ نہ دیکھا — اور وہ ہاتھ جو اس کے اپنے نہ تھے، علیحدہ کیے اور بنا اپنے ہاتھ لیے کانچ کے لذت کدے سے باہر نکل گیا۔

چند ہی لمحوں کے بعد میرے تلوے جلنے لگے — میں ننگا تھا — اب کیا دیکھتا ہوں، دہکتے چمکتے ابرق کی کئی پھٹی لرزاں سی چادر لوہے کی طرح تپ رہی ہے اور تانبے کی وسعت جھجکتی چلی آ رہی ہے۔

○○

(تحریر: ۲۸ / مارچ ۱۹۷۲ء، لکھنؤ)
(مطبوعہ: کتاب، لکھنؤ)

سڑک ماضی کی

میں اپنی محبوب، کشادہ، ہموار، کالی، چکنی اور اُداس سڑک پر دن ڈھلے ٹہل رہا تھا۔
شام راکھ ہو رہی تھی اور میرا دل ڈوب رہا تھا۔
نیم کے پیڑ خاموش تھے، شاخیں جھکی ہوئی تھیں اور پتیاں چپ چاپ۔
بجلی کے کھمبے سوئے ہوئے تھے۔
آسمان کی نیلاہٹ گہری ہو رہی تھی۔
رات کی سیاہی دبے پاؤں بڑھ رہی تھی۔
سڑک بھی اُداس تھی اور میں بھی۔
ہمارا عشق بھی خوب تھا۔
میں تھکے تھکے سے قدموں سے ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا:
''سڑک کی اُداسی سڑک کا سکون تو نہیں...''
رات کی سیاہی نے ماحول کی اداسی کو اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا۔
بجلی کے کھمبے ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔
سڑک کا نصیب بھی سویا ہوا تھا۔
''نصیب تو میرا سویا ہوا ہے...! میری اُداسی میرا سکون کیوں نہیں؟''
میرا دل ڈوب رہا تھا۔
بجلی کے کھمبے بھی منتظر تھے اور میں بھی۔
قمقمے روشن ہوئے اور میں نے دیکھا۔
روشنی سیاہ تھی۔
وہ رات کیسی تھی؟
آسمان سیاہ تھا، ستارے مدھم تھے اور آسمان کی سیاہی میں اضافہ کر رہے تھے۔

بجلی کے کھمبے بے حس تھے، قمقموں کی آنکھوں سے روشنی بہہ رہی تھی، روشنی جو سیاہ تھی۔
نیم کے پیڑ جوں کے توں خاموش تھے، شاخیں بھی جھکی ہوئی تھیں اور پتیاں بھی چپ چاپ۔
سڑک، میری جنم جنم کی اُداس دوست، جوں کی توں خاموش تھی۔
میری آنکھیں اندھیرے میں بھٹک رہی تھیں۔
آسمان، ستارے، بجلی کے کھمبے، قمقمے، نیم کے پیڑ، شاخیں، پتیاں اور سڑک — سب میری نظروں کے سامنے تھے۔
سیاہی کی حکومت میں سب کچھ سیاہ ہو جاتا ہے مگر پھر بھی نظر آتا ہے۔
میرا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔
''سیاہی اور سناٹا...!''
میں نیم کے پیڑ کے تنے کا سہارا لے کر رُک گیا۔
''رات کی سیاہی کا دوست، سناٹا...!''
''میرا کوئی دوست نہیں...!''
''سڑک بھی میری دوست نہیں...!''
''سیاہی آئی اور سناٹا بھی سائے کی طرح ساتھ تھا... دوستی... دوستی!''
''میں تنہا کھڑا ہوں... سڑک تنہا دراز ہے... دوستی... کوئی دوستی ہے...؟''
مجھے وحشت ہونے لگی اور میں نے پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔
بجری چرمرا رہی تھی۔
''یہ بھی سیاہی اور سناٹا ہے... یہ آواز... یہ چرمراہٹ...''
''دھک... دھک... دھک... دھک دھک دھک۔''
''اور یہ آواز؟''
''یہ میری آواز ہے...!''
''یہ بھی سیاہی اور سناٹا ہے... تمھارے دل میں بھی ان کا بسیرا ہے۔''
''اُف ف ف...!''
''میں پاگل ہو جاؤں گا...!''
''پاگل، پاگل... پاگل... پاگل...!''
''گگ گ گ گ ا ا ا ا م م م...!''

میرے قدم رُک گئے۔

''تم...!''

میں نے مڑ کر دیکھا۔

''تم! مجھے بھول گئے کیا؟''

''تم... میں تمھاری ماں ہوں... ماں!''

''ماااااں ں ں...!''

میں اُس روشن اندھیرے میں آواز کی جانب بے اختیار بڑھا۔

میری آنکھوں میں بجلی کوندگئی۔ سر گھوم گیا۔

میری آنکھیں کھلیں اور میں نے دیکھا۔

میں نیم کے پیڑ کے تنے کے قریب بجری پر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ میرے ماتھے پر میرے خون کا تلک لگا ہوا تھا۔

رات کچھ زیادہ ہی روشن ہوگئی تھی کہ سیاہی بھی کچھ زیادہ ہی گہری ہوگئی تھی۔

سناٹا بھی کچھ زیادہ ہی گہرا ہوگیا تھا کہ ہوا دھیمے دھیمے بہنے لگی تھی اور نیم کی پتیاں سرسرا رہی تھیں۔

میں نے ہاتھ پھیلا کر نیم کے پیڑ کا سہارا لیا اور کھڑا ہوگیا۔

میں نے آسمان کی سیاہ وسعت کی جانب نظریں اُٹھائیں۔

ستارے پلکیں جھپکا رہے تھے۔

میں نے دھیمے دھیمے قدم بڑھائے۔

میرا دل، میرے پاؤں میں دھڑک رہا تھا۔

میں نے قمقموں کی جانب دیکھا۔

روشنی سیاہ تھی، ابھی تک سیاہ تھی۔

''روشنی جب سیاہ ہوتی ہے، وہ گھڑی قیامت کی گھڑی ہوتی ہے۔''

''جب قیامت کی گھڑی ہوتی ہے، طوفان آتے ہیں...!''

''جب طوفان آتے ہیں، کچھ نہیں بچتا...!''

'''میں چند گھڑیوں کا مہمان ہوں...!''

''پاگل...!''

''پاگل... پاگل... پاگل...!''

''پاگل ہو گیا؟''

میں نے اپنے بال نوچے۔

میرے ہاتھ خون میں لت پت ہو گئے۔ میرا سر لہولہان تھا۔

''نجم!''

میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

''یہ تو مونا کی آواز ہے!''

''مونا ا ا ا ا ا ا...!''

میں چلاّیا۔

''مونا ا ا ا ا ا ا...!''

''میں تمھارے قریب ہی ہوں نجم!''

''میں نے تمھیں قتل ہونے دیا، میں نے تمھیں قتل ہونے دیا... مونا، میں نے تمھیں قتل ہونے دیا... میں نے تمھیں قتل کر دیا مونا... مونا! تمھیں قتل کر دیا گیا... میں دیکھتا رہا... مونا، میں تمھارا قاتل ہوں... مونا، چلی جاؤ، میرے پاس کیا رکھا ہے، میرا دامن سیاہ ہے... میرے ہاتھ سیاہ ہیں... میرا دل سیاہ ہے... مونا، جاؤ...! جاؤ یہاں سے! نہیں تو میں تمھیں قتل کر دوں گا...!''

مونا کی سانسیں اُکھڑ گئیں اور میری چیخ نکل گئی۔

میری انگلیوں کو گرفت میں میری گردن تھی۔

''مونا ا ا ا ا ا ا...؟''

رات سیٹیاں بجا رہی تھی، ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔

''پاگل...!''

''پاگل... پاگل... پاگل...!''

''پاگل ہو گیا؟''

میری گردن دُکھ رہی تھی۔

جگہ جگہ سے جلد اکھڑ گئی تھی، ناخن کیلیں بن گئے تھے اس رات!

''میرا دل ڈوب کیوں نہیں جاتا!''

''رات کا سمندر کتنا گہرا ہے... میں ڈوب کیوں نہیں جاتا...''

''تُم م!''

میرا دل بھر آیا۔

آواز تھی کہ جادو، میرا دل بھر آیا۔

''تُم م!''

مجھے دل خراش چیخ سنائی دی۔

''سُش ش ش ما ا ا ا...!''

''میرے پیارے پگلے تُم! میں تمھارے قریب ہوں، مگر تم مجھے بھول جاتے ہو...!''

''سُش ش ش ما ا ا ا...!''

''سُشما، جاؤ... جاؤ سُشما!''

''تُم م!''

''کون؟... جیت!''

''تُم م!''

''موہن!''

''تُم م!''

''ارجن دیو!''

''تُم م!''

''امر!''

''جاؤ تم سب! جاؤ! جا ا ا ا ؤ ؤ جیت... موہن... ارجن دیو... امر!... تم سب اپنا اپنا گلا گھونٹ کر بھاگ گئے... تم سب بیوفا ہو... میرا پیچھا چھوڑو... میں پاگل ہو جاؤں گا... پاگل ہو جاؤں گا... پاگل ہو جاؤں گا... میں پا ا ا ا گل ل ل ہو جاؤں گا... پا ا ا ا گل ل...''

''پاگل!''

میرا سر گھوم گیا۔

آنکھیں اندھیرا کھا گئیں۔

میں نے دیکھا۔

میں اپنی محبوب، کشادہ، ہموار، کالی، چکنی اور اُداس سڑک پر ٹہل رہا تھا۔

میرا دل بجھا ہوا تھا۔

نیم کے پیڑ خاموش تھے، شاخیں جھوم رہی تھیں اور پتیاں دھیمی آواز میں بربا گا رہی تھیں۔
بجلی کے کھمبے بے حس تھے، قمقموں کی آنکھ سے سیاہ روشنی بہہ رہی تھی اور پورے ماحول پر نور برس رہا تھا۔
آسمان سیاہ تھا۔
چند لمحے میں بے جان سا کھڑا رہا۔
میرے لب کانپتے رہے۔
پھر میرے کانوں کے پردے ایک دل خراش چیخ نے پھاڑ دیے۔
"پا اااا گل ل ل...!"

مندرجہ بالا تحریر ایک پاگل کی تحریر ہے۔ اس تحریر کا خالق میرا دوست تھا۔ میرے دوست نے زندگی کے آخری دن پاگل خانے میں گزارے تھے۔ اب کہ میرا پاگل دوست مر چکا ہے میں اس کی بے ربط تحریر پیش کر رہا ہوں کہ آپ لوگ اس تحریر میں ربط پیدا کریں، معنی و مفہوم تلاش کریں۔
OO
('تلاش'، نئی دلی: ۱۹۶۳ء)

تہ در تہ

تہ در تہ
در تہ
—در تہ جذبے
کروٹیں بدل رہے ہیں
کتنی دھوپ ہے
کتنا غبار
دم گھٹ جائے گا

ٹکٹ؟
کنڈکٹر کو ۳۷ نئے پیسے دیتا ہوں — دس دس کے تین سکے، پانچ کا ایک سکہ اور دو کا ایک سکہ — پھر وہ مجھ سے کیوں پوچھتا ہے کہاں جانا ہے؟
مجھے ۳۷ نئے پیسوں میں جہنم جانا ہے۔ یہ میں اسے نہیں کہتا ہوں — یہ بات اس کی سمجھ سے بہت پرے ہے —
(ہا ہا ہا) میں کہتا ہوں ماڈل ٹاؤن!
ماڈل ٹاؤن جہاں جھیل ہے، شالامار باغ ہے، چوڑی اور ہموار سڑکیں ہیں، جہاں کوٹھیوں میں بھرے بھرے جسموں والی لڑکیاں رہتی ہیں، جہاں میرا گھر ہے، میرا گھر — میرا جہنم۔

کتنی دھول ہے
کتنا غبار

سندھیا ہاؤس!
صرف پانچ سواریاں!
ایک، دو، تین، چار، پانچ
بس صاحب بس!
(ٹن ٹن ٹن)
آپ کہاں جائیں گے؟
منڈی ہاؤس!
سات نئے پیسے!
کوئی صاحب اسٹینس مین؟؟؟
(ٹن ٹن ٹن)

کتنی دھول ہے
کتنا غبار

میرے گھر میں (جہنم میں) ایک پلنگ بچھا ہوا ہے۔ نرم، گرم — عورت کی آغوش نرم اور گرم ہوتی ہے میرا پلنگ
دیواریں سونی سونی ہیں، ننگی ننگی ہیں اور چھت جھکی جھکی سی ہے، میں اڑ نہیں سکتا۔ میں...
ٹکٹ دکھائیے!
چیکر اتنی جلدی کیوں آ گیا — مجھ سے ٹکٹ کیوں مانگتا ہے — کیا میری زندگی کا مقصد کاغذ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو سنبھالنا ہی ہے...
...دل زوروں سے دھک دھک کر رہا ہے...
بس تیزی سے بھاگ رہی ہے، بس نیم کے اس پیڑ سے ٹکرا کیوں نہیں جاتی۔

کتنی دھول ہے
کتنا غبار

جھکڑ چل رہے ہیں

... ...

قریب آؤ، قریب آؤ نا!
تم جانتی ہو، میں نے پہلی بار تمھیں کب دیکھا
تھا... ایسٹ وارڈ میں۔ تم بجلی کی طرح لپک رہی
تھیں، لوگ مر رہے تھے، تم مسکرا رہی تھیں...
تمھارے لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹ سجی رہتی ہے...
لوگ مر رہے تھے، تم لاشوں کو مورچری میں
بھجوا رہی تھیں، نئے مریضوں کو دلاسہ دے رہی
تھیں اور مسکرا رہی تھیں... کملا، تمھارے لبوں پر
ہمیشہ مسکراہٹ سجی رہتی ہے... وہ دن کتنے حسین
تھے۔ ہیضہ پس منظر کا کام کر رہا تھا اور تم تھیں
منظر اور میں تھا کہ... کہ

منڈی ہاؤس!
ایک صاحب کو یہاں اُترنا ہے!
منڈی ہاؤس!
کیوں صاحب، سو رہے ہیں کیا؟
(ٹن ٹن ٹن)
آپ کا ٹکٹ؟
دلّی گیٹ!
بارہ نئے پیسے!
آپ کہاں جائیں گے؟
اور آپ؟

اس ملک کا کیا ہوگا؟
لوگ بس اسٹاپ آنے سے پہلے سو جاتے ہیں۔
پوری قوم سو رہی ہے — ہم بھی کیا لوگ ہیں تین سال سے

کنگز وے کے گندے نالے پر پل بنا رہے ہیں... اتنا چھوٹا سا پل
بنانے میں ہمیں تین سال لگ گئے... اور... ہم کچھ نہیں کر سکتے...
یہ پارلیمنٹری ڈیموکریسی ہے...

مسٹر!
اس بچی کو اپنی جگہ دے دو!
کیوں؟
آج کل کے نوجوان نہیں جانتے،
تہذیب کس چڑیا کا نام ہے۔
معاف کیجیے گا! تہذیب وہ چڑیا ہے
جو آپ لوگوں نے چڑیا گھر میں نمائش کے لیے
رکھی ہوئی ہے... یہ میری سیٹ ہے، میں اپنی سیٹ
اس "بچی" کو نہیں دے سکتا۔
شٹ اپ...Don't call me Bachchi!
مادام، میں نے تو آپ کو بچی نہیں کہا... ان بزرگوار
نے یہ نام آپ کو بخشا ہے۔
ہمارے زمانے میں غیر لڑکیاں، مائیں، بہنیں اور
بچیاں ہوتی تھیں اور ہم انھیں اپنی جگہ دے دیا
کرتے تھے!
جناب، ہمارے اس دور کو پارلیمنٹری ڈیموکریسی
کا دور کہتے ہیں... اور اس دور میں بچیوں اور
بچوں کو برابر کے حقوق ملے ہوئے ہیں...
حالانکہ بسوں کے معاملے میں بچیوں کو کچھ زیادہ
ہی حقوق ملے ہوئے ہیں... بچیوں کے لیے دو
سیٹیں مخصوص ہیں... پھر آپ ہمیں کہتے ہیں کہ
تہذیب...

...پارلیمنٹری ڈیموکریسی ایک رویّہ ہے... رائے

عامہ... چند سالوں میں ایک اسکول ماسٹر چیف منسٹر تو بن سکتا ہے لیکن کروڑ پتی نہیں بن سکتا... کروڑ پتی بنتا ہے تو پارلیمنٹری ڈیموکریسی فراڈ ہے... فراڈ... یہ ملک فراڈوں کا ملک ہے — اسکینڈلوں کا ملک ہے... سب سے بڑا اسکینڈل تو ملک کی تقسیم ہے... لعنت ہے — لعنت ہے۔

مسٹر زبان بند کرو، میری عمر پچپن سال ہے اور میں نے یہ بال دُھوپ میں سفید نہیں کیے اور میرا یہ جسم اب بھی لوہے کا ہے اور میں نے تمھیں ایک جھانپڑ لگایا تو تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گے... تو آپ اپنے زمانے کی تہذیب کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں... آپ کے بال سفید ہیں صرف اسی کا مجھے لحاظ ہے، ورنہ... آپ مجھے جھانپڑ لگائیں گے میں آپ کو گولی ماردوں گا... یہ میرا زمانہ ہے...

ان بزرگوں سے اللہ بچائے۔ ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے، ہمارے جسم لوہے کے ہیں... بھئی آپ نے زندگی میں اور کیا کیا ہے... بچے پیدا کیے ہیں، درجنوں، اور... تمام عمر کلرکی کی ہے، ٹھیکیداری کی ہے اور... تمام عمر سونے میں کاٹ دی ہے... اس کے علاوہ آپ کو کچھ علم ہی نہیں... ہم نے یہ بال دُھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں اور ہمارا جسم۔ لعنت ہے ان بزرگوں پر... بیس سال کی لڑکی دیکھی اور جسم کی رگیں اینٹھ گئیں اور زبان پر... اس بچی کو اپنی جگہ دے دو... بھوک، بھوک، بھوک کے مارے ہوئے... ان سے پوچھو، ہٹلر کون تھا... کہیں گے، پتہ نہیں...

عمر گنوادی، نہ کچھ سیکھا، نہ کچھ جانا... بچے پیدا
کیے، رشوتیں لیں اور سوئے اور... ہم نے یہ بال
دھوپ میں نہیں سفید کیے... لعنت ہے... ہم
اپنے والدین سے... ہمارے والدین ہماری
ذلت کا باعث ہیں... Idiots ...

دلی گیٹ!
اور کوئی!
(ٹن ٹن ٹن)
کسی صاحب نے ٹکٹ لینا ہو تو لے لے،
شرمائے نہیں۔
آپ کو تین نئے پیسے چاہئیں؟
دو لیجیے، ایک ابھی کھلا ہوا نہیں ہے۔
دریا گنج والے صاحب آگے بڑھ جائیں!
لالہ جی! دریا گنج آ گیا!
یہ بس کہاں جائے گی؟
آپ کو کہاں جانا ہے؟
کشمیری گیٹ!
آئیے!
(ٹن ٹن ٹن)
بارہ نئے پیسے!

... ...

سنا ہے پاکستان نے بارڈر پر فوجیں جمع کر لی ہیں... ...

... ...

امی! میرے ان دوستوں میں ایک ہندوستانی
ہے اور ہندو ہے، جس کے لیے آپ نے بنا پیاز
کے ترکاری تیار کی ہے... ابا آپ اور تم الماس...

آپ سب پہچانیے میرے ہندو دوست کو...

ہا ہا ہا...

ہی ہی ہی... کیوں انتظار حسین صاحب!

آپ بڑے مسلمان بنتے ہیں... امی، یہ انتظار
حسین صاحب ہیں... اور جنھیں آپ پہچان نہیں
سکیں... وہ یہ ہیں بلراج صاحب... ہاہاہا...

ہی ہی ہی... انتظار صاحب، اپنے آپ کو مسلمان
کہنے سے پہلے آپ اپنی شکل تبدیل کریں...

بلراج، یار ایک کام کرو...

یار، کشمیر لے لو، لتا منگیشکر ہمیں دے دو۔

... منحوست! صبح جب ہم دس کروڑ پاکستانیوں کی
آنکھ کھلتی ہے، لتا کی آواز ہمارے کانوں میں
پڑتی ہے... لتا...

... ...

پاکستان اور ہم... ہم اور پاکستان... لعنت ہے...
ہم اکٹھے دوستوں کی طرح کیوں نہیں رہ سکتے۔

عزیز کنیڈا چلا گیا ہے، پاکستان چھوڑ کر۔ میں بھی
یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ میں اور عزیز کہیں دوٗر
ملیں گے... یہ لوگ یہاں سر پھوڑیں گے اور ہم
کہیں دوٗر بیٹھ کر روئیں گے...

آپ کا ٹکٹ؟

اف! بھئی آپ کی بسوں میں سوار ہو کر آدمی مجرم
بن جاتا ہے... جیسے عادی مجرم کو ہر شام تھانے
میں آواز پڑتی ہے، آپ کو بھی ہر اسٹاپ پر ٹکٹ
دکھانا پڑتا ہے...

ہا ہا ہا

کشمیری گیٹ؟
(ٹن ٹن ٹن)
بھئی! اُلڈ لو کیسل پر بس رکوایئے گا!

رام منوہر لوہیا کہتا ہے...
کشمیری گیٹ سے باہر آ کر بس خوب بھاگتی ہے!

ایک بات میں صاف طور پر
کہنا چاہتا ہوں... میری زندگی میں
ہمارا جسم ایک تھا۔
ہماری دھڑکنیں ایک تھیں اور... اب تم...

شوں ں ں گر ڑ ر ڑ ر ڑ
لڈلو کیسل!
شوں ں ں ں گر ڑ

کیوبا کے معاملے میں خردشچیف بہتر آدمی ثابت ہوا...
اولڈ سیکریٹریٹ!
(ٹن ٹن ٹن)

تم جانتے ہو، جب میں نے تمھیں کہا تھا...
میں تیزی کا قائل ہوں... اس سے میرے
ذہن میں یہی تھا کہ ہم...

مال روڈ!
آپ کہاں جائیں گے؟
سات نئے پیسے!
آپ؟

مال کا کوئی جواب نہیں...

مونا! تمھارا جواب نہیں...

ایک دل اور سو افسانے!
بھئی آپ اچھا گاتے ہیں...!

جی ہاں! قسمت میں کنڈکٹری لکھی ہے نا!

برانڈ اہاؤس!

(ٹن ٹن ٹن)

ایک دل اور سو افسانے، ہائے محبت ہائے زمانے۔

ایک دل...

کنگزوے کیمپ!

ماڈل ٹاؤن...!

گھر؟

جہنم!

زندگی راس نہ آئے تو...

... سو جاؤ! ماڈل ٹاؤن فرسٹ اسٹاپ!

زندگی کتنی سونی ہے! سڑک کتنی سونی ہے!! بس کتنی سونی ہے!!!

○○

(سالنامہ 'تلاش' نئی دہلی: ۱۹۶۳ء)

بس اسٹاپ

زندگی کے اُس موڑ پر، اس لمحے، مجھے انتظار کرنا تھا، بس انتظار کرنا تھا۔
میں اُس بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کر رہا تھا۔ میری تپتی ہوئی گھڑی میں ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔
نام کو تو وہ بس اسٹاپ تھا — نام کو کیا، وہ واقعی بس اسٹاپ تھا کہ بجلی کے کھمبے پر، تین ہاتھ اوپر، سبز رنگ کے ٹین کے ٹکڑے پر لکھا ہوا تھا، Bus stop by request۔ ہاں، اگر آپ بس اسٹاپ پر سر چھپانے کی جگہ بھی چاہیں، تو وہ بس اسٹاپ نہیں تھا۔ نہ تو وہاں کوئی شیڈ تھا اور نہ ہی کوئی پیڑ۔ راکھ کی رنگت کی ایک لمبی ویران سڑک تھی، بجلی کے تاروں کی پرچھائیاں تھیں، باریک اور متوازی، اور کھمبے کی پرچھائیں تھی، ٹھگنی سی، زمین میں دھنسی ہوئی کہ سورج سر کے اوپر تھا۔
میں یہ جان نہ پا رہا تھا کہ اس بس اسٹاپ پر میرے قدم کیسے آن پہنچے تھے — شہر سے دور، اجاڑ بس اسٹاپ، جون کی دوپہر، پینے کو پانی نہیں، دم لینے کو سایہ نہیں اور میری کمبختی کہ ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور بس کو ایک بجے آنا تھا۔
میں اس آگ اُگلتی اُبلتی دوپہر میں اپنے دل کی تسکین کے لیے بھٹک رہا تھا اور بھٹکتے بھٹکتے اس بس اسٹاپ پر آن پہنچا تھا مگر چند ہی لمحوں میں مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ بس کے آنے تک میرا دل ہی نہ رہے گا، وہیں بس اسٹاپ پر پگھل جائے گا۔
میں نے سوچا کہ لوٹ جاؤں، لیکن کہاں؟ اور پھر کسی اور سواری کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ اجاڑ، جلتے بھنتے بس اسٹاپوں پر رکشا، تانگہ، اسکوٹر یا ٹیکسی کہاں ملتی ہے۔
اب سوائے اس کے کہ بس کا انتظار کرتا اور کوئی چارہ نہ تھا۔
اب میں تھا، دھوپ تھی، سڑک تھی اور بجلی کا کھمبا تھا۔ اس سے بڑھ کر بھلا بس اسٹاپ اور کیا ہو سکتا ہے۔
اس انتظار کے لمحوں میں ایک راکھ کی رنگت کی سڑک ہی تھی جو مرکزِ نگاہ ہو سکتی تھی اور تھی۔
کہیں کہیں تارکول پگھل گیا تھا اور سڑک گہری کالی ہو گئی تھی اور سورج کی تیز روشنی میں چمک

رہی تھی۔

سڑک کو تاحدِ نظر ناپ تولنے کے بعد میں نے گھڑی کی جانب دیکھا۔منٹوں کی سوئی پینتیس کے نشان کے قریب تھی — میں نے صرف پانچ منٹوں میں اس جلتے بھنتے ویرانے کا بھرپور جائزہ لے لیا تھا اور ایک بس تھی کہ میری نظروں سے دور، جانے کہاں تھی اور میں دھوپ میں جلتا بھنتا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

چند لمحے میں گھڑی کی جانب دیکھتا رہا اور ان چند لمحوں میں مجھے محسوس ہوا کہ میری زندگی کا حصار، میرے گوشت پوست کا حصار، میرے ذہن کا حصار جس میں ساتوں سمندروں کی وسعتیں سمٹی ہوئی ہیں، پل بھر میں بکھرنے کو ہے۔

''ہم نچنت سے تک انتظار بھی نہیں کر سکتے... ہماری زندگی کس قدر ناپائدار ہے...!'' میں مسکرا دیا۔لیکن بس کا انتظار تو میری بے بسی تھی۔

''ہم جھنجلاہٹ میں اوٹ پٹانگ سوچنے لگتے ہیں...!'' میں پھر مسکرا دیا۔

بس کا انتظار تو میری زندگی تھی۔

میں نے پھر گھڑی کی جانب دیکھا۔منٹوں کی سوئی جوں کی توں سُست تھی۔

میری زندگی، اس سے پہلے، صرف ایک بار بس اسٹاپ پر ٹھہری تھی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب میری کنپٹیوں پر سفید بال نہیں تھے۔میری آنکھیں عینک کی محتاج نہیں تھیں اور مجھے جان لیوا انتظار کی لذت نصیب نہیں ہوئی تھی۔

اور پھر وہ بس اسٹاپ بھی کہیں مختلف تھا — وہاں سر چھپانے کو شیڈ تھا، پیاس بجھانے کو پیاؤ تھا، بھانت بھانت کے لوگ تھے، بھانت بھانت کی آوازیں تھیں۔لوگ بسوں سے اُترتے اور تانگوں پر چڑھ جاتے۔تانگوں سے اُترتے اور بسوں پر چڑھ جاتے — اور اسکوٹر تھے، رکشا اور ٹیکسیاں تھیں — اور ڈھیر سارے، لڑتے جھگڑتے، ہنستے بولتے مسافر تھے۔

میں اُس بس اسٹاپ پر بھی بس کا انتظار کر رہا تھا۔یہ مجھے یاد نہیں کہ میں کون سی بس کا انتظار کر رہا تھا اور مجھے کہاں جانا تھا۔اتنا یاد ہے، اس دن بھی جون کی دوپہر تھی۔دھوپ تیز تھی کہ نہیں، اس کا مجھے اندازہ نہیں کہ میں شیڈ تلے کھڑا تھا۔ایک دو مرتبہ میری زبان خشک ہوئی تھی اور میں نے پیاؤ سے کنوئیں کا ٹھنڈا اور شہد سے میٹھا پانی پیا تھا۔گھڑی دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ اَن گنت چہرے تھے نظروں کے سامنے۔شاید میں چہروں سے اُکتا کر گھڑی دیکھتا اور مجھے اپنی بس کے انتظار کا احساس ہوتا مگر یہ بھی نہ ہوا کہ کچھ اور ہو گیا۔اب یہ میری خوش قسمتی تھی یا اُس بس اسٹاپ کا اعجاز، کون جانے؟

میں یونہی اِدھراُدھر دیکھ رہا تھا — یونہی کہ ہنستے بولتے مسافروں کو دیکھ کر میری نظریں ایک مزدور کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ مزدور جو اُس وقت مرکز نگاہ تھا، مجھے یاد ہے، ٹھیلہ کھینچ رہا تھا۔ ٹھیلے کے دونوں بم اس کے گرے ہوئے ہاتھوں میں تھے اور دونوں بموں سے بندھی ہوئی رسی اس کے دائیں کندھے میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ چیونٹی کی چال سے ٹھیلہ کھینچ رہا تھا کہ ٹھیلے پر اس کے قد سے کہیں اوپر تک، آگے پیچھے ٹرنک لدے ہوئے تھے۔ ایک رسی تھی جو ٹرنکوں کو روکے ہوئے تھی، ایک میلا کپڑا تھا جو اس کے بائیں کندھے پر رکھا ہوا تھا — دس قدم ٹھیلہ کھینچنے پر وہ رُک جاتا۔ بائیں ہاتھ کا بم چھوڑ دیتا، بوجھ اس کے دائیں کندھے اور دائیں بازو پر آن پڑتا۔ وہ تھکا تھکا سا بایاں ہاتھ اُٹھا کر بائیں کندھے پر رکھا ہوا میلا کپڑا اٹھاتا، چہرے اور گردن پر پھیلا ہوا پسینہ پونچھتا، کپڑا پھر کندھے پر جماتا اور بایاں بم تھام کر پھر ٹھیلہ کھینچنے لگتا۔ پھر دس قدم پر رُکتا، پھر پسینہ پونچھتا اور پھر چیونٹی کی چال سے چل پڑتا۔

اتنا مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں نے یہ سوچا تھا کہ اُس کی منزل کہاں ہے؟

اس کا ہر دسواں قدم ایک پڑاؤ تھا۔ یہ میں نے جان لیا تھا اور پھر میں نے اس کی منزل بھی دیکھی۔

میری نظروں کے سامنے وہ چوتھے پڑاؤ پر رُکا ہی تھا اور اس نے ٹھیلے کا بایاں بم چھوڑا ہی تھا اور بائیں کندھے پر رکھا ہوا میلا کپڑا اٹھانے ہی کو تھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ گئیں، رسی ڈھیلی پڑ گئی اور ٹرنک اوپر تلے نیچے آن پڑے۔ ایک ٹرنک اس کے سر پر آن پڑا اور ٹرنک کی نوک اس کی دائیں کنپٹی میں اُتر گئی۔

اس کے بعد یہی ہوا کہ بسیں رُک گئیں، اسکوٹر، تانگے، رکشا، ٹیکسیاں سب رُک گئے۔ شیڈ خالی ہو گیا، لوگ بھاگ اُٹھے اور پھر چند لمحوں کے بعد بسیں پھر دوڑنے لگیں، اسکوٹر، تانگے، رکشا، ٹیکسیاں سب دوڑنے لگے، شیڈ بھر گیا، لوگ لوٹ آئے۔

اور وہ مزدور جو مرکز نگاہ تھا، اللہ جانے کہاں تھا۔ اور ان چند لمحوں میں اللہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔

کسی نے کہا تھا، چار بجے ہیں، تو میری توجہ ادھر ہوئی تھی، میری بس کو نہیں آنا تھا اور نہیں آئی تھی اور میں بنا کسی احساس اور مایوسی کے لوٹ آیا تھا۔

ابھی ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

''ایک بس اسٹاپ دوسرے بس اسٹاپ سے کس قدر مختلف ہے...!'' میں مسکرا دیا۔ میرے لب خشک ہو گئے تھے، زبان سوکھ گئی تھی، حلق کانٹا ہو گیا تھا۔

میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔دل زور سے دھڑک رہا تھا۔آنکھیں بُری طرح جل رہی تھیں۔

''ایک بس اسٹاپ دوسرے بس اسٹاپ سے کس قدر مختلف ہے...!''میں پھر مسکرادیا۔

''ہر بس اسٹاپ کی، ہر نقطے کی اپنی دُنیا ہوتی ہے...!''

مسکراہٹ بدستور میرے لبوں پر تھی۔

میں نے پلکیں گرا کر چکاچوند آنکھوں میں اندھیرا لانا چاہا مگر میری آنکھوں میں سورج اُتر گئے تھے۔میں نے پھر پلکیں اُٹھالیں۔

سڑک جوں کی توں دراز تھی۔دُور دُور تک کوئی مزدور نہ تھا،کوئی ٹھیلہ نہ تھا۔

میں اس بس اسٹاپ کا مقدر تھا یا پھر وہ بس اسٹاپ میرا مقدر تھا۔

میں نے کھمبے کی جانب بنا کسی احساس کے دیکھا۔تین ہاتھ اوپر،سبز رنگ کے ٹین کے اس ٹکڑے کی جانب دیکھا جس پر لکھا تھا Bus stop by request اور پھر مسکرادیا۔

اور پھر میں نے بجلی کی متوازی تاریں دیکھیں اور پھر اوپر آکاش دیکھا— پھر وہی راکھ کی رنگت کی سڑک تھی جو کہیں کہیں تارکول کے پگھلنے سے گہری کالی ہوگئی تھی اور چمک رہی تھی۔

ایک بجنے میں دس منٹ تھے۔

مجھے تھکن کا شدید احساس ہو رہا تھا— میں نے کھمبے کا سہارا لے لیا۔

''میں تنہا ہوں...نہیں، میں تنہا نہیں ہوں کہ منتظر ہوں...!''میرے سوکھے لب مسکرانے لگے۔

''میں تنہا نہیں ہوں کہ منتظر ہوں...دس منٹ ہی تو رہ گئے ہیں بس کے آنے میں،بس کے مجھ تک پہنچنے میں...دس منٹ کیا ہوتے ہیں...!''میرے لب جوں کے توں مسکراہٹیں اپنائے ہوئے تھے۔

میں نے دائیں ٹانگ پر جسم کا پورا بوجھ ڈالتے ہوئے بائیں ٹانگ کو تھکن سے نجات دلائی، رومال سے آنکھیں مسلیں— پھر مسلیں— عینک کے شیشے رگڑے اور عینک آنکھوں پر چڑھالی۔

مجھے تعجب ہوا۔آخری منٹ درمیان میں کھڑا تھا۔

اور پھر میں نے دیکھا۔میری تپتی ہوئی گھڑی میں ایک بج رہا تھا۔

بس کا دُور دُور تک کوئی نشان نہ تھا۔

میں تھا، دھوپ تھی، سڑک تھی اور بجلی کا کھمبا تھا اور زندگی کے اُس موڑ پر اُس لمحے، مجھے انتظار کرنا تھا۔بس انتظار کرنا تھا۔

OO

('ادبِ لطیف' (جوبلی نمبر)،لاہور:۱۹۶۳ء)

واردات

اس کی آنکھوں میں نیند تھی اور اس کا چہرہ کھنچا ہوا تھا اور سرخ تھا۔

اس کا سر اچانک ہی میرے دائیں کندھے پر آن پڑا تھا اور اس کا بایاں ہاتھ میری چھاتیوں کو چھوتا ہوا میری گود میں گر پڑا تھا اور میں چونک گئی تھی — میں چونکی اور میری پیشانی پر بل پڑ گئے اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں نیند تھی اور اس کا چہرہ کھنچا ہوا تھا اور سرخ تھا — اس کی آنکھوں میں پشیمانی، شرم یا شرارت کی کوئی جھلک نہیں تھی۔

وہ سنبھل گیا مگر ابھی نیند کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔

میری پیشانی کے بل مٹ گئے — نیند میں جسم کی باگ ڈور ہاتھ سے چھوٹ ہی جاتی ہے۔

میں نے آخر دسمبر کی اس خنک رات کو ریگل سے معمول کے مطابق بس پکڑی تھی، اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ اُس نے بھی ریگل ہی سے بس پکڑی تھی کہ میں نے اسے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا اور جب میں اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی، وہ اپنی طرف کو سکڑا بھی تھا۔ پھر میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔

بس قریب قریب خالی تھی — بس خالی تو نہیں تھی لیکن بھری ہوئی بھی نہیں تھی اور تیز رفتار سے سنسان سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔

یکایک مجھے محسوس ہوا کہ اس کا گھٹنا میری ران سے چھو رہا ہے — میں نے اس کی طرف دیکھا۔

اس کی پلکیں گری ہوئی تھیں، اور اس کا چہرہ کھنچا ہوا تھا اور سرخ تھا۔ اس کا سر کھڑکی کے گرے ہوئے شیشے کے سہارے ٹکا ہوا تھا۔ اس کی نشست کا زاویہ بدل گیا تھا۔ اس کا سر تو اب میرے کندھے پر نہیں آسکتا تھا لیکن اس کا گھٹنا میری ران سے چھو رہا تھا۔

پیشتر اس کے کہ میں اپنی طرف کو سکڑتی، اپنی ران کو اس کے گھٹنے کی حد سے پرے کرتی، کنڈکٹر نے ٹکٹ کے لیے پوچھا۔

میں نے اپنا پرس کھولا، تمیں پیسوں کے سکّے اکٹھا کیے اور کنڈکٹر کی طرف بڑھا دیے۔
''ایک ٹکٹ کنگز وے!'' اس کا گھٹنا میری ران سے چھو رہا تھا۔
کنڈکٹر نے ٹکٹ پنچ کیا اور میری طرف بڑھا دیا۔
پھر کنڈکٹر نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔
اس نے کندھے جھٹکے، کانپا اور پلکیں اٹھائیں۔
کنڈکٹر نے کہا:
''ٹکٹ؟''
اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چند سکّے کنڈکٹر کی طرف بڑھا دیے۔
''ایک ٹکٹ کنگز وے!'' اس کا گھٹنا میری ران سے چھو رہا تھا۔
کنڈکٹر نے ٹکٹ پنچ کیا اور اس کی طرف بڑھا دیا اور آگے بڑھ گیا۔
میں اپنی طرف کو سکڑی اور اپنی ران اس کے گھٹنے کی حد سے پرے کی اور ایک نظر اسے دیکھا۔
اس کی آنکھوں میں نیند تھی اور اس کا چہرہ کھنچا ہوا تھا اور سرخ تھا۔
اس نے ریگل سے بس پکڑی تھی اور اسے کنگز وے جانا تھا۔
میں نے ریگل سے بس پکڑی تھی اور مجھے کنگز وے جانا تھا۔
اس کا سر میرے دائیں کندھے پر آن پڑا تھا اور اس کا بایاں ہاتھ میری چھاتیوں کو چھوتا ہوا میری گود میں گر پڑا تھا۔
اس کا گھٹنا میری ران کو چھو رہا تھا۔
اس کی آنکھوں میں نیند تھی اور اس کا چہرہ کھنچا ہوا تھا اور سُرخ تھا۔
اس کی آنکھوں میں پشیمانی، شرم یا شرارت کی کوئی جھلک نہیں تھی۔
وہ لاعلم تھا اور میں؟
اور میں؟
میں سیٹ کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی۔
اس نے پھر نشست کا زاویہ بدل لیا تھا۔ وہ سیٹ کی پشت پر سر ٹیکے ہوا تھا، اس کا بایاں بازو سیٹ کی پشت پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ جھکا ہوا تھا اور اس کی انگلیاں میرے دائیں کندھے کو چھو رہی تھیں۔
''بس قریب قریب خالی تھی ــــ بس خالی تو نہیں تھی لیکن بھری ہوئی بھی نہیں تھی اور تیز رفتار

سے سنسان سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔

اور میں کچھ سوچ نہ پا رہی تھی۔

یا پھر بس کی سی رفتار سے سوچ رہی تھی۔

کیا سوچ رہی تھی؟

میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی یا میرا ذہن خالی تھا۔ بس تیز رفتار سے سنسان سڑکوں پر دوڑ رہی تھی یا میں تیز رفتار سے زندگی کی سنسان سڑکوں پر دوڑ رہی تھی، مجھے کچھ علم نہ تھا — میں غرق تھی۔

اور جب میں اپنے آپ میں آئی، چیکر ٹکٹ کے بارے میں پوچھ رہا تھا اور اس کی انگلیاں میرے دائیں کندھے کو چھو رہی تھیں۔

میں نے ٹکٹ چیکر کی طرف بڑھایا۔

چیکر نے ٹکٹ کا نمبر چیک کیا، ٹکٹ پنچ کیا اور میری طرف بڑھا دیا۔

پھر چیکر نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔

اس نے کندھے جھٹکے، کانپا اور پلکیں اٹھائیں۔

چیکر نے کہا۔

''آپ کا ٹکٹ؟''

اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنی آنکھوں کے سامنے گھمایا، انگلیاں پھیلائیں — ٹکٹ انگلیوں کی گرفت میں نہیں تھا — میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ کھڑا ہو گیا، اس نے پتلون کی جیبیں دیکھیں — ٹکٹ نہ ملا — میری نظروں کا مرکز وہی تھا۔

اس نے جھک کر سیٹ کے نیچے دیکھا۔

اَن گنت مڑے تڑے ٹکٹ اور ٹکٹوں کے پرزے بکھرے پڑے تھے اور یہاں، وہاں بس کی رفتار کے ساتھ اُڑ رہے تھے۔

اس نے ایک مڑا تڑا ٹکٹ اٹھایا اور دیکھا اور پھینک دیا — میری نظروں کے احاطے میں وہی تھا۔

''آپ کا ٹکٹ مسٹر؟'' چیکر کی آواز قدرے تیکھی تھی۔

وہ ٹکٹ کی ناکام تلاش کے بعد آرام سے سیٹ کے کونے میں سکڑ گیا اور اس نے کہا: ''میں نے ابھی ٹکٹ لیا تھا!''

''کیا ہوگا؟ دکھایئے؟'' چیکر کی آواز تیکھی تھی۔

''میں نے ابھی ٹکٹ لیا تھا!''

''مسٹر! اگر آپ نے ٹکٹ لیا ہے تو دکھایئے اور اگر نہیں لیا تو لیجیے!'' چیکر کی آواز میں قدرے نرمی تھی یا — یا بیزاری تھی۔

''میں نے ٹکٹ لیا تھا!'' اس نے چیکر کی طرف دیکھا — میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''مسٹر، آپ ٹکٹ لیجیے!''

''ٹکٹ؟ لیکن میرے پاس — میں نے ٹکٹ — اب میرے پاس پیسے نہیں ہیں — میں نے ٹکٹ لیا تھا!''

''تم جھوٹ بولتے ہو، تم نے ٹکٹ نہیں لیا!'' چیکر 'مسٹر' اور 'آپ' سے 'تم' پر آ گیا اور اس کی آواز بھی تیکھی ہوگئی۔

وہ خاموش رہا۔

چیکر نے کنڈکٹر سے پوچھا:

''اس نے ٹکٹ لیا تھا؟''

کنڈکٹر نے کہا:

''مجھے علم نہیں، میں نے گاڑی کمپلیٹ کرنے کے بعد پوچھا تھا، کوئی بِنا ٹکٹ تو نہیں ہے۔ سب خاموش رہے تھے۔''

''تم نے ٹکٹ نہیں لیا، تم جھوٹ بولتے ہو — میں پندرہ سال سے چیکنگ کر رہا ہوں اور شکل سے پہچان لیتا ہوں کہ...''

اُس نے کہا: ''میں نے ٹکٹ لیا تھا جو کھو گیا ہے اور اب میرے پاس پیسے نہیں ہیں!'' اس کی آواز میں سکون تھا اور اس کی آنکھوں میں پشیمانی، شرم یا شرارت کی کوئی جھلک نہیں تھی — میری آنکھیں محو حیرت تھیں۔

''تم جھوٹ بولتے ہو، میں شکل سے...'' اس نے چیکر کی تیز، غصیلی آواز کاٹ دی۔

''آپ پندرہ سال سے چیکنگ کر رہے ہیں لیکن آپ چیکنگ کے آداب سے بے خبر ہیں، آپ شکل سے کیا پہچان لیتے ہیں، اس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ کا کام اب صرف اتنا ہے، یا تو مجھے بس سے اُتار دیجیے یا بس تھانے لے جایئے، زیادہ باتیں بنا کر میرا اور اپنا وقت ضائع مت کیجیے!''

چیکر کا چہرہ سرخ ہوگیا، اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گھنٹی کی رسّی کھینچ دی۔

گھنٹی زن سے بجی اور بس بے ہنگم شور کے ساتھ رُک گئی۔

وہ کھڑا ہو گیا — اس کی آنکھوں میں پشیمانی، شرم یا شرارت کی کوئی جھلک نہیں تھی — میں پلکیں جھپکائے بنا اسے تک رہی تھی۔

''تم نے ٹکٹ نہیں لیا تھا!'' چیکر کی آواز میں نرمی تھی۔

اس نے پہلی بار میری طرف دیکھا۔ ''میں نے ٹکٹ لیا تھا نا!''

میں کانپ گئی۔

اس کی آنکھوں میں التجا نہیں تھی، پشیمانی، شرم یا شرارت کی کوئی جھلک نہیں تھی — اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں صرف اتنا پوچھ رہی تھیں، ''میں نے ٹکٹ لیا تھا نا!''

میں کانپ گئی۔

بس کھڑی تھی۔

میں کانپ رہی تھی اور اس کی جانب دیکھ رہی تھی اور میں نے گھبراہٹ میں اپنے گھٹنے بھی نہیں ہٹائے تھے کہ اسے جانے کے لیے راستہ ملتا۔

کنڈکٹر اور چیکر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

یکا یک چیکر نے مجھ سے پوچھا: ''آپ اس کے ساتھ بیٹھی ہیں، کیا اس نے ٹکٹ لیا تھا؟''

میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، میرے بدن کی لرزش بڑھ گئی۔

وہ پھر بیٹھ گیا — اسے اپنے پر کتنا بھروسہ تھا یا — یا اسے مجھ پر کتنا بھروسہ تھا۔

میں نے چیکر کی طرف دیکھا۔ ''جی انھوں نے ٹکٹ... ٹکٹ...''

میں نے تیزی سے پرس کھولا اور ایک روپے کا نوٹ کنڈکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے تیزی سے کہا: ''ایک ٹکٹ ریگل سے کنگز وے۔''

بس تیز رفتار سے سنسان سڑکوں پر دوڑ رہی تھی اور اس کا سر میرے دائیں کندھے پر آن پڑا تھا — میرے کندھے پر اس کی نیند کا بوجھ میرا پہلا سکھ تھا۔

OO

('فنون'، لاہور: ۱۹۶۵ء)

An Erotica

جسم کے جنگل میں ہر لمحہ قیامت ہے مجھے

You have known for a long time what it is I wish to establish :

THE RIGHT TO DARE EVERYTHING.

—— Paul Gauguin

Why can't a novel just once be defended as eroti. and valuable as well.

—— Norman Mailer

حضور!

مجھے اس فضول و بے معنی سلسلے میں واقعی کچھ کہنا ہے۔

میں نے سوچا تھا کہ مر جاؤں گا اور یوں دنیا سے رشتہ ٹوٹ جائے گا — مگر ایسا نہ ہوا اور اتفاقاً مجھے اپنی بات کہنے کا موقع مل گیا۔

جی ہاں، میں نے خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اس الزام کو بخوشی قبول کرتا ہوں — میں سمجھتا ہوں، میری 'ہاں' الزام کو ہر لحاظ سے جرم ثابت کرتی ہے اور اب مجھے کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔

آپ میری صورت پر نہ جائیں — میں ستم زدہ نہیں ہوں۔ میں نے تو ستم ڈھائے ہیں۔ اَن گنت ستم جو بھیانک ہیں۔ اور یہ آخری ستم، یہ خودکشی کی کوشش تو ایسا ستم ہے جو سماج کی اُجلی نظروں میں مکروہ ہے۔

میں ایک سانس میں بہت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس لیے اپنی سُست رفتاری پر معافی چاہوں گا — ہوسکتا ہے، آپ آج میرا بیان ہی سن سکیں، اور چالیس پچاس مقدمے نہ بھگتا سکیں۔

مجھے اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ خودکشی بزدلوں کا کام ہے — میں بھی کتنا بڑا بزدل ہوں کہ خودکشی کا ایسا ڈھنگ اپنایا جو ناپختہ تھا اور پکڑا گیا۔ اگر کسی اُدیوگ پتی یا سیاست داں کی طرح منصوبہ بندی کرتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا — ہاں میں بزدل ہوں، اور مجھے اپنی بزدلی کا احساس پہلی بار ہوا ہے۔

اگر کسی نے کافی ہاؤس میں مجھے بزدل کہا ہوتا تو کافی کی پیالی اس کے سر پر ہوتی — مگر اس عدالت میں میں خاموش رہا۔ یہاں میرے ہاتھ میں کافی کی پیالی تو نہیں تھی، مگر میرے منہ میں زبان تو تھی، اور ہے۔ میں کم از کم چلّا ضرور سکتا تھا — اب بھی چلّا سکتا ہوں — جیسا کہ آپ جانتے ہیں، میں بالکل خاموش رہا۔ خاموش رہا، چلّایا نہیں — چلّاتا تو توہین عدالت کا مقدمہ بھی بن جاتا اور مجھ پر بزدلی کے الزام کے ساتھ ساتھ بدتمیزی کا الزام بھی عاید ہو جاتا — ویسے آپ چاہیں تو مجھے آپ بیک وقت بزدلی اور بدتمیزی، دونوں جرموں کی سزا دے سکتے ہیں۔

اس وقت مجھے صرف ایک بات کا احساس ہے — کہیں میرا بیان آپ حضرات کو بور نہ کر دے!

بوریت کا احساس، نامردی کے احساس سے بھی زیادہ ہولناک ہے — کوئی بھی ماہر نفسیات میری بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔

جی ہاں، میری یہی کوشش ہوگی کہ میرا بیان آپ حضرات کو بور نہ کرے — میرے دوست، وہ جو کونے کے بینچ پر اُداس بیٹھے ہوئے ہیں، میری بات سے متفق نہیں ہوں گے۔ ان سب نے اپنی زندگی کی اَن گنت شامیں میرے ساتھ گزاری ہیں۔ زندگی کے اُداس ترین لمحات میں انھیں میرے قرب اور میری باتوں سے راحت ملی ہے۔ یہ سب غمگین چہرے لیے میرے پاس آئے ہیں اور بشاش چہرے لیے واپس گئے ہیں — لیکن اب مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہے۔ خودکشی کی ناکام کوشش نے مجھے متزلزل کر دیا ہے — پھر بھی میری یہی کوشش ہوگی کہ میری زندگی کی داستان، جس کا نقطۂ عروج خودکشی کی ناکام کوشش ہے، پوری افسانوی تفصیل کے ساتھ آپ تک پہنچے اور آپ پل بھر کے لیے بھی بور نہ ہوں۔

جب میں نے ہوش سنبھالا، میں نے دیکھا کہ میری مختصری دنیا میری اور میرے والد کی ذات پر مشتمل ہے — میں ابھی اپنی دنیا کو اچھی طرح پہچان بھی نہ پایا تھا کہ میرے والد دوسری بڑی جنگ کی بھٹی میں جھونک دیے گئے اور میرے ذہن میں ان کی فوجی شخصیت کے دھندلے سے نقوش ہی باقی رہ گئے۔

جنگ کی بھٹی میں جھلس مرنے سے پہلے وہ مجھے اپنے دوست ڈاکٹر کھرے کے پاس چھوڑ گئے — میری عمر دس کے لگ بھگ تھی۔ میں اپنی کچی سمجھ کے ساتھ، ڈاکٹر کھرے کے سائیں سائیں کرتے بنگلے میں، اپنے والد کی غیر موجودگی شدت سے محسوس کرتا۔

ایک کمی، ایک اکیلا پن، ایک شدید احساس — میں اپنے ہم عمر ہم جماعتوں میں گھل مل نہ سکا۔

میری ذہنی تشکیل میں میری تنہائی کا بڑا ہاتھ ہے۔

اونچے درختوں اور گھنی باڑ سے گھرے ڈاکٹر کھرے کے وسیع و عریض اور تقریباً ویران بنگلے میں ایک تو وہ خود رہتے تھے، ہر دم سٹیتھوسکوپ گلے میں لٹکائے جو سوتے وقت بھی ان کے گلے میں پھنسا رہتا — اور ایک ان کی بیٹی مایا رہتی تھی، انھی کی طرح خاموش اور اکیلی۔

وہ جب بھی، ناشتے کے وقت یا کھانے کے وقت، اکٹھے ہوتے، اکیلے نظر آتے — ایک

دوسرے سے الگ، ایک دوسرے سے کوسوں دُور۔

اس اُداس بنگلے میں تیسرا جیو تھا ایک بچہ — میں، ان دنوں کا راجو، ایک اکیلا۔

ہاں، دو ایک سہمے ہوئے نوکر بھی تھے جو بنگلے کے پچھواڑے گیراج نما کوارٹروں میں اپنے دن رات گزارتے — کام کاج کے سلسلے میں وہ بنگلے میں موجود ہوتے تو بچتے اور کتراتے ہوئے نظر آتے۔

آپ خود شناخت کر سکتے ہیں کہ اس رنگ کے پس منظر میں کون سی شے دس برس کے ایک اکیلے بچے کی نگاہ کا مرکز بن سکتی ہے — مایا۔ ہاں مایا، ڈاکٹر کھرے کی بیٹی۔ میں آج بھی مایا کو دیکھ سکتا ہوں، محسوس کر سکتا ہوں۔

میانے قد کی گوری چٹی جوانی جس کے بدن میں زردیاں گھلی ہوئی تھیں — اس کی پیلی پیلی سی رنگت بڑی بھلی لگتی۔ باریک بھوؤں کے تلے اس کی بڑی بڑی بے چین آنکھیں ہر وقت کسی انجان دھیان میں کھوئی رہتیں۔ اس کے گہرے گلابی ہونٹ مجھے ایک کھلے گھاؤ کا احساس دلاتے۔ اس کے چہرے، بازوؤں اور پنڈلیوں کے دھڑکتے ماس میں نیلی رگیں صاف نظر آتیں۔ جب کبھی اس کا آنچل ڈھلک جاتا تو اس کے کھلے گلے کے چست اور تنگ بلاؤز میں اس کی تندرست اور جوان چھاتیاں ایک بیقرار معجزہ لگتیں۔

جب کبھی بن پڑتا، میں مایا کو بس دیکھتا رہتا — اس کے پاس جانا چاہتا، اس سے باتیں کرنا چاہتا، اسے چھونا چاہتا۔

سچ کہتا ہوں، میں نہیں جانتا کہ لڑکپن کا موہ اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ مایا کے بدن کو لفظوں میں تو میں نے آج باندھا ہے، پر کل کا سچ بھی یہی کچھ ہے — ممکن ہے، تب میرے الفاظ کچھ اور ہوتے، پر جذبے کی صداقت یہی ہوتی۔

میں نے اسے چھونا چاہا، لیکن وہ مجھ سے دوُر دوُر ہی رہی۔

آج وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ دوُریوں کی زنجیر توڑ ڈالنے میں اس کی دردمندی نے خوبصورت بھومیکا نبھائی۔

وہ زمانہ، جو اس بنگلے میں میری تنہائی کا زمانہ تھا، اسی زمانے میں میرے مستقبل میں نئی تنہائیوں کے امکان پیدا ہو گئے — میرے والد جنگ میں ہلاک ہو گئے۔

دس برس کے بچے کا باپ زندہ تھا اور بچہ اکیلا تھا۔ اب دس برس کے بچے کا باپ مر چکا تھا اور بچہ اکیلا تھا — اپنے آپ میں سمٹی، اپنے آپ میں گم مایا جیسے یکایک چونک اُٹھی، جاگ پڑی،

چھلک گئی۔ اس دکھ بھری گھڑی میں، دردمندی کے ناطے، وہ میرے قریب آ گئی، بہت قریب۔ قریب آتی چلی گئی، مجھے پرچانے، سنبھالنے، بچانے، جانے کس کس خیال کے تحت۔

ظاہر ہے، مایا مجھ سے عمر میں بڑی تھی، بہت بڑی۔ ان معنوں میں کہ میں ابھی ایک بچّہ تھا اور وہ تھی ایک مکمل جوان عورت۔ میں نے اسے کبھی ہنستے کھیلتے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی مجھے اس کے ساتھ کبھی کوئی مرد نظر آیا تھا— بہت بعد کی بات ہے، جب میں نے ایف۔ اے۔ کا امتحان پاس کیا تھا اور وہ بی۔ ایس۔ سی۔ کے بعد ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ کے جھمیلے سے فارغ ہو چکی تھی، تب بھی وہ مجھے الگ اور اکیلی نظر آئی۔ میری موجودگی اور میرا ساتھ دوسری بات ہے— لیکن بات ان دنوں کی ہے جب وہ میڈیکل کالج میں تھی اور میں کین ٹونمنٹ (Cantonment) کے ایک اسکول میں۔

میں نے مایا کو ہمیشہ کتابوں میں گم دیکھا تھا— میں خود بھی کتابوں کا مارا ہوا تھا۔ تنہائی اور خاموشی کے ان دنوں میں آپ سے آپ کتابیں میری دوست بن گئی تھیں۔ جہاں تہاں، جیسے تیسے جو کتاب بھی ہاتھ لگتی، چاٹ جاتا۔ کچھ پلّے پڑتا، کچھ سر پر سے گزر جاتا۔ کچھ کتابیں بدن میں سرسراہٹ بن کر رینگنے لگتیں اور میں مایا کے وجود میں نہ جانے کیا کھوج پانے کا جتن کرتا۔

آج اس مفلس بیان میں کیے بنا رہا نہیں جاتا کہ ہائے، کتابوں کو دوست بنانے والوں کی زندگی فقط ایک خرابی کے سوا کچھ بھی نہیں— اچھے ہیں وہ لوگ جنھیں کتابوں سے خدا واسطے کا بیر ہے۔

میں اسکول سے کوئی دو بجے لوٹتا اور مایا شام پانچ کے قریب۔ ڈاکٹر کھرے کا پتہ ٹھکانا نہ مجھے معلوم ہوتا، نہ اسے— دھواں دھواں شام، سائیں سائیں کرتا بنگلہ، کوئی ویرانی سی ویرانی اور ہم دونوں۔

ہم چائے پینے لگتے تو نوکر دبے پاؤں کھسک جاتے۔ رات کا کھانا کھانے بیٹھتے تو نوکر اندھیرے میں غائب ہو جاتے— ڈاکٹر کھرے کا ساتھ، ہونے نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ تھے اور ان کے غیر موجود مریض۔

ڈاکٹر کھرے کی دنیا میں، ان کے اندر باہر کی دُنیا میں ہر شے یا تو کوئی مرض تھی یا پھر کوئی مریض— ان کی نظروں میں ہم دونوں، میں اور مایا، ایک بچّہ اور ایک جوان عورت، کوئی مرض تھے یا مریض، کون جانے۔

میں جانتا تھا کہ مایا کو آگے چل کر ڈاکٹر بننا ہے— وہ ڈاکٹر تو بنتی ہی مگر اس کا تشخص ڈاکٹر کھرے جیسا ہرگز نہ ہوتا۔

ایک شام، میرے والد کے ہلاک ہونے کے کچھ دن بعد، میرے قریب آ جانے کے کچھ

دن بعد، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے کمرے میں لے گئی — ایسا پہلی بار ہوا تھا۔

میں اس کے کمرے کو آنکھوں میں بھر رہا تھا کہ اس کی آواز مجھے اس کے قریب لے آئی:

''میں یہاں پلنگ پر ذرا پاؤں پسار کر بیٹھوں گی، تم کرسی کھینچ کر پاس آ جاؤ — آج ہم چائے یہیں پئیں گے۔''

وہ پلنگ کی پشت کا سہارا لے کر اور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئی۔

میں چپ چاپ کرسی پر بیٹھا رہا۔

نوکر چائے رکھ کر دبے پاؤں کھسک گیا۔

اس نے چائے بنائی اور ایک پیالی میری طرف بڑھا دی — ہم چائے پینے لگے۔

ان دنوں میں نے کہیں کچھ پڑھا تھا اور سمجھ نہ پایا تھا۔ وہ بات کچھ اوٹ پٹانگ طور سے میرے ذہن میں تھی — نہ جانے کیا ہوا، میں کہہ بیٹھا: ''مایا دیدی، آپ بہت زرد دکھائی دیتی ہیں۔''

اس نے میری طرف بڑے دھیان سے دیکھا، جیسے اس نے میری بات بڑے دھیان سے سنی ہو: ''کیا مطلب؟'' پھر کچھ رُک کر اس نے کہا: ''ذرا پھر کہو اپنی بات۔''

میں نے دھیمی آواز میں کہا: ''آپ کچھ پیلی پیلی سی ہیں۔''

اس نے پھر مجھے غور سے دیکھا: ''اچھا — مگر تمھاری دیدی تمھیں لگتی کیسی ہے؟'' اس نے خود کو اپنے روپ سے الگ کر لیا۔

میں چپ رہا۔

اس نے کہا: ''بولو نا!''

میں بول اٹھا: ''بہت اچھی — بڑی پیاری۔''

اس نے چائے کی ٹرے تپائی پر رکھتے ہوئے کہا: ''تمھاری بات تمھاری عمر سے بڑی ہے — مجھے ڈر لگتا ہے، کہیں تم وقت سے پہلے جوان نہ ہو جاؤ!''

میں کچھ سمجھ نہ پایا — کبھی کبھی کتابوں میں لکھی ہوئی کچھ باتیں بھی میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔

مجھے چپ دیکھ کر اس نے کہا: ''ابھی ابھی تم نے یہی کہا تھا نا کہ میں کچھ پیلی پیلی سی ہوں، پر تمھیں اچھی لگتی ہوں — میرے چھوٹے سے بڑے بچے، لڑکیوں کو ہمیشہ تھوڑا سا anaemic رہنا چاہیے۔'' اس کی آواز میں مجھے ایک حدت سی محسوس ہوئی۔

میں پھر خاموش رہا — میں کچھ سمجھ ہی نہ سکا تھا، بس میں نے سوچ لیا کہ اپنے کمرے میں

جاتے ہی ڈکشنری میں anaemic کے معنی ضرور تلاش کروں گا۔

وہ جو کہتے ہیں نا "یہ شام بھی کہاں ہوئی" — ہائے وہ شام۔ چھوٹی عمر میں پہلی قید۔

چھوٹی عمر میں احساس کی یہ نوعیت — جانے دنیا والے کیا کہیں گے۔

وہ شام اسیری تھی یا رہائی، بس یوں جانیے، اس شام کے ساتھ شاموں کے ایک حسین سلسلے کا آغاز ہوا۔

انتظار کی کربناک لذت اور ملن کی اطمینان بخش آسودگی —

تنہائی کے لمحے، جدائی کے لمحے۔ ہر شے سرد اور پرائی —

ملن کی گھڑیاں، زندگی کا مقصد۔ ہر شے زندہ اور اپنی —

ایک ویران بنگلے میں، ایک چھت کے نیچے بھیدوں بھرے ماحول کی پکڑ اتنی مضبوط تھی کہ نہ میرا دم نکلتا تھا، نہ مجھے چین ملتا تھا۔

آج سوچتا ہوں تو حیران ہو جاتا ہوں — کیسا شدید تھا میرا لڑکپن۔

اُن دنوں جی چاہتا تھا کہ کمروں کی دیواریں ڈھا دوں — بس ایک بڑی سی چھت کے نیچے ایک بڑا سا کمرہ ہو — دیواریں بھی تو جدائی اور فاصلے ہوتی ہیں!

ہر شام، رات کا گہرا رنگ پکڑتے ہی تمام ہو جاتی — میں بوجھل قدم اٹھاتا ماما کے کمرے سے لوٹ آتا، یا وہ پُرسکون انداز میں میرے کمرے سے لوٹ جاتی۔

کبھی کبھی ہم ایک ساتھ اُٹھتے، ڈرائنگ روم میں ایک ساتھ کھانا کھاتے اور پھر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔

کئی برس بیت گئے — اب بہت کچھ میں سمجھنے لگا تھا اور اب بہت کچھ میری سمجھ میں آ جاتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے۔

میری طبیعت قدرے ناساز تھی اور خدا جانے کس نوکر نے کب ڈاکٹر کھرے کو خبر دی تھی۔

ڈاکٹر کھرے گاؤن پہنے، گلے میں سٹیتھوسکوپ لٹکائے اور ہاتھوں میں چرمی تھیلا پکڑے ہوئے آئے — انھوں نے مجھے دیکھا، میرا ماتھا چوما اور بولے: "بس اتنی سی بات — کچھ نہیں ہے۔ آج آرام کرو۔ اسکول مت جانا — یہ تین گولیاں چار چار گھنٹوں کے وقفے سے کھا لینا اور چھٹی — ماما تو اس وقت کالج میں ہوگی۔ مائی پوئر بے بی!"

میں نے ڈاکٹر کھرے کو بہت دنوں کے بعد دیکھا تھا — وہ مجھے حیرانی میں چھوڑ کر چلے گئے۔

میں تمام دن بستر میں دبکا پڑا رہا۔ جی چاہتا تھا کہ روؤں اور جی بھر کے روؤں لیکن نہ رو سکا، نہ پڑھ سکا، نہ سو سکا۔

نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ اور جب کھلی تو شام ڈھل چکی تھی۔

شب خوابی کے اسی لباس میں، جو میں نے پچھلی رات ہی سے پہنا ہوا تھا، میں بستر سے اُٹھا اور کمرے سے باہر نکلا۔

مایا کے کمرے کی بتی جل رہی تھی۔

میں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، ذرا سنبھلا اور بنا آواز کیے، ہولے سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو گیا۔

اب تک کا معمول یہ تھا کہ مایا پانچ بجے کے قریب کالج سے واپس گھر آتی تھی۔ تب تک میں بن سنور کر تیار ہو چکا ہوتا، جیسے ہمیں کہیں باہر جانا ہو۔

کبھی وہ میرا ماتھا چوم کر، کبھی میرے گال پر ہلکا سا چانٹا مار کر، اور کبھی مجھے بازوؤں میں سمیٹ کر کہتی: ''کیا ہمیں کہیں جانا ہے — اورز لین میں یا سکینڈل پوائنٹ پر!''

میں تیز آواز میں صرف اتنا کہہ پاتا: ''دیدی، یہ بھی کوئی بات ہے بھلا۔''

جب میں مایا کے کمرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا، وہ دیوار کی جانب رُخ کیے پلنگ پر دراز ہے — اس نے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔

میں کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا اور اسے اسی حالت میں دیکھتا رہا — اس کی وہ حالت، اس کی بے خبری کا وہ عالم۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے دھیرے سے کرسی کھسکاتے ہوئے ہلکی سی آواز پیدا کی۔

اس نے کروٹ بدلی اور مجھے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی کمزوری مسکان تھی — اپنا نیچے اوپر کھسکا سرکا لباس درست کرتے ہوئے اس نے کہا: ''کب سے بیٹھے ہو؟''

کچھ سوچ کر میں نے جواب دیا: ''دیدی، آپ نے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ کیوں بیٹھے ہو۔''

اس نے میرے چہرے پر نگاہیں جما کر کہا: ''ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔''

میں اُٹھا اور اس کے پاس جا بیٹھا۔

میرا ہاتھ تھام کر وہ بولی: ''تم تو بالکل پاگل ہو۔''

میں نے کہا: ''اور وہ جو کلاس میں ہمیشہ فرسٹ آتا ہے، وہ کیا ہے؟''

اس نے میرا گال تھپتھپایا: ''اسے پاگل کون کہتا ہے...'' پھر میرے نائٹ سوٹ کا کالر کھینچتے

ہوئے، میرا چہرہ اپنے چہرے کے قریب لاتے ہوئے اس نے کہا: ''بتاؤ تو بھلا آج ہمیں کہاں جانا ہے!''

میں بے اختیار اس سے لپٹ گیا: ''دیدی... ''میرے ہونٹ اس کا کندھا چھو رہے تھے۔

اس کے بازوؤں کا حلقہ تنگ اور سخت ہو چلا تھا۔ میری کمزور چھاتی میں اس کے تندرست اور جوان پستان کھبنے لگے تھے۔

میں نے بمشکل تمام گردن اُٹھائی اور بھنچی بھنچی آواز میں صرف اس قدر کہہ سکا: ''دیدی... ''

مجھے خود اپنی آواز اجنبی لگی۔

اس نے گرفت ڈھیلی کی، میرے گالوں کو سہلایا اور پھر میرے ہونٹوں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا: ''میرا سمجھدار نادان بچہ۔''

مایا تب تک مجھے ''میرا چھوٹا سا بڑا بچہ'' کہتی آئی تھی، اب پہلی بار اس نے مجھے ''میرا سمجھدار نادان بچہ'' کہا تھا۔

میں نے آنکھیں پھیر کر، دیوار پر نظریں جما کر اس سے پوچھا: ''آپ میرے کمرے میں کیوں نہیں آئیں؟''

وہ میرے دائیں ہاتھ کی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولی: ''تم نے آج مجھے پیلی پیلی سی دیدی کیوں نہیں کہا؟''

میں کیا کہتا — میں نے کہا: ''دیدی، آپ سچ مچ پیلی ہیں۔''

''اور؟''

''بڑی اچھی، بڑی پیاری۔''

اس نے پچکارنے کے انداز میں کہا: ''راجو، بتاؤ تو بھلا anaemic کے معنی کیا ہیں؟''

میں نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا — اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکان تھی۔

میں نے کہا: ''آپ تو ہر بات یاد رکھتی ہیں!''

''تم کیا ہر بات بھول جاتے ہو؟'' وہ فوراً بول اُٹھی۔

''او دیدی، آپ مجھے مارتی کیوں نہیں، پیٹتی کیوں نہیں!'' میں بھرّائی ہوئی آواز میں یک لخت کراہ اُٹھا۔

اس نے میرا جھکا ہوا سر اُٹھایا اور میری آنکھوں کو پڑھتے ہوئے کہا: ''راجو، میں گئی تھی تمھارے کمرے میں — تم سو رہے تھے — آج میرا اپنا جی اچھا نہیں، اس لیے رُک نہ سکی۔''

میں تقریباً رو پڑا: ''آپ بیمار ہیں کیا؟''

اس نے میری ہتھیلی چومتے ہوئے کہا: ''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس ذرا جی اچھا نہیں۔''

اب جو میں نے اسے بہت غور سے دیکھا تو وہ مجھے بہت زرد دکھائی دی — میں نے پوچھا تو اس نے صرف اتنا کہا: ''تم نہیں سمجھو گے۔''

میں قدرے تیز آواز میں بول اُٹھا: ''پر کیوں نہیں دیدی۔''

وہ دھیمی آواز میں بولی: ''اس لیے کہ یہ تمھارے سمجھنے کی بات نہیں۔'' وہی ہلکی سی مسکان اس کے لبوں پر تھی۔

میں نے کہا: ''ہاں میں نادان بچہ ہی تو ہوں!''

اس نے میرے سر پر بڑی محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''تو تو پگلا ہے — راجو، میں پیریڈ سے ہوں۔ اس سے پہلے کبھی اتنا خون ضائع نہیں ہوا۔ اسی لیے تو جی اچھا نہیں — اگر ڈاکٹر صاحب جلدی آ گئے تو انھیں کہنا پڑے گا۔''

میں خاموش ہو گیا — اُداس ہو گیا۔ میں نے کہا: ''پر دیدی، آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔''

اس نے کہا: ''ابھی کہاں راجو، ابھی کہاں — پھر راجو، تن بدن کے بھید تو کھلتے کھلتے ہی کھلتے ہیں!''

میں کچھ نہ کہہ سکا۔ بہت دیر تک چپ رہا۔

اس نے پھر بات شروع کی: ''اب بتاؤ، میرا جی کیوں اچھا نہیں؟''

میں جھینپ سا گیا۔

اس نے میری بھوؤں کو اپنی انگلیوں سے چٹکیاں لیتے ہوئے کہا: ''کون کہتا ہے، تم نادان ہو — نادان تو میں ہوں۔'' اس نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر جھکایا اور لپٹا لیا۔ پھر بازو میرے گرد باندھ لیے۔

اس کا آنچل اس کے کولہوں کے نیچے دبا پڑا تھا۔ ننگے ملائم پیٹ اور پتلی کمر سے ذرا اوپر تنگ بلاؤز میں جکڑے پڑے اس کے گول اور سخت اُبھار مجھے پھونک رہے تھے۔ میرے مشتعل اعضا مجھ سے پوچھے بنا ایک انجانی کہانی کہہ رہے تھے اور وہ گرم گرم سانس چھوڑتی سب کچھ سن رہی تھی۔ میری آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹپکنے لگے۔ میں نے اس کی کانپتی ہوئی گرفت میں کسمساتے ہوئے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کی پھڑکتی ہوئی رگوں والی گردن پر رکھ دیے — میرے آنسوؤں اور میرے ہونٹوں سے اس کی گردن بھیگ گئی۔

میں بڑی مشکل میں تھا۔

میرے ہاتھوں نے بڑی سختی سے اس کا چہرہ تھام رکھا تھا — میرے منہ سے نکل گیا: ''میں کیا کروں، میں بڑی مشکل میں ہوں۔''

اس نے بھنچی بھنچی آواز میں بہت دھیمے سے کہا: ''میرا جوان بچہ — اچھا مجھے سانس تو لینے دو۔''

میں بمشکل اس کے تن سے الگ ہو سکا۔

اس نے پھر کہا: ''بہت مشکل میں ہونا! میں ہوں نا تمھاری مشکل!''

میں نے اس کے اُبھاروں پر سر رکھ دیا۔

اس نے میرا چہرہ ہاتھوں میں تھامتے ہوئے مجھے اٹھایا۔

وہ تکیے پر سر دھرے پلنگ پر دراز تھی — میں اس کے بالکل پاس ٹانگیں نیچے لٹکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ میری گود میں رکھا اور جیسے بڑے پیار سے، بڑی شفقت سے میری مشکل جان لی: ''میں خود مشکل میں ہوں۔ ہم آج اپنی مشکل حل نہیں کر سکتے — ہاں، میں تمھاری مشکل ضرور آسان کر سکتی ہوں — اچھا یہ بتاؤ، تم نے اب تک مجھے چوما کیوں نہیں۔ کیا تم مجھ سے پیار نہیں کرتے؟''

میں نے اسے کندھوں سے تھام کر اپنی طرف کھینچا اور اس کے کھلے ہوئے ہونٹوں کے گھاؤ پر اپنے ہونٹ رکھ دیے — میری گود میں پڑے اس کے متحرک ہاتھ میری مشکل آسان کرنے لگے۔

جانے کب، یگ بیتے یا پل، میں بڑے زور سے کانپا۔ میری فولادی مشکل جیسے اُبل پڑی، گرم چشمے کی مانند پھوٹ بہی۔ پھر میں مشکل منزل تک پہنچنے کی تھکن میں اس پیلی پیلی سی رنگت والے بدن سے لپٹ کر سو گیا۔

صبح سویرے میری آنکھ کھلی — میں نے خود کو اسی کمرے میں، اسی پلنگ پر پایا۔

اپنے کمرے میں جانے کے لیے اٹھا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا — میرا ماتھا چومتے ہوئے اس نے کہا: ''تم میرے مرد بچے ہو۔''

اس کی بڑی بڑی آنکھیں سرخ تھیں۔

میں بنا کچھ کہے چلا آیا۔

وہ دن یا اگلا دن، یا اس سے اگلا دن — کتنے زمانے، کتنے جیون —

میں اسکول سے واپس آنے کے بعد، کبھی بن سنور کر اور کبھی ٹائٹ سوٹ پہنے مایا کا انتظار

کرتا — ہفتوں،ہم نے ڈرائنگ روم میں چائے پی۔

کبھی کبھی وہ صاف لفظوں میں کہتی: ''پڑھائی میں دھیان نہ دو گے تو مجھے کھو دو گے!''

میں چپ رہتا۔ بس اسے چاہت بھری نظروں سے دیکھتا رہتا — بھلا میں اسے کیسے کھو سکتا تھا — کھو دیتا تو مر نہ جاتا۔

وہ ایم. بی. بی. ایس. کے جھمیلے سے فارغ ہو چکی تھی اور مجھے ابھی ایف. اے. کا امتحان پاس کرنا تھا — میں نے دن رات ایک کر دیے۔

نظروں کی زد میں یا نظروں سے پرے — موجود یا غائب — مضبوط دیواروں کی روک یا ہاتھ بھر کا فاصلہ — سب کچھ منظور تھا لیکن اسے کھو دینا منظور نہ تھا۔

رتجگے اور تھکن — آنکھوں کی جلن اور نیند کا نشہ۔ کتابیں، قلم، کاغذ اور پیلی پیلی دیدی کا مردبچہ۔

مہینوں بعد ایف. اے. کا نتیجہ نکلا تو مجھ سے پہلے مایا ہی کو خبر ملی اور اسی نے مجھے بتایا کہ میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہوں۔

ڈاکٹر کھرے نے بھی ایک دن کہا: ''میں جانتا تھا، یہی ہوگا!'' یہی ایک بات بیتے برسوں میں انھوں نے ہر چھوٹے بڑے امتحان کا نتیجہ نکلنے پر مجھ سے اور مایا سے کہی تھی۔

اب وقتی طور پر میں فارغ تھا — مایا اسپتال چلی جاتی اور میں بنگلے کی دیواروں سے سر پھوڑتا، بنا سر ٹکرائے۔

ایک دن کھانا کھاتے وقت مایا نے پوچھا: ''تمھارے کالج میں لڑکیاں بھی تو ہیں نا؟''

میں چونکا — لیکن چپ رہا۔

''بولو نا — کچھ تو بولو'' اس نے پھر کہا۔

میں نے بڑے ضبط کے ساتھ جواب دیا: ''آپ کے کالج میں بھی تو — آپ کے اسپتال میں بھی تو —'' میں جواب مکمل نہ کر سکا۔

''تم بڑے دکھی ہو نا — تم نے میرا دکھ کبھی جانا ہے؟'' اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔

مجھے ایسا لگا، جیسے میری دھڑکنیں رُک گئی ہیں۔

وہ مجھے ہمیشہ پڑھ لیتی تھی — اس نے مجھے فوراً پڑھ لیا۔

وہ اُٹھی، میرے پاس رُکی، پھر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ پلنگ پر — میری دھڑکنیں جو چند لمحے پہلے رُک سی گئی تھیں، بڑے زوروں سے پھڑک رہی تھیں۔

اس نے مجھے شرارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: ''کوئی مشکل تمھیں پریشان تو نہیں کرتی؟''

میری نظریں جھک گئیں: ''او دیدی — پلیز۔''

''دیدی؟''

میری نظریں جھکی رہیں: ''آپ مجھ سے بڑی بھی تو ہیں۔ میں آپ کو دیدی، مایا دیدی نہ کہوں تو کیا کہوں — اور کچھ میرے دھیان میں آیا ہی نہیں۔ پھر دیدی کہنا مجھے اچھا بھی تو لگتا ہے!''

وہ چپ رہی۔

ہم بہت دیر تک چپ رہے۔

میری نظریں جھکی رہیں — مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ رہی ہے۔

''میری طرف دیکھو۔'' اس کی آواز لپکی۔

میں نے گردن اٹھائی — اس کی طرف دیکھا۔

اس نے کہا: ''یہاں، میرے پاس آ کر بیٹھو۔''

میں بس کھنچتا چلا گیا — اس کے پاس بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی نشست کا زاویہ بدلتے ہوئے، ذرا مڑتے ہوئے میرے کندھوں پر اپنے مہربان ہاتھ رکھے اور میری پیشانی کو چومنے کے بعد کہا: ''سچ مچ تم میرے مرد بچے ہو — راجو، جب تم بڑے ہو جاؤ گے، ایک ایک بات کی باریکی سمجھنے لگو گے — جب کبھی تمھارے دھیان میں تمھاری دیدی آئے گی، جب تمھیں ان دنوں کی یاد آئے گی — مجھے بتاؤ راجو، تم اپنی دیدی کو بُری عورت تو نہ سمجھو گے!''

اس کی آواز میں اتنا درد تھا، اتنی گہرائی تھی کہ میں تو بس ڈوب گیا۔ جانے میں نے کیا کہنا چاہا اور جانے کیا کہہ بیٹھا — اب دھیان میں آتا ہے کہ آنسوؤں کی چلمن سے اسے دیکھتے ہوئے میں نے کہا تھا: ''دیدی میری اچھی دیدی، مجھے بتایئے، پیار کیا بُرے لوگ کرتے ہیں؟''

مجھے یاد ہے، میری گردن جھک گئی تھی اور میرے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں پھیل گئی تھیں — مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے پیار کا سمبندھ بُرے لوگوں کے ساتھ جوڑ کر اس سے سوال نہیں پوچھا تھا۔ عورت اور پھر بُری عورت تو دُور دُور تک میرے ذہن میں نہیں تھی۔ اور دیدی تو میری اپنی چاہت کا روپ تھی — میں نے تو دو چار لفظوں میں بس اتنا کہا تھا: دیدی، تم کتنی اچھی ہو... بُرے لوگوں سے تمھارا کیا واسطہ!

میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس نے کہا: ''آج میں ہوں اور تم مجھے پیار کرتے ہو۔ جب میں نہ رہی، تب تم کس سے پیار کرو گے؟'' اس نے ایک سرد آہ بھری اور میرے بالوں میں اپنی انگلیاں اُلجھاتے ہوئے کہا: ''جب کوئی ہوتا ہے تو ایک بات ہوتی ہے۔ جب کوئی نہیں ہوتا، تب وہ بات رہتی ہے کیا؟''

میں چپ چاپ، اُداس اور غمگین، بجھا بجھا سا بیٹھا رہا — پتا نہیں، وہ مجھ سے کیا کچھ کہہ رہی تھی یا خود اپنے آپ سے۔

''میں ایک ڈاکٹر کی بیٹی، خود ایک ڈاکٹر، اتنی پڑھی لکھی — پھر یہ سب کیا ہے، کیوں میری جان پر بنی ہے!'' اس نے کہا تو خود اپنے آپ سے، لیکن میں نے سنا، صاف طور پر سنا۔

''دیدی، آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟'' میں نے خود کو مایوس آواز میں کہتے سنا۔

وہ کانپی، سنبھلی، اپنے آپ میں آئی — اس نے باری باری میری ہتھیلیاں چومنا شروع کر دیں: ''آج میں ہوں اور تم مجھے پیار کرتے ہو۔ یہی کافی ہے۔''

آج حیران ہوتا ہوں، میں نے کیسے کہا: ''مایا دیدی — جب آپ اسپتال میں ہوتی ہیں، جب آپ اپنے کمرے میں ہوتی ہیں، جب آپ سو جاتی ہیں — جب آپ مجھ سے دوُر ہوتی ہیں، جب آپ میری نظروں کے سامنے نہیں ہوتیں — جب آپ مجھ سے پڑھنے کو کہتی ہیں اور جب میں آپ سے دوُر رہ کر، رات رات بھر پڑھتا ہوں — جب آپ میرے قریب ہوتی ہیں، میرے ساتھ ہوتی ہیں — دیدی، میرے لیے آپ ہر وقت ہوتی ہیں اور میں ہر وقت آپ سے پیار کرتا ہوں...''

میری ہتھیلیوں کو چومتے ہوئے اس کے گیلے ہونٹ بے حرکت ہو گئے — اس نے میری طرف دیکھا، پھر میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا: ''اور جب میں نہ رہی، تب؟''

میں نے سنجیدگی سے کہا: ''ہو سکتا ہے، تب میں بھی نہ رہوں — ہو سکتا ہے، میں رہوں — لیکن دیدی، آج یہ پیار، یہ چاہت اور کل وہ دھیان، وہ تڑپ — میرے دھیان میں تو آپ پل پل کی تڑپ بن جائیں گی — ایک وقت آئے گا، نہ میں رہوں گا، نہ وہ تڑپ۔ تب کہیں ہوگا پیار کا انت — کیوں دیدی، کتنے یگ ہیں ہماری مٹھی میں!''

میرے رخسار چومتے ہوئے اس نے جیسے خود کلامی کی: ''مایا، دیکھو اپنا کرشمہ — تمھارا راجو وقت سے پہلے جوان ہو گیا — عمر سے پہلے سمجھ دار بن گیا!''

مجھے جھینپ نے آن پکڑا — میں نے گردن جھکا لی۔

میں شانت تھا — وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

اس نے کہا: ''شرماتے کیوں ہو — اور تھکے تھکے سے کیوں لگتے ہو؟''

میں بول اٹھا: ''نہیں تو — تھکن کیسی دیدی؟''

''تو پھر تم میری طرف دیکھتے کیوں نہیں؟''

میں نے اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھا — وہی میری پیلی پیلی سی خوبصورت اور جوان دیدی۔ وہی اس کے بدن کی رعنائیاں، وہی جادو، وہی بیقراری۔

میں اس کے پاس بیٹھا تھا، وہ میرے قریب بیٹھی تھی — کون کس سے جڑا بیٹھا تھا۔

''آج مجھے توڑ دو راجو — آج خود ٹوٹ جاؤ راجو!''

میرا ماتھا تپنے لگا، کانوں کی لویں دہکنے لگیں، آنکھیں جلنے لگیں۔

''جسم کی بھول بھلیوں میں ہر راستہ ہم ایک ساتھ طے کریں گے — میں تم پر ہر بھید کھول دوں گی — میں تم سے بڑی ہوں نا — تمھاری دیدی ہوں نا!''

اس نے میرے چہرے کو اپنے نازک ہاتھوں میں بھرتے ہوئے میرے پیاسے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے اور پھر دھیرے دھیرے چومنے لگی — چومتی رہی۔

میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔ میرے ہاتھوں میں سختی آ گئی۔ میرے بازو اکڑ گئے۔

اس نے میرے ہاتھ سہلائے اور ہولے ہولے دو جلتے بدنوں کے بیچ اپنے پستانوں پر رکھ دیے: ''اپنی ہتھیلیوں سے میری چھاتیاں مسلو، اپنی مٹھیوں میں قید کر لو...''

جانے کب اس نے کہا — جانے کب میں نے سنا: ''پیار کرنے والوں کے بیچ دیواریں کیوں — کپڑوں کی دیواریں کیوں؟''

میں نے ڈری ہوئی آواز میں کہا: ''دیدی، دروازہ کھلا ہے!''

اس نے میرے تمتماتے گال پر ہلکا سا پیار بھرا چانٹا مارا: ''پاگل ہے میرا مرد!''

اس نے پہلی بار مجھے 'مرد' کہا تھا — مگر پھر بھی دروازہ تو بند ہونا ہی چاہیے تھا نا!

مجھے اٹھاتے ہوئے اس نے کہا: ''چاہو تو دروازہ بند کر دو — راجو، کوئی آیا ہے کبھی یہاں۔ نوکر تو جرأت کر نہیں سکتے۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے اور انھوں نے کچھ دیکھ بھی لیا تو فوراً چپ چاپ چلے جائیں گے — وہ ایک ڈاکٹر ہیں۔ وہ جان جائیں گے ہم پیار کے ماروں کو — یوں بھی ہمارا پیار کسی دوسرے کی اُلجھن کیوں؟ اور کسی دوسرے کی اُلجھن، ہماری اُلجھن کیسے؟''

میں ایک قدم تک نہ اُٹھا سکا — حیرت کے مارے وہیں اس کے پاس کھڑا رہا۔

اس نے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا تو میں نے اس کے گورے پاؤں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

''دیدی، پیار کرنے والوں کے بیچ کپڑوں کی دیواریں کیوں؟''

اس کی بڑی میٹھی آواز مجھے سنائی دی: ''دروازہ بند کردوں؟''

میں وہیں اس کی گود میں گر پڑا: آپ مجھے سزا کیوں نہیں دیتیں؟''

اس نے مجھے اٹھایا، پلنگ پر بٹھایا اور خود کھڑی ہوگئی — اس کا آنچل فرش پر گرا پڑا تھا۔

اس نے اپنے گرے ہوئے آنچل کی طرف دیکھا اور میں نے جھک کر آنچل ہاتھوں میں تھام لیا — وہ بنا کچھ کہے دھیرے دھیرے گھومنے لگی اور ساڑی میرے متحرک ہاتھوں میں آتی چلی گئی۔

ساڑی میرے ہاتھوں میں تھی اور وہ ہاتھ بھر کی دوری پر میرے پاس کھڑی تھی۔

اس نے قدم بڑھا کر میرے بالوں میں انگلیاں کھسوتے ہوئے کہا: ''پریمیکا کے بدن سے اترا ہوا ہر کپڑا پریمی سے محبت مانگتا ہے۔ میری ساڑی بڑے پیار سے تہ کرو اور کرسی پر رکھ دو۔''

کتنی پریشانیاں تھیں اس کام میں۔ میرے ہاتھ جیسے میرے بس میں نہ تھے۔ پوری توجہ کے باوجود جانے کتنا وقت لگ گیا۔ ساڑی کرسی پر رکھنے کے بعد دھک دھک کرتے دل سے اس کی طرف دیکھا — بلاؤز اس کی باہوں میں پھنسا پڑا تھا، ہک الگ ہو چکے تھے۔

اس نے میری طرف دیکھا، پھر گردن جھکا کر اپنے اُبھاروں کو دیکھنے لگی — میں نے بڑی مشکل سے بازو پھیلائے اور کانپتے ہاتھوں سے اس کے پستانوں پر جھولتا بلاؤز دھیرے سے الگ کر ڈالا۔ جانے مجھے کیا ہوا، میں نے آن کی آن میں معطر بلاؤز میں اپنا منہ چھپا لیا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ بڑی دیر تک بلاؤز میں منہ چھپائے روتا رہا۔

''میری طرف دیکھو۔'' اس کی آواز سنائی دی۔

بڑے ضبط کے ساتھ میں نے بلاؤز ساڑی کے اوپر رکھ دیا اور اس کی طرف دیکھا۔

وہ تکیے پر سر رکھے دراز تھی۔ اس کی جوان مغرور اٹھانیں انگیا میں بندھی پڑی تھیں اور ریشمی پیٹی کوٹ نے اسے کمر سے گھٹنوں تک ڈھانپ رکھا تھا۔

میں بیچارگی سے جیسے اس کے خاموش حکم کا منتظر تھا۔

وہ مجھے دیکھ رہی تھی اور میں اسے — آج، اتنے برسوں کے بعد، میں کہہ سکتا ہوں، اس رات کی دھڑکتی تنہائی میں، روشن کمرے کی ہر شے ہماری نظروں کے تصادم سے سلگ اُٹھی تھی۔

اس نے — وہ پلنگ تھا یا بستر یا اوڑھنا بچھونا جسم و جاں کا، جسم و جاں کے لیے — اپنی بانہیں اُٹھائیں، میری جانب پھیلائیں، ہاتھ کھلے، انگلیاں متلاشی۔ بانہیں گول اور چینی یا متوازی، ٹھیک

نشانے پر مرکوز۔ لپکتی بانہوں کی درمیانی محفوظ وسعت، یا کہوں اسے مجھ پناہ گیر کا دشت امکاں— وہ منظر جو زندگی بھر کا روگ بن جائے، ایسا منظر جس کا بھید کتابوں کی سرد گرم رفاقت بھی نہیں کھول پاتی۔

ان بانہوں کا سونا پن تو ایک جادوئی بلاوا تھا— اور پھر میں ان بانہوں میں تھا، ان کی کسی ہوئی گرفت میں نرم نرم تپش کا خاص مہمان۔

گرم گرم سانسوں کے درمیان اس کی مدھر آواز ہولے سے اُبھری: ''جب بدن ایک دوسرے سے لپٹ جائیں تو ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے— ایک دوسرے کو جی بھر کر دیکھ لیں، ایک دوسرے کو جی بھر کر چوم لیں تو لپٹ جانے کا سرور کچھ اور ہی ہوتا ہے...''

اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس نے مجھے کندھوں سے تھام کر ہولے سے اُٹھایا اور خود بھی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر دائیں ہاتھ سے میری ٹھوڑی اُٹھا کر اس نے میری آنکھیں چوم لیں: ''بولو، یہ انگیا ہے یا کوئی دڑبہ۔ اتنی دیر تو کوئی کبوتروں کو بھی قید نہیں رکھتا— کھول دو یہ دڑبہ اور رہا کر دو اس حسین اور بیقرار جوڑے کو...''

میری آنکھیں بند تھیں۔ وہ میری گری ہوئی پلکوں پر باری باری اپنے ہونٹوں کے پھاہے رکھ رہی تھی— میرے ہاتھوں نے اس کی ننگی پیٹھ سہلاتے سہلاتے اس کی انگیا کے بند کھول دیے، تیلی سی طنابیں اس کی بانہوں سے الگ کر دیں۔

میری گری ہوئی پلکیں، اس کے ہونٹوں کے پھاہے— میں نے سنا: ''یہ جو اِک ریشمی شامیانہ سا بندھا ہے میری کمر کے گرد، اب تم ہی بتاؤ، اور کون ہے جو ہٹائے گا اسے...''

میرے ہاتھوں نے اس کا حکم مانا— اِک ڈوری اور اِک گانٹھ۔ گانٹھ جو کھلی، ڈوری جو ہوئی ڈھیلی، میں نے جو اٹھائیں پلکیں، اس نے جو پساریں ٹانگیں، شامیانہ ہوا بدن سے الگ۔

''تن بدن کی یہ آزادی اور تم اس سے محروم— ان ہاتھوں کی برکت، تم ہو گے آزاد!''

سچ مچ ان ہاتھوں میں بڑی برکت تھی— کپڑوں کی دیواریں ان ہاتھوں نے ڈھا دیں، بڑے پیار سے اور بن آواز۔

آواز تو بس میں نے اس کی سنی: ''نہ کوئی اُلجھن، نہ کوئی پردہ— تم مجھے آنکھوں میں بھر لو اور میں تمھیں— اُتار لیں یہ بدن آنکھوں میں سدا کے لیے...''

وہ پلنگ کی پشت کا سہارا لے کر، سر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر اور ٹانگیں پسار کر بیٹھ گئی— میں لرزتی ٹانگیں لٹکائے اس کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی پنڈلیاں میرے کولھوں کو چھو رہی تھیں— میری گود میں اِک اور وجود کی توانائی گرمیِ حیات بن چکی تھی۔

میں اسے آنکھوں میں اُتار رہا تھا — کھلے بال، دمکتی پیشانی، گہری آنکھیں، تمتماتے رخسار، اور مسکراتے ہونٹ۔ وہ گردن، وہ کندھے، وہ بانہیں، وہ بالوں بھری گیلی بغلیں۔ بدن کے تناسب سے کچھ بڑے پستان، بھرے بھرے اور گول، پیلے پیلے سے گورے ابھاروں کی اٹھانوں پر کرشمے کی صورت پھیلے ہوئے کتھئی رنگت کے دائروں میں زندہ، ٹھوس اور سر بلند سرِ پستاں — میری نظریں تو بس وہیں رُک گئیں، وہیں ٹھہر گئیں، وہیں کی ہو رہیں۔

میں یہ دیکھ نہ پایا کہ اس کی نظریں میرا کیا کچھ سمیٹ رہی ہیں۔

تب میرے منتظر کانوں نے اس کی آواز سنی: ''بھر لو میرے پستانوں کو اپنی مٹھیوں میں، چومتے رہو میرے اُبھاروں کو، چوس لو رس ان اٹھانوں کا — پگھلا دو، بہا دو ان میں چھپا برسوں پرانا درد...''

اس کی آواز، اس کے لفظ، اس کا حکم — یوں جانو، ایک کتھا کہانی —

وہ خاموش سیاہ سلگتی رات —

وہ دو جلتے بدن، پیار کی ایک عجب دھن میں مگن —

وہ ایک انمول لمس، نعمت ہے جس کا نام —

ایک ایک مسام کی بیداری، ایک ایک رگ کی تڑپ —

ایک ایک فتنے کی سخت جانی، لبوں کی آنچ تلے تپتی ہوئی —

جب میرے اس نا قابل بیان وجود کی نا قابل برداشت توانائی اس کے بھیگے ہاتھوں کی رہنمائی میں، اس کی بھیدوں بھری گود کی گہرائی میں، اس کی مدد اور تعاون کے ساتھ ایک جدوجہد میں ڈھل گئی، تب وہ، وہ نہ رہی اور میں، میں نہ رہا — بس جسم و جاں ایک لاوے کی صورت پھوٹ بہے اور ہمیں بہا لے گئے۔

صبح منہ اندھیرے جب میری آنکھ کھلی، میں نے اپنا چہرہ اس کے پستانوں میں گم پایا — وہ میرے بالوں میں اپنی انگلیاں اُلجھائے، میری نیند ٹوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔

میرا بدن ساکت تھا۔ ایک میرا دل دھڑک رہا تھا اور ایک میری پلکوں میں حرکت ہوئی تھی۔ پھر بھی وہ جان گئی کہ میری نیند ٹوٹ چکی ہے — نیند ٹوٹنے کی آواز اس نے سن لی تھی، جیسے اس کے باخبر پستان سوتی اور جاگتی آنکھوں کے فرق کو خوب پہچانتے ہوں۔

اس نے بڑے پیار سے کہا: ''اب تم مرد سے ایک پیارے سے بڑے بچے بن جاؤ۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔ نہاؤ، پھر بھرپور ناشتہ کرو — کالج بھی تو جانا ہے تمھیں!''

میں نے اس کے پستانوں کو مٹھیوں میں بھر لیا تھا اور پستانوں کے سخت جان سروں کو باری باری

چوم رہا تھا۔

اس نے پھر بڑے پیار سے کہا: ''اپنی دیدی کا کہا نہیں مانو گے!''

میں فوراً اُٹھ بیٹھا — میں نے بے اختیاری میں اس کے ہاتھ تھامے اور چوم لیے۔

اس نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پھر اس کے ہاتھ میری گود میں تھے۔ اور وہ فتنہ جو سر اُٹھا چکا تھا، اس کے ہاتھوں کی پیار بھری نرمی اور آنچ محسوس کر رہا تھا۔ وہ خود تپنے لگا تھا۔

اس نے بانہیں کھولیں، مجھے ان میں بھرا اور پھر جیسے مجھے اوڑھ لیا — اس نے خود مشتعل فتنے کو جائے پناہ بخشی جو ایک زلزلے کی زد میں تھی۔

جب زلزلہ تھم گیا تو اس نے شفقت سے میرا ماتھا چوما: ''اب تو اپنی دیدی کا کہنا مانو گے!''

میں نے اس کی طرف دیکھا — اس نے کہا: ''تم سے اُٹھا نہ جائے، چلا نہ جائے پھر بھی تم کالج جاؤ گے — پورے دھیان سے ہر لیکچر سننا — گھر آنے کے بعد اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سو جانا۔ سوتے رہنا۔ میں خود تمھیں جگاؤں گی...''

دن بھر میں نیند سے لڑتا رہا، تھکن سے لڑتا رہا۔ کالج میں کانوں سے جو کچھ سنا، دھیان میں رکھنے کا جتن کرتا رہا — گھر لوٹا، کھانے سے فارغ ہوا، کپڑے بدلے، پلنگ پر لیٹا اور سو گیا۔

رات کے دس بجے ہوں گے، جب میری آنکھیں کھلیں۔

وہ پاس بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی انگلیاں ہولے ہولے میری چھاتی میں ہلکی سی گدگدی پیدا کر رہی تھیں — میں مسکرا دیا۔ میں نے دیکھا، تپائی پر دودھ بھرا گلاس رکھا ہے اور ایک طشتری میں ناشپاتی اور سیب کے قتلے پڑے ہیں۔

اس نے کہا: ''اٹھو، منہ پر چھینٹے مارو اور کچھ کھا پی لو۔ پھر سو جانا۔''

میں نے کہا: ''نہیں دیدی!''

''اچھا پہلے اُٹھ تو پڑو، باقی باتیں بعد میں۔''

غسل خانے سے آنے کے بعد میں نے پھل کھائے، دودھ پیا۔

اس نے کہا: ''راجو، مجھے کچھ سڈنی کارٹن کے بارے میں بتاؤ۔''

میرے منہ سے نکل گیا: ''دیدی یہ بھی کوئی بات ہوئی!''

اس نے نرمی سے کہا: ''نہیں راجو — کیا تم چاہو گے کہ تم بیمار پڑ جاؤ اور تمھاری دیدی کو دُکھ ہو؟''

میں چپ رہا۔

اس نے کہا: ''لیٹ جاؤ راجو۔ میں تمھارے پاس بیٹھی ہوں — کچھ بات کرو۔ جب تمھیں

نیند آنے لگے تو سو جانا — جب تم سو جاؤ گے، میں بھی تمھیں دیکھتے دیکھتے یہیں تمھارے ساتھ سو جاؤں گی — کیوں ٹھیک ہے نا۔ تم یہی تو چاہتے ہو کہ تمھاری دیدی تمھارے پاس رہے۔ دیکھو میں تمھارے پاس ہوں اور صبح جب تمھاری آنکھ کھلے گی، تم مجھے اپنے پاس پاؤ گے — اب مجھے بتاؤ، وہ ایک پل، دھڑ سے گردن الگ ہونے سے پہلے کا وہ پل، اس پل سڈنی کارلٹن کے ذہن میں کیا تھا؟ اس پل کیا اس کی پریمیکا اس کے دھیان میں تھی؟ اس پل کیا موت کے تماشائیوں کے قہقہے اور آوازے اس کا وقت برباد کر رہے تھے؟ اس پل کی حقیقت کیا تھی؟ اس پل کا سچ کیا تھا؟

مجھے یاد ہے، میں کچھ بھی نہ کہہ پایا تھا — مجھے یاد ہے، اس کی چھلکتی آواز کے طلسم میں میں نے اس ایک پل کو گزرتے دیکھا اور پھر ادھر سڈنی کارلٹن کی گردن دھڑ سے الگ ہو کر گری، اُدھر میرا سر نیند کی آغوش میں لڑھک گیا۔

صبح سویرے جب مجھے ہوش آیا، میں نے اسے اپنے بستر ہی پر دیکھا۔

وہ رات بھر میرے پاس رہی تھی۔ میرے نزدیک اور مجھ سے دور — وہ تر و تازہ نظر آ رہی تھی اور میں خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔

میں کہنیوں کے بل ذرا سا اٹھا اور اس کی مسکراتی آنکھیں دیکھ کر میں نے کہا: ''دیدی، آپ کتنی اچھی ہیں — نالنے کا سلیقہ تو کوئی آپ سے سیکھے!''

اس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں بھر لینے کے بعد کہا: ''سڈنی کارلٹن کے پاس تو بس پل بھر کی مہلت تھی۔ ہماری مٹھی میں تو پوری زندگی ہے — میں ضبط کر سکتی ہوں، خود کو مار سکتی ہوں لیکن تمھیں نڈھال اور بجھا بجھا سا نہیں دیکھ سکتی — دیکھو نا تم کتنے جاندار لگ رہے ہو!''

میں اس سے لپٹ گیا۔ تب میں نے جانا کہ رات میرے سونے کے بعد اس نے اپنا لباس بدلا تھا۔ ایک نائٹی اس کے بدن پر تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے، اسے کچھ اُٹھا کر، نائٹی اس کے بدن سے الگ کرنا چاہی تو اس نے کہا: ''نہیں راجو، نہیں۔ تمھیں کالج جانا ہے — میں نہیں چاہتی، میرا جوان بچہ اُجڑا اُجڑا سا نظر آئے۔''

اس نے اِک صبر کے ساتھ مجھے اپنے بدن سے جدا کیا اور کھڑی ہو گئی۔

دروازے کے پاس پہنچتے ہی وہ رُکی: ''تمھیں یاد ہے نا، کل سویرے میں نے تم سے کیا کہا تھا!'' پھر وہ میرے کمرے سے چلی گئی — وہ کتنی دور تھی، وہ کتنی پاس تھی — مجھے اُٹھنا تھا، تیار ہونا تھا اور کالج جانا تھا۔

تین بجے کے قریب گھر واپس پہنچا تو کمرے میں پلنگ پر، تکیے کے عین اوپر، دھاریوں

والے پیپرویٹ کے نیچے ایک رقعہ پڑا ہوا دیکھا — لکھا تھا:

راجو۔

آج شام اسپتال میں کچھ دیر ہو جائے گی — انتظار مت کرنا۔ پڑھنے میں من لگانا۔ نیند آئے تو سو جانا۔ سنو۔ کیتھرین دی گریٹ ایک خط میں والٹیئر کو کیا لکھتی ہے:

Men make love more intensely at twenty, but make love better, however, at thirty.

تم تو ابھی بیس کے بھی نہیں ہوئے۔

دیدی

بہت دیر تک میں سوچتا رہا کہ اس نے 'ماما' کیوں نہ لکھا، 'دیدی' کیوں لکھا؟

'ماما' بڑا خوبصورت نام ہے۔ 'دیدی' بھی کم خوبصورت نام نہیں — ہو سکتا ہے، کوئی بے معنی اُلجھن مٹا ڈالنے کی غرض سے آپ نے 'دیدی' لکھا ہو — دیدی، آپ سچ مچ گریٹ ہیں۔

میں نے کاغذ کے اس پرزے پر اپنے ہاتھ سے لکھا: ''دیدی، آپ سچ مچ گریٹ ہیں۔''

اپنے دستخط کیے، تاریخ ڈالی، وقت درج کیا — پھر میں نے بیش قیمت کاغذ کا وہ پرزہ اس فائل میں رکھ دیا جو مجھے بہت عزیز تھی اور جس میں میری ذات سے متعلق ہر دستاویز محفوظ پڑی تھی۔

فائل کو اسٹیل کی الماری میں رکھنے کے بعد میں نے کپڑے بدلے، ہاتھ منہ دھویا اور پلنگ پر گر سا پڑا۔ ذرا سی بھوک لگی تھی، لیکن جی نہ چاہا کہ کسی سے کچھ کہوں، کھانے کو کچھ مانگوں۔ کتاب کھولی، پر نظریں ٹک نہ سکیں۔ روشندان کے میلے شیشے کے اس طرف منڈیر پر بیٹھی چڑیا کو دیکھتا رہا۔ چڑیا اُڑ گئی تو پھر کتاب کھول کر بیٹھ گیا۔ ابھی کچھ پنے ہی پڑھ پایا تھا کہ نیند کا جھونکا آ گیا۔ کتاب بند کی اور سو گیا۔

نیند کھلی تو شام ہو چکی تھی — ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے پی اور پنیر کے دو چار پکوڑے کھائے۔ پھر دو چار میگزین سرسری طور پر دیکھے۔

اپنے کمرے میں واپس آنے کے بعد دیر تک ریڈیو سنتا رہا۔ جی بھر گیا تو ریڈیو بند کرنے کے بعد کمرے میں ٹہلتا رہا۔ دھیرے دھیرے اُٹھتے قدم گننا شروع کیے تو قدم ہی گنتا رہا۔ قدم گنتے گنتے دیدی کے کمرے تک جا پہنچا۔ پل بھر کو رکا اور لوٹ آیا — تکیے کے عین اوپر دھاریوں والا پیپرویٹ جوں کا توں رکھا تھا۔ انگلیوں میں تھام کر، ہاتھ گھما گھما کر پیپرویٹ کی گہری نیلی دھاریاں دیکھتا رہا۔ تھک گیا تو پیپرویٹ وہیں کہیں رکھ دیا اور ڈائننگ روم میں چلا گیا۔ ڈائننگ

میبل پر بیٹھا تو بنا سوچے سمجھے دھیرے دھیرے جانے کیا کیا کھاتا رہا۔ پیٹ ٹھسا ٹھس بھر گیا تو تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ کمرے میں لوٹ آیا اور بستر پر گرتے ہی سو گیا۔

آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا تو اچھی خاصی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

کافی دیر تک باتھ روم میں آئینے کے سامنے کھڑا رہا اور اپنا چہرہ دیکھتا رہا۔ پچھلی شام اور رات کا کوئی نقش چہرے پر نظر نہ آیا — منہ ہاتھ دھوئے، دانت صاف کیے — صبح کے بندھے بندھائے عمل سے فارغ ہونے کے بعد چائے منگوائی۔ پانی کے دو بڑے گھونٹ پیے جو ہمیشہ کی طرح اچھے لگے۔ چائے پی تو جی خوش ہو گیا۔

کمرے سے باہر نکلا تو آپ سے آپ پتا چل گیا کہ سب لوگ گھر پر ہیں — سب لوگ، یعنی مایا اور ڈاکٹر کھرے۔ سب لوگ، یعنی ہم تین جنے۔

مایا کے کمرے میں پہنچا — وہ سو رہی تھی۔

چپ چاپ کرسی پر بیٹھا اسے سوتا دیکھتا رہا — وہ سو رہی تھی، میں اسے دیکھ رہا تھا، کتنا اچھا لگ رہا تھا، چھٹی کا وہ دن کتنا اچھا تھا۔

بہت دیر کے بعد وہ جاگی۔ کروٹ بدل کے اس نے مجھے دیکھا۔ پھر جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے وہ مسکرائی اور اس نے کہا: ''آج میں تم سے یہ پوچھوں گی کہ کیوں بیٹھے ہو؟''

میں نے بھی کچھ یاد کیا اور سوچ کر جواب دیا: ''دیدی، آپ نے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ کب سے بیٹھے ہو؟''

اس نے میرے چہرے پر نگاہیں جما کر کہا: ''ادھر آؤ، میرے پاس بیٹھو۔''

میں اُٹھا اور اس کے پاس جا بیٹھا۔

میرا ہاتھ تھام کر وہ بولی: ''تم اب بھی بالکل وہی پرانے پاگل ہو!''

میں بے اختیار اس سے لپٹ گیا: ''دیدی...''

اس نے اپنے بازوؤں کے حلقے میں مجھے سمیٹ لیا — جب اس کی گرفت سخت ہونے لگی تو میں نے کہا: ''دیدی، ڈاکٹر صاحب گھر پر ہیں۔''

اس نے بڑی سختی کے ساتھ مجھے بھینچ لیا۔ میرے ہونٹ چومنے کے بعد اس نے کہا: ''آج کے بعد تم اپنی دیدی کو ناراض نہیں کرو گے — اگر ڈاکٹر صاحب گھر پر ہیں تو تم کرسی ہی پر کیوں نہ بیٹھے رہے؟ یہاں پلنگ پر کیوں آئے، مجھ سے لپٹ کیوں گئے؟''

میں چپ رہا۔

اس نے پھر کہا: ''راجو میرے بچے، تم تو اتنے سمجھدار ہو، پھر ایسا بُرا خیال کیوں؟''

میں بول اٹھا: ''مجھے کیا ہو جاتا ہے دیدی؟''

اس نے میرے گال سہلاتے ہوئے کہا: ''راجو، تم بالکل ٹھیک ہو۔ تمھیں کچھ بھی نہیں ہوا۔''

میں نے اس کے پستانوں کو مٹھیوں میں بھرا تو اس نے کہا: ''نہیں راجو، ڈاکٹر صاحب گھر پر ہیں۔''

میں ایک جھٹکے سے الگ ہو گیا۔ وہ ہنس پڑی: ''ڈاکٹر صاحب گھر پر ہیں تو ہم ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔ ناشتے کا وقت تو نکل چکا ہے — ابھی مجھے باتھ روم میں جانا ہے، دانت صاف کرنے ہیں، نہانا ہے — ارے، تم بھی تو ابھی تک نہائے نہیں۔ جاؤ اور اپنا تولیہ لے آؤ۔ آج میں تمھیں نہلاؤں گی!''

میں جھینپ گیا۔

''یہ تم جھینپ کیوں جاتے ہو!'' اس کی کھنکتی ہوئی آواز مجھے سنائی دی: ''اچھا جاؤ نہاؤ اور بن سنور کر آؤ۔ پھر ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔''

نہانے کے بعد، بال بنانے کے بعد، اچھے کپڑے پہنے جب میں ڈائننگ روم میں پہنچا تو مایا وہاں نہیں تھی — مجھے فوراً پتا چل گیا کہ ڈاکٹر گھر سے بنا کھانا کھائے جا چکے ہیں۔

مایا نے جب ڈائننگ روم میں قدم رکھے تو پورا کمرہ دودھیا روشنی سے دُھل گیا۔ لگ رہا تھا کہ اس نے نہانے کے بعد بھیگے بدن ہی کپڑے پہن لیے تھے — سفید، بے داغ اور مہین کپڑے کا ڈھیلا ڈھالا بلاؤز اس کے کندھوں، اُبھاروں اور پیٹ کے اوپری حصے کو کچھ یوں ڈھانپے ہوئے تھا جیسے ڈھانپنے کا عمل کپڑوں سے بے نیازی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ اسی کپڑے کی اوڑھنی اس نے اوڑھ رکھی تھی۔ اوڑھ کیا رکھی تھی، یوں جانیے کہ وہ تو اُڑتے اُڑتے کسی کشش کے تحت ان گورے کندھوں پر آن پڑی تھی۔ ننگی اور کومل بانہوں کا حسن اس حسین بدن سے ذرا بھر جدا نہ تھا۔ پیٹی کوٹ کی رنگت اور بھومیکا، بلاؤز اور اوڑھنی سے میل کھا رہی تھی — بھیگے بدن کا وہ ڈھیلا لباس یہاں وہاں بدن کے ساتھ چپک گیا تھا اور یہاں وہاں لباس پر بدن کا رنگ چڑھ گیا تھا۔

اُف رانوں کی وہ گولائیاں، پنڈلیوں کی گول سختیاں، بھرے بھرے کولہوں کا گداز، پتلی کمر کا لوچ، جوبنوں کا اُبھار، کندھے اور گردن، ہونٹ اور ناک، آنکھیں اور بھویں، ماتھا اور کان، کھلے گیلے بال — پھر بدن سے نکلتی اِک آنچ، اِک مہک۔

مجھے اچھا بھلا کھانا بالکل اچھا نہ لگ رہا تھا۔ میں بڑی مشکل سے نوالے حلق سے نیچے اُتار رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا — وہ بڑے سلیقے سے، دھیرے دھیرے، پوری لذت کے

ساتھ کھانا کھا رہی تھی جیسے دُنیا بھر کے تمام ذائقے اس تھالی میں، ان کٹوریوں میں سمٹ آئے ہوں اور وہ انھیں اپنے وجود میں سمو رہی ہو۔

اس نے نیچی نظروں کے ساتھ پچکارتی ہوئی آواز میں کہا: ''راجو، پورے دھیان سے اور پیٹ بھر کر کھانا کھاؤ۔''

جب ہم ہاتھ منہ صاف کر چکے تو اس نے کہا: ''کافی ہم کمرے میں پئیں گے۔ آؤ۔''

میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ پلنگ کی پشت کا سہارا لے کر نیم دراز صورت میں بیٹھ گئی — میں ذرا فاصلے پر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھی، میں خاموش تھا — کافی بھی ہم نے خاموشی ہی کے عالم میں پی۔

''اچھا راجو،'' اس نے کہا: ''ڈاکٹر صاحب تو گھر پر نہیں ہیں، اب؟''

میں نے بیچارگی سے اس کی طرف دیکھا۔

''چلو یہ بتاؤ، کل شام تم کیا کرتے رہے؟''

میں چپ رہا۔

''اچھا مجھ سے پوچھو، کل شام میں کیا کرتی رہی؟''

میں چپ چاپ بہت دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ بولی: ''کل دن بھر میرا ایک مریض زندگی اور موت کے درمیان تڑپتا رہا۔ مجھ سے جو بن پڑا، میں نے کیا۔ تھک گئی، ٹوٹ ٹوٹ گئی، پر لگی رہی، جتی رہی، موت کو تو نہ ٹال سکی، لیکن کوشش میں نے پوری کی — اور تم ہو کہ تم نے زندگی کی ایک شام ضائع کر دی، ایک بے معنی انتظار میں۔ تم جانتے تھے کہ میں اسپتال میں ہوں۔ پھر انتظار کا ہے کا۔ تم نے میرا رقعہ پڑھا تھا نا۔ جانتے ہو، وہ میں نے اسپتال سے ایک آیا کے ہاتھ بھیجا تھا — اگر اسی طرح پڑھنے لکھنے میں تمھارا من نہ لگا تو پھر تمھاری دیدی اور ایک بُری عورت میں فرق کیا رہا...''

میں تو بس ٹوٹ گیا — آپ سے آپ اُٹھا اور بے اختیار ہو کر اس کے پیروں میں سر رکھ کر رونے لگا، روتا رہا — اس کے پیروں کو چومتا رہا، نہ جانے کب تک۔

اسی عالم میں مجھے اس کی جادوئی آواز سنائی دی: ''بس بس — تم نے تو میرے پیر آنسوؤں سے دھو ڈالے ہیں — کل کی موت تو گئی کل کے ساتھ، میری زندگی تو میرے آج کے ہاتھ میں ہے — راجو، تم میرا آج ہو۔ راجو، مجھے اپنی بانہوں میں بھر لو، میرے گلے لگ جاؤ...''

میں نے سر اُٹھایا اور اس کی جانب دیکھا — اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔
میں نے بڑھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اس کی آنکھیں چوم لیں۔
اس کے ہاتھ میری پیٹھ سہلانے لگے — میں نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا۔
میرے ہاتھ اس کے پستانوں کو مسلنے لگے تو اس نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا: ''نہیں راجو، اس وقت کوئی شرارت نہیں۔ بس سو جاؤ — کھانے کے بعد تھوڑا سا سونا چاہیے نا!''
میں سو گیا — مجھے پتا نہیں کہ وہ سوئی تھی یا نہیں۔ جب میری آنکھ کھلی، وہ باتھ روم میں تھی اور شام گہری ہو چکی تھی۔
میں پلنگ پر پڑا رہا۔
باتھ روم سے کمرے میں آتے ہی اس نے کہا: ''تم سو رہے تھے، چائے میں نے اکیلے ہی پی لی — میں نے کہہ دیا ہے کہ رات کو ہم بہت ہلکا کھانا کھائیں گے — اب تم اُٹھو، آنکھوں پر چھینٹے مارو، آدمی بنو۔''
میں چپ چاپ اُٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا — آنکھوں پر چھینٹے مارے، اس کے تولیے سے منہ پونچھا، آئینے میں چہرہ دیکھا اور کمرے میں لوٹ آیا۔
وہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی — میں پلنگ پر بیٹھ گیا۔
''راجو، آج کا دن تو بیت گیا۔ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں، ہم نے یہ دن کیسے گزارا — ہماری زندگی میں آج کا دن کوئی کارنامہ نہیں کہ ہم اسے انگلیوں میں تھام سکیں، آنکھوں کے سامنے گھما پھرا سکیں، پرکھ سکیں، لیکن جب کبھی تم آج کے دن کو دھیان میں لاؤ گے، تمھیں یہی محسوس ہوگا کہ تم نے آج کا دن گنوایا نہیں تھا...''
میں نے بڑی دھیمی آواز میں کہا: ''دیدی، دن تو کیا، مجھے آج کا ایک ایک پل یاد رہے گا۔''
وہ مسکراتے ہوئے بولی: ''لیکن راجو، ابھی پورا دن کہاں گزرا ہے۔ رات تو ابھی باقی ہے۔''
میں جھینپ گیا — وہ ہنس پڑی۔
''راجو، میں اسی طرح جھینپ جاتی تھی اور وہ اسی طرح ہنس پڑتے تھے...''
''کون دیدی کون؟'' میں یکا یک بے چین ہو اُٹھا۔
وہ آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگی — میں دم سادھے اس کی طرف دیکھتا رہا۔
ٹہلتے ٹہلتے، کچھ سوچتے سوچتے وہ میرے پاس آ کر رُک گئی۔ اس نے میرا سر، میرا چہرہ

اپنے ہاتھوں میں بھرلیا۔ پھر میرا چہرہ اپنے اُبھاروں میں دباتے ہوئے بڑی شفقت سے بولی:
''بتاؤ مجھے، میں نے کیا کہا ہے؟''
میں چپ رہا — میں کہ اس کے ابھاروں کی نرم آنچ میں گم تھا، کیا کہتا۔
اس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں بھرے بھرے ذرا اوپر کی طرف اُٹھایا، قدرے جھکی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی: ''بولو، میں نے کیا کہا تھا — میں تمھارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔''
میں بڑی مشکل سے کہہ سکا: ''آپ نے کہا تھا، آپ اسی طرح جھینپ جاتی تھیں اور وہ اسی طرح ہنس پڑتے تھے...''
اس نے فوراً پوچھا: ''پھر تم بے چین کیوں ہو اُٹھے؟''
ایک پل میں ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ میرا جی چاہا کہ اپنا سر پھوڑ لوں — میری بے چینی میں حسد اور جلن کا جذبہ کیوں اور کیسے شامل ہو گیا تھا۔
میں نے نظریں جھکا لیں۔
میرا ماتھا چومنے کے بعد وہ پھر ٹہلنے لگی۔
میں نے سنبھل کر بڑے ضبط کے ساتھ پوچھا: ''دیدی، کون تھے وہ؟''
وہ رُک گئی — میں نے دیکھا، اس کے ہونٹ پل بھر کو کانپے، اس کے بدن میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی، پھر وہ سنبھل گئی۔
میرے پاس پلنگ پر بیٹھتے ہوئے اور میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس نے کہا: ''راجو، ان کا نام تھا گوتم...'' بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا: ''زمانے گزر چکے ہیں، پر جیسے کل کی بات ہو۔ وہ مجھ سے ملنے اسی بنگلے کی طرف آ رہے تھے۔ راستے ہی میں ان کی موٹر سائیکل ایک اسٹیشن ویگن کے ساتھ ٹکرا گئی — وہ نہ رہے راجو، نہ رہے...''
میں نے محسوس کیا، میرے ہاتھوں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت ہو گئی ہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ یکا یک بجھ سی گئی ہے — میں اسے اُداس پا کر خود اُداس ہو گیا۔
مجھے اُداس دیکھ کر جیسے اس نے اپنی اُداسی جھٹک دی، جھاڑ دی۔
''نہیں راجو، میں تمھیں کبھی اُداس دیکھنا نہیں چاہتی اور میری زندگی میں، وعدہ کرو، تم کبھی اُداس نہ ہو گے — میں نے گوتم سے پیار کیا۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ گوتم نہیں رہے اور تم ہو — ایک کے نہ ہونے اور دوسرے کے ہونے کے بیچ تمھاری دیدی کھڑی ہے — سب دکھ اور

ساری اُداسیاں تمھاری دیدی جھیل چکی ہے، جھیل سکتی ہے— گوتم نے مجھ سے پیار کیا، بھرپور، اٹوٹ۔ نہ وہ کبھی اُداس ہوئے، نہ مجھے کبھی اُداس ہونے دیا— میں جانتی ہوں، تم مجھ سے پیار کرتے ہو، بھرپور، اٹوٹ۔ تم کبھی نہ چاہو گے کہ میں اُداس ہو جاؤں، لیکن راجو، جب تم میری زندگی میں آئے یا جب میں نے جانا کہ میں تمھیں اپنی زندگی میں لے آئی ہوں، اس سے ایک زمانہ پہلے میں اُداسی کے ساگر میں ڈوب چکی تھی...''

اس کی آواز میں وہ سنجیدگی اور گہرائی تھی جو سچ کا روپ اور روشنی ہوتی ہے۔

''گوتم کہا کرتے تھے کہ پیار، تعلیم اور تربیت بھی تو ہے— راجو، اسی ناتے میں تمھیں اپنے بیتے دنوں کے بارے میں بتا رہی ہوں۔ جب تم میری زندگی میں آئے، تم چھوٹے سے بچے تھے اور میں تھی ایک جوان عورت— گوتم جب میری زندگی میں آئے، وہ ایک منجھے ہوئے آدمی تھے اور میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا۔ اُن دنوں میں چڑیا کی طرح اُڑا کرتی تھی اور گلہری کی طرح پھدکا کرتی تھی۔ گوتم نے مجھے اتنا پیار کیا، خود میرے اندر چھپی ہوئی چاہتوں کے اتنے بھید کھولے کہ میں اُڑنا بھول گئی۔ پھدکنا مجھے یاد نہ رہا۔ بس آنند کی انجانی سیمائیں تھیں اور ایک گہری سوچ— راجو، آج میں جو کچھ بھی ہوں، سب گوتم کی گہری سوچ کا نتیجہ ہے— زندگی، ایک پیار بھی اور ایک مقصد بھی— اب یہی دیکھو، ڈاکٹر صاحب سب کچھ جانتے تھے اور خوش تھے، اس لیے کہ ہم نے نہ کبھی کچھ چھپانے کی کوشش کی اور نہ ہی کبھی جھوٹ بولا...''

سچ کہتا ہوں، اس کا ایک ایک لفظ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

''ہم شادی کر سکتے تھے لیکن نہ کبھی ہم نے سوچا، نہ کبھی دھیان ہی آیا۔ پھر زندگی بھی تو ابھی پوری باقی تھی— کیوں راجو، زندگی ابھی پوری باقی ہے نا!''

میں نے دھیرے سے کہا: ''دیدی، زندگی کتنی باقی ہے، یہ تو میں نہیں جانتا، ہاں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے بِنا میری زندگی کا کچھ مطلب نہیں۔''

اس نے کہا: ''یہ تو ہوا پیار، پر زندگی مقصد بھی تو ہے!''

میں نے جواب دیا: ''دیدی، میں جی جان سے کوشش کروں گا کہ آپ مجھ سے کبھی مایوس نہ ہوں۔''

اس نے پوچھا: ''اور اگر میں نہ رہی تو؟''

میں تقریباً چلا اُٹھا: ''دیدی...''

وہ بے رحمی سے بولی: ''تمھیں جواب دینا پڑے گا۔''

میں نے بڑے ضبط کے ساتھ کہا: ''آپ ہر پل میری یادوں میں رہیں گی اور میں اپنا وعدہ کبھی نہ بھولوں گا۔''

اس نے ایک دم مجھے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور بے تحاشہ میرا ماتھا چومنے لگی۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: ''دیدی، وہ حادثہ کب ہوا تھا؟''

اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور کہا: ''ابھی انکل جنگ پر نہیں گئے تھے اور تم ہمارے یہاں نہیں آئے تھے — راجو، انکل کو گوتم کی موت سے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ وہ ہر شام یہاں آتے، گھنٹوں میرے پاس بیٹھتے، میرا غم بانٹتے — پھر انھیں جنگ پر جانا پڑا اور...'' اس نے میری طرف دیکھا۔ اس نے پہلی بار میرے والد کا ذکر کیا تھا: ''کبھی کبھی میرے ذہن میں سوال اُٹھتا ہے کہ مرتے وقت انکل کیا سوچ رہے تھے؟''

میں نے کہا: ''وہ یک دم ہلاک ہو گئے تھے۔ انھیں کچھ سوچنے کا موقع کہاں ملا تھا!''

اس نے کہا: ''گوتم کو بھی سوچنے کا کوئی موقعہ نہ مل سکا!''

میں چپ رہا۔

یکایک اس نے کہا: ''راجو، تم نے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ میں نے تم سے ہی کیوں پیار کیا؟''

میں کیا پوچھتا۔ یہ کیا کم تھا کہ وہ مجھ سے پیار کرتی ہے — میں چپ رہا۔

اس نے کہا: ''جب انکل ہلاک ہو گئے تو میں نے جانا کہ ہمارا دکھ سانجھا ہے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ تمھارے اندر ایک گوتم چھپا ہے۔ بس مجھے تم سے پیار ہو گیا — تم میرے گوتم ہو — میں نے خود سے کہا تھا: 'اُس گوتم نے تمھیں سنوارا تھا، اِس گوتم کو تم سنوارو!''' اس کی آواز میں درد بھی تھا، سکون بھی تھا: ''راجو، پیار میں کچھ چھپاتے نہیں اور میں کچھ چھپاؤں گی بھی نہیں — گوتم کے بعد تم ہو، جس نے میرے بدن کو چھوا ہے، چوما ہے، پیار کیا ہے — یہ میں ہی تھی جس نے تمھیں اپنے بدن کی راہ دکھائی — راجو، تم مجھے بُری عورت تو نہیں سمجھتے!''

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں ذرا اونچی آواز میں کہہ بیٹھا: ''اگر آپ نے ایسی بات کہی تو میں جان دے دوں گا۔''

اس ایک پل میں جانے کیا ہوا کہ اس کا ہاتھ اُٹھا اور ایک ایسا بھرپور طمانچہ میرے منہ پر آن پڑا کہ میرے کان بجنے لگے۔ درد اور حیرت کے ملے جلے احساس کے ساتھ میں سنبھلا اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔

ہماری نظریں ملیں تو اس نے آگے بڑھ کر میرا تمتمایا ہوا چہرہ اپنے ہاتھوں کے کنول میں

سمیٹ لیا: ''کیسے نکلی یہ غلیظ بات تمھارے منہ سے؟ کیسے کہی یہ گھناؤنی بات تم نے؟'' اس کی آواز ایک کمزور اور زخمی چیخ تھی۔

''مجھے معاف کردو دیدی۔'' میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔

اپنے گرم ہونٹوں سے میرے گال چومنے کے بعد اس نے کہا: ''تم سچ مچ مجھے پیار کرتے ہو!''

میں نے کہا: ''دیدی، جب آپ خود کو عورت کہتی ہیں، مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ میں جانتا ہوں، آپ ایک عورت ہیں، میں یہ بھی جانتا ہوں، عورت کیا ہوتی ہے۔ لیکن یہ لفظ 'عورت' آپ پر جچتا نہیں، سجتا نہیں — یہ لفظ چھوٹا پڑ جاتا ہے۔ آپ اس لفظ سے بہت بڑی ہیں — اور جب آپ خود کو بُری عورت کہتی ہیں تو میرا سر گھوم جاتا ہے، مجھے کچھ ہو جاتا ہے — اس گھر میں کوئی عورت یا بُری عورت نہیں رہتی۔ اس گھر میں میری دیدی رہتی ہے اور میں اپنی دیدی کے ساتھ رہتا ہوں — یہی میرا گھر ہے، یہی میری زندگی ہے... '' میری آنکھیں بھر آئیں۔

میرا چہرہ اس کے ہاتھوں کے کنول میں کانپ رہا تھا۔ آنکھوں کی روشنی آنسوؤں نے دھندلا دی تھی — میں اس کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ اس نے میرے بالوں کو اپنی انگلیوں میں اُلجھاتے ہوئے میرا چہرہ اپنے ابھاروں میں چھپا لیا۔ میں نے روتے روتے کہا: ''دیدی مجھ سے کبھی الگ نہ ہونا، مجھے کبھی الگ نہ کرنا۔''

اس نے اپنی بانہیں میرے گرد باندھتے ہوئے کہا: ''اس بندھن کو صرف ایک چیز توڑ سکتی ہے اور وہ ہے موت — موت سے لڑا جا سکتا ہے، پر اس پر ہمارا اختیار نہیں۔ ہاں، ہمارا وقت ہمارے اختیار میں ہے — اُٹھو، صبح سے ان کپڑوں میں یوں بیٹھے ہو جیسے ہمیں کہیں باہر جانا ہے — جاؤ اور کپڑے بدل کر آ جاؤ۔ انھیں کہتے ہوئے جانا کہ کھانا ہم اسی کمرے میں کھائیں گے۔''

میں اُٹھا، کچن میں جا کر کھانے کے بارے میں کہا، پھر اپنے کمرے میں پہنچ کر ملحقہ باتھ روم میں صابن مل مل کر اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا۔ ڈھیلا ڈھالا نائٹ سوٹ پہنا اور اس کے کمرے میں لوٹ آیا۔

صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ منہ ہاتھ دھو چکی ہے۔ پانی کی بوندوں سے اس کی اوڑھنی اور بلاؤز کچھ کچھ بھیگے ہوئے تھے۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سامنے چھوٹی میز پر کھانا چنا رکھا تھا۔

میں کرسی پر بیٹھنے کے بجائے اس کے ساتھ، اس سے جُڑ کر پلنگ پر بیٹھ گیا — اس کی ہدایت کے مطابق بہت ہلکا سا کھانا تیار کیا گیا تھا۔ ٹماٹر کا سوپ، توسٹ اور مکھن اور اوول ٹین۔

سنکے ہوئے ٹوسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے اس نے کہا: ''صبح کھانا بہت لذیذ تھا— تمھیں اچھا کیوں نہ لگا؟''

پہلے تو میں ذرا جھینپا، پھر میں نے کہہ دیا: ''بھیگے بدن اس لباس میں آپ اتنی اچھی لگ رہی تھیں کہ مجھے اور کچھ بھی اچھا نہ لگا۔''

اس نے کہا: ''اور اب؟ لباس تو اب بھی وہی ہے۔ ہاں، میرا بدن بھیگا ہوا نہیں ہے۔''

میں کچھ دیر خاموش رہا، پھر میں نے کہا: ''اچھی تو آپ اس وقت بھی لگ رہی ہیں— صبح اور اب رات میں فرق صرف اتنا ہے کہ میں دن بھر آپ کو اس لباس میں دیکھتا رہا ہوں۔''

وہ مسکرانے لگی: ''تو تم باتیں بنانا سیکھ گئے ہو— لیکن راجو، ابھی تو تم بیس برس کے بھی نہیں ہو!''

میرے منہ سے نکل گیا: ''دیدی، آپ مجھے تنگ کیوں کرتی ہیں؟''

وہ ہنس پڑی۔

سچ کہتا ہوں، میں نے بڑی ہمت سے کہا: ''دیدی، آج رات چاہے سڈنی کارلٹن کی مُنڈی دھڑ سے الگ ہو جائے، پر میں سونے والا نہیں...''

اس نے سوپ کی خالی پلیٹ ایک طرف کھسکاتے ہوئے کہا: ''یہ رتجگے کا ارادہ کس لیے؟''

میں سچ مچ جھینپ گیا۔

اس نے جیسے پچکارا: ''جھینپتے کیوں ہو، صاف صاف کہو۔''

میں چپ رہا۔

وہ بولی: ''سڈنی کارلٹن کی مُنڈی دھڑ سے الگ ہو جائے یا دھڑ پر تنی رہے، نیند تو آ ہی جائے گی۔''

میں تیزی سے بول اُٹھا: ''جب آئے گی، تب کی تب دیکھیں گے!''

ہم کھانے سے فارغ ہو چکے تھے— وہ اُٹھی، اس نے میز اُٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھی اور پھر کرسی پر بیٹھ گئی— میں پلنگ پر بیٹھا رہا اور اسے تکتا رہا۔

اس نے کہا: ''چلو مان لیا کہ تمھاری آنکھوں میں نیند نہیں ہے— اگر میں کہوں کہ مجھے نیند آ رہی ہے تو؟''

میں جھٹ سے بولا: ''ایک تو آپ نے 'اگر' کہا ہے، دوسرے آپ کرسی پر نہ بیٹھتیں بلکہ پلنگ پر لیٹ جاتیں۔''

اس نے کہا: ''یہ بھی کوئی بات ہوئی بھلا!''

میں نے سنجیدگی سے کہا: "اگر آپ سونا چاہتی ہیں تو سو جائیں۔ میں آپ کو دیکھتا رہوں گا۔"

"راجو، یہ بھی ہے چاہت کا ایک روپ۔" اس کی آواز بڑی گہری تھی۔ میرے پاس بیٹھتے ہوئے اس نے کہا: "راجو، چاہت کا یہ روپ برسوں میری زندگی کا انتظار بنا رہا۔ تم نیند میں گم ہوتے تھے اور میں چپ چاپ بیٹھی تمھیں دیکھتی رہتی تھی۔"

وہ چپ چاپ میرے پاس بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بیتے برس نمی کی صورت اُبھر آئے تھے۔

میں جذبات بھری مدھم آواز میں بولا: "آپ نے کہا تھا: 'تم جب کبھی آج کے دن کو دھیان میں لاؤ گے، تمھیں یہی محسوس ہوگا کہ تم نے آج کا دن گنوایا نہیں...' دیدی، میں سچ کہتا ہوں، آج کا دن میری زندگی کا یادگار دن ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر اور آنکھوں میں ایک مقناطیسی کشش تھی، جیسے آپ سے آپ کچھ ہو گیا ہو— میرے گال تھپتھپاتے ہوئے وہ بولی: "میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ابھی پورا دن کہاں گزرا ہے، رات تو ابھی باقی ہے..." اس کی آواز میں اِک لپک تھی۔

ایک حسن بے پناہ، ایک بھرپور محبت، ایک یادگار دن کی اُمیدوں بھری رات۔ کون جانے اور کسے خبر کہ میں اس کی بانہوں میں تھا یا وہ میری بانہوں میں تھی۔

اس نے میرا ماتھا چوما، آنکھیں چومیں، کانوں کی لویں چومیں اور پھر ہونٹ چومے۔ اس کے سلگتے ہونٹوں کا لمس جیسے پل پل رات کی گہرائی میں ڈوب جانے کا عمل ہو۔

میں نے اس کی اوڑھنی الگ کی۔

وہ ٹانگیں پھیلا کر، سر کے نیچے تکیہ جما کر چت ہوگئی۔ پھر اس نے بانہیں اُٹھائیں، ہاتھ باندھے اور سر کے نیچے دبا لیے— ننگی اور گوری بانہوں کا وہ انداز، کہنیوں کے وہ موڑ، بغلوں کے وہ بھورے باغیچے، کھلے اور ڈھیلے بلاؤز میں آزاد پستان اور ان کی مغرور اٹھانیں— اس نے آنکھیں میچ لیں۔

میں اپنے بدن میں دوڑتی سرسراہٹوں کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

اس کے ہونٹوں میں اِک ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی: "مجھے چومو— میرے ہونٹ..."

میں نے اپنے ہاتھوں میں اس کا چہرہ بھرا، جھکا اور اس کے کانپتے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ میں ان ہونٹوں کو چوم رہا تھا اور محسوس یہ ہو رہا تھا کہ وہ ہونٹ مجھے چوم رہے ہیں۔ میرے ہاتھ مجھ سے پوچھے بنا اس کے ابھاروں تک جا پہنچے تھے اور لگ یہ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ سر کا بوجھ

تکیے پر ڈال کر میرے ہاتھوں کو ان اٹھانوں تک لے گئے ہیں — میں بے تحاشہ اس کے ہونٹ کاٹنے لگا، اس کے پستان نوچنے لگا۔

''نہیں راجو، جلدی کا ہے کی، تیزی کیسی؟ وحشت اچھی نہیں — میری چھاتیاں مت نوچو۔ دکھنے لگی ہیں — انھیں پیار سے چومو — یہ تم کب تک بیٹھے رہو گے — لیٹ جاؤ، پھیل جاؤ — پھیل جاؤ کہ تمھیں اوڑھ سکوں...''

اس سے پہلے کہ میں پھیل جاتا، اس سے پہلے کہ وہ مجھے اوڑھ لیتی، اس نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ بیٹھی: ''چاہت کی سیماؤں کا کوئی انت نہیں — جب آنکھیں سننے لگیں، جب کان سونگھنے لگیں، جب ناک دیکھنے لگے — جب انگلیوں کے لمس اور زبان کے ذائقے میں کوئی فرق نہ رہے...'' وہ بول تھے، لذتوں کے نشان تھے یا بارش کی نرم بوندیں جو وجود میں چھپی بیقراری کو جگاتی ہیں، تیز کر دیتی ہیں — مجھے پتا بھی نہ چلا کہ میرے بدن پر کپڑوں لتّوں جیسی چیزیں نام تک کو نہ رہی تھیں۔ اُن ہاتھوں کا کرشمہ کس نے دیکھا، کس نے جانا۔ یہ بھی اُن ہاتھوں ہی کا کرشمہ تھا کہ اُس کا اپنا بدن بھی کپڑوں کے برائے نام اور بے معنی بندھن سے مکت ہو چکا تھا۔

اُس نے مجھے اوڑھ لیا، میں نے اسے اوڑھ لیا۔

ہم، ہم نہ رہے۔

کون سا ہاتھ کس کا تھا: اس ہاتھ کی پہنچ کہاں تک تھی —

کون سے ہونٹ کس کے تھے، اُن ہونٹوں نے کہاں کہاں پڑاؤ ڈالا —

کون سا انگ کب کھلا —

کون سا رنگ کب بکھرا —

ہڈیاں کب چٹخیں، خون کب اُبلا —

''میں بہہ چکی ہوں راجو، بہہ رہی ہوں — پھوٹ پڑو راجو، پھوٹ بہو...''

سخت جان وقت پھٹ پڑا، لمحہ لمحہ، ذرّہ ذرّہ، بوند بوند۔

اس جامد وقت کے سیال اور شدید بہاؤ میں ایسا اذیت ناک سکون تھا جو زندگی بھر ایک طلب بنا رہتا ہے اور جو مجھ غریب کے الفاظ کی پکڑ سے باہر ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ جب میری نیند کھلی، صبح ہو چکی تھی، تو غلط ہوگا۔ پھر غلط بیانی کا کوئی سبب بھی تو نہیں ہے۔ سبب اگر ہو بھی، تب بھی غلط بیانی کبھی میری زندگی کا حصّہ نہیں بن سکتی — دیدی سے میں نے کیا کچھ نہ سیکھا تھا!

اس یادگار دن کی اُمیدوں بھری اس رات کو ابھی سکون اور آسودگی کے کتنے لمحے گزرے تھے، مجھے خبر نہیں۔ رات کا کون سا پہر تھا، یہ بھی خبر نہیں — کچھ خبر تھی تو بس اتنی کہ نرم و نازک ہونٹوں کا اِک لمس، آنچ لیے اِک بھیگی بھیگی سی تڑپ بن کر، پیشانی سے شروع ہوتا اور قیامتیں ڈھاتا ہوا جاگتے تکو نے جنگل میں گوشت پوست کے خبردار باسیوں کو اپنا لیتا اور وہیں کا ہو جاتا۔ اس اپنائیت کو کیا کہوں۔ وہی تو تھی جس نے بہتی آگ کو بوند بوند سمیٹا۔

اشتعال اور سکون، سکون اور اشتعال کے ان لمحوں میں ایک اپنائیت اس کی تھی، میرے لیے اور ایک اپناپن میرا تھا، اس کے لیے۔

وہ تھی، میں تھا اور رات تھی اور ہم تینوں کی بیداری۔

رات کی رخصتی کے وقت میں اس کے ابھاروں کے بیچ چہرہ چھپائے گم تھا اور وہ میرے سر کو اپنے ہاتھوں میں باندھے چپ تھی — میری گمشدگی اور اس کی چپ، محبت اور چاہت، سکھ اور چین کی گواہ تھی۔

''اٹھو راجو، کپڑے پہن لو۔ اپنے کمرے میں جا کر تھوڑا سا آرام کر لو — کالج بھی تو جانا ہے۔'' اس کی آواز میں پیار اور ٹھہراؤ کی کیفیت تھی۔

چھٹی کا وہ ایک دن، اس دن کا تفصیل سے ذکر — آپ پوچھ سکتے ہیں، اس کا مطلب کیا ہے؟

مطلب صرف اتنا ہے کہ اس ایک دن کی دلنشیں طوالت اگلے دس برسوں کی حسین ترین پہچان ہے۔

ذہانت، رہنمائی اور بلا کی سپردگی — یہ تو تھی دیدی۔

جستجو، آرزو اور شدید طلب — اور یہ تھا میں۔

دیدی کا کہنا تھا کہ بیس کی عمر سے پہلے ہی میں پریم لیلا کا شدید اداکار بن گیا تھا اور پچیس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے تو میں نے خود کو کہیں بہتر اداکار ثابت کر ڈالا تھا۔

وہ ہنس کر کہتی: ''کیتھرین غلط ثابت ہوئی!''

میں جھینپ جاتا: ''جیت تو آپ کی ہوئی ہے!''

دیدی دن بدن نکھرتی گئی — اُسے کتنی محنت کرنی پڑتی تھی، خود کو بنائے رکھنے میں، عمر کے فاصلے کو کم کرنے میں۔ پھر اسپتال کی ذمے داریاں اور اس کی لگن، بس حیرت ہوتی ہے۔

میں بھی دھیرے دھیرے، قدم قدم بڑھتا چلا گیا — کالج اور یونیورسٹی سے، امتحان

در امتحان، ایک بڑی فرم کی ایک اہم کرسی تک۔
دیدی کہتی: ''تم نے میری لاج رکھ لی۔''
میں کہتا: ''آپ تو میری زندگی ہیں۔''

ڈاکٹر کھرے، جو تھے، وہی رہے۔ ہاں، اُن کے چہرے پر جو ایک بے رُخی، ایک تناؤ رہتا تھا، وہ نہ رہا تھا۔ اُن کے چہرے پر ایک اطمینان اور ایک نرمی نظر آنے لگی — وہ سکھی تھے۔ بس اتنا کہنا کافی ہے۔

آپ کو یاد ہوگا، دیدی نے کہا تھا کہ ہماری مٹھی میں تو پوری زندگی ہے — جی ہاں، 'پوری زندگی' میں دیدی نے جو کچھ بھی مجھ سے کہا، میرے دھیان میں ہے۔ اگر لکھنے بیٹھ جاؤں تو سینکڑوں پنے لکھ ڈالوں۔ اگر انھیں کتابی شکل دے دوں تو بڑے بڑے انعام یافتہ لکھک شرم کے مارے زمین میں دھنس جائیں۔

دیدی کو پتا نہیں تھا کہ 'پوری زندگی' کی عمر کتنی ہے لیکن اس نے کئی بار الگ الگ لفظوں میں، الگ الگ حوالوں سے کہا تھا: ''راجو میرے بچّے، لوگ جنم جنم کے ساتھ کی بات کرتے ہیں۔ پچھلا جنم، یہ جنم، اگلا جنم — یاد رکھنا، بھولنا مت کہ پچھلے جنم میں تم میرے ساتھ نہیں تھے اور اگلے جنم میں تم میرے ساتھ نہیں ہوگے، اس لیے کہ نہ کوئی پچھلا جنم تھا اور نہ کوئی اگلا جنم ہوگا — صدیوں پرانے اس آڈمبر میں یہ جو آج ہے، یہ زندگی جو ہم جی رہے ہیں، بس یہی سچ ہے اور یہی حقیقت ہے...''

ہم نے واہموں سے الگ ہٹ کر، حقیقت کے حسن میں ڈوب کر زندگی گزار دی — آج دیدی نہیں ہے اور میں ہوں۔ میں ہوں اور میری یادیں ہیں۔ دیدی میری یادوں میں زندہ ہے۔ آنے والا کوئی کل مجھے نہ دیکھے گا۔ تب نہ میں رہوں گا، نہ میری یادیں رہیں گی، نہ دیدی رہے گی — حقیقت، سچ اور حسن کی زندگی بس اتنی ہے۔

دیدی ابھی چالیس کی بھی نہیں تھی، میں ابھی تیس کا بھی نہیں تھا — وہ بلا کی حسین اور جوان تھی، اور میری چاہتیں کہیں زیادہ گہری ہو چکی تھیں — ایک صبح، رات بھر دو جسموں کے ایک بنے رہنے کے بعد، میں نے جھینپتے ہوئے کہا: ''دیدی، کچھ تو زندگی کا کام کاج اور کچھ یہ وقتی تھکن مجھے آپ سے الگ کر دیتی ہے، ورنہ — سچ کہتا ہوں، آپ بہت خوبصورت ہیں اور میں پل بھر کے لیے بھی آپ سے الگ نہیں ہونا چاہتا، لیکن — لیکن دیدی، آج آپ کچھ زیادہ ہی پہلی نظر آ رہی ہیں!''

اس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں بھرتے ہوئے اور مجھے محبت بھری نظروں کے

ساتھ دیکھتے ہوئے کہا: ''میرے ڈاکٹر، آج کیا آفس نہیں جاؤ گے؟''

میں نے کہا: ''آپ ہی بتایئے، میں نے کبھی کوئی چھٹی لی ہے؟''

وہ بولی: ''نہیں، چھٹی تو کبھی نہیں لی لیکن — راجو، آج میرا ڈے آف ہے۔''

میں فوراً بول اُٹھا: ''تو آج میں آفس نہیں جاؤں گا — اور آپ مجھے روکیں گی نہیں۔''

وہ ہنس پڑی: ''پر تم تھکے ہوئے ہو!''

میرا چہرہ اس کے ہاتھوں کی گرفت میں تھا اور وہ مجھے محبت بھری نظروں کے ساتھ دیکھ رہی تھی — میں نے یک لخت، قدرے تیزی اور سختی سے، اس کی گرفت توڑ ڈالی۔ پھر میں بڑی شدت سے اس کے ہونٹ چومنے لگا، کاٹنے لگا۔ میرے ہاتھ اُس کے پستان نوچنے لگے۔ وہ ''راجو، راجو'' پکارتی رہی، پر میرے ہاتھوں نے سننے سے انکار کر دیا۔ میرے اندھے بہرے ہاتھوں نے، اِک جنون کے عالم میں اس کی ٹانگیں جیسے پھاڑ ڈالیں، اور پھر میں اس کے بدن میں پوری طاقت سے بغیر اجازت داخل ہو گیا۔ ایک میں تھا، ایک وحشت تھی اور ایک تھا فتور۔

جب میرے ہوش و حواس درست ہوئے، میں نے دیکھا، بیچارگی کی اِک عریاں اور پیلی پیلی مورت میرے بوجھ تلے دبی پڑی ہے اور رو رہی ہے۔

وہ رو رہی تھی اور اس کے ہاتھ میرا چہرہ سہلا رہے تھے — میں رونے لگا، سچ مچ رونے لگا۔ اس قدر رویا کہ اس کے آنسو تھم گئے: ''راجو میرے بچّے، چپ ہو جاؤ — مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو...''

میں بمشکل کہہ سکا: ''دیدی، کیوں میرا جرم اپنے سر لیتی ہیں آپ!''

''نہیں راجو، نہیں — تم نے کوئی جرم نہیں کیا — مجھے معاف کر دو، میں تمھارا ساتھ نہ دے سکی۔''

میں نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا — میں کانپنے لگا۔

وہ مجھے پڑھ لیتی تھی، اس نے مجھے پڑھ لیا: ''کچھ نہیں راجو، بس ذرا سی deficiency of iron...''

''دیدی...'' میں نے کبھی اپنی آواز میں اتنا درد محسوس نہیں کیا تھا — میں نے خود سے خاموش آواز میں پوچھا: ''کیا مہذّب سماج میں تم سا وحشی کبھی ہوا ہے؟''

اس نے پھر مجھے پڑھ لیا: ''نہیں راجو نہیں...'' وہ بڑے زوروں سے رونے لگی۔

رونے کی آواز کے دوران اِک ذرا سا کھٹکا ہوا — میں نے گردن گھما کر دیکھا، پردہ اٹھائے

ڈاکٹر کھرے دروازے میں کھڑے ہیں — سٹیتھوسکوپ ان کے بدن سے چپکا ہوا تھا۔

میں نے دیدی کے ننگے بدن پر چادر ڈال دی اور منہ موڑ کر جلدی سے نائٹ سوٹ پہن لیا۔

ڈاکٹر کھرے پلنگ کے قریب آئے۔ کچھ دیر وہ دیدی کو گھورا کیے۔ پھر انھوں نے جھک کر دیدی کی آنکھیں دیکھیں، انگلیاں اور ناخن دیکھے۔

انھوں نے دیدی کا ماتھا چومنے کے بعد میرا ماتھا چوما، پھر دیدی سے قدرے اونچی آواز میں صرف اتنا کہا: ''کیوں بیمار ہو تم؟ اس گھر میں کوئی بیمار کیوں؟'' وہ کمرے میں نہ رُکے، بس چلے گئے۔

''اس گھر میں کوئی بیمار کیوں؟''

میری آنکھیں بھر آئیں۔ دیدی رو رہی تھی — کون جانے، کسی اور کمرے میں ڈاکٹر کھرے کی آنکھیں نم تھیں یا نہیں۔ ہاں، اُن لفظوں کی سسکیاں دیدی کے کمرے میں دھڑک رہی تھیں۔

میں دیدی کے ساتھ لپٹ گیا — جانے کب تک لپٹا رہا۔

اس دن میں نے پہلی چھٹی لی — پھر تو چھٹیوں کا ایسا جان لیوا سلسلہ شروع ہوا کہ دن، دن نہ رہے اور راتیں، راتیں نہ رہیں۔ وقت ایک عذاب بن گیا۔

دیدی ایک ڈاکٹر تھی۔ وہ کہا کرتی تھی موت سے لڑا تو جا سکتا ہے، پر اس پر ہمارا اختیار نہیں۔ جب دیدی دوسرے مریضوں کی موت سے لڑتے لڑتے خود مریض بن گئی تو اس کی اپنی موت سے لڑنا ڈاکٹر کھرے کی ذمہ داری بن گیا — ایک ہوشمند ڈاکٹر کی ذمّے داری جو باپ کی ذمّے داری سے بڑی تھی۔

deficiency of iron تھی یا severe anaemia یا کچھ اور مصیبت، دیدی بستر ہی کی ہوکر رہ گئی — اسپتال کا ایک کمرہ، دیدی کا کمرہ بن گیا۔ وہ کمرہ، اس کمرے کی ایک کرسی، اس کمرے کے باہر طویل خاموش برآمدہ اور برآمدے میں پڑے بے جان بینچ میری زندگی بن گئے۔

میں دیدی کی دائیں جانب کرسی پر بیٹھا رہتا اور اسے تکے جاتا۔ نرم بستر پر سفید بے داغ چادر اور اس کا تھکا تھکا سا گورا زرد بدن اور بجھی بجھی سی آنکھیں۔ تھکی تھکی سی سانسیں اور اُداس بانہیں، نازک ہونٹ کہ بیچارگی سے کانپتے ہوئے بھور کے دیے۔ پستان کہ حسرتوں کے پرندے — مجھے ایسا لگنے لگا کہ میری آنکھیں زرد ہو گئی ہیں۔ جدھر دیکھتا، ہر شے زرد دکھائی دیتی۔

یہ میرے تب کے محسوسات ہیں۔ اُن دنوں مجھے ان کے معنی بوجھل دھند میں لپٹے ہوئے دکھائی دیتے تھے — آج بھی صورت کم و بیش وہی ہے۔

اس کے بائیں ہاتھ کی نیلی رگ میں سوئی پیوست رہتی۔ کبھی نمکین پانی، کبھی گلوکوز اور کبھی

خون، بوند بوند، اس کے جسم میں اُترتا رہتا — جب اس کے جسم میں کافی مقدار میں خون اُتر جاتا تو اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی پھیل جاتی۔ تب اس کی رگ میں سے سوئی نکال لی جاتی۔ مگر تیسرے چوتھے روز وہی عمل پھر شروع ہو جاتا۔

ایک گہری رات کی خاموشی میں اس نے کہا: ''کبھی کبھی وقت کا نام بدل جاتا ہے۔ گولیاں، کیپسول، انجکشن اور نہ جانے کیا کیا وقت کی پہچان بن جاتے ہیں — میرے اچھے راجو، آج میرے بدن میں سرخی کی ہلکی سی حرارت برقرار ہے — مجھے چوم لو، آج مجھے چوم لو...''

صبح ہونے سے پہلے، پرندوں کے جاگنے سے پہلے، دیدی مرگئی۔

مجھے ٹھیک سے پتا نہیں کہ ڈاکٹر کھرے کے نزدیک دیدی کی موت ایک مریض کی موت تھی یا بیٹی کی موت — انھوں نے لاش کا ماتھا چومنے کے بعد، لاش کا منہ چادر سے ڈھک دیا۔ میرے قریب آ کر انھوں نے میرا ماتھا قدرے زور سے دبایا اور بنا کچھ کہے دوسرے مریضوں کو دیکھنے چلے گئے۔

شام ہونے سے پہلے پہلے ہم نے اس خوبصورت جسم کو، جسے پچھلی ہی رات میں نے چوما تھا، پھونک ڈالا — آسمان کی جانب لپکتی وہ سنہری لپٹیں سدا کے لیے میری آنکھوں میں بس گئیں۔

دیدی کو رخصت ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں اور میں کئی برسوں سے دیدی کے کمرے میں رہتا ہوں — دن بھر کام کاج کرتا ہوں۔ نہ کبھی تھکتا ہوں، نہ کبھی بیمار ہوتا ہوں۔ فرصت کے کربناک لمحوں میں دوستوں کے ساتھ بے مقصد گفتگو کرتا ہوں — شب و روز کا یہ اُکتا دینے والا سلسلہ اِک جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں...

اس روز ایک جانی پہچانی صورت نے، جسے سب لوگ سیما کے نام سے پکارتے ہیں اور جسے میں نے کبھی دوست بھی نہیں کہا، محبت کا اظہار کیا تو میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا — وہ پھٹ پڑی: ''تم ایک بیمار آدمی ہو — ایک مریض — ایک لاعلاج مرض کے مارے ہوئے...''

میں چپ رہا۔

جب وہ قدم پٹختی ہوئی چلی گئی تو مجھے محسوس ہوا، میں نے انجانے میں اسے بہت دکھ دیا ہے۔

میں نے سوچا، چند ننگے بُچّے جملے لکھ کر ایک صحت مند لڑکی کو سمجھا دوں کہ مجھ سا بیمار شخص اسے کبھی کوئی سکھ نہیں دے سکتا...

بس چند جملوں پر مشتمل چھوٹا سا خط پوسٹ کرنے کے ارادے سے بے دھیانی میں سڑک کراس کر رہا تھا کہ دائیں جانب سے بس آن دھمکی۔ اس ایک پل میں میرے دھیان میں بس اتنی

سی بات آئی: قصہ تمام سمجھو، قصہ ختم کر دو...

جب مجھے ہوش آیا، میں نے دیکھا، میں ہسپتال میں پڑا ہوں اور ڈاکٹر کھڑے مجھ پر جھکے ہوئے ہیں...

آپ مجھ پر خودکشی کی ناکام کوشش، عدالت کی توہین اور فحاشی کے الزام میں مقدمہ چلا سکتے ہیں...

بیان کہیے، کہانی کہیے یا واردات، اسے میرے دوست راج نے لکھا تھا۔

کوئی آٹھ مہینے پہلے ایک رات دس بجے کے قریب مجھے اطلاع ملی کہ راج ایک حادثے میں بُری طرح زخمی ہو گیا ہے اور نازک حالت میں اسپتال میں پڑا ہے۔

میں فوراً اسپتال پہنچا — اسے اس بُری حالت میں دیکھ کر اِک چوٹ تو دل پر لگی ہی، یہ جان کر حیرت بھی ہوئی کہ وہ حادثہ ایک اتفاق نہیں، خودکشی کی کوشش تھی اور تعزیرات ہند کے مطابق یہ ایک جرم ہے — راج حراست میں زیر علاج تھا۔

میں نے پولیس کی فائل میں راج کا ایک خط پڑھا جو سیما کے نام تھا:

سیما،

جب دو جنتے دل و جان سے ایک دوسرے میں ڈوب جاتے ہیں تو ایک تعلق جنم لیتا ہے جسے دل والے 'زندگی' کہتے ہیں — اب 'زندگی' میرے بس میں نہیں۔

نادان لڑکی — میرے ساتھ عمر بتانے کا مطلب ہے، تنہائی میں پل پل مرنا — تمھارا دم گھٹ جائے گا۔

موجِ سراب کو موج نہیں کہتے۔

پھر میرا کیا ہے، کیا خبر — لاعلاج مرض کا مارا جانے کب خودکشی کر لے — کل، آج، ابھی!

جب بہت دن کے بعد وہ اس قابل ہوا اور اسے اجازت ملی کہ وہ تھوڑی بہت گفتگو کر سکتا ہے تو میں نے بڑی وحشیانہ صاف گوئی کے ساتھ اس سے پوچھا: ''یہ تمھیں خودکشی کرنے کی کیا سوجھی؟''

اس نے تیکھے لہجے اور قدرے اونچی آواز میں کہا: "کیا بکتے ہو؟"

میں چونکا، سنبھلا اور میں نے کہا: "راج، اتنی تیزی اچھی نہیں۔ تمھاری جان ابھی خطروں میں بُری طرح پھنسی پڑی ہے — کیا تمھیں ڈاکٹر کھرے نے کچھ نہیں بتایا؟"

وہ بہت دیر تک چپ رہا۔ میں اسے دیکھتا رہا — پھر اس نے بڑے اطمینان سے بڑی نحیف آواز میں اپنی بات کہی: "تعجب ہے، تم ڈاکٹر کھرے کو اب تک سمجھ نہیں پائے — ان کا بنیادی سروکار، موت اور موت سے جنگ لڑنا ہے — میں ان کا راجو نہیں، ان کا مریض ہوں، وہ یقیناً میری جان بچانے میں مصروف ہوں گے — انھیں زندگی کے دیگر مسائل کا اتا پتا تو ہے، پر ان کی دلچسپی واجبی سی ہے — تم بتاؤ، چکر کیا ہے؟"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ چکر کیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں اپنی اُلجھن دور کر سکا — میں نے دھیمی آواز میں، کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہوئے، حادثے اور خط کا ذکر کیا — یہاں میں یہ کہنا ضرور چاہوں گا کہ اس کا خط، اسے ایمبولینس میں ڈالنے کے بعد، پولیس کو جہازی بس کے پچھلے پہیوں کے نیچے دبا پڑا نظر آیا تھا۔

میری بات سن کر جیسے وہ زمانوں تک چپ رہا۔ پھر اس نے کہا: "کبھی کبھی اتفاق انسانی شعور کا کرشمہ بن جاتا ہے، مگر عام طور پر اتفاق انسانی تجربے میں عذاب کے علاوہ اور کچھ بن نہیں پاتا — یہ سچ ہے کہ میں نے ایک قیمتی جان کو مار ڈالنا چاہا۔ ناکام کوشش کے عذاب کے ساتھ ساتھ میں وہ سزا بھی بھگتوں گا جو قانونی طور پر میرے پلّے باندھی جائے گی..."

میں آس پاس بھول گیا، درو دیوار بھول گیا۔ یہ بھول گیا کہ کہاں بیٹھا ہوں اور کیوں بیٹھا ہوں — میں نے بڑی غصیلی آواز میں کہا: "یہ کیا بیہودگی ہے؟"

اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا: "بیہودگی صرف اتنی ہے کہ میں نے خودکشی کی کوشش کی — میں عدالت میں ایک بیان دینا چاہوں گا کہ عدالت ایک فرد کو مجرم ٹھہرانے سے پہلے اچھی طرح جان تو لے!"

اس کی ذہنی اور جسمانی حالت نازک تھی، پھر بھی وہ کئی دنوں تک ڈھیرے ڈھیرے بیان لکھنے کے جان لیوا عمل میں مصروف رہا۔

ابھی اس کا بیان مکمل نہیں ہوا تھا جب میں اسے شام کو نسبتاً بہتر حالت میں چھوڑ کر گیا — آدھی رات کے وقت مجھے اطلاع ملی کہ اس کی موت ہو گئی ہے۔

وہ مرنے سے پہلے اپنا بیان مکمل کر چکا تھا۔

راج کی زندگی کے واقعات کو 'انسانی تماشا' کہا جا سکتا ہے۔

کوئی نہیں جانتا کہ اس کا بیان پولیس کی فائل سے کیسے باہر نکلا، کس نے اس بیان کی نقلیں تیار کیں، کیوں کر وہ نقلیں ہمارے شہر کے پڑھے لکھے لوگوں تک پہنچیں!

آج حالت یہ ہے کہ لڑکیاں اس بیان کو سہیلیوں میں بانٹتی ہیں، نو جوان اسے بار بار پڑھتے ہیں اور شہر کے معزز لوگ اس کا ذکر سنتے ہی سیخ پا ہو جاتے ہیں۔

OO

(غیر مطبوعہ: ۱۹۸۱ء)

There exist no words, in any human language, which can comfort guinea pigs who do not know the cause of their death.

—— A Hiroshima Survivor

میں کوئی بیس برس کے بعد بھارت لوٹا تھا۔

میں نے دانستاً 'بھارت' لکھا ہے — میں بنا کسی نفسیاتی اُلجھن کے 'وطن' لکھ سکتا ہوں۔ مجھے 'وطن' کے وہ معنی معلوم ہیں جو مجھے سکھائے گئے تھے، پڑھائے گئے تھے، اور مجھے وہ معنی بھی معلوم ہیں جو میں نے اپنی نامراد پیدائش کے برسوں بعد خود دریافت کیے تھے۔ میرے دریافت کردہ معنی اِک ذرا سے فرق کے ساتھ وہی تھے جو مجھے سکھائے گئے تھے، پڑھائے گئے تھے۔ یہ ذرا سا فرق یقین اور اندھے یقین کی تفریق تھا — اب یہ الگ بات ہے کہ بیسویں صدی کی اس نویں دہائی کے نصف آخر میں 'وطن' کے معنی گھس گھسا کر بدشکل ہو گئے ہیں، اکیسویں صدی میں نئی تعلیم کے تحت نئے معنی کیا ہوں گے، یہ آپ راج پتھ پر 'حکمران — رعایا' کا کھیل کھیلنے والے لونڈوں سے پوچھ سکتے ہیں۔

تو میں نے دانستاً 'بھارت' لکھا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اب بھارت میرا وطن نہیں ہے۔ یا اس لیے بھی نہیں کہ اب مغربی یوروپ کا ایک ملک میرا وطن ہے — میری اُلجھن یہ ہے کہ اب میرا قلم بدشکل معنوں والے الفاظ نہیں لکھ سکتا۔

میرا پہلا پڑاؤ دارالسلطنت تھا۔

میں نے دانستاً 'دارالسلطنت' لکھا ہے — میں بنا کسی نفسیاتی اُلجھن کے 'دِلّی، نئی دِلّی' لکھ سکتا ہوں۔ میری دِقت یہ ہے کہ مجھے 'دارالسلطنت' کے صدیوں پرانے اور آزمائے ہوئے معنی معلوم ہیں — اتہاس کے ایک خستہ اور یک رنگ ورق کے فضول و بے معنی اضافے کے باوجود سلطنت وہی بیس برس پرانی ہے۔ اور دِلّی، نئی دِلّی کہ فرنگیوں کی حکومت اور لوٹ کھسوٹ، افسوسناک اور احمقانہ تقسیم، اجڑے بچھڑے اور زخمی مہاجرین کی آمد اور تشدد کے ہاتھوں عدم تشدد کے قتل کے باوجود تہذیب اور تمدن کا اِسم تھی، اب حماقت و نااہلیت کے سبب بدرنگ سیاسی لغت کا ایک بے جان و بے زمین اوّل جلول لفظ بن کر رہ گئی ہے۔

میرا پہلا قدم، غیر متوقع طور پر، اجنبیوں کے درمیان تھا۔

کیا وقت کا فاصلہ محسوسات کو اجنبی بنا دیتا ہے؟

کیا صادق و سالم محسوسات اجنبی اور انجانے فاصلے کم نہیں کرتے؟

میں دوستوں کے درمیان تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں دوستوں کے درمیان ہوں؛ پھر کیا ہوا کہ میں نے محسوس کیا، میں اجنبیوں کے درمیان ہوں۔

ہمارے درمیان کچھ برسوں کا فاصلہ تھا، ہمارے درمیان چند سرحدوں کا فاصلہ تھا — ہماری دردمندی سرحدوں کے فاصلوں کی کاٹ تھی؛ وقت کے فاصلوں کو ہم رنگ روپ کی غیر اہم تبدیلی، سماجی ذمے داریوں کی کمی بیشی اور دائمی نیند سمجھتے تھے؛ اور یہ صرف بیس برس پہلے کی بات ہے۔

ایسی ستھری اور کھری سوچ کو زنگ کیسے لگ گیا — ہمارے محسوسات میں تو کتابوں میں مرے ہوئے لوگ بھی دھڑکا کرتے تھے۔

میں نے بُری طرح محسوس کیا کہ درخشاں مشترکہ ماضی اور مضبوط گہرے تعلقات کے حوالے سے میری سوچ منفی ہے، اور میری منفی سوچ میری یاترا کو یقیناً ایک مایوس کن سفر میں تبدیل کر دے گی۔

اپنی ہی سوچ کو منفی قرار دینا ایک مثبت ردِ عمل تو تھا، مگر وہ ردِ عمل متوازی خطوط پر رواں تھا — سوچ اور سوچ کا فوری مخالف ردِ عمل پچاس برس کی عمر کے ایک آدمی کو خراب کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

کیا میں بیس برس کے بعد صرف خراب ہونے کے لیے بھارت لوٹا تھا؟

دوستوں میں اجنبی دوستوں کی متصادم شناخت نے برسوں بعد کی پہلی ملاقات کی ابتدائی گھڑیاں بوجھل احساس میں منتقل کر دیں اور میں نے چپ چاپ اور آپ سے آپ طے کر لیا کہ میں کسی واجبی سے ہوٹل یا مناسب سے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہروں گا اور ایک بار پھر گھر کے واسطے ترسوں گا۔

اگر گھر کے معنی چار دیواروں میں مقید ایک مختصر سا خطۂ زمین ہے تو میں کبھی بے گھر نہیں تھا، کبھی بے گھر نہیں تھا اور نہ اب ہوں — بے در و دیوار سے گھر کی چاہت مجھے یوں متاثر نہ کر سکی تھی کہ اپنی یا کسی اور کی فطری قنوطیت کبھی میری رگوں کو اینٹھ نہ سکی تھی؛ ہاں جذبوں کی شدت نے بارہا اور قدم قدم پر دیوار و در مسمار کیے تھے۔

گھر کے ہونے کے احساس کی نفی میری زندگی کا مرکز تھی اور گھر کے نہ ہونے کا دُکھ، حسرت نہ ہوتے ہوئے بھی، میری دُکھتی رگ کی مسلسل و متواتر دھڑکن تھا۔

احساس کی بھول بھلیاں نہ جینے دیتی تھیں، نہ مرنے دیتی تھیں — جسم موٹی کھال کے ہوں

تو گھر تو کیا، شہر اور ملک تک اختیار میں ہوتے ہیں۔

میرے انکار سے قاف کو بڑی خوشگوار مایوسی ہوئی کہ مجھے اس کے گھر قیام کرنا تھا؛ وہ گھر جس کی خوبصورتیوں کی تصویریں اس نے مجھے بھیجی تھیں؛ وہ گھر جسے وہ اپنی کہانیوں میں جہنم کہتا تھا—محسوسات کے باریک تضاد کو سمجھنا اور پھر اسے سر کرنا غریب سرکاری اردو کہانی کار افسر کے بس کی بات کہاں؟

میرا انکار اور قاف کی خوشگوار مایوسی— مجھے محسوس ہوا، میرے پہلے قدم کا رُخ صحیح ہے۔

وہ دوست کہ اجنبی تھے، وہ اجنبی کہ دوست تھے، میں نے ان سے کہا: "اگر تم لوگ محسوسات کو غلط معنی دینے کی علّت میں گرفتار نہیں ہوئے ہو تو مجھے اب اجازت دو...!"

جی ہاں، میں نے سوچا ہوا جملہ بولا تھا—اپنے محسوسات کو لفظوں میں ڈھالنا میرے بس میں تھا؛ میرا حق بھی تھا؛ اور لفظوں کا انتخاب میرے اختیار میں تھا۔

ان کے اختیار میں ایئرپورٹ سے ان کی واپسی تھی۔

میں دارالسلطنت میں تھا۔

میں سالم ہندوستان کے صوبہ سرحد میں نہیں تھا؛ جہاں میں نے دوسری جنگ عظیم کے ابتدائی دنوں میں پہلی بار اسکول کا منہ دیکھا تھا؛ جہاں لنڈا دریا بہتا تھا؛ اور جہاں میرے بچپن میں میرے ذہن میں خوفناک تعصبات ٹھونس دیے گئے تھے کہ لمبی جھول کھاتی ملیشیا کی قمیصیں اور شلواریں پہننے والے پٹھان بچّوں کو اپنے جھولوں میں ڈال کر لے جاتے ہیں اور پھر ان کی کھوپڑیوں سے مومیائی نکالتے ہیں۔

میں دارالسلطنت میں تھا۔

میں تقسیم شدہ بھارت کے تقسیم شدہ پنجاب میں نہیں تھا جہاں، مجھے بتایا گیا تھا، دو آبے میں ہم سات پشتوں سے رہتے چلے آئے ہیں؛ جہاں میں نے دہکتی گرمیوں میں اور ٹھٹھرتی سردیوں میں دھرتی کے انگ انگ میں تڑپتے اور مچلتے حسن و عشق کی بو باس محسوس کی تھی؛ جہاں، دیگر نئے اور پرانے صوبوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی، صدیوں پرانا اور زنگ لگا مذہبی جنون آج روشنی اور گیان کی ہر کرن کو داغدار کر رہا ہے۔

میں بھارت میں تھا۔

بھارت جہاں بیس برسوں میں، طول و عرض میں، ارباب اقتدار کی نہ ہونے کے برابر یا کمزور

خود اعتمادی کے سبب ہزاروں اسکولوں، کالجوں، گلیوں، محلوں، بازاروں، کالونیوں اور نگروں کی اُکتا دینے والی پہچان کا وسیلہ وزیر اعظم اور وزیر اعظم کے رشتے داروں کے نام ہیں۔

میں نے نو تعمیر شدہ بین الاقوامی ایئرپورٹ سے، جو مقتول وزیر اعظم کے نام سے سجایا گیا تھا، اپنی باری کے نمبر کا اسکوٹر پکڑا۔

اہم اور غیر اہم غیر ملکی نگاہوں سے صدیوں پچھڑے پالم گاؤں کی جہالت وحماقت چھپانے کی خاطر اٹھائی گئی بے سود دیواروں کا سلسلہ ختم ہوا تو میں نے جھولتے پٹوں اور قینچی پھری داڑھی مونچھوں والے اسکوٹر ڈرائیور سے کہا: ''بادشاہو، یہ شہر کبھی میرا شہر تھا... میں بیس برس کے بعد لوٹا ہوں... مجھے کسی ایسے ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں لے چلو جو اچھا بھی ہو اور سستا بھی!''

اسکوٹر ڈرائیور نے میری بات سنی، رفتار ذرا دھیمی کی، گردن گھما کر ذرا کی ذرا میری طرف دیکھا اور زیرِ لب مسکرایا؛ پھر اس نے واپس گردن گھما کر رفتار تیز کر دی۔

میرے ایک لمبے تڑنگے پٹھان پاکستانی ناول نگار دوست نے مجھ سے یوروپ میں کہا تھا: ''بھارتی اسکوٹر ڈرائیور پاکستانی اسکوٹر ڈرائیوروں سے لاکھ درجے شریف، ایماندار اور مہذب ہیں... پاکستان میں تو ان کو نہ خدا کا خوف ہے، نہ ضیاء الحق کا...!''

میں نے شرارتاً اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے اپنے دوست سے پوچھا تھا: ''ضیاء الحق تو ہے... کیا اس کا ہونا خدا کے ہونے کا ثبوت ہے؟''

میرا پاکستانی دوست، جو دس برس سے جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے، میری بات سن کر چڑ گیا تھا اور اس نے تقریباً بوکھلا کر بڑے سخت اور اونچے لہجے میں کہا تھا: ''یہ تم اپنے ان بھارتی پروفیسر ادیبوں سے پوچھو جو ضیاء الحق سے تمغے اور تحفے وصول کرتے ہیں... حرام زادے!''

خدا کے ہونے یا نہ ہونے کی بات الگ ہے، ہاں میرے دوست کا غصہ سچائی کی نفی نہیں تھی۔

اُردو کے ان ادیبوں نے ایمرجنسی کی سیاہی میں مادام اور مادام کے حواریوں کے تلوے بھی چاٹے تھے۔

خیر۔

مجھے یہ نہیں دیکھنا تھا کہ ایک سیکولر ریاست میں اسکوٹر ڈرائیور خدا سے خوف کھاتے ہیں یا مقتول وزیر اعظم کے وزیر اعظم بڑے بیٹے سے—شرافت، ایمانداری اور تہذیب کسی خدا یا خدا کے کسی بندے کا خوف نہیں، آدمی کی تربیت اور معاشرے کی صحت کی علامت ہے۔

میں مطمئن تھا — اسکوٹر ڈرائیور کی خاموش زیرِ لب مسکراہٹ سے میں صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچ سکتا تھا یا پہنچنا چاہتا تھا کہ وہ بھلا بھی ہے اور باخبر بھی۔

چوڑی اور ہموار سڑکوں پر ایک پرشور لے میں بھاگتے ہوئے اسکوٹر کی رفتار میں اس وقت کمی آجاتی جب پولیس کی ناکہ بندی قریب ہوتی — ہر کلو میٹر ناکہ بندی تھی۔

ایمرجنسی کے زمانے میں ایسی ہی ناکہ بندیوں کی تصویریں یوروپ کے مختلف اخبارات میں اکثر دکھائی دیا کرتی تھیں — وہ زمانہ، جو برسوں کی کٹھن طوالت لیے مہینوں میں ختم ہوگیا تھا، ہم لوگوں کے لیے جان توڑ مصروفیت کا زمانہ تھا؛ ہم لوگوں نے ننگے خالی ہاتھوں اور دہکتے ہوئے لفظوں کے ساتھ مادام کی ایمرجنسی کے اشتہار بازوں کا یوروپ کے ہر شہر میں پیچھا کیا تھا اور انھیں قدم قدم پر شرمندہ کیا تھا — ہمیں ذرہ برابر ڈر نہیں تھا کہ ہماری پہچان کا واحد وسیلہ، ہمارے پاسپورٹ منسوخ کردیے جائیں گے؛ ہمیں ذرہ برابر خوف نہیں تھا کہ ماروتی تجربے کا نااہل وناکام، مادام کا لاڈلا بگڑا ہوا چھوٹا بیٹا ہماری جان کا دشمن بن جائے گا — ہماری اپنی ہی کوشش پس ماندہ تیسری دنیا کے ایک بڑے ملک میں جمہوریت کی حفاظت تھی — غربت اور جہالت کی مکروہ لعنتوں کے باوجود ایک سیکولر جمہوریت کی بنیاد یوروپ میں ہمارا سر اونچا کیے ہوئے تھی اور کہ اسی جمہوریت کو مادام شخصی حکومت میں منتقل کردیں، ہمیں قبول نہ تھا۔

یکایک اسکوٹر ڈرائیور نے گردن گھما کر پوچھا: ''آپ نے کلکتہ دیکھا ہے؟''

میں چونکا۔

اسکوٹر رنگ روڈ پر میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کراسنگ پر سبز سگنل کی آنکھوں کے اشارے کا منتظر تھا۔

''کلکتہ...؟'' میں نے کہا: ''کیوں؟''

''کلکتہ محفوظ جگہ ہے!'' اس نے جواب دیا۔

مجھے شرارت سوجھی: ''ہاں، اگر وہاں فٹ بال میچ نہ ہو رہے ہوں تب!''

''مطلب؟'' وہ ذرا پریشان ہوگیا۔

میں مسکرادیا: ''یہی کہ میں نے کلکتہ دیکھا ہے، لیکن پچیس برس پہلے۔''

سرخ سگنل کے بعد زرد سگنل کی آنکھ دم بھر کو روشن ہوئی، پھر سبز سگنل کی آنکھ جل اٹھی اور اسکوٹر نے دھیرے دھیرے رفتار پکڑ لی۔

کوئی دو کلو میٹر کے بعد اسکوٹر دائیں ہاتھ کو مڑا اور ایک لین میں کوئی سو میٹر چل کر سلیٹی رنگ

کی ایک صاف ستھری عمارت کے سامنے رُک گیا۔

''آپ اس علاقے کو پہچانتے ہوں گے؟'' اسکوٹر ڈرائیور نے گردن گھما کر پوچھا۔

میں نے کہا: ''کچھ کچھ... ساؤتھ ایکسٹینشن ہے نا...! ساؤتھ دلی۔''

''جی ہاں... دولتیوں اور نو دولتیوں کا علاقہ۔''

''لیکن تم مجھے اس علاقے میں کیوں لے آئے ہو...؟ میں تو بھائی ایک مزدور پیشہ شخص ہوں۔''

وہ مسکرایا: ''اس لیے کہ بھارت میں ڈالر، پاؤنڈ، مارک اور فرانک کے دام ان کی قیمت سے زیادہ ہیں...!''

اب میں مسکرایا: ''مطلب؟''

''یہی کہ یہاں آپ آرام اور آسانی سے رہ سکیں گے۔''

میں خاموش رہا — میں سوچ رہا تھا۔

''آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ہم اسکوٹر ڈرائیوروں کو ہر ہوٹل اور ہر گیسٹ ہاؤس سے کچھ کمیشن ملتا ہے...''

میں نے اس کی بات کاٹ دی: ''لیکن تم اسکوٹر ڈرائیور نہیں ہو!''

''جی...! کیا کہا؟'' وہ بوکھلا گیا۔

''میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، تم اسکوٹر ڈرائیور نہیں ہو... تم نے کس سبجکٹ میں ایم. اے. کیا ہے؟''

اس نے کہا: ''آپ تو مذاق کر رہے ہیں!''

میں نے کہا: ''ایم. اے. پاس شہری کا اسکوٹر ڈرائیور ہونا، مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟''

اس نے کہا: ''یا تو آپ بیس برس بعد نہیں لوٹے ہیں، یا پھر میں اسکوٹر ڈرائیور نہیں ہوں۔''

میں نے کہا: تمھاری بات صحیح ہے۔ میں پچھلے بیس برسوں میں، ذہنی طور پر، بھارت ہی میں رہا ہوں۔ پھر میرا لوٹنا کیا... میری بات بھی صحیح ہے کہ تم اسکوٹر ڈرائیور نہیں ہو....''

اُس نے کہا: ''پر آپ جانتے ہیں کہ آپ ایئر پورٹ سے، یہاں ساؤتھ ایکسٹینشن تک، میرے ہی اسکوٹر سے پہنچے ہیں۔''

میں نے کہا: ''پر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہر اسکوٹر ڈرائیور، اسکوٹر ڈرائیور نہیں ہوتا۔''

چند لمحوں تک وہ خاموش رہا — وہ چند لمحے، جو اپنی عمر سے لمبے تھے۔

پھر اس نے کہا: "آپ کی بات صحیح ہے۔ کروڑوں لوگوں کے اس ملک میں لاکھوں گریجویٹ موجود ہیں۔ ایم. اے. بھی کم نہیں ہوں گے... ان میں سے ایک میں ہوں اور میں اسکوٹر ڈرائیور نہیں ہوں... بس یوں سمجھ لیجیے، ایک ناکردہ جرم کی سزا کاٹ رہا ہوں۔"

اس نے کہا تھا کہ وہ ایک ناکردہ جرم کی سزا کاٹ رہا ہے — اور ساؤتھ ایکسٹینشن کی اس سلیٹی رنگ کی عمارت کے ایک کمرے میں (جس کا نام 'اے ون گیسٹ ہاؤس' ہے) سامان رکھتے ہوئے میں نے اسے کہنا چاہا تھا: دوست، کون جانے کس نے کس ناکردہ جرم کی سزا پائی ہے — پر میں نے کہا: "دوست، سواریاں ڈھونے اور سڑکیں روندنے سے فرصت ملے تو کسی شام چلے آنا... ممکن ہے سزا کی ایک شام سہل ہو جائے۔"

OO

(نامکمل: وجہ نامعلوم: ۱۹۸۵ء)

دو آٹو گراف اور ایک خط

پہلے دو آٹوگراف پیش کرتا ہوں:

۱۔ منٹو اگر اتنا بڑا انسان بھی ہوتا، جتنا بڑا فنکار تھا
تو شاید ہمیں اس کا ماتم اتنا جلد نہ کرنا پڑتا۔

فیض

۲۔ اسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ
وہ بے حجاب سہی، میں تو بے حجاب نہیں

حفیظ (جالندھری)
۲-۳-۵۸

اب ایک خط سے اقتباس پیش کرتا ہوں:

''منٹو پر مضمون میں نے صرف اس لیے نہ لکھا کہ یہ چیز بیچنے والے یہ چیز بیچ لیں تو میں لکھوں۔ سرت چیٹر جی کے 'دیوداس' میں دیوداس کے باپ کی وفات پر ایک رسمی طور پر چھاتی پیٹنے والا آتا ہے لیکن دیوداس اسے دنیادار، بڑے بھائی کی طرف بھیج دیتا ہے۔ صرف یہ کہتے ہوئے — 'اُدھر!' میں نے سب کو 'اُدھر' بھیج دیا ہے۔''

راجندر سنگھ بیدی
۱۱/مارچ ۱۹۵۹ء

منٹو کی موت کے چند ماہ بعد جیل سے رہا ہونے پر فیض صاحب یوم اقبال کے موقعہ پر راجہ غضنفر علی خاں کی دعوت پر دلّی تشریف لائے تھے۔ 'گلِ رعنا' میں مشاعرہ تھا۔ میں نے موقع پا کر اپنی آٹوگراف بک ان کے سامنے بڑھا دی۔ وہ کچھ لکھنے لگے تو میں نے کہا:

''فیض صاحب! کچھ منٹو کے بارے میں! میں آپ کے تاثرات جاننا چاہتا ہوں!''

فیض صاحب میری طرف دیکھنے لگے۔ کافی دیر تک وہ سوچتے رہے اور پھر انھوں نے پہلا

آٹوگراف لکھ دیا۔

اسی طرح سر سری رام کے مشاعرے میں کافی رات گئے، میں نے حفیظ جالندھری صاحب کو صوفے پر تنہا بیٹھے پکڑ لیا اور اپنی آٹوگراف بک ان کے ہاتھوں میں تھما دی۔

''حفیظ صاحب! کچھ منٹو کے بارے میں کہ آپ اب تک خاموش رہے ہیں!''

حفیظ صاحب نے میری طرف دیکھا اور پھر انھوں نے میری آنکھوں کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپتے ہوئے کہا:

''ہماری مشرقی تہذیب میں کچھ شرم ہوتی ہے!''

اور پھر انھوں نے دوسرا آٹوگراف لکھ دیا۔

بیدی صاحب سے میری ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی اور اس ملاقات میں منٹو کے بارے میں طویل بات چیت بھی ہوئی تھی۔ ۱۹۵۹ء میں ان کی کہانی 'اپنے دکھ مجھے دے دو' پڑھنے کے بعد میں نے انھیں بمبئی کی ملاقات کے حوالے سے ایک خط لکھا اور منٹو کا ذکر بھی کیا۔ انھوں نے خط کا طویل جواب دیا اور منٹو کے بارے میں بھی لکھا جو میں نے اوپر پیش کیا ہے۔

کہتے ہیں، بڑے ادیب کی ہر تحریر، اس کی تخلیقات ہوں، خط ہوں یا آٹوگراف، اس کی ذات کا آئینہ ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے — فیض صاحب منٹو کو بڑا فنکار (کتنا بڑا، یہ مجھے پتہ نہیں) مگر کم بڑا (کتنا کم، یہ بھی مجھے پتہ نہیں) انسان سمجھتے ہیں — ان کی بات میں بڑا تضاد ہے، شاید ان کا مارکسی ذہن منٹو سے بے باک انسان کو قبول نہیں کرتا ورنہ وہ یوں فنکار اور انسان میں خط نہ کھینچتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ''اپنے دور میں انھیں فراق سے کوئی ربط نہیں، منٹو کا وہ کوئی ذکر نہیں کرتے''[1] — فنکار اور انسان میں یوں تمیز کرنے والا کہاں تک بڑے ادیبوں کی صف میں آتا ہے، یہ فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میرے ایک ادب نواز دوست نے فیض صاحب کا آٹوگراف پڑھ کر 'نقشِ فریادی' اور 'دستِ صبا' کھڑکی سے باہر پھینک دی تھیں۔

حفیظ صاحب نے منٹو کو بے حجاب کہتے ہوئے خود کو مشرقی حیا کا علمبردار کہا ہے — میں نے انھیں سر سری رام کے مشاعروں میں لہک لہک کر 'ابھی تو میں جوان ہوں' پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اُن کی آنکھوں میں عجیب سی چمک ہوتی ہے اور ان کے منہ کا زاویہ کچھ اس طرح بدل جاتا ہے کہ ان کی منٹو کے بارے میں رائے مضحکہ خیز محسوس ہوتی ہے — اس کا فیصلہ بھی آپ خود کریں۔

---

[1] مظفر علی سید

رہ گئے بیدی صاحب! انھیں آپ ان کے ادب سے جانیے یا ان کی کسی اور تحریر سے جیسے کہ یہ خط، وہ ایک فنکار، ایک انسان کے رُوپ میں سامنے آتے ہیں۔

آخر میں منٹو کا ایک مشہور آٹوگراف پیش کرنا چاہتا ہوں جو منٹو کو انسان یا فنکار میں رکھنے کی جگہ منٹو کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

۷۸۶

''کتبہ''

یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔ اس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری کے سارے اسرار و رموز دفن ہیں — وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا۔

سعادت حسن منٹو

۱۸؍اگست ۱۹۵۴ء

OO

تنبولا

وہ جو مثلِ موجِ ہوا شہر شہر گھومتے ہیں[1]، جانتے ہیں کہ اس ملک میں جینے کی... سانس کے آنے جانے کی نہیں، "بہ ہوش و حواس گاڑی ہانکنے کی"، جس میں مرنا بھی شامل ہے، دو علامتیں ہیں: کلکتہ اور بمبئی۔ جدید ادب کی تخلیق اور بقا کے لیے ہمیں ایک علامت کو جینا ہوگا اور ایک کو رد کرنا ہوگا۔

محمد حسن عسکری جنھوں نے مغرب کے ادب کو سمجھا ہے، کی میکارتھی ازم کے زمانے کی ایک تحریر ہے...

> "آج کل ہمارے ملک میں مغربی ادب کا ذکر کچھ بدتمیزی یا بداخلاقی کی علامت سمجھا جانے لگا ہے کیونکہ ہمارے نقادوں کے خیال میں ہماری زندگی اور روایت یوروپ سے بالکل الگ ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن آج کل ہمارے درمیان ایک چیز مشترک ہے اور وہ روایتوں سے بھی زیادہ سنگین ہے یعنی ایٹم بم سے فنا ہوجانے کا خطرہ۔ اگر ساری انسانیت کو ایٹم بم سے نیست و نابود ہونا ہے تو تنقیدی مضامین ہمیں اس موت سے نہیں بچا سکتے لیکن فنا ہونے سے پہلے ہمیں یہ تو سمجھ لینا چاہیے کہ آخر ایٹم بم ہمارے سروں پر کیوں گریں گے؟"

('انسان اور آدمی' اشاعت اکتوبر ۱۹۵۳ء)

یہ اس قد آور ادیب محض کی تحریر ہے جو ideological convictions کی کمی کے کارن ایٹم بم سے فنا ہوجانے کے خطرے کو روایتوں سے بھی زیادہ سنگین سمجھتا ہے اور یوں پندرہ بیس برسوں میں مرکھپ جاتا ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا، ایٹم بم سے فنا ہوجانے کا خطرہ اسلامی ادب کی تحریک چلانے سے ٹلا نہیں کرتا۔ محمد حسن عسکری کی موت یقینی تھی۔ اگر کل وہ اپنی کم علمی (یوں وہ بہت پڑھے لکھے ہیں) کے کارن نہ مرتے تو آج بنگلہ دیش کی کہانی اُن کی موت کا سبب بنتی۔

---

[1] اُردو کے جدید ادیبوں میں ایسے کتنے ادیب ہیں، یہ ایک الگ سوال ہے۔

ممکن ہے آپ پوچھیں، کلکتہ، بمبئی اور بنگلہ دیش کا جدید ادب سے کیا سمبندھ ہے؟

میں آپ کو اطلاع دوں گا، آپ کا brain wash ہو چکا ہے۔

ویت نام جینے کا اسلوب ہے۔ ویت نام جینے کی آدرش صورت ہے۔ ویت نام جدیدیت ہے۔ ویت نام آزادی ہے۔

۱۹۵۳ء کے آس پاس تقسیم وطن کے المیے اور تلنگانہ بغاوت کے باوجود اور باوصف ہمارے پاس جینے کے ڈھیر سارے سادھن تھے۔ ہماری نظروں کے سامنے ہمارے ہیرو... قومی نیتا، ادبی شخصیتیں موجود تھیں۔ سات آٹھ کٹھن برسوں میں ہم نے دیکھا کہ امتحان کی آنچ تک جھیلنا ان کے بس کا نہ تھا۔ ان ہی دنوں زندگی کے ہر شعبے میں degeneration کے دوران وہ تحریر نما پیدا ہوئی جس کا میکارتھی ازم کے بعد کے rebel without a cause سے کوئی تعلق نہ تھا یعنی یہ محرر عالمگیر ناکامی کے سمبل یو این او کے عہد میں اپنے اپنے دڑبوں میں بند رہے اور ہمارے پرانے ادبی ہیروز کی تحریر کا ہینگ اوور ثابت ہوئے۔

ساتویں دہائی کے شروع میں myth-making اور روایتی ہیرو کی موت کے بعد جو تحریر سامنے آئی، وہ نام نہاد literary output سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ اس اچھی بُری قدرے اجنبی تحریر کا جو تقسیم وطن کے بعد کی نسل کی complex problems کا احاطہ کرتی ہے، المیہ یہ ہوا کہ یہ attention-getting value بن گئی جس کا استعمال آج ادب دشمن، عوام دشمن عناصر کر رہے ہیں اور یہ revolution in textile کی طرح کی سوچی سمجھی سازش ہے۔

اب تھوڑا سا فساد ہو جائے۔

اڑتیس برس کے جیف نٹل کا کہنا ہے[1]:

> "Dad was a liar. He lied about the war and he lied about sex. He lied about the bomb and he lied about the future. He lived his life on an elaborate system of pretence that had been going on for hundred of years." (1968)

ترجمہ میں نے اس لیے نہیں کیا کہ محمد حسن عسکری کہتے ہیں، یہ بڑا کٹھن کام ہے۔ غالباً اسی لیے ہمارے ہاں دستوئیفسکی اور ٹالسٹائی ترجمہ نہیں ہوئے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ یو. ایس. آئی. ایس. نے بڑے بڑے مترجم پیدا کیے ہیں۔

---

[1] کیا آپ اپنے ہاں کے کسی ایسے اہم جدید افسانہ نگار کا نام لے سکتے ہیں جو پینتیس برس سے کم کا ہو۔ یوں تو یہ بے معنی سی بات ہے، پھر بھی میں آپ سے یہ بات پوچھنا چاہتا ہوں۔

ساتویں دہائی کے شروع کی ایک اُردو کہانی کا جملہ سنیے۔ یہ جملہ نئی نسل کی اس زمانے کی ذہنی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے: ''ہمارے والدین ہماری ذلت کا باعث ہیں۔''

وہ لوگ جو دوسری جنگ عظیم سے ذرا سی بھی دلچسپی رکھتے ہیں، جانتے ہیں کہ دورانِ جنگ سویڈن (جس نے بعد میں فلاسفر فلمساز انگمار برگماں پیدا کیا۔ جس نے Seventh Seal اور ایٹم بم کے خوف پر قیامت کی انقلابی فلم Winter Light بنائی) غیر جانبدار ملک تھا۔ سویڈن کی نئی نسل نے اپنے بزرگوں کو اب تک نہیں بخشا ہے کہ ان کے نزدیک غیر جانب داری نازیوں کی حمایت تھی اور آج نئی نسل کے جھنڈے تلے پورا سویڈن ویت نام کی جنگ آزادی کی حمایت کرتا ہے اور ویت نام سے بھاگے ہوئے امریکی فوجیوں کو پناہ دیتا ہے۔ لیکن اپنے ہاں اب تک جدید ادیب دانستاً غیر جانب داری (مواد اکٹھا کرنے کی حد تک ہی سہی) کے فریب کا شکار ہے۔ غالباً وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔

غیر جانب داری، بے عملی اور ماضی پرستی حکومت کے بڑے کام آتی ہے اور جب دانشور بھی اس مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے، تب حکمراں چین کی نیند سوتا ہے۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اُردو کے بیشتر جدید ادیب نہ جی رہے ہیں، نہ ادب لکھ رہے ہیں بلکہ تنبولا کھیل رہے ہیں۔ تنبولا بنا کسی risk کے بڑی نفع بخش light refreshment اور entertainment ہے اور جدید اُردو ادب کے creative process کا مکمل اظہار ہے۔ اعلان ہوتا ہے: Two fat colonals۔ اگر آپ جدید ہیں، imaginative ہیں، آپ فوراً اٹھاسی کے ہندسے کو کاٹ دیں گے۔ اسی طرح کا اعلان ہوتا ہے: Lonely۔ آپ فوراً ایک کے ہندسے کو کاٹ دیں گے۔ اب صاحب! ایک بھونپو بجے چلا جا رہا ہے اور دھڑا دھڑ جدید افسانے نکلتے آ رہے ہیں جن کا نہ تو سماجی مسائل کے اقتصادی پہلوؤں سے کوئی تعلق ہے اور نہ عصری تاریخ کے تیز و تند عوامی بہاؤ سے۔ یہ بھونپو کیا ہے؟ یہ وہی بھونپو ہے جو انقلابی عمل سے بچے ہوئے الفاظ کو اشتہار بازی کے لیے استعمال کرتا ہے، جو عوامی تحریکوں کو کچلنے کے لیے خود عوامی نعرے اپنا لیتا ہے۔ جو ادب میں چپ سادھ کر نئی نسل کو ورغلاتا ہے، جو ادب کے غیر ادبی معیار کا نعرہ لگا کر سماج کی contradictions سے ہماری نظریں ہٹانے کی کوشش کرتا ہے، جو زندگی اور ادب کو مختلف خانے سمجھتا ہے اور اس کا پرچار کرتا ہے اور یوں عمل اور تخلیق کو الگ کرنے کی سازش میں شریک ہے۔ کیا ایسی کسی تحریک یا رجحان سے انور سجاد سے افسانہ نگار کا کوئی سمبندھ ہو سکتا ہے؟ میں نے اپنی سہولت کے لیے ایک افسانہ نگار کا انتخاب کیا ہے:

''ویت نام ایسے ملکوں میں انسان کشی، میری موت ہے۔ آزادی کی جنگ لڑنے والی، آزادی کی حفاظت کرنے والی ہر قوم کے میں دوش بدوش ہوں۔ یو۔ ایس۔ اے میں نیگرو کی گردن میں پھانسی میرے سانس کو کاٹتی ہے۔ سلمز کے باسیوں کی بھوک میرے پیٹ میں خلا پیدا کرتی ہے۔ لاطینی امریکہ اور افریقہ ایشیا کی نو آزاد قوموں کی امیدیں، میری امیدیں ہیں۔ ان کے خوف، ان کی تشویش، میرے خوف، میری تشویشیں ہیں۔ وہ سب مجھ میں زندہ ہیں، میں ان میں زندہ ہوں۔''

''مجھے سرگرمی سے اپنی ذات کی تخلیق، اپنے معاشرے کی تخلیق میں حصہ لینا ہے کہ ہم نے ابھی عروج کی سیڑھی کے رُخ قدم نہیں اُٹھایا۔ مجھے سیڑھی کا چناؤ بھی کرنا ہے کہ جس پر آخری قدم کوئی نہ ہو، کوئی انتہا نہ ہو کہ زوال کا امکان پیدا ہو۔ میں حقیقت کی تلاش، معنویت کی کھوج میں سیڑھیاں چڑھتا ہی چلا جاؤں، ہر نیا قدم ساتھیوں کے قدموں کے ساتھ مل کر اُٹھے۔ جب ایک حقیقت کا سراغ ملے تو نئی حقیقت کی جستجو شروع ہو جائے کہ حقیقت کی تلاش کا عمل انقلاب ہے۔''

''میرے نزدیک دنیا کے کریہہ المنظر، جابہ جا تڑخے ہوئے نقشے کی پلاسٹک سرجری صرف ایک طرح ممکن ہے اور وہ ہے ایک ایسے سوشلسٹ نظام کی دریافت جو بالآخر پھر کہیں (چین اور روس کی طرح) دنیا کے چہرے کو تڑخانے کے امکانات نہ پیدا کر دے...''

کہیں نئی حقیقت کی جستجو چین اور روس کے نظریاتی اختلافات سے تو نہیں شروع ہوتی؟
جو لوگ سیاست اور ادب کو الگ الگ خانوں میں بانٹتے ہیں، ان کی طرف اشارے کرتے ہوئے انور سجاد نے مجھے لکھا تھا:

''اُس سازش میں تمھارا کوئی حصہ نہیں کیونکہ میں تمھیں تمھاری کہانیوں کے حوالے سے بھی جانتا ہوں۔''

میں نے اُدھر کے افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''اُدھر انور سجاد، خالدہ اقبال ہیں جنھیں اب افسانہ نگاری کے علاوہ عملی کام

بھی کرنا پڑے گا ورنہ فوجی ڈکٹیٹر شپ انھیں ڈس لے گی۔"

یہ جملہ بنگلہ دیش کی جنگ آزادی سے تقریباً دو برس پہلے لکھا گیا تھا۔ انور سجاد کے الفاظ اور انور سجاد کا اسٹیتھو اسکوپ انور سجاد سے لڑ رہے ہوں گے۔ مجھے اس کا یقین ہے۔

جدیدیوں کے وہ سردار جو ہاتھی دانت کے ٹاور میں (کرشن چندر کی بات صحیح تھی لیکن گھپلا یہ ہوگیا کہ وہ اپنی بات qualify نہیں کر پائے تھے) بیٹھ کر کہہ رہے ہیں (اور کریڈیٹ لے رہے ہیں) کہ پاکستان کے ترقی پسند بنگلہ دیش کے مسئلہ پر خاموش ہیں جبکہ پاکستان کے جدید ادیبوں نے مظالم کی مخالفت کی ہے، یہ ایک اور سازش ہے۔ پاکستان کے جن جدید ادیبوں نے بنگلہ دیش کے عوام پر توڑے جا رہے مظالم کی مخالفت کی ہے، ان کا ہندوستان کے جدید ادیبوں سے کوئی سمبندھ نہیں ہے کہ پاکستان کے وہ جدید ادیب ایک سیاسی نظریے میں یقین رکھتے ہیں اور یہاں کے جدید سرداروں کا مسلک اب ترقی پسند بہروپیوں کی طرح سماجی مرتبہ حاصل کرنا ہے۔

ہماری زبان کو بھی حکمرانوں نے ہمارے ہی سمبل سے ختم کیا ہے۔

اگر اُردو بولنے والے، اُردو لکھنے والے، اور اُردو پڑھنے والے صرف دس منٹ کے لیے، صرف دس منٹ کے لیے غالب کو بھول جائیں، تو کیا ہو؟ آپ نے کبھی سوچا ہے؟ یہ دس منٹ حکومتِ وقت کے لیے مصیبت بن جائیں گے کہ ان دس منٹوں میں ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ہماری زبان کا جمہوریت میں قتل کیا گیا ہے اور ہمیں قاتل کی گردن مارنی ہے۔ ہماری جذباتی تسلی کا کارن اب ہماری عظمت کا سمبل لوہے اور سیمنٹ کی شکل میں ہماری زبان کی چھاتی پر کھڑا ہے۔

"میں پاگلوں کی طرح بول رہا ہوں۔ تم سوچ رہے ہوگے کہ بے ربط، مہمل، واہیات جملے، یہی کچھ میری زندگی میں باقی رہ گیا ہے... پیارے! یہ میری زبان ہے جو میری روح بھی ہے۔ میں نے اس زبان میں کھایا ہے، پیا ہے، اس زبان میں سوچا ہے... میری زبان کے گلے پر چُھری چل رہی ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتا۔ بس اپنی نظروں سے گرتا چلا جا رہا ہوں... میں پاگل ہوں مگر مجھے اپنا پاگل پن اچھا لگتا ہے کہ یہ میں نے مستعار نہیں لیا ہے۔ میں نے اسے جنم دیا ہے..."

ایک شہری جو قلی ہے اور ایک شہری جو افسانہ نگار ہے (ویسے ایک قلی افسانہ نگار بھی ہو سکتا ہے اور افسانہ نگار قلی بھی) دونوں میں کیا فرق ہے؟ یہی نا کہ افسانہ نگار علم کے میدان میں قلی سے آگے ہے۔ اسی لیے افسانہ نگار کی ذمہ داری کہیں زیادہ ہے۔ اسے تمام سماجی مسائل کی تفتیش کرنا ہوگی۔ سماجی برائیوں اور امراض کی تہ تک جانا ہوگا اور ہر عوامی مسئلے پر ایک مضبوط اسٹینڈ بھی لینا ہوگا۔

المیہ یہ ہے کہ بہت سارے معصوم ادیب planted ادیبوں جو یقیناً ذہین ہوتے ہیں، کے جال میں پھنس کر مسائل کو حل کرنے کی گربازی میں مسائل ہی کو جھٹلا دیتے ہیں اور یوں نادانستہ طور پر عوام دشمن عناصر کا ساتھ دیتے ہیں۔

تقریباً دو برس پہلے میں نے ایک کہانی میں شہر کا شہر عمارت blast کی تھی جہاں کا کروچ، کیکٹس اور صلیب پناہ گزیں تھے (یہ اور ایسی بہت ساری چیزیں جدیدیوں کا من بھاتا میوہ ہیں)۔ اس کہانی کو سی. پی. (ایم) سے نظریاتی طور پر وابستہ ادیبوں نے پسند کیا اور اسی کہانی میں ایک صاحب نے 'نکسلیت' بھی دیکھی۔ میں نہ تو سی. پی. (ایم) کا ممبر ہوں اور نہ ہی ایم. ایل. کا۔ ہاں! میں نے اتنا جانا ہے کہ سی. پی. (ایم) کے نقطۂ نظر کو جانے بنا آپ ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال کو صحیح طور پر نہیں جان سکتے۔ مجھے سی. پی. ایم. ایل. نوجوانوں سے بھی گہری دلچسپی ہے کہ انھیں سمجھے بغیر آپ نئی نسل کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ نئی نسل جو اب ادب نہیں پڑھتی، سیاسی نظریات پڑھتی ہے۔ ۱۹۶۸ء کی فرانس کی 'طالب علم- مزدور' بغاوت کے بعد جب لوگوں نے دیکھا بھالا تو پتہ لگا کہ ناول مارا گیا ہے۔ اور پھر یہ لوگ نئی نسل کے احساس کی شدت کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس کی بڑی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ اور یوں بھی مجھے یوادانی سے کوئی دلچسپی نہیں۔) میں نے اس کہانی میں ادھر کے پڑھے لکھے نوجوانوں کا تجزیہ کیا تھا جن کے کان عوامی چاپ کی طرف لگے ہوئے ہیں لیکن جو اپنے بے نام سے سکھ آرام کی کرسی میں ابھی بُری طرح گرفتار ہیں۔ میں نے اس تضاد کو ایک فکر کے عمل بننے کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ میں حوصلہ پانے کی کوشش میں ہوں کہ اگلی کہانی میں اس تضاد سے چھٹکارا پا سکوں۔

ہم نے جس سماج میں آنکھ کھولی ہے، اس سماج نے پیشتر اس کے کہ ہمیں اپنی سوجھ بوجھ کا علم ہو، ہماری کھوپڑی میں ایک مخصوص مذہب اور دیومالا اور ان کے حوالے سے ایک ملک اور اس کی تاریخ کا سارا کوڑا ابھر دیا۔ اپنے آپ کو اس بلاخیز عہد میں جینے کے قابل بنانے کے لیے پہلے ہمیں اپنی کھوپڑی صاف کرنا پڑے گی۔ سماج اور فرد کی زندگی میں موجود تضادات کا احساس، ان کی واضح پہچان اور پھر ان سے چھٹکارہ پانے کی کوشش تخلیق کی جانب پہلا قدم ہے۔

> ''ماؤ صرف اس لیے بڑا نہیں ہے کہ اس نے اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائی، وہ اس لیے بھی بڑا ہے کہ اس نے کھوپڑی میں پاؤں پسار کر سوئے ہوئے Confucious کو دھکے مار مار کر نکال باہر کیا۔ یہ لازوال تخلیق ہے۔''

ہم سمبلو کے درمیان زندگی گزارتے ہیں۔ جو سمبلو ہماری زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز

ہوتے ہیں، وہ حکمرانوں کے پیدا کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب ان سمبلز کے بوسیدہ مفاہیم کو چیلنج کیا جاتا ہے تو ظلم ٹوٹتا ہے۔ آج دنیا بھر کی نئی نسل پر ظلم ٹوٹ رہا ہے۔ اب ذرا اپنے جدید ادیب کو لیجیے۔ وہ سیاسی شعور کی کمی کے کارن اور غیر شعوری طور پر مذہبی تعصبات کی اسیری کے کارن بیکاری کی تعلیم اور indirect تجربات کے ملبے کا استعمال کیے چلا جارہا ہے۔ نظر انتخاب تک پلٹے نہیں۔ نتیجہ؟ زندگی تضادات کا شکار ہے جس کا اسے علم نہیں۔ تحریر میں جو تضادات آجاتے ہیں ان کا علم کیسے ہو؟ افسانے کے مرکزی خیال کی انگلی تھامے، افسانے کی جزئیات کو جھٹلاتا ہوا چلتا جائے گا اور آخرکار تھک ہار کر پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھ رہے گا اور ڈھیر ہو جائے گا۔

کہتے ہیں انقلاب بھی مغرب کی دین ہے۔ چمن گپتا نے ایک جگہ بڑی خوبصورت اور ہم ایشیائیوں کا سر اونچا کرنے والی بات کہی ہے۔ کہتا ہے:

''انقلاب تو ایشیا کی بھی بہت بڑی دین ہے۔ لانگ مارچ اور ویت نام۔''

یہاں، اپنے ہاں جدیدیت کے ایک رجحان بننے سے پہلے پچھلی دہائی کے شروع میں جب نئی تحریر سامنے آئی تھی، ان دنوں بھی ایک ہیرو پیدا کیا تھا — کینیڈی۔ بہت کم جدید ادیب جانتے ہیں کہ ژاں ژینے جس کی موت کی خبر ابھی حال ہی میں ایک جدید پرچے نے شائع کی تھی (کم بخت پھر بھی نہیں مرا)، نے کینیڈی کے مقابلے میں، آس والڈ کو ترجیح دی تھی۔ اور یہ وہی ژاں ژینے ہے، جس کا طرز حیات اس لیے سارتر کو عزیز تھا کہ وہ بورژوا سماج کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا اور یہ وہی ژاں ژینے ہے جو زندگی کے ایک چھوٹے سے دائرے میں کھری زندگی بسر کرنے اور اس تجربے کو ادب کرنے کے بعد جب زندگی کے بڑے دائرے میں آیا اور کندھا رگڑنے لگا تو ان حقیقتوں کو سامنے لاسکا جو انقلاب کے لیے فضا تیار کرتی ہیں۔

اب تو خیر Pentagon Papers کی اشاعت نے کینیڈی متھ بھی پاش پاش کر دی ہے۔ آج امریکہ کا نیا ہیرو Daniel Ellsberg ہے جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے اینٹی ہیرو ہے۔

جدیدیت جسے ایک رجحان کہا جاتا ہے، نہ تو تقسیم وطن کے بعد کی کسی سماجی تحریک سے پھوٹا ہے اور نہ ہی یہ رجحان کوئی تحریک بن پایا ہے جو صورتِ حال کو سمجھنے اور سنوارنے کی ناکام یا کامیاب کوشش ہوتی۔ جدیدیت کا آغاز چند ایک حساس، دکھی اور برہم نوجوانوں کی تحریریں تھیں۔ ان چند لکھنے والوں کی برہمی جو غلط یا صحیح تو ہو سکتی ہے، سچی تھی۔ اس لیے نئی تحریر کا مشکل اور خطرناک کام ہوتا رہا۔ آخرکار وہی ہوا جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہوا تھا۔ مفاد پرست آئے، قریب آئے گھل مل بیٹھے اور پھر جلد ہی وہ وقت آ گیا جب نئی نسل کی برہمی کا اظہار جو ایک مثبت قدر ہے، ایک

بے ہنگم، بے رُخ شور میں گم ہو گیا۔

ایسا ہوا، اچھا ہوا کہ ایک حقیقت کا سراغ تو ملا۔ اب نئی حقیقت کی جستجو ہوگی۔

جدید ادب کی تخلیق اور بقا کے لیے ہمیں شکست کا انتخاب کرنا پڑے گا جو ہمارے عہد کا شعور ہے، ہمارے عہد کا عمل ہے، ہمارے عہد کی تخلیق ہے۔ اگر یہ انتخاب جدید ادیب کے بس کی بات نہیں، تب سمجھوتوں سے بہتر تو یہی ہے کہ یا تو وہ (بہ قول افتخار جالب) ویت نامی بدھ بھکشوؤں کی طرح جل مرے اور یا پھر (بہ قول عزیز الحق) اپنی Frontal Labactomy کروا کے ابدی Euphoria میں مبتلا ہو جائے۔

OO

مین را جرنل

موسم گرما، ۱۹۶۸ء

پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ
ایک ناپسندیدہ کہانی
ابلاغ کسے کہتے ہیں؟: محمد عمر میمن
ایک اور ناپسندیدہ کہانی

پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ

وہ آئینہ خانہ جو پارسی ڈرگ اسٹور کہلاتا ہے، وہاں وہ دُبلی پتلی لڑکی شیشے کے کاؤنٹر پر جھکی ہوئی تھی اور وہاں اَن گنت دُبلی پتلی لڑکیاں شیشے کے کاؤنٹروں پر جھکی ہوئی تھیں اور اس نے اور انھوں نے کہا تھا:

''ایک پیکٹ ایف ایل''۔ جب اس کی آنکھ کھلی، وہ پھر ایک تھا کہ آنکھ لگنے سے پہلے وہ ایک سے کئی ہو گیا تھا اور اس کے کئی پاؤں سنبھالے نہ سنبھلے تھے کہ اس کے سر گھوم رہے تھے اور وہ دھڑام سے گر گیا تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی، وہ ایک تھا اور مجروح تھا اور کرچی کرچی کاؤنٹر کے چوکھٹے میں بُری طرح پھنسا ہوا تھا۔

کرچی کرچی کاؤنٹر کی ایک نوک اس کی پسلیوں میں اُتری ہوئی تھی اور شیشے کے اَن گنت ذرّے اس کے جسم میں داخل ہو گئے تھے اور وہ اس بے نام سی لذت سے دوچار تھا جو اس کے جسم کی دیکھی بھالی ہوئی نہ تھی۔

اور وہ آئینہ خانہ جو پارسی ڈرگ اسٹور کہلاتا ہے، وہاں کی الماریوں سے ایف ایل کے تمام پیکٹ غائب تھے کہ ایک دُبلی پتلی اور بہت ساری دُبلی پتلی لڑکیوں نے بیک آواز کہا تھا: ''ایک پیکٹ ایف ایل!''

اور وہاں وہ کئی دن بعد کرچی کرچی کاؤنٹر کے چوکھٹے میں بُری طرح پھنسا ہوا پایا گیا تھا اور ڈاکٹر نے کہا تھا: — یہ اسے یاد نہ رہا کہ جب وہ کئی دن بعد ہاسپٹل سے باہر نکلا، اس نے سوچا، ڈاکٹر نے کیا کہا تھا؟ اور وہ بے نام سی لذت جو اس سے پیشتر اس کے جسم کی دیکھی بھالی ہوئی نہ تھی اور جس سے اب اس کا جسم مانوس تھا، بیان سے باہر تھی کہ اب الفاظ بونے بن گئے تھے اور وہ بے نام سی لذت اُفق تا اُفق پھیل گئی تھی اور اس کی آنکھیں اب پہلی بار وہ کچھ دیکھ رہی تھیں، جو اس کے ذہن کے بس میں بھی نہ تھا۔

اور وہ صبح سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

جب اس کی مٹھیاں دیر تک بھنچی رہتیں، اس کی انگلیاں دکھنے لگتیں۔ وہ دھیرے دھیرے مٹھیاں ڈھیلی چھوڑتا، انگلیاں پھیلاتا، انگلیاں چٹخاتا اور پھر آپ سے آپ مسکرانے لگتا اور پھر یکایک یوں ہوتا کہ اس کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آتیں، اوپر تلے کے دانت ایک دوسرے میں گڑ جاتے، مٹھیاں بھنچ جاتیں اور پھر اس کی انگلیاں دکھنے لگتیں — اور وہ صبح سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔

اس نے ٹیڑھی بھینگی ناہموار انٹرنیشنل ہائی وے روند ڈالی تھی اور اس کے پاؤں لہو سے لتھڑے ہوئے تھے۔

اس نے دائیں ہاتھ کی بھیانک طور پر بھنچی ہوئی مٹھی سے پیشانی پر بھرپور ضرب لگائی — اس کی آنکھوں میں بجلی کوند گئی۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور دائیں دروازے کی جانب دیکھا۔

وہاں، وہ کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں پستول تھی جس کا رُخ اس کی جانب تھا۔

اس نے بائیں دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں بھی، وہ کھڑا تھا اور اُس کے ہاتھ میں پستول تھی جس کا رُخ اس کی جانب تھا۔

اس نے دائیں ہاتھ کی مٹھی کھولی، نیچے کو جھکا، لہو سے لتھڑے ہوئے پاؤں چھوئے اور گردن اُٹھائی۔ لہو سے لتھڑا ہوا ہاتھ بلند کیا اور دائیں دروازے کی جانب دیکھا۔

گولی چلی، اس کی کھوپڑی میں دھماکہ ہوا اور پھر بائیں دروازے کی جانب سے گولی چلی، اس کے دل میں بھگدڑ مچ گئی۔

اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ اس کی عمر کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی بیوی بوڑھی ہے اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے پہاڑوں سے شدید نفرت ہے۔

اس کی بیوی بوڑھی تھی اور اسے پہاڑوں سے شدید نفرت تھی — بوڑھی بیوی کا جسم اس کا دیکھا بھالا ہوا تھا اور پہاڑوں کے بارے میں اس نے محض سن رکھا تھا۔ اِک حسرت تھی اس کے دل میں کہ پہاڑوں کی چوٹیاں اس کی بیوی کے جسم کا حصہ ہوتیں۔

وہ گولی جو اس کی کھوپڑی سے نکالی گئی اور وہ گولی جو اس کے دل سے نکالی گئی (گولیاں تو اس کی کھوپڑی اور دل سے نکل گئیں لیکن دھماکے کی گونج کھوپڑی میں اور بھگدڑ کی رڑک دل میں جوں کی توں رہی)، دونوں گولیاں ایک سی تھیں اور یہ لطیفہ اس نے بارہا ہوا میں اچھالا تھا اور ہر بار اس کے لاکھوں کروڑوں اربوں خلیے اس کی جان کو آ گئے تھے اور ہر بار اسے سینکڑوں میل دور جانا پڑا تھا اور ہر بار اسے ساڑھے پانچ روپے خرچ کرنا پڑے تھے۔

پھر یوں ہوا — اس نے محسوس کیا کہ تجارت اور تخلیق ہم معنی الفاظ ہو گئے ہیں، چاروں اور

سیاہی پھیل گئی ہے، سمتیں کھو گئی ہیں۔

— میں نے اتنا جانا... میں نے اپنے جسم کا ایک ایک مسام کھلا چھوڑ رکھا ہے... میں نے اتنا جانا، ابھی تجارت اور تخلیق میں کچھ فاصلہ باقی ہے۔ میں نے اپنی بینائی داؤں پر لگا دی اور گھٹا ٹوپ سیاہی میں ایک طرف چل پڑا۔

اس کا تو کوئی بھائی نہ تھا (اور کہتے ہیں) بھائی نہ ہوں تو بازو نہیں ہوتے اور بازو نہ ہوں تو دو قدم چلنا دشوار ہے کہ اکیلے کا راستہ تو کوئی بھی بھائی روک سکتا ہے۔

— دو قدم چلنا واقعی دشوار ہے... ہاں، چار قدم آگے بڑھ جاؤں، پھر کوئی روک نہیں کہ بھائیوں کے بازو صرف دو قدم لمبے ہوتے ہیں۔

اور چار قدم بڑھنے پر اسے محسوس ہوا،

بے لذتی کے بادل چھائے ہوئے ہیں، اس نے وراثت میں پائے ہوئے چاقو سے جس کے پھل پر وقت کا بے رنگ سا زنگ لگا ہوا تھا، اپنی ران میں مدتوں سے دھڑکتی ہوئی مضطرب مچھلی نکالی اور میلے میلے سے مٹی مٹی سے سمندر میں پھینک دی۔

جسم سے کوئی کتنا کام لے سکتا ہے؟

اور ذہن سے؟

کچھ لوگ ذہن کے لیے جسم بیچتے ہیں اور کچھ لوگ جسم کے لیے ذہن!

بات صرف اتنی تھی کہ بیچنے والوں کے جسم اور ذہن کے درمیان کچھ نہ تھا— "کچھ نہیں" جو اُن کے جسم اور ذہن کی پہچان تھا۔ اس نے دیکھا اس کے ایک ہاتھ میں حساب کتاب کا مسودہ ہے اور دوسرے ہاتھ کے پنجے میں لہولہان پستان۔ اس کے ایک ہاتھ میں ترازو ہے اور دوسرے ہاتھ کے پنجے میں لہولہان پستان۔ اُن دونوں کی آنکھیں انگارے ہیں اور منہ رال کا منبع۔

اس کی آنکھیں دو گہرے گدلے گڑھے تھیں— گدلے گڑھوں میں تو یہی کچھ ہوا کرتا ہے— یہ واہمہ ہے کہ آنکھوں میں سب کچھ ہوا کرتا ہے— اُف ف ف...

اُف ف ف— ربڑ کا ٹکڑا تھا، کہاں تک کھنچتا، ٹوٹ گیا۔

میلے میلے سے مٹی مٹی سے سمندر کی لہروں کے لب پر اُف کا نغمہ تھا اور اس کی ران پر ہاتھ برابر کھلا گھاؤ— لہریں زیرِ لب گنگناتی ہوئی کنارے کی جانب بڑھتیں، اس کی کمر کے گرد دم بھر کو بازو لپیٹتیں اور لوٹ جاتیں اور وہ کہ آلتی پالتی مارے ہوئے بیٹھا تھا، ران کے کھلے گھاؤ کی جانب دیکھتا، جہاں چلّو بھر میلا میلا سا مٹی مٹی سا پانی تھما ہوتا۔

سیاہی پھیل گئی ہے، سمتیں کھو گئی ہیں۔

— میں نے اتنا جانا... میں نے اپنے جسم کا ایک ایک مسام کھلا چھوڑ رکھا ہے... میں نے اتنا جانا، ابھی تجارت اور تخلیق میں کچھ فاصلہ باقی ہے۔ میں نے اپنی بینائی داؤں پر لگا دی اور گھٹا ٹوپ سیاہی میں ایک طرف چل پڑا۔

اس کا تو کوئی بھائی نہ تھا (اور کہتے ہیں) بھائی نہ ہوں تو بازو نہیں ہوتے اور بازو نہ ہوں تو دو قدم چلنا دشوار ہے کہ اکیلے کا راستہ تو کوئی بھی بھائی روک سکتا ہے۔

— دو قدم چلنا واقعی دشوار ہے... ہاں، چار قدم آگے بڑھ جاؤں، پھر کوئی روک نہیں کہ بھائیوں کے بازو صرف دو قدم لمبے ہوتے ہیں۔

اور چار قدم بڑھنے پر اسے محسوس ہوا،

بے لذتی کے بادل چھائے ہوئے ہیں، اس نے وراثت میں پائے ہوئے چاقو سے جس کے پھل پر وقت کا بے رنگ سا زنگ لگا ہوا تھا، اپنی ران میں مدتوں سے دھڑکتی ہوئی مضطرب مچھلی نکالی اور میلے میلے سے مٹی مٹی سے سمندر میں پھینک دی۔

جسم سے کوئی کتنا کام لے سکتا ہے؟

اور ذہن سے؟

کچھ لوگ ذہن کے لیے جسم بیچتے ہیں اور کچھ لوگ جسم کے لیے ذہن!

بات صرف اتنی تھی کہ بیچنے والوں کے جسم اور ذہن کے درمیان کچھ نہ تھا— ''کچھ نہیں'' جو اُن کے جسم اور ذہن کی پہچان تھا۔ اس نے دیکھا اس کے ایک ہاتھ میں حساب کتاب کا مسودہ ہے اور دوسرے ہاتھ کے پنجے میں لہولہان پستان۔ اس کے ایک ہاتھ میں ترازو ہے اور دوسرے ہاتھ کے پنجے میں لہولہان پستان۔ اُن دونوں کی آنکھیں انگارے ہیں اور منہ رال کا منبع۔

اس کی آنکھیں دو گہرے گدلے گڑھے تھیں— گدلے گڑھوں میں تو یہی کچھ ہوا کرتا ہے— یہ واہمہ ہے کہ آنکھوں میں سب کچھ ہوا کرتا ہے— اُف ف ف...

اُف ف ف— ربڑ کا ٹکڑا تھا، کہاں تک کھنچتا، ٹوٹ گیا۔

میلے میلے سے مٹی مٹی سے سمندر کی لہروں کے لب پر اُف کا نغمہ تھا اور اس کی ران پر ہاتھ برابر کھلا گھاؤ— لہریں زیر لب گنگناتی ہوئی کنارے کی جانب بڑھتیں، اس کی کمر کے گرد دم بھر کو بازو لپیٹتیں اور لوٹ جاتیں اور وہ کہ آلتی پالتی مارے ہوئے بیٹھا تھا، ران کے کھلے گھاؤ کی جانب دیکھتا، جہاں چلو بھر میلا میلا سا مٹی مٹی سا پانی تھما ہوتا۔

مَیں خود کو کہاں تک ڈھوتا پھروں، کب تک ڈھوتا پھروں۔

جب تک جسم اور ذہن ایک نہ ہو جائیں۔

جسم اور ذہن ایک گھاؤ ہو جائیں اور گھاؤ، اوپر تلے نمک ہو جائے۔

اس ہنستی مدھر آواز نے پوچھا: ''نیند نے کہاں تک ساتھ دیا!''

اس نے بوجھل پلکیں اُٹھائیں۔ کہا: کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ... کہ...

وہ ہنستی ہوئی مدھر آواز ہمہ تن گوش تھی۔

یہاں وہاں کہیں کچھ نہ تھا— اس کی نظروں کے سامنے، اس کے دائیں ہاتھ میں ایف ایل تھا۔ چپکے ہوئے لسلساتے ایف ایل میں ہوا تھی اور ہوا آواز لیے ہوئے تھی۔

ہوا اور آواز سے کیا ہو سکتا ہے۔ ہوا اور آواز تو انائی تو نہیں ہوتیں؟

اور شہر بلیک آؤٹ کی زد میں تھا اور وہ سڑک کے عین وسط میں دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ دائیں بائیں کے مکانوں کی کالی قطاریں معنی کھو چکی تھیں۔ آسمان کالی خاموشی میں بے معنی ہوا پڑا تھا— صرف بجھے ہوئے لیمپ پوسٹ سوالات کی شکل میں کھڑے تھے۔

''تم جاسوس ہو یا طالب علم۔''

وہ جاسوس ہے یا طالب علم ہے— وہ کال کوٹھری شہر تھی یا رات تھی اور 'یا' کے معنی ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ یہاں تو 'جاسوس' اور 'طالب علم' ہم معنی الفاظ ہیں۔ وہ کال کوٹھری شہر تھی، صبح کی روشنی میں ڈھے گئی اور وہ پھر سڑک کے عین وسط میں دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ دائیں بائیں کے مکانوں کی قطاریں معنوں کی تلاش میں صبح کی روشنی سے کندھے رگڑ رہی تھیں، آسمان کی رنگت میں معنی تھے۔ صرف سہمے ہوئے لیمپ پوسٹ سوالات کی شکل میں کھڑے تھے— سوالات جن کا معنوں سے کوئی علاقہ نہیں۔

اس کے جسم پر بچھو چپکے ہوئے تھے۔ کال کوٹھری، یارات کی سوغات۔

اس نے وراثت میں پائے ہوئے چاقو سے ایک ایک بچھو کو جسم سے نوچ، سمندر میں پھینک دیا۔

میلے میلے سے مٹی مٹی سے سمندر کی لہروں نے اُف ف ف کا الاپ شروع کیا، لہریں اس کی جانب لپکیں، اس سے بغل گیر ہوئیں اور لوٹ گئیں۔

وہ اُٹھا اور ہر مسام، ہر گھاؤ میں نمک کا ذائقہ لیے پھر بیچ شہر آ گیا— سڑک کے اس پار جانے لگا تو سبز اور خاکی رنگ کے اختلاط کی حرام زدگی، بھدے سے بے نام رنگ سے لپی پتی جیپ تلے آتے آتے بچا— اس پار آئینہ خانہ تھا، وہ آئینہ خانہ جو پاری ڈرگ اسٹور کہلاتا ہے۔

وہ پوچھیں گے، میں کہاں تھا؟

میں کہاں تھا؟

ہاسپٹل — سمندر کے کنارے — کال کوٹھری —

اس نے دیکھا، وہ چوراہے پر تھا — چاروں سمت لوگ بھاگ رہے تھے۔ سب کی پشت اس کی جانب تھی۔

میں کس سمت جاؤں؟

دیکھتے دیکھتے سارا شہر خالی ہو گیا — وہ چوراہے پر اکیلا کھڑا تھا۔

اس کے کانوں نے کہا: ہم کچھ سن رہے ہیں!

ہنگامی صورت حال سے نپٹنے کے آلات۔

اس کی آنکھوں نے کہا: ہم کچھ دیکھ رہے ہیں۔

فلائنگ اسکوئڈ، ایمبولینس اور فائر بریگیڈ — اس کے قریب آن کھڑے ہوئے۔

اس کا جرم آوارگی ہے، اسے گرفتار کر لو!

اس کا مرض آوارگی ہے، اسے اسٹریچر پر لٹا دو!!

اس کی آوارگی آگ ہے، اسے بجھا ڈالو!!!

اور پھر یوں ہوا اور دیکھنے والوں نے دیکھا، ناک والوں نے سونگھا: — چاروں اور پانی ہے۔ پانی کی ڈانواڈول سطح پر لپٹوں میں لپٹی آوارہ لاش ہچکولے کھا رہی ہے۔ چاروں طرف بدبو پھیل رہی ہے، جیسے کہیں ربڑ جل رہی ہو۔

OO

(تحریر: ۲۹ر دسمبر ۱۹۶۶ء، بمبئی)

(مطبوعہ: 'تحریک'، نئی دلی: ۱۹۶۷ء)

ایک ناپسندیدہ کہانی

['گفتگو' ادب اور تہذیب کا باشعور ترجمان ہے۔
اس میں لکھنے والے وہ جدید تر ادیب ہیں، جو تذبذب، تشکیک اور بے دلی کی نیم تاریک، نیم روشن فضاؤں سے گزر رہے ہیں۔ اگر وہ پرانی اقدار سے مایوس ہیں تو یقیناً ان کے دل میں نئی اقدار کی روشنی موجود ہے اور ایک نہ ایک دن وہ اس روشنی کو تلاش کرلیں گے۔ اُردو ادب کا مستقبل اُن کے وجود سے تابناک ہے۔]

مندرجہ بالا عبارت سردار جعفری کے 'گفتگو' کے Brochure سے لی گئی ہے۔ یہ Brochure سردار جعفری نے مجھے بمبئی سے ۲۹ نومبر، ۱۹۶۶ء کو پوسٹ کیا تھا جو مجھے یہاں دلّی میں ۲ دسمبر، ۱۹۶۶ء کو ملا تھا۔

ظاہر ہے، یہ دعوت نامہ تھا 'گفتگو' میں لکھنے کا — ایک زمانے سے میں خاموش تھا۔ بہت ساری کہانیاں ذہن میں تھیں لیکن کسی کہانی کے خدوخال واضح نہ تھے۔ میں نے ان دنوں تقریباً ڈیڑھ برس کے عرصے میں سوائے 'دیوندر ستیارتھی کے ساتھ ایک دن'[1] کے اور کچھ نہ لکھا۔ نتیجتاً خاموش رہا، سردار جعفری کو خط تک نہ لکھا۔

میں دسمبر ۱۹۶۶ء کے دوسرے ہفتے میں بمبئی چلا گیا — ۱۴ جنوری ۱۹۶۷ء کے 'اُردو بلٹز' میں مندرجہ ذیل تحریر شائع ہوئی:

کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ کہانی کا آغاز کوئی کرتا ہے اور انجام کوئی اور۔ اب یہی دیکھیے نا، مہندر ناتھ نے گذشتہ دنوں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس میں انور عظیم کو رواداری کا درس دینا چاہا اور انور عظیم نے قبول کرنے سے انکار کردیا — اور یہیں سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔

کانفرنس میں علمی اور ادبی بحث کی سطح بہت اونچی تھی۔ مہندر ناتھ نے انور عظیم کے پیپر میں

---

[1] قاسم محمود کے زمانے کے 'ادبِ لطیف' کے لیے لکھا گیا یہ مشہور اور بدنام انٹرویو 'تحریک' میں شائع ہوا تھا کہ سانحۂ تعمیر نے ادبی نظام درہم برہم کردیا تھا۔

اٹھائے ہوئے بہت سے سوالات اور نکتوں کو چھوڑ کر صرف اس بات پر خفگی کا اظہار کیا کہ فلم میں کام کرنے والے ادیبوں پر اعتراض کیا گیا ہے۔ ''اگر ہم فلم[1] میں کام کرنا چھوڑ دیں تو کیا انور عظیم صاحب ہمیں نوکری دیں گے؟'' — انور عظیم نے کہا: ''سوال نوکری کا نہیں، ادیب کے ضمیر کا ہے اور جہاں تک رواداری کا تعلق ہے، میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں، جو کانفرنس سے چند دن پہلے بمبئی میں پیش آیا۔''

مہندر ناتھ بوکھلا کر کھڑے ہو گئے: ''مسٹر پریزیڈنٹ، انور عظیم کو ذاتی حملہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔''

انور عظیم نے کہا: ''پانی ہمیشہ نشیب میں مرتا ہے۔ احتجاج کے جواب میں احتجاجاً میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔''

مجھے علم نہیں، انور عظیم کس واقعے کے بارے میں کہنا چاہتے تھے لیکن رواداری کے سلسلے میں مجھے کچھ کہنا ہے۔

کرکٹ میچ دیکھنے کا جنون گذشتہ دنوں مجھے بمبئی کھینچ لایا — ایک شام حسن کمال نے مجھ سے کہا کہ سردار جعفری کے 'گفتگو' کے لیے اُردو افسانے پر بات چیت ریکارڈ کی جائے گی۔ بات چیت کے لیے راجندر سنگھ بیدی، انور عظیم اور مجھے چنا گیا — تین نسلوں کے لوگ — یہ سب کچھ ندا فاضلی نے ارینج کیا اور موضوع طے پایا: 'اُردو افسانے کا نیا موڑ۔'

ایک شام ہم سب، انور عظیم، حسن کمال، ندا فاضلی اور میں سردار جعفری کے ہاں پہنچے۔ تھوڑی دیر بعد مہندر ناتھ بھی آ پہنچے۔ وہ بیدی کی جگہ پُر کرنے آئے تھے۔

بات چیت شروع ہوئی — انور عظیم سے پوچھا گیا، اُن کے خیال میں اُردو افسانے کا نیا موڑ کون سا ہے؟ انور عظیم نے تاریخی پس منظر میں اُردو افسانے کو ناپنا تولنا شروع کیا۔ انھوں نے ایک موڑ پریم چند کو کہا اور یوں وہ بڑھتے بڑھتے منٹو، بیدی تک آن پہنچے جو ان کے نزدیک ایک اور اہم موڑ ہے۔ ابھی وہ اپنی بات مکمل نہ کر پائے تھے کہ حسن کمال نے مجھ سے پوچھا: ''آپ اپنے

---

[1] دو تین برس ہوئے، کرشن چندر کے ہاں کوئی تقریب تھی۔ مہمانوں میں قرۃ العین حیدر، بیدی، سردار جعفری، دھرم ویر بھارتی اور اندر راج آنند اور کئی اور لوگ موجود تھے۔ ان دنوں میں اور بھوشن بن مالی بمبئی میں تھے، اس لیے ہم باہر والوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ ہم دونوں اندر راج آنند کے ساتھ تخلیقی فلم کے امکانات کے سلسلے میں بات کر رہے تھے اور ہماری بات چیت میں انگمار برگماں، فیلی نی، کروساوا، ژاں لک گودار اور ستیہ جیت رائے کے نام اور کام آ رہے تھے۔ میں نے کہیں بات چیت کے دوران یہ کہہ دیا کہ فیلی نی کہتا ہے: I write on celluloid۔ فوراً ہی پاس بیٹھے ہوئے فلمی مبصر مہندر ناتھ نے کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور وہ قہقہہ بلند ہوا کہ کیا کہوں؟ ان کی فلمی قابلیت!!!

افسانے کی جڑیں پریم چند میں پاتے ہیں یا کہیں اور؟''

میں نے حسن کمال کے سوال کا جواب دینے سے پہلے تفصیل سے اپنی ذہنی نشوونما کا ذکر کیا۔ کیسے میں نے ادیب کی پہچان پائی اور کہاں میں نے اُردو افسانے میں کمرشیل رائٹرز کو پکڑا؟ بات ۴۷ تک پہنچی اور میں نے سردار جعفری کے ایک سوال کا بیچ میں جواب دیتے ہوئے صاف گوئی اور دلائل کے ساتھ یہ کہا کہ میں کرشن چندر کو کمرشیل رائٹر سمجھتا ہوں بلکہ نان رائٹر—اور ثابت کر سکتا ہوں۔ یوں میری جڑیں کہاں ہیں، یہ جاننا بہت مشکل ہے۔ ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا (میں فرش پر نظریں گاڑے بول رہا تھا اور سب توجہ سے سن رہے تھے—میں یوں محسوس کر رہا تھا) کہ مہندر ناتھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا: Bastard ... I will slap him—سب چکرا گئے۔ سب سے زیادہ پریشانی سردار جعفری کو ہوئی کہ ہم اُن کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مہندر ناتھ کو دوسرے کمرے میں لے گئے اور پھر تقریباً دس منٹ بعد مہندر ناتھ کے ساتھ لوٹ آئے— مہندر ناتھ نے مجھ سے معافی مانگی اور کہا کہ وہ اپنے بھائی کی بُرائی نہیں سن سکتے۔ بعد میں جعفری صاحب نے بھی معذرت چاہی کہ یہ ناخوشگوار حادثہ ان کے ہاں ہوا۔

میں غیر متوقع طور پر خاموش رہا۔ مجھے اتنا افسوس نہیں تھا جتنا تعجب۔ میں کرشن چندر کے بارے میں کچھ کہہ رہا تھا، ایک افسانہ نگار کے بارے میں، کسی کے بھائی کے بارے میں نہیں۔ اور سنا ہے، مہندر ناتھ بھی افسانہ نگار ہیں، اس لیے مجھے اور بھی زیادہ تعجب تھا۔

کیا مہندر ناتھ کے ہاں رواداری کے یہی معنی ہیں؟

برادر کرشن چندر کی محبت میں مہندر ناتھ کے پاگل ہو جانے کا حادثہ ۱۹ر دسمبر، ۱۹۶۶ء کو ہوا۔

۲۹ر دسمبر ۱۹۶۶ء کی شب بمبئی میں انور عظیم کے فلیٹ میں 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' کی تخلیق ہوئی۔ انور عظیم دتی میں تھے اور سردار جعفری بھی دتی میں تھے۔ ایک شام حسن کمال، ندا فاضلی اور ایک نئے شاعر نے جس کا نام میں بھول گیا ہوں، کہانی 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' سنی اور پھر ندا فاضلی نے کہانی سنبھال لی۔

ندا فاضلی ان دنوں سردار جعفری کے ہاں ملازم تھا۔ سردار جعفری نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں بمبئی کے قیام کے دوران کوئی کہانی لکھوں تو وہ 'گفتگو' کو دوں۔

۶ر جنوری، ۱۹۶۷ء کو سردار جعفری سے 'اُردو بلٹز' کے آفس میں ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے کہا، ''افسانہ میں نے پڑھ لیا ہے، بہت اچھا ہے'' اور میرے سامنے انھوں نے کہانی کاتب کے حوالے کی۔

۱۱ر جنوری، ۱۹۶۷ء کو میں دتی لوٹ آیا۔

۱۴؍جنوری، ۱۹۶۷ء کے اُردو 'بلٹز' میں مہندر ناتھ کے پاگل پن کا قصہ شائع ہوا۔
فروری، ۱۹۶۷ء کے 'تحریک' میں گوپال متل نے لکھا:
''فیصلہ کن دلیل: بمبئی کی ایک ادبی محفل میں بلراج مین را نے کرشن چندر کے فنِ افسانہ نویسی پر نکتہ چینی کی تو کرشن چندر کے پہلوان بھائی مہندر ناتھ نے انھیں گالیاں دیں اور پیٹنے کی دھمکی دی۔ اس طرح انھوں نے ثابت کر دیا کہ 'ایشیا کے عظیم ترین افسانہ نگار' کے فن کی تائید اب صرف گالی اور مکّے ہی سے ہو سکتی ہے۔''
'تحریک' کا یہ شمارہ جنوری ۱۹۶۷ء کے آخری ہفتے میں مارکیٹ میں آیا تھا۔
فروری ۱۹۶۷ء کے پہلے دو تین دنوں میں انور عظیم بمبئی چھوڑ کر دلّی چلے آئے اور انھوں نے کہا: ''بمبئی میں لوگ بہت پریشان ہیں اور 'بلٹز' میں مہندر ناتھ کی کارستانی کی اشاعت نے ان کی پریشانیاں بڑھا دی ہیں۔''
اس دوران مجھے انور سجاد اور ریاض احمد چودھری کے خطوط ملے، جن میں اس شرمناک فعل پر غم و غصہ کا اظہار کیا گیا تھا۔
آخر 'کھیت واڑی' کے ''کرملن[1]'' میں فیصلہ ہوا جس کی اطلاع مجھے ۸؍فروری ۱۹۶۷ء کو ملی۔ یہ اطلاع مجھے سردار جعفری کے خط سے ملی، جو یوں ہے:

گفتگو۔

۲۵، کھیتان بھون، ۱۹۸، جے ٹاٹا روڈ، بمبئی ایک

۶؍فروری، ۱۹۶۷ء

برادر تسلیم۔ میں اس خط کے ساتھ آپ کی کہانی واپس کر رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ 'گفتگو' میں اس کی اشاعت ممکن نہ ہوگی۔ اس سے آپ کی کہانی پر حرف نہیں آتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ میں کوشش کے باوجود آپ کی کہانی سمجھ نہ سکا۔ دوسرے احباب نے بھی سمجھنے کی کوشش کی۔ حسن کمال کے مطابق اس میں آزادی سے پہلے اور بعد کا ہندوستان ہے۔ ندا فاضلی کی رائے میں یہ کہانی ایک جنسی طور پر ناآسودہ نوجوان کی کہانی ہے جو مشت زنی کرتا ہے[2]۔ میری طرح کرشن چندر اور

---

1 یہ ترکیب منتوی ہے

2 جو مشت زنی کرتا ہے۔ یہ الفاظ گوپال متل نے 'تحریک' میں شائع نہیں کیے تھے۔ غالباً 'مشت زنی'، 'لونڈے بازی' ترکیبیں گوپال متل کی طبع نازک پر گراں گزرتی ہیں۔

مقتل

قرۃ العین حیدر کی سمجھ میں کہانی بالکل نہیں آئی۔ عادل منصوری نے کہا کہ کہانی ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئی ہے لیکن نصف اوّل اچھا ہے۔

میں صحیح یا غلط چونکہ ابلاغ کا قائل ہوں، اسی لیے مجبوراً آپ کی کہانی واپس کر رہا ہوں۔ میں نے آپ کے نام کے بغیر آپ کی کہانی بیس پچیس عام قارئین کو بھی دی تھی اور ان سب نے اپنی کم فہمی یا نافہمی کا اظہار کیا۔

اُمید ہے کہ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا سردار جعفری

میں نے فوراً سردار جعفری کو خط لکھا:

سلور جوبلی ٹی بی ہاسپٹل، دلّی ۹

۸رفروری ۱۹۶۷ء

سردار پدم شری جعفری صاحب، آداب۔

'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' اور آپ کا خط ملا۔ کچھ کہنے کی اجازت دیجیے۔

آپ نے لکھا ہے، ''میں کوشش کے باوجود آپ کی کہانی سمجھ نہ سکا۔'' ہوسکتا ہے، آپ کہانی نہ سمجھے ہوں لیکن — بات یہ ہے کہ آپ نے 'بلٹز' کے آفس میں کہانی کی تعریف کی تھی اور میرے سامنے کہانی کاتب کے حوالے کی تھی۔ اب دو باتیں ہیں۔ جب آپ نے کہانی کی تعریف کی تھی، اس وقت کیا آپ کہانی سمجھ پائے تھے؟ اگر نہیں سمجھ پائے تھے تو جھوٹی تعریف اور دکھاوے کے لیے کہانی کاتب کو دینا 'سردار جعفری' کی کون سی مصلحت تھی کہ کہانی مجھے لوٹائی جاسکتی تھی۔ اور کہانی اب ایک ماہ بعد آپ کی سمجھ میں نہیں آئی ہے تو کیا آپ کی ایک ماہ پہلے کی سمجھ اور اب کی سمجھ کے بیچ 'پدم شری'[1] آگیا یا آپ کے گھر میں ہوئے تماشے کی اشاعت یا 'ٹوٹتی ہوئی دیواروں' کا دباؤ؟

اور صاحب، یہ حق آپ کو کس نے دیا تھا کہ میری کہانی جو صرف میری کہانی ہے اور جو ایڈیٹر 'گفتگو' اور صرف ایڈیٹر 'گفتگو' کے حوالے کی گئی تھی، دنیا بھر کو پڑھنے

---

[1] ۲۶رجنوری ۱۹۶۷ء یوم جمہوریت پر صدر جمہوریہ نے سردار جعفری کو 'پدم شری' کے خطاب سے نوازا تھا۔ انور عظیم کا کہنا ہے کہ پہلی مبارکباد جعفری کو وزیر داخلہ نے دی۔ انور عظیم نے آج تک جعفری کو اس سلسلے میں کوئی مبارکباد نہیں دی ہے'' یہ کیسی دوستی ہے؟''

کو دیں۔ کرشن چندر ہوں یا قرۃ العین حیدر، مجھے ان سے کیا لینا؟ مجھے کسی سے کچھ نہیں لینا۔ میری کہانی ہے، میں کسی کو سناؤں یا پڑھنے کو دوں۔ آپ ایڈیٹر ہیں، آپ کہانی شائع کریں یا لوٹا دیں۔ بس! یہ کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، حسن کمال، ندا فاضلی، عادل منصوری اور بیس پچیس عام قارئین کہاں سے آن ٹپکے؟

آپ تو 'سیاسی ادیب' ہیں، آپ کو صرف یہ کہنا چاہیے تھا، ''کہانی لوٹا رہا ہوں، اب مجھے پسند نہیں'' اس طرح آپ نے سب کچھ کہہ دیا ہوتا اور میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہوتا[1]

یہ خط آپ حسن کمال، ندا فاضلی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، عادل منصوری اور بیس پچیس عام قارئین کو بھی پڑھنے کو دے دیجیے، کہانی ان کی سمجھ میں آ جائے گی۔

آپ کا مین را

آٹھ فروری کی صبح کو سردار جعفری کا خط ملا اور میں نے فوراً ہی اس کا جواب دے دیا——شام ہوئی اور میں نے 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' بغل میں دبایا اور نکل پڑا اپنے دوستوں کی تلاش میں——اتفاق سے تینوں سر پھرے، بھوشن، نارنگ اور یوگیش مل گئے۔ تینوں اس بات پر خوش کہ کہانی لوٹ آئی ہے، سننے کو ملے گی۔ کہانی سنائی اور اوپر تلے چار شامیں 'غارت' ہو گئیں۔ پانچویں شام جب ہینگ اوور اُترا، سب بضد کہ اب ذرا عوامی شاعر سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ پہلے آپ ایک لطیفہ سنیے۔

سردار جعفری سے میں یوں مخاطب ہوا تھا، 'سردار پدم شری جعفری' سردار اور جعفری کے بیچ پدم شری رکھنے سے خطاب میں صوتی حسن آ جاتا ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ حکومتِ ہند نے حال ہی میں ایک اعلان کیا ہے کہ خطاب یافتہ شخص خطاب کو نام کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتا۔

کہانی کو بہر حال کہیں شائع ہونا تھا۔

میں نے کہانی کا مسودہ اور مندرجہ بالا دونوں خط گوپال متل کے حوالے کر دیے۔ کہانی اور دونوں خطوط گوپال متل کے ایڈیٹوریل کے ساتھ 'تحریک' کے مارچ ۱۹۶۷ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔

---

[1] یہاں ایک جملہ تھا جو نہ جانے کیوں گوپال متل نے نکال دیا۔ جملہ یوں تھا: ''آپ کا خط جھوٹ در جھوٹ کی بدترین مثال ہے۔''

مقتل صاحب کا ایڈیٹوریل یوں ہے:

''مین را کی کہانی 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' شائع ہو رہی ہے۔ اس کہانی کی بھی ایک کہانی ہے۔ مین را نے یہ کہانی پہلے علی سردار جعفری کو دی تھی جو 'گفتگو' کے نام سے ایک جریدہ شائع کرنے والے ہیں۔ کہانی علی سردار جعفری نے واپس کردی۔ اس سلسلے میں انھوں نے مین را کو جو خط لکھا اور مین را نے اس خط کا جو جواب دیا، وہ دونوں ہم نے کہانی کے ساتھ شائع کردیے ہیں۔ مین را کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہانی کی واپسی میں کہانی کی ناپسندیدگی کو نہیں بلکہ افسانہ نگار کی شخصیت کی ناپسندیدگی کو دخل ہے اور علی سردار جعفری نے ایک واقعے سے متاثر ہو کر کہانی کے متعلق اپنے سابقہ فیصلے پر نظرِ ثانی کی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی حتمی بات کہنا ہمارے لیے مشکل ہے، البتہ اس سلسلے میں یہ ذکر غالباً بیجا نہ ہوگا کہ بعینہٖ اسی قسم کا واقعہ منٹو کے ساتھ بھی ہوا تھا۔ 'چغد' کے صفحہ ۱۹۰ پر منٹو کی یہ تحریر موجود ہے:

''اس کتاب کا ایک افسانہ 'بابو گوپی ناتھ' جب 'ادبِ لطیف' میں شائع ہوا تو میں بمبئی میں مقیم تھا۔ تمام ترقی پسند مصنفین نے اس کی بہت تعریف کی۔ اس کو اس سال کا شاہکار افسانہ قرار دیا۔ علی سردار جعفری، عصمت چغتائی اور کرشن چندر نے خصوصاً اس کو بہت سراہا۔ 'نل کے سائے' میں کرشن نے اس کو نمایاں جگہ دی مگر یکایک خدا معلوم کیا دورہ پڑا کہ سب ترقی پسند اس افسانے کی عظمت سے منحرف ہو گئے۔ شروع شروع میں دبی زبان میں اس پر تنقید شروع ہوئی۔ سرگوشیوں میں اس کو بُرا بھلا کہا گیا مگر اب بھارت اور پاکستان کے تمام ترقی پسند ممٹیوں پر چڑھ کر اس افسانے کو رجعت پسند، اخلاق سے گرا ہوا، گھناؤنا اور شر انگیز قرار دے رہے ہیں۔''

''یہی سلوک میرے افسانے 'میرا نام رادھا ہے'[1] کے ساتھ کیا گیا حالانکہ جب شائع ہوا تھا تو تمام ترقی پسندوں نے اُچھل اُچھل کر اس کی تعریف و توصیف

---

[1] منٹو کا یہ افسانہ 'میرا نام رادھا ہے' جسے میں سومرسٹ مام کے مشہور افسانے Rain سے کہیں بہتر اور بڑا مانتا ہوں، بمبئی کے فلمی کارخانے کی ایک مشہور جسمانی شخصیت کو بے نقاب کرتا ہے۔ اس افسانے کی تخلیق کے برسوں بعد مجھے اتفاق سے اس جسمانی شخصیت سے ملنے کا اتفاق ہوا اور میں نے منٹو کا لوہا مان لیا۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ چین کے انقلاب میں نہرو اور پٹیل کی موت ڈھونڈنے والے انقلابی عوامی شاعر سردار جعفری نے ان دنوں فلمی مصلحت کے کارن اس جسمانی شخصیت کے نام اپنی نظم 'یلغار' منسوب کی — آپ 'پتھر کی دیوار' مجموعے میں یہ انقلابی کارنامہ دیکھ سکتے ہیں۔

کی تھی۔''

سردار جعفری نے منٹو کو ایک خط میں لکھا تھا:

''میں تمھاری افسانہ نگاری پر ایک طویل مضمون لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ تمھیں اب تک دقیانوسی قسم کے لوگوں نے صرف گالیاں ہی دی ہیں ان سے کسی اور چیز کی توقع بیکار تھی۔''

لیکن انجمن ترقی اُردو، علی گڑھ[1] نے سردار جعفری کی جو کتاب 'ترقی پسند ادب' کے نام سے شائع کی ہے، اس میں منٹو پر اسی جعفری نے ان الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے:

''...وہ مزدوروں کی ذہنی سطح کی پستی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور فن کی بلندی کو ثابت کرنے کی طرح طرح سے کوششیں کرتا ہے لیکن حقیقتاً وہ خود اس ذہنی سطح پر پہنچ گیا ہے جس کی پستی گندے نالوں اور چہ بچوں تک کو شرما دیتی ہے۔''

(اشاعت اوّل، صفحہ ۶۵)

''... منٹو جیسے غلاظت نگار گورکی کے روس میں بھی پیدا ہوئے تھے۔'' (صفحہ ۷۵)

''...وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ میں پروپیگنڈہ نہیں کرتا، میں ظالم اور مظلوموں میں فرق نہیں کرتا، میں تو صرف آرٹ اور ادب پیدا کرتا ہوں۔ میں صرف رنڈیوں اور چکلوں اور بھڑووں کے بارے میں لکھتا ہوں۔ اس غلاظت کو گوارا بنانے کے لیے وہ حسن عسکری سے سند لیتا ہے کہ یہ 'اسلامی ادب' ہے۔'' (صفحہ ۸۵)

'تحریک' کے مارچ ۶۷ء کے شمارے میں 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' کی اشاعت کے کوئی تین ہفتے بعد مجھے گوپال مِتّل کا خط ملا کہ میری کہانی نے ہنگامہ بپا کر دیا ہے۔

'تحریک' کا اپریل ۱۹۶۷ء کا شمارہ شائع ہوا تو مجھے ہنگامے کی تفصیلات کا علم ہوا۔

سردار جعفری نے مجھے خط میں لکھا تھا: ''عادل منصوری نے کہا کہ کہانی ان کی سمجھ میں بھی نہیں آئی ہے لیکن نصف اوّل اچھا ہے'' لیکن 'تحریک' کے اپریل ۱۹۶۷ء کے شمارے کے صفحہ ۳ پر عادل منصوری کا یہ خط شائع ہوا:

''مین را کی کہانی کے متعلق سردار جعفری نے جو جملہ میرے نام سے منسوب کیا ہے،

---

[1] انجمن ترقی اُردو کے کرتا دھرتا آج کل ایک 'نقاد و شاعر' ہیں۔ کسی زمانے میں انھوں نے بھی منٹو اور میراجی کو ادب کا پنساری کہا تھا۔ یہ 'نقاد و شاعر' آج کل جدیدیوں کی رہنمائی کے چکّر میں ہیں اور کچھ جدیدی روٹی روزی کے چکّر میں انھیں رہنما مانتے بھی ہیں۔

وہ بالکل غلط ہے۔ بات دراصل یوں ہوئی تھی۔ جعفری صاحب نے مین را کی کہانی دیتے ہوئے کہا کہ 'ذرا یہ کہانی پڑھیے، اس کی کتابت ہو چکی ہے اور گفتگو کے پہلے شمارے میں اسے شائع بھی کر رہا ہوں'۔''

جواب میں میں نے کہا کہ 'جب آپ اسے گفتگو میں شائع کر ہی رہے ہیں تو پرچے میں ہی پڑھ لوں گا'۔

انھوں نے کہانی پڑھنے کے لیے مزید اصرار کرتے ہوئے کہا کہ 'میں یہ کہانی کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، حسن کمال وغیرہ لوگوں کو پڑھوا چکا ہوں۔ میں نے خود بھی کئی بار پڑھی لیکن کہانی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی'۔

جواب میں (کہانی پڑھنے سے پہلے ہی) میں نے کہا کہ 'یہ کیا ضروری ہے کہ کہانی سمجھ میں آنی ہی چاہیے۔ ادب میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو سمجھ کے دائرے سے باہر رہتی ہیں، صرف سمجھ کے پیمانے سے تخلیق کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا'۔

اس گفتگو کے دوران گجراتی کے نئے کوی راجندر شکلا میرے ساتھ تھے جو ان باتوں کے گواہ ہیں۔

مجھے سردار جعفری کی غلط بیانی سے تعجب اور دُکھ ہوا ہے۔''

عادل منصوری کا خط پڑھ کر میں چکرا گیا — سردار جعفری پدم شری کے خطاب کے باوجود ذہنی طور پر اس حد تک پست ہے، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا — میں نے سردار جعفری کو مندرجہ ذیل خط پوسٹ کیا۔ یہ خط میں نے 'تحریک' کا اپریل ۱۹۶۷ء کا شمارہ ملنے کے بعد اور عادل منصوری کا خط پڑھنے کے فوراً بعد لکھا تھا۔

''سلور جوبلی ٹی بی ہاسپٹل، دلی-۹: ۲۹ / مارچ، ۱۹۶۷ء

سردار پدم شری جعفری صاحب

یوں تو ہر آدمی زندگی بھر جھوٹ کا سہارا لیتا ہے لیکن ادیب تو ہر آدمی نہیں ہوتا۔ ادیب کیا ہوتا ہے، آپ کیا جانیں؟ ہاں! یوں تو ہر آدمی زندگی بھر جھوٹ کا سہارا لیتا ہے لیکن جب اس کے دانت جھڑنے لگتے ہیں، وہ جھوٹ کا سہارا لینا چھوڑ دیتا ہے کہ اور کچھ نہیں تو اپنی عمر کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ آپ تو عام آدمی کے لیے بھی ندامت کا باعث بن گئے۔

'تحریک' کا اپریل کا شمارہ دیکھیے! عادل منصوری نے آپ کے پوپلے منہ پر بھرپور طمانچہ مارا ہے (یاد رہے نہ تو میں آج تک عادل منصوری سے ملا ہوں اور نہ کبھی اس سے خط کتابت ہوئی ہے) اور یہ بات عام ہوگئی ہے کہ سردار جعفری جھوٹا ہے۔

رہی بات ابلاغ کی۔ محمد عمر میمن نے آپ کا قیمہ کر دیا ہے— مجھے افسوس صرف اس بات کا ہے کہ بیچاری قرۃ العین حیدر مفت میں بدنام ہوئی — آخر آدمی صحبت ہی سے تو پہچانا جاتا ہے۔ اب آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگیا ہوگا کہ مین را کے کیا معنی ہیں؟

مین را

متل صاحب نے صحیح لکھا تھا کہ میری کہانی نے ہنگامہ کر دیا ہے— 'تحریک' کے اپریل ۱۹۶۷ء کے شمارے میں محمد عمر میمن کا مضمون 'ابلاغ کسے کہتے ہیں؟' بھی شائع ہوا۔ یہ مضمون جو دراصل ایک طویل خط تھا اور جسے متل صاحب نے مضمون کی صورت میں شائع کیا 'مین را جرنل' ایک میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ 'تحریک' کے اسی شمارے میں پرکاش فکری[1] نے اپنے کالم 'رف نوٹس' میں 'شیشے کے سینگوں والا بکرا' کے عنوان کے تحت لکھا:

''ایک روسی لوک کتھا ہے۔ ایک بڑھیا کے جوار کے کھیت میں ایک مرتبہ ایک بکرا گھس آیا اور جوار کو برباد کرنے لگا۔ بڑھیا نے بکرے سے کہا: بکرے کھیت سے باہر جا۔ بکرے نے جواب دیا: میری آنکھیں شیشے کی ہیں، میرا سینگ سنہرا ہے، میں مارتے مارتے تیرا دم نکال دوں گا۔ بڑھیا وہاں سے خوف کھا کر بھاگنے لگی۔ وہ چلتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔ راستے میں اسے ایک ریچھ ملا۔ ریچھ نے بڑھیا کو روتے دیکھ کر پوچھا: ماجرا کیا ہے؟ بڑھیا نے ساری بات بتائی۔ ریچھ نے کہا: چل میں بکرے کو کھیت سے باہر نکالتا ہوں۔ مگر بکرے نے اس کو دیکھ کر بھی وہی دھمکی دی: ابے جا جھبرے بھالو، میری آنکھیں شیشے کی ہیں، میرا سینگ سنہرا ہے، میں مارتے مارتے تیرا دم نکال دوں گا۔

ریچھ بھی وہاں سے ڈر کر بھاگا۔ اب بڑھیا اور رونے لگی۔ اس بار اس کی ہمدردی کو ایک بھیڑیا ملا مگر اس کی بھی وہی گت بنی۔ اس کے بعد بڑھیا کی مدد کو ایک لومڑی آئی مگر بکرے کے سامنے اسے بھی دُم دبا کر بھاگنا پڑا۔ ایک ننھا سا خرگوش

---

[1] پرکاش فکری کا قیام رانچی میں ہے۔

بڑھیا کی اعانت پر تیار ہوا لیکن شیشے کی آنکھوں اور سنہرے سینگوں والے بکرے کے سامنے اس کی بھی ایک نہ چلی۔ آخر میں بڑھیا کی مدد کو ایک شہد کی مکھی آئی۔ بڑھیا نے کہا: یہاں ریچھ، بھیڑیا، لومڑی، خرگوش سب ہار گئے، تو ننھی سی جان کیا کر پائے گی۔ مگر شہد کی مکھی نے بڑھیا کو دلاسا دیا۔ اُڑ کر کھیت میں جا پہنچی، بکرے کی ناک پر ڈنک مارا اور بکرا میں میں کرتا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور پھر کبھی کھیت کا رُخ نہ کیا۔ مین را کی کہانی واپس کرتے ہوئے پدم شری جعفری نے جو خط لکھا وہ بھی بعینہٖ اسی کہانی سے ملتا جلتا ہے — بھئی کہانی میری سمجھ میں نہیں آئی، کرشن چندر کی سمجھ میں بھی نہیں آئی، قرۃ العین حیدر بھی ہار گئیں، حسن کمال اور ندا فاضلی کے بھی چھکے چھوٹ گئے، عادل منصوری نے بھی سپر ڈال دی اور بیس پچیس عام قارئین نے بھی کانوں کو ہاتھ لگائے۔

مین را نے شکایت کی ہے کہ جعفری صاحب، آپ تو سیاسی آدمی ہیں، اتنا کچھ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے کہہ دیا ہوتا کہ کہانی اب پسند نہیں۔ اس طرح آپ نے سب کچھ کہہ دیا ہوتا اور میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہوتا۔

مین را سے یہ چوک ہوئی کہ وہ سردار جعفری کی سیاست اس خط میں نظر انداز کر گئے۔ سیاست اور کسے کہتے ہیں۔ سردار نے اپنے خط میں جن لوگوں کا حوالہ دیا ہے، اس میں اس امر کا اہتمام ہے کہ یہ شکایت نہ ہو سکے کہ کہانی کسی خاص مکتبۂ فکر والوں کی سمجھ میں نہیں آئی اور اس طرح جانبداری سے بچنے کی بڑی سطحی کوشش کی گئی ہے۔

انھوں نے ''ایشیا کے سب سے بڑے افسانہ نگار'' اور ''بین الاقوامی شہرت کے مالک'' کرشن چندر کا نام لیا حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ کرشن چندر کا نام جتنا بڑا ہے، دل اتنا بڑا نہیں ہے۔ آج تک ستائش کے سوا کوئی دوسری چیز اس نے قبول نہیں کی۔ اس کو صحیح طور سے دیکھنے والوں کو اس کے بھائی بند bastard کہہ کے slap کرنے کی دھمکی دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیسے ممکن تھا کہ اس تماشے کے منظرِ عام پر آنے کے بعد بھی کرشن چندر کو مین را کی کہانی سمجھ میں آجاتی۔ قرۃ العین حیدر کا نام اس لیے لیا گیا کہ دیکھو بھئی، کرشن چندر تو ترقی پسند ہے اور تم سے ناراض ہے۔ وہ کہانیوں میں یہ پسند کرتا ہے کہ حیدرآباد کی سڑکوں پر رکشا کھینچنے

والا مزدور دنیا کے معاشی نظام کی تاریخ بیان کرے اور خانہ بدوش لاچی پیرس جا کر ماڈل بننے کے خواب دیکھے۔ مگر قرۃ العین حیدر ترقی پسند بھی نہیں اور تم سے ناراض بھی نہیں۔ وہ تو زوال پذیر بورژوا سماج کی فرد ہے اور انھیں کی عکاسی کرتی ہیں۔
ایک مرتبہ پاکستان میں ہماری پنچایت نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کی چیزوں کو ہاتھ نہ لگائیں اور عصمت نے دہی بڑے اور چاٹ جیسی چٹخارہ دار زبان میں ان کی ہجو 'پوم پوم ڈارلنگ' کے عنوان سے 'نقوش' میں چھپوائی تھی۔ بعد میں کرشن چندر نرم پڑا اور ان کی سفارش میں کہا کہ پہلے قرۃ العین حیدر نے صرف رقص گاہ کی روشنی دیکھی تھی، اب باہر کا اندھیرا بھی دیکھ لیا ہے مگر اس کے باوجود ہم لوگ کبھی بھی ان کو ترقی پسند یا اپنے قریب نہیں سمجھتے ہیں، مگر دیکھو، انھوں نے بھی اس کہانی کے آگے سپر ڈال دی۔ ندا فاضلی اور عادل منصوری، یہ تو جدید ہیں۔ عادل منصوری تو اپنے فن میں وہی abstraction برتتا ہے جو آپ کی کہانیوں کی خصوصیت ہے، اسے تو یقیناً آپ کی کہانی سمجھ میں آنی چاہیے تھی مگر اس کے دانت بھی کھٹے ہو گئے۔

ہم نے یہ بھی چاہا کہ یہ تمام لوگ اگر شیشے کی آنکھوں سے ڈر کر بھاگ رہے ہیں تو عوام کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔ سلطانی جمہور کا زمانہ ہے اور ان بڑے بڑے جغادریوں کے مقابلے میں ان کی حیثیت شہد کی مکھی کی ہو سکتی ہے اور شاید یہ سنہرے سینگوں والا بکرا ان سے چت ہو جائے مگر اس قضیے میں شہد کی مکھی بھی ہار مان گئی، لہٰذا کہانی واپس۔

سیاسی چال بازی کا کرشمہ یہ ہے کہ ایک ہی ہلّے میں انھوں نے مین را کو سب سے بدظن کر دیا حتیٰ کہ اپنے قارئین سے بھی۔

دوسرے نام تو نہیں مگر عادل منصوری کے نام کا استعمال کافی معنی خیز اور تحقیق طلب ہے۔ چند مہینے پہلے جدید شاعری پر فلسفہ طرازی کرتے ہوئے سردار جعفری نے یہی کھیل کھیلا تھا اور اس طرح کی باتیں کی تھیں کہ جدید شاعروں کی صف میں ترقی پسندوں جیسی پھوٹ پڑ جائے۔ عادل منصوری کا نام یہاں خاص طور سے لیا جانا کچھ اس امر کی غمازی کرتا ہے کیونکہ کرشن چندر کہانی سمجھے یا نہ سمجھے، کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن وہ لوگ جو خود فن میں زبردست تبدیلیوں کے قائل ہیں اور اس کے لیے کوشاں ہیں، وہ اگر ایسی کوششوں کو حقیر سمجھتے ہیں تو ظاہر ہے، آپس میں

اُلجھنیں ہوں گی اور ترقی پسندی کی لاش پر بیٹھے ہوئے گدھوں کو سامان نظارہ مہیا ہوگا۔ مین را نے تھوڑی جلد بازی سے کام لیا۔ وہ کم از کم ندا فاضلی اور عادل منصوری کا version معلوم کر لیتے تو پھر ادب میں گھسے ہوئے ان شیشے کی آنکھوں والے بکروں کو ایسی ڈنک لگتی کہ مزہ آ جاتا۔

خیر، ابھی بھی ان باتوں کی تحقیق ہو سکتی ہے۔ صرف اتنے سے کام نہیں چلے گا۔ مین را کی جرأت کہ اس نے 'تمام' زمانے کو مخالف پاتے ہوئے بھی اسے للکارنے کی ہمت کی۔ ایک جیالے اور عوامی فنکار کی جرأت مندی کا یہ ثبوت کہ ایک کہانی کی واپسی کے لیے تیس چالیس آدمیوں کے کندھوں کی ضرورت پڑ گئی۔''

پرکاش فکری نے لکھا ہے کہ میں کم سے کم ندا فاضلی اور عادل منصوری کا version معلوم کر لیتا — اتفاق کی بات ہے کہ میری طبیعت کی عجلت پسندی میرے کام آ گئی۔ سردار جعفری کا خط ملتے ہی میں نے جعفری کو خط لکھ دیا اور اپنے یاروں کے ساتھ 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' کی سطروں میں کھو گیا۔ میں اس بات سے خوش ہوں کہ جو کچھ ہوا، آپ سے آپ ہوا — میں نے تو اب تک ندا فاضلی کو ایک لفظ تک نہیں لکھا ہے اور نہ ہی عادل منصوری کا شکریہ ادا کیا ہے۔ محمد عمر میمن 'تحریک' کے مئی ۶۷ء کے شمارے میں صفحہ ۳۵ پر لکھتا ہے:

'' Intuition یا hunch کو ٹھوس حقیقت کی سرحد تک آتے آتے کچھ وقت ضرور لگتا ہے۔ اپریل کے شمارے میں عادل منصوری کا وضاحتی خط اس بات کی دلیل ہے کہ بسا اوقات وقت کا فاصلہ حیرت انگیز طور پر سمٹ بھی سکتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے: مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین سا ہو چلا تھا کہ سردار جعفری صاحب چند ادیبوں کے نام بطور ڈھال استعمال کر رہے ہیں۔ ''ابلاغ کسے کہتے ہیں؟'' میں قارئین کو اسی hunch نما یقین کی بازگشت محسوس ہوگی۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ ہے، اس کی توقع کیا، مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ عادل منصوری صاحب اس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ میرے وہم کو حقیقت سے ہمکنار کر دیں گے۔

اس فعل پر میں انھیں مبارکباد پیش نہیں کروں گا۔ جو کچھ انھوں نے کیا ہے، وہ ایک دیانت دار قلمکار کے منصب کے عین شایان شان ہے۔ یہاں ان کی خموشی تکلیف دہ ہوتی۔''

اب میں ان خطوط کو پیش کرتا ہوں جو 'تحریک' کے اپریل، مئی اور جولائی ٦٧ کے شماروں میں شائع ہوئے — اپریل کے شمارے کے خطوط:

• سلمان عباسی (لکھنؤ): یہ حقیقت ہے کہ مین را کا افسانہ 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' ایک پیچیدہ گتھی ہے لیکن ایسی گتھی نہیں جو ادب پر لینن پرائز اور پدم شری کے خطابات رکھنے والوں کے لیے قابل حل نہ ہو۔ دراصل مین را نے آڑی ترچھی لکیروں سے ایک خوبصورت نقشہ تیار کیا ہے۔ اس نے الفاظ کے توڑ مروڑ میں زندگی کے ان سنگین المیوں کو سمو دیا ہے جو آج کے ننگے ماحول کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ یقیناً افسانوی ادب میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

• امر ساہنی (سونی پت): مین را کی تخلیق 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' کے متعلق آپ کا اداریہ، سردار جعفری کا خط اور پھر خود مین را کا جواب پڑھا۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آ گئی لیکن اگر یہ تخلیق جسے نہ جانے آپ نے بھی کسی مجبوری کے تحت کہانی تسلیم کیا ہے، کہانی مان بھی لی جائے تو اس سے کہانی کار کے ذہنی انتشار کے علاوہ اور کچھ بھی پلے نہیں پڑتا۔ نئی نسل کے بعض ادیب کوئی 'کارنامہ' قسم کی تخلیق پیش کر کے رات بھر میں دنیائے ادب کو چونکا دینا چاہتے ہیں اور مین را کی یہ تخلیق بھی زیادہ سے زیادہ اسی سلسلے کی ایک بے معنی سی قلابازی کا نمونہ کہی جا سکتی ہے اور اگر سردار جعفری اور دوسرے باشعور ادیبوں اور قارئین کی سمجھ میں نہیں آئی تو اس میں ان کا کیا قصور؟

• سین کمل (گلبرگہ): مین را کی کہانی بہت کوشش کے باوجود میرے لیے ایک معمہ ہی بنی رہی۔ صرف کہانی کے تعلق سے دیے گئے دونوں خطوط ضرور سمجھ میں آئے۔ تعجب ہے کہ اس کہانی کو آپ نے کیا سوچ کر 'تحریک' میں اتنی نمایاں جگہ دی۔

• قمر اقبال (دیجاپور): آپ کے اداریے (گوپال متل کے) پرکاش فکری کے خط (کالم) اور مین را کے case سے متعلق کچھ نہ لکھنا غیر انصافی ہوگی۔ مین را کے افسانے سے قطع نظر (ویسے میں انھیں چند اچھے کہانی کاروں میں شمار کرتا ہوں) سردار جعفری کا رویہ یقیناً غیر مناسب ہے۔ چونکہ آج جدید قلمکار بڑی سرعت و برق رفتاری سے ادب کی تمام تر اصناف پر چھاتا جا رہا ہے، اس لیے ترقی پسندوں کو خاصی تشویش پیدا ہوگئی ہے، ہر شخص کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے کہ کہیں اس کی 'ادبی

کرسی نہ چھن جائے۔ یہی وجہ ہے، جواد بھتے ہوئے ترقی پسندوں کا بچا کھچا ریوڑ خطرے کی بو سونگھ کر چوکنا ہو گیا ہے اور اپنے بچاؤ کے لیے وہی طریقہ کار اپنا رہا ہے جو اس کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

• ایس نجم الحسن انجم ادیب (کولار): اس کہانی کے بیچ قرۃ العین حیدر، کرشن چندر، ندا فاضلی، عادل منصوری اور حسن کمال کی رائے نہیں آئی بلکہ 'پدم شری' آ گیا۔ آج کل 'تخلیقات' کو 'فن کی عینک' سے نہیں پرکھا جاتا بلکہ 'شہرت اور نام کی عینک' سے پرکھا جاتا ہے۔ آج کل یہ روش عام ہے، یہاں نام بکتے ہیں، نام چلتے ہیں اور نام ہی کی چھاپ سے کام چلتا ہے — کیا سردار جعفری صاحب اس کہانی کا تجزیہ کرنا چاہتے تھے۔ اگر نہیں تو مختلف اصحاب سے کہانی کے متعلق رائے لینے کی کیا ضرورت تھی۔

• ہربنس لال ساہنی (سونی پت): آپ کے اداریہ اور سردار جعفری کے نام لکھے گئے مین را کے خط کے باوجود بھی مین را کی کہانی 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' دوبارہ پڑھنے پر بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ خدا معلوم یہ کہانی کی خوبی ہے یا میری کم فہمی — لیکن اتنی بات صاف ہے کہ مین را کہانی کار سے اچھے مکتوب نگار ہیں اور اسی مکتوب نگاری کے طفیل انھوں نے اپنے آپ کو ایک حلقے میں کہانی کار تسلیم کروالیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہنگامی شخصیت بننے کی کوشش میں بھی ہیں۔ بزم احباب (تحریک کا خطوط کا کالم) سے التماس ہے کہ اگر کسی ایک کی سمجھ میں بھی یہ کہانی آئی ہو تو وہ دیگر قارئین کو بھی سمجھا کر فیضیاب کریں۔

• وقار واثقی (مہو کینٹ): بلراج مین را کا افسانہ پڑھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانوں کا ادب بھی نئی شاعری کی طرح اپنا چولا بدل رہا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے قاری کو بھی دماغی ورزش کرنی ہوگی۔ سردار جعفری یا کرشن چندر نئے افسانے کے ناقد نہیں ہو سکتے۔

• ان راہی سیوہاروی (احمد آباد): مین را کی کہانی کے ساتھ علی سردار جعفری کا سلوک صحافتی بددیانتی کی بدترین مثال ہے۔ اس لیے جتنی بھی مذمت کی جائے، کم ہے۔ مین را کی کہانی 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' اور علی سردار جعفری کا خط ایک سے زائد بار پڑھا۔ علی جعفری کی سمجھ میں جب کہانی نہیں آئی تو انھوں نے دو سمجھ داروں، کرشن چندر اور قرۃ العین حیدر کو پکارا، جنھوں نے

جعفری کی بات کی تائید کر دی۔ اپنی بات کو مزید وزنی بنانے کے لیے پدم شری جعفری نے کچھ بوجھ بجھکو اور ڈھونڈ نکالے گمران کی حالت بھی عجیب سی ہے۔ ایک بجھکو حسن کمال نے کہا، اس میں آزادی سے پہلے اور بعد کا ہندوستان ہے۔ کیا یہ صاحب بتا سکتے ہیں کہ یہ جملے کہانی کی تعریف میں ہیں یا مذمت میں۔

- ایس نورالحسن انور ادیب (میسور): سردار جعفری نے مین را کا افسانہ لوٹا کر اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ فن کار کو دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں نہ کہ فن کو۔

- مصور سبزواری (نوح): بلراج مین را کی کہانی سردار جعفری کے مبہم خط کے ساتھ شائع ہو کر اور وقیع بن گئی ہے اور سردار جعفری کی بد دماغی پر ایک لطیف طنز۔

- عبدالرؤف محبوب (باگلکوٹ): مین را کی کہانی بعنوان 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' کو سمجھنے کے لیے تھوڑا کھر چا ہوا دماغ چاہیے۔ کئی جگہ الفاظ کی تنظیم بہت پسند آئی مثلاً ''سمندر کی لہروں نے اُف کا نغمہ گنگنانا شروع کیا'' اور.... ''اور وہ کال کوٹھری جو شہر تھی یا رات'' وغیرہ وغیرہ۔ مین را نے صرف سردار جعفری کو ''سیاسی'' ادیب کہا ہے لیکن میرے خیال میں ان تمام لوگوں کو جن کے نام خط میں شامل ہیں، 'سیاسی ادیبوں کا گروہ' کہنا مناسب ہوگا۔

- قیصر جہاں (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ): 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' تعجب ہے، سردار جعفری کو پسند نہیں آیا۔

- بدیع الزماں خاور (داپولی): آپ نے (گوپال مِتّل نے) مین را کی کہانی اور ترقی پسند ادیبوں کی حالیہ کانفرنس کے نام پر جو ہنگامہ کھڑا کیا ہے، اس کے لیے آپ کو داد دیے بغیر نہیں رہا جاتا۔

- صابر شاہ آبادی: مین را کی کہانی بغور پڑھی جو واقعی مبہم اور غیر واضح ہے لیکن سردار جعفری کی رائے کی دورنگی پر افسوس ہوا۔

- علیم صبا نویدی (مدراس): کرشن چندر کے بھائی مہندر ناتھ کا بلراج مین را کے ساتھ ناروا سلوک افسوس ناک ہے۔

- عرفی آفاقی (گورکھپور): مین را کی کہانی ایک بار پڑھی، دو تین بار پڑھوں تو شاید کچھ پلّے پڑے۔

- نشاط قیصر (پٹنہ): 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' توجہ کی مستحق ہے۔ علی سردار جعفری کے خط اور آپ کے 'اس شمارے میں' (گوپال متل کا ایڈیٹوریل) سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعی کسی ذاتی کشیدگی کی بِنا پر کہانی نہیں شائع کی گئی — اور کہانی؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی زندگی کے چند واقعات کو ایک کہانی کی شکل میں دینے کی کوشش کی ہے لیکن کہانی میں ربط، تسلسل پیدا کرنے میں وہ بُری طرح ناکام رہا ہے۔

- یوگیش گپتا (دہلی): بلراج مین را کی کہانی اور اس کے چھپنے کی کہانی پڑھی تو مزہ آ گیا۔ سردار جعفری یا ایسے ہی اور اُردو ہندی کے ترقی پسندوں کے بارے میں یوں تو کچھ غلط فہمی نہیں ہے، پھر بھی چاہے کیسا ہی آدمی ہو نقاب اُٹھنے کے وقت کچھ نہ کچھ تو شرماتا یا جھنجھلاتا ہی ہے اور اس کے یہ پینترے واقعی لذت دیتے ہیں، یہ سچ ہے — پر مجھے بلراج سے شکایت ہے کہ آخر کیوں وہ سردار صاحب کے جھوٹ پر ناراض ہے۔ جھوٹ تو وہاں بنیاد میں ہے۔ یہ کمبل تو انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے بہت عرصہ پہلے درویش سے مانگ کر اوڑھا تھا۔ کمبل اوڑھے ہی اوڑھے وہ بڑبڑاتے رہے۔ اس کی کچھ آواز باہر بھی آتی رہی۔ سرکار کو یہ ناگوار گزرا تو اس نے ایک کمبل اور ڈال دیا۔ سردار کی سردی دور ہوئی، اب وہ سرکار کے گن گاتے ہیں۔ پر یونیفارم وہی ہے، سو مین را کو شکایت کیوں؟ اتنے سے جھوٹ پر؟

مئی ۱۹۶۷ء کے شمارے کے خطوط:

- عرفی آفاقی (لکھنؤ): پرکاش فکری نے ترقی پسند سیاست کا تجزیہ (شیشے کے سینگوں والا بکرا) بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے، اس پر عادل منصوری کا خط مستزاد۔

- حبیب کیفی (جودھپور): 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' کے متعلق تمام مواد پڑھ ڈالا۔ اس کہانی

کوایک باردو باراور ضرورت پڑے تو سو بار پڑھ کر مطلب اخذ کیا جائے نہ کہ چیخا چلایا جائے۔

- زیدی جعفر رضا (علی گڑھ): سردار جعفری اس کہانی کو نہیں سمجھ سکے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔اس طرح کی چیزیں ان کی سمجھ سے بالاتر ہوا کرتی ہیں۔رہ گیا متعلقین جعفری کا سوال، تو ظاہر ہے کہ وہ سردار صاحب کی نا سمجھی پر اپنی سوجھ بوجھ کا سکہ جمانے کا اس سے خوبصورت طریقہ اور نکال بھی کیا سکتے تھے۔بہر حال اس خوبصورت کہانی کی اشاعت کے لیے آپ اور کہانی کار دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

- بدیع الزماں خاور (داپولی): اپریل ۱۹۶۷ء کے 'تحریک' میں پرکاش فکری کے 'رف نوٹس' اوران کے ساتھ شائع شدہ عادل منصوری کا خط پڑھنے کے بعد مین را کی کہانی کے سلسلے میں ایک ایسی حقیقت سامنے آجاتی ہے جو بے حد تلخ ہے۔جو برتاؤ جعفری صاحب نے مین را کی کہانی کے ساتھ کیا ہے وہ بہر اعتبار مذموم اور افسوسناک ہے۔

- ستیش جمالی (سونی پت): سردار جعفری نے مین را کی کہانی واپس کر کے اپنی نالائقی کو پھر سے نمایاں کیا ہے اور اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ اونچی جگہوں پر بیٹھے ہوئے پاکھنڈی ادیب نئے ادیبوں کو آگے نہیں آنے دیتے اور نئی دچار دھاراؤں سے ادب کو روشناس نہیں کراتے۔

- جی ایم راہی (فتح پور): عادل منصوری کا خط سردار جعفری کے غلط اقدامات پر ایک اور ضرب ہے۔میں بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ کیا عالم گیر شہرت کا حامل غلط بیانی جیسے جرائم کا بھی ارتکاب کر سکتا ہے۔

'تحریک' کا جون ۶۷ء کا شمارہ 'اقبال نمبر' تھا۔ظاہر ہے، 'اقبال نمبر' جیسے پاک شمارے میں لغویات کے سلسلے میں گنجائش نہیں تھی۔

جولائی ۱۹۶۷ء کے شمارے کے خطوط:

- ریاض احمد (پٹنہ): بلراج مین را کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، اسے پڑھ کر لگا کہ ان لوگوں پر ماتم

کروں جو کہ اپنے کو زبردستی ادبی بُت منوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں یہ صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر سردار جعفری قسم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ انھیں ادبی بت سمجھ کے پوجتے ہیں، تو ان کا یہ خیال غلط ہے اور وہ یہ جان لیں کہ ان کی ہر وہ حرکت جو کہ نا قابلِ برداشت ہے، کبھی قبول نہیں کی جائے گی۔ بلراج مین را نئی پود کا ایک نہایت ذہین فنکار ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر چیز ہر آدمی کی سمجھ میں آ جائے۔ آج سے چند سال قبل جب 'صنم' پٹنہ کا افسانہ نمبر شائع ہوا تھا تو اس میں کرشن چندر کا 'مردہ سمندر' کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اس وقت سردار جعفری کہاں تھے؟ انھوں نے کیوں اس پر کچھ نہ لکھا؟ میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ ان پر کرشن چندر، عصمت چغتائی وغیرہ کی دھونس ہے، نہیں تو وہ کبھی بھی بلراج مین را کی کہانی ان لوگوں کو نہیں دیتے بلکہ اگر ان میں صلاحیت ہوتی تو خود اس کہانی کو جانچتے۔ اگر کہانی سردار جعفری، کرشن چندر، عصمت چغتائی وغیرہ کی سمجھ میں نہیں آئی تو ان کی نظر کا قصور ہے نہ کہ بلراج مین را کا۔ اور پھر جب کرشن چندر 'مردہ سمندر' جیسی کہانی لکھ سکتے ہیں اور کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تو بلراج مین را بھی اس قسم کی کہانی لکھ سکتا ہے۔ آنے والا وقت فیصلہ کرے گا کہ کون صحیح تھا۔ پرانے لوگ یہ سمجھ لیں کہ ان کے بعد اُردو ادب کی باگ ڈوران ہی نئے لوگوں کو سنبھالنا ہے، جن میں ایک فرد بلراج مین را ہے۔

- علیم اللہ حالی (پٹنہ): 'تحریک' کی ادبی تحریکات ادھر چند مہینوں سے خاصی بڑھ گئی ہیں۔ جدید ذہنوں کی گتھیوں کو سلجھانے کی پُرخلوص کوشش تو بہرحال قابلِ ستائش ہے مگر ایسے لوگوں سے بچیے جو مسائل کو اور بھی اُلجھا دیتے ہیں اور اُلٹی سیدھی باتیں لکھ کر اپنی شخصیت کو منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

- دور آفریدی (بمبئی): مین را کی کہانی میں نے پڑھی تھی۔ بہت خوب تھی۔ سردار جعفری صاحب نے اسے اپنے رسالے میں شائع کرنے سے انکار کیا اور اس کے جواز میں کچھ لایعنی احکامات بھی مین را کو لکھ بھیجے، جو کچھ معروف اور کچھ نو واردانِ ادب کے لگائے ہوئے (اس کہانی کے بارے میں) تھے۔ یہ عمل کم سے کم جعفری صاحب کو زیب نہ دیتا تھا۔ اپنے کردار کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنا کسی ذمہ دار شخص و شخصیت کے لیے افسوسناک حد تک بُرا ہے۔

مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا ہے کہ مندرجہ بالا خطوط کے سلسلے میں کیا کہوں؟

ناموں کی فہرست پر نظر ڈالتا ہوں تو یوگیش گپتا نظر آتا ہے جو میرا یار ہے۔ وقار واثقی، علیم اللہ حالی اور دورآفریدی کی تخلیقات تو میرے ذہن میں نہیں ہیں لیکن ان کے نام میرے ذہن میں ہیں۔ ستیش جمالی سے حال ہی میں سرسری ملاقات ہوئی ہے۔ باقی کے لکھنے پڑھنے والے میرے لیے نئے ہیں — لیکن ان لوگوں کو کیا ہوا، یہ لوگ کہاں گئے؟ محمود ہاشمی، کمار پاشی، بلراج کومل، راج نرائن راز اور زبیر رضوی — شہریار، بشیر بدر، شمس الرحمٰن فاروقی، غیاث احمد گدی، اقبال متین، اقبال مجید، رتن سنگھ، جوگندر پال اور احمد ہمیش۔ محمد علوی اور باقر مہدی۔

اس سلسلے کا آخری خط میرا ہے جو 'تحریک' کے اگست ۱۹۶۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور وہ یوں ہے:

''مہندر ناتھ، سردار جعفری اور میری کہانی 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' کے سلسلے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، پڑھا۔ اس کے علاوہ مجھے اعجاز احمد (واشنگٹن)، انور سجاد (لاہور)، ریاض احمد چودھری (لاہور)، امّ عمارہ (ڈھاکہ)، حسن کمال (بمبئی) اور شرون کمار ورما (امرتسر) کے خطوط بھی ملے ہیں۔ انور عظیم کا کہنا ہے کہ میری کہانی (جس کی کتابت ہوچکی تھی) سردار جعفری نے اس وجہ سے لوٹائی تھی کہ ان پر سنڈیکیٹ نے دباؤ ڈالا تھا، [1] اس سنڈیکیٹ میں کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور مہندر ناتھ شامل ہیں۔ مہندر ناتھ کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ وہ لوگ جو ادب میں پہلوانی کرتے ہیں، ان سے میرا کوئی سمبندھ نہیں۔ کرشن چندر کے بارے میں انور سجاد نے لکھا تھا، ''ان لوگوں کے لیے سب سے بڑی گالی ہمارا افسانہ ہے۔'' اور مرنے سے چند ماہ پہلے راج کمل چودھری نے لکھا تھا، ''(بوڑھوں کا) جنازہ (ہمارے) کندھوں پر ہو تو (ہمارا) خاموش رہنا مناسب ہے۔'' میں صرف اتنا کہوں

---

[1] انور عظیم نے ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس کو ایک رپورتاژ میں سمیٹا تھا۔ یہ رپورتاژ 'گفتگو' کو بھیجا گیا تھا۔ یہ اس لیے شائع نہ کیا گیا کہ انور عظیم نے اس رپورتاژ میں چند مشہور ترقی پسند ادیبوں کی کھال اُتاری ہے — جعفری نے انور عظیم کو لکھا تھا (مجھے انور عظیم نے خط دکھایا تھا) کہ اب تمھیں (انور عظیم) کرشن چندر کا گنجا سر بھی اچھا نہیں لگتا — دلچسپ بات یہ ہے کہ انور عظیم کی تازہ ترین کہانی 'قتل برائے قتل' مطبوعہ 'سویرا' لاہور میں ایک Bloody Hypocrite افسانہ نگار کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے سر کی طرح اس کا دل بھی گنجا ہے۔

گا کہ کرشن چندر کے حواری لاکھ شور مچائیں (ہندی پرچوں میں) اور کرشن چندر لاکھ 'ہاتھی دانت کا ٹاور' سا سین سیشنل جرنلزم (Sensational Journalism) لکھیں، اب وہ اپنے پاؤں کھڑے نہیں ہو سکتے۔ رہیں قرۃ العین حیدر، ان کی سمجھ سے میری کہانی 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' دور ہے۔ انھوں نے خود مجھے اس کہانی کی تخلیق سے سال بھر پہلے بمبئی میں کہا تھا کہ ان کی سمجھ میں میری کہانیاں نہیں آتیں۔ اب انھیں ربڑ کی عورت اور استعمال شدہ ایف ایل کے معنوں کا علم ہو گیا ہوگا؟''[1]

اعجاز احمد نے واشنگٹن سے لکھا: ''سردار جعفری اور تمھارے درمیان جھگڑے کا مجھے افسوس ہے محض تمھارے واسطے سے۔ نہ میں سردار جعفری کو اہم سمجھتا ہوں، نہ کرشن چندر کو۔ دونوں واہیات قسم کے ادیب ہیں۔ سردار جعفری کی بابت تو بالخصوص مجھے شبہ ہے کہ وہ ادیب ہیں بھی یا نہیں۔''

شرون کمار ورما نے لکھا: 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' نے جو ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے، اس سے جعفری اور ترقی پسند گروپ کی ذہنیت صاف ہو گئی ہے۔ تمھارا خط جو تم نے جعفری کو لکھا تھا، اُردو ادب میں زندہ رہے گا۔ 'یہ لوگ' کس نچلی سطح تک اُتر سکتے ہیں، آج معلوم ہوا ہے۔ ان کے ہاں ادب سے زیادہ گروپ بازی اور پارٹی کا خیال ہے۔ شاید اسی وجہ سے آج کل کرشن چندر 'ربڑ کی عورت'[2] جیسے واہیات افسانے لکھ رہا ہے۔''

اب چند ان خطوط کا بھی ذکر ہو جائے جو اس 'ہنگامے' کی پیداوار ہیں لیکن جو ایک دوسری سمت رُخ کیے ہوئے ہیں۔

محمد عمر میمن نے 'تحریک' کے مئی ۱۹۶۷ء کے شمارے میں لکھا: ''ہمارے یہاں لوگ صحت مند بحث و تمحیص سے عموماً دامن بچانے کے عادی ہیں۔ یہ اس لیے کہ بحث و تمحیص یا تنقید کا استعمال ہمارے یہاں بڑی حد تک ایسے موقع پر ہوتا ہے جب اپنی یا اپنے گروہ کی فضیلت اور اپنے حریف یا اس کے گروہ کی ہزیمت درکار ہو۔ ظاہر ہے، اس صورتِ حال میں جب تنقید اپنے ضمن میں توصیف اور اپنے اغیار کے ضمن میں تنقیص سے عبارت ہو، تو اس سے کسی قسم کی سودمندی کی امید عبث ہے۔ ادھر چند دنوں سے دہلی اور بمبئی کی ادبی فضا خاصی نازک ہو چلی ہے۔ برسوں کا جمود یکلخت ٹوٹ گیا ہے اور مین را — جعفری مناقشہ نے ذہین افراد کو ایک لمحۂ فکریہ بہم پہنچا دیا ہے۔

---

[1] یہ آخری جملہ گوپال متل نے 'تحریک' میں شائع نہیں کیا تھا۔

[2] کرشن چندر کا افسانہ 'ربڑ کی عورت'، 'سویرا لاہور' میں شائع ہوا تھا۔ اسی شمارے میں میرا افسانہ 'کمپوزیشن ایک' بھی چھپا تھا — دونوں افسانے پڑھیے۔ آپ بخوبی جان لیں گے، کون کیا لکھ رہا ہے؟

کیوں نہ اس لمحہ سے فائدہ اٹھایا جائے اور جذبات کو بالائے طاق رکھ کر قطعی معروضیت اور سنجیدگی کے ساتھ چند ادبی مسائل پر بحث کی جائے۔ قدیم و جدید ہر مکتبۂ فکر کے اصحاب کو اس مکالمے کے ذریعہ اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کا موقع مل سکے گا۔ اپریل کے شمارے میں میں نے 'ابلاغ' کی بابت اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ یہ خیالات اسناد اور قطعیت کے مدعی ہرگز نہیں۔ ان میں لچک موجود ہے — میں بخوشی ان پر تنقید قبول کروں گا۔

'ابلاغ' ہی کی ذیل میں عادل منصوری صاحب کے خط کا حسبِ ذیل جملہ میرے لیے کافی اہم اور اس سے زیادہ پریشان کن ہے۔ لکھتے ہیں: ''ادب میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو سمجھ کے دائرے سے باہر رہتی ہیں۔'' شاعر مذکور کی غزلوں نظموں میں سے کئی ایک میری دسترس سے باہر ہیں لیکن میں اپنی کم فہمی کو اپنے تجربے اور وجدان کی محدودیت پر محمول کرتا ہوں نہ کہ اس بات پر کہ ''ادب میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو سمجھ کے دائرے سے باہر رہتی ہیں۔'' منصوری صاحب کے اس جواب کی بے پناہ سادگی اور معصومیت حسین ضرور ہے لیکن یہ وہ معصومیت ہے جس سے Abstract Painting کے ناظرین متصف کیے جاتے ہیں۔ یہ حضرات کسی Abstract Painting کو اپنی فہم سے بالا پا کر بھی اس کی توصیف و تحمید سے نہیں جھجکتے۔ غالباً اس مفروضے کے تحت کہ فنِ تصویر کشی میں چند باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں اور جہاں افہام و تفہیم اس anarchy سے وابستہ ہو، کہی گئی ہر بات کچھ معنی ضرور رکھے گی۔

صاحب یہ روش تو layman کی روش ہے، پکاسو کی نہیں۔ عادل منصوری صاحب سے اس موضوع پر چند سنجیدہ اور بامعنی جملوں کی توقع بجا طور پر کی جا سکتی ہے۔ کیا وہ ان باتوں کی طرف میری راہنمائی فرمائیں گے جو ان کی دانست میں ادب کے دائرے میں رہ کر بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔

عادل منصوری نے جولائی ۱۹۶۷ء کے 'تحریک' میں جواب دیا: ''ادب میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو سمجھ کے دائرے سے باہر رہتی ہیں، یہ جملہ کہتے وقت سردار جعفری صاحب کا رُخِ روشن میرے سامنے تھا۔ اب آنکھیں میچ کر تخیل و تصور کے کبوتروں کو دُور دُور تک اُڑانے کے لیے ہاتھ ہلاتا ہوں لیکن کبوتر ہیں کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے اور وہ رُخِ روشن کا دھندلا سا خاکہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کبوتروں کو اُڑانے کی بے حد کوششوں کے نتیجے میں کبوتر پھڑ پھڑانے لگتے ہیں اور غٹرغوں، غٹرغوں کی آوازوں سے مجھے بھر دیتے ہیں۔ میں پھر اپنے آپ کو خالی کر کے دور اُفق کے پار کسی کا منتظر ہوں لیکن پھر وہی پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور غٹرغوں، غٹرغوں، سوچ آن کر کے

دیکھتا ہوں تو میرے (اپنے) ہاتھوں میں کبوتروں کے جھڑے ہوئے پر مسکراتے پاتا ہوں۔"

"تخلیقی لمحوں میں فنکار جن مقامات سے گذرتا ہے، وہاں دوسرا کوئی بھی شخص تجربے اور وجدان کی بے پناہ وسعتوں کے باوجود بھی پر نہیں مار سکتا۔ ایسے لوگوں کو 'سدرۃ المنتہیٰ' سے واپس لوٹنا پڑتا ہے۔"

"محمد عمر میمن صاحب، میری روش کو بھلے layman کی روش کہیں، لیکن میرے لیے یہی حقیقت ہے۔"

● انیس امام (آرہ): "'ابلاغ کسے کہتے ہیں؟' اس شمارے کا واحد ادبی مضمون ہے۔ موصوف مضمون لکھنے بیٹھے اور وہ بھی ایک اہم ادبی موضوع پر لیکن پورا مضمون مین را کے مقدمے کی بریف ہو کر رہ گیا۔ 'بریف' کو لفظ بحث سے بدل دیا جائے تو شاید زیادہ اچھا رہے گا۔ یا تو یہ مدیر کی غلطی ہے کہ خط کو مضمون کا عنوان دے دیا یا مضمون نگار کی کمزوری کہ مضمون سے کما حقہٗ انصاف نہ کر سکا۔ حوالوں کا اکٹھا کر دینا مرتب کا کام ہے، مضمون نگار کی ذمہ داری اس سے آگے کی ہوتی ہے۔"

● نظام الحسینی (کلکتہ): "عادل منصوری، محمد علوی اور بعض دوسرے نئے شاعروں کی بعض چیزیں میری فہم وادراک سے باہر ہوتی ہیں لیکن وہ یہ کہہ کر قارئین کا منہ بند کر دینا چاہتے ہیں کہ ادب میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو سمجھ کے دائرے سے باہر رہتی ہیں، تو کلیہ یہ ہونا چاہیے کہ جو چیزیں نہ سمجھ میں آئیں انھیں ادب میں شامل کر لیا جائے، تنقید نگاروں کو چھٹی مل جائے گی۔"

اب آخر میں مظہر امام (گوہاٹی) (مظہر امام آج کل پٹنہ میں ہیں) کے طویل خط کا پہلا پیرا گراف پڑھیے: "اپریل ۱۹۶۷ء کے 'تحریک' میں 'ابلاغ کسے کہتے ہیں؟' کے عنوان سے محمد عمر میمن صاحب کا لاس اینجلس سے آیا ہوا مضمون (یا خط؟) آپ نے بڑے تزک واحتشام سے چھاپا ہے۔ اس مضمون میں کئی کام کی باتیں کہی گئی ہیں لیکن تعجب ہے، انھوں نے بغیر کسی حوالے کے اپنے مضمون میں فقرے کے فقرے بلکہ پیراگراف کے پیراگراف Martin Esslin کی کتاب The Theatre of the Absurd سے لے لیے ہیں۔ میمن صاحب نے Samual Beckett کے Waiting For Godot کا ذکر تو بڑے طمطراق سے کیا ہے، لیکن انھوں نے بہ نفسِ نفیس

ڈرامے کا مطالعہ کرنے میں وقت ضائع نہیں فرمایا اور جو کچھ اس کے بارے میں تحریر کیا ہے وہ Esslin کی کتاب ہی سے اخذ ہے۔ میمن صاحب نے انگریزی الفاظ تک ہو بہو وہی رہنے دیے ہیں اور ان کے ترجمے تک کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔''

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، محمد عمر میمن کا 'ابلاغ کسے کہتے ہیں؟' ایک طویل خط تھا، جسے گوپال متل نے مضمون کی صورت میں شائع کیا تھا۔ مناسب تو یہی تھا کہ متل صاحب پہلے ہی اعلان کر دیتے کہ یہ مضمون دراصل ایک طویل خط میں سے لیا گیا ہے لیکن جب اس 'طویل خط' یا 'مضمون' کے سلسلے میں اشارے کیے گئے، تعجب ہے، تب بھی متل صاحب خاموش رہے۔

محمد عمر میمن نے مجھے لکھا ہے: ''متل صاحب نے میرا خط نہیں چھاپا۔ میں ان کے حق مدیری کا پاس رکھتے ہوئے صرف اس پر متاسف ہوں کہ یہ جغادری امام اسے میری خاموشی تعبیر کرتے ہوئے اپنی فتح نہ سمجھ بیٹھیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے لوگوں کے منہ لگنے سے کیا حاصل۔ نہ یہ سمجھے ہیں نہ کبھی اس کی توقع ہی کی جا سکتی ہے۔ چلو اچھا ہوا کہ متل صاحب نے خط نہ چھاپا۔''

محمد عمر میمن کا اشارہ اس خط کی جانب ہے جو اس نے گوپال متل کو مظہر امام کے لگائے ہوئے 'الزامات' کے بارے میں لکھا تھا — متل صاحب کو چاہیے تھا کہ مظہر امام کا خط شائع کرنے سے پہلے 'الزام' کی تصدیق کر لیتے۔ متل صاحب اکثر ٹی ہاؤس جاتے ہیں۔ چار قدم پر گلگوٹیا کی دکان ہے جہاں سے انھیں The Theatre of the Absurd مل سکتی تھی۔ کتاب پڑھتے اور مظہر امام کے لگائے گئے 'الزامات' کی تصدیق ہو جاتی — جب متل صاحب یہ نہ کر پائے، تب ان کا فرض تھا کہ محمد عمر میمن کا خط شائع کرتے، لیکن یہ بھی نہ ہوا۔ کیوں؟ میں پوچھتا ہوں، کیوں؟ متل صاحب کی غفلت، تن آسانی اور غیر ذمہ دارانہ ادارتی فرائض افسوسناک ہیں[1] — کافی عرصہ بعد میں نے میمن کا خط متل صاحب سے حاصل کیا اور 'اقدار' پٹنہ کو بھیج دیا لیکن اس سے پہلے کہ خط پٹنہ پہنچتا، 'اقدار' کی موت ہو گئی۔ ظفر اوگانوی کہاں ہے، کوئی بتائے۔

چند باتیں گوپال متل کے بارے میں:

متل صاحب سے میں پہلی بار ۱۹۵۹ء کے آخر میں ملا تھا۔ چند ہی ملاقاتوں میں دوستی ہو گئی۔

---

[1] ایسی ہی ایک حرکت 'شب خون' الہ آباد کے ایڈیٹر نے کی تھی، میری کہانی ''ظلمت'' اور محمود ہاشمی کے مضمون 'ایک خطرناک میلان' کے سلسلے میں۔

مثل صاحب واحد ادیب ہیں (میری جان پہچان کے خاصے بڑے حلقے میں) جو عمر کے لحاظ سے میرے بزرگ ہیں لیکن یہ احساس نہ کبھی مجھے ہوا، نہ انھوں نے ایسی کوئی بات کی کہ میں یوں محسوس کرتا۔ ہم ملتے ہیں۔ کبھی فلم کی بات کرتے ہیں کبھی کرکٹ کی۔ ہم فحش باتیں بھی کرتے ہیں اور ادب میں فحاشی پر بھی بات چیت کرتے ہیں۔ لطیفے، خوش گپیاں اور جملے بازی۔ گذشتہ پانچ چھ ماہ کے دوران ہمارے درمیان صرف ویت نام کی بات ہوئی ہے اور خاصی تیز اور گرم۔ وہ ایک طرح سے سوچتے ہیں، میں دوسری طرح سے سوچتا ہوں۔ ان کی شہرت ایک طرح کی ہے، میری شہرت دوسری طرح کی ہے (اس جملے کے لیے میں شرمسار ہوں)۔

'تحریک' میں 'پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ' کے سلسلے میں 'ہنگامہ' ہوا تو کچھ لوگوں کی بھویں تن گئیں۔ انور عظیم کا کہنا تھا کہ جو کچھ ہوا، ٹھیک ہوا لیکن یہ سب 'تحریک' کے ذریعے نہ ہوتا تو مناسب تھا۔ کیوں؟ 'تحریک' امریکی پرچہ ہے؟ میں نے اب تک ۳۴ کہانیاں لکھی ہیں۔ ۳۳ چھپ چکی ہیں۔ ان میں سے کتنی 'تحریک' میں چھپی ہیں؟ میری پہلی کہانی 'ساقی' میں، دوسری 'تحریک' میں، تیسری 'سویرا' میں اور چوتھی 'لیل ونہار' میں چھپی تھی۔ 'سات رنگ'، 'ادبِ لطیف'، 'فنون'، 'نقوش'، 'آج کل'، 'بلٹز' اور 'شب خون' اور اَن گنت دوسرے پرچے — ممکن ہے، کسی پرچے کے بارے میں کسی کی کچھ رائے ہو۔ یا اس ادیب کے بارے میں ایسی ہی رائے ہو لیکن میرا ان سب باتوں سے کیا تعلق؟ میری کہانی یہ تو کہتی ہے کہ میں مین را کی تخلیق ہوں، یہ نہیں کہتی کہ میں 'سویرا' میں چھپی ہوں — جو کہانی 'گفتگو' میں چھپ رہی تھی، 'تحریک' میں چھپ گئی — میرے ذہن میں کہانیاں ہوتی ہیں، پرچے نہیں ہوتے۔ اگر 'تحریک' میں چھپنے سے میں امریکی ہو جاتا ہوں تو صاحب 'بلٹز' میں چھپنے سے کیا ہو جاتا ہوں؟ اور 'گفتگو' میں چھپنے سے کیا ہو جاتا؟ اور میری نوے فیصدی کہانیاں پاکستان میں چھپی ہیں، تب تو میں پاکستانی ہوا (ویسے ایسی ہی بات قومی زبان کے لاؤڈ اسپیکروں نے اکثر کہی ہے) — اگر میری کسی تخلیق میں امریکی پروپیگنڈہ نظر آئے، تب بات دوسری ہے۔

ایک گفتگو کے دوران میرے دوست کیول سوری نے سردار جعفری سے کہا تھا: ''مثل صاحب کی دلچسپی مین را کی کہانی کی اشاعت میں اتنی نہیں تھی، جتنی خطوط میں... مثل صاحب کی مدیرانہ نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ قصہ ان کے دشمنوں کی بدنامی کا سبب بنے گا۔''

میں اس سلسلے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ'، 'سویرا' سے 'شب خون'

تک کسی بھی پرچے میں چھپ سکتی تھی[1] — نہ چھپتی تو دس سال بعد چھپ جاتی کہ وہ تخلیقات جو کسی ادبی سیاست سے وابستہ ہو جائیں، بعض اوقات برسوں بعد چھپا کرتی ہیں۔ فیض کے خلاف جوش کی نظم ایک زمانے بعد، 'سویرا' لاہور میں چھپی۔

مزیدار بات یہ ہے کہ مثل صاحب کے ساتھ ہماری دوستی اس حد تک مشہور ہوئی کہ ہم بھی امریکی ہوگئے، یا امریکہ نواز ہوگئے — ''شبِ افسانہ کا ہنگامہ مثل صاحب سے منسوب کر دیا گیا۔ جھگڑا فساد، مار پیٹ کمار پاشی، کیول سوری اور مجھ سے ہوئی اور کہا گیا کہ مثل صاحب کے آدمیوں نے سب کچھ کیا ہے — اور صاحب جو جھگڑے مثل صاحب سے ہوئے ہیں، وہ کیا ماؤزے تنگ کے آدمیوں نے کیے ہیں — کانگریس فار کلچرل فریڈم کی میٹنگ میں جب مثل صاحب نے یہ کہا کہ اُردو زبان افسانہ نگاری کی متحمل ہی نہیں، تو مثل صاحب کے 'فرمان' کا قیمہ بلراج کومل یا دیوندر اسرؔ نے نہیں کیا تھا جو وہاں موجود تھے بلکہ میں نے کیا تھا جو اتفاق سے مثل صاحب کے ساتھ وہاں جا نکلا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ ایک مراٹھی ادیب (نام بھول گیا ہوں) جنھوں نے مراٹھی زبان میں اُردو افسانے کے تین انتخاب شائع کیے ہیں اور 'انگارے' کے زمانے سے جیلانی بانو (انتخاب کا نام 'زمانہ ہمارا ہے') تک کو سمیٹا ہے، اُردو افسانے کے 'سنہری دور' کا ذکر کر رہے تھے اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کا نام بار بار لے رہے تھے۔ مثل صاحب یہ نہ سن سکے اور انھوں نے اُردو ادب سے افسانہ نکال باہر کیا۔ میں نے کومل اور دیوندر اِسر سے کہا کہ کچھ کہیے۔ لیکن دونوں چپ سادھے بیٹھے رہے، آخر مجھے مثل صاحب کو خاموش کرنا پڑا — افسانے کے سلسلے میں وہ ایک عرصے سے خاموش ہیں۔ کانگریس فار کلچرل فریڈم کی میٹنگ کے کافی عرصے بعد ایک بار مجھ سے کہنے لگے کہ انھوں نے ایک ریڈیو کانٹریکٹ اس لیے لوٹا دیا ہے کہ انھیں افسانے پر کچھ کہنے کے لیے کہا گیا تھا اور افسانہ ان کے مطالعے کے دائرے سے باہر ہے۔

انور عظیم مارکسسٹ ہیں۔ میرے دوست ہیں۔ چند برس ہوئے، انھوں نے ہندی کے ایک فرقہ پرست ہفتہ وار میں میرے خلاف ایک مضمون لکھا۔

---

[1] 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' 'ساریکا' بمبئی کے جون ۱۹۶۸ء کے خاص نمبر کے لیے منتخب کی گئی تھی۔ کہانی کمپوز ہو چکی تھی کہ مجھے پتہ چلا اور میں نے ایڈیٹر مہودے کو خط لکھ دیا کہ میں معاوضہ تین سو روپے لوں گا۔ میں کمرشیل پرچوں میں نہیں لکھتا۔ ہاں اگر کمرشیل پرچے اپنی ساکھ کے لیے میری کہانی کا انتخاب کرتے ہیں تو معاوضے کی رقم میں طے کرتا ہوں — یہ کہانی 'ساریکا' میں اس لیے شائع نہ ہوئی کہ وہ تین سو روپے دینے کے اہل نہیں ہیں۔ وہ بمبئی کے ادبی تاجروں کا مال دو سو روپے (لگ بھگ) فی کہانی کے حساب سے خریدتے ہیں۔

محمود ہاشمی کچھ بھی نہیں ہیں (نہ مارکسسٹ، نہ اینٹی مارکسسٹ۔ انھوں نے امریکی سفارتخانے کے لیے چند کتابیں ترجمہ کی ہیں۔ اگر انھیں روسی یا چینی سفارت خانے سے ترجمے کا کام ملے، میرا خیال ہے، انھیں یہ کام کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ترجمہ کرنے سے کوئی امریکی، روسی یا چینی کیسے ہوسکتا ہے) میرے دوست ہیں۔ دو برس ہوئے، انھوں نے 'شب خون' میں میرے خلاف ایک مضمون لکھا۔

انور عظیم اور محمود ہاشمی، دونوں کے مضامین واہیات تھے — اور میں صرف یہی جانتا ہوں کہ دونوں مضامین واہیات تھے نہ کہ یہ کہ انور عظیم فرقہ پرستوں کے اور محمود ہاشمی 'شب خون' کے ایجنٹ ہیں یا کبھی تھے۔

ایک زمانہ ہوا، گوپال متّل اور سردار جعفری نے مل کر کتابیں ترتیب دی تھیں۔ وہ زمانہ establish ہونے کے لیے بہترین زمانہ تھا۔ متّل اور جعفری، دونوں established ہیں، دونوں Status Quo میں یقین رکھتے ہیں، دونوں ایک ہیں — جہاں تک دونوں کی مدیرانہ صلاحیتوں کا تعلق ہے، وہ جس نے میرا افسانہ کسی دباؤ کے تحت شائع نہ کیا اور وہ جس نے کسی 'مصلحت' کے تحت میرا افسانہ شائع کیا، میرے نزدیک دونوں میں کوئی لمبا چوڑا فرق نہیں ہے۔

نئے افسانہ نگار، شاعر اور ناقد اس 'ہنگامے' کے دوران کہاں مصروف تھے؟

بعض پرانے ادیبوں کا یہ کہنا ہے کہ نئے لوگوں کا ایک گروہ ہے اور بعض کا یہ کہنا ہے کہ کچھ نئے لوگوں کا ایک گروہ ہے — میں کسی گروہ سے متعلق نہیں ہوں، اگر ایسا ہوتا تو نئے لوگوں میں سے کچھ تو اس ادبی غنڈہ گردی کے خلاف میرے ساتھ ہوتے۔

یہ بات میرے علم میں ہے کہ یہاں، وہاں تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد ادبی اشتہار بازی کے تحت کچھ نئے لوگ ایک احمقانہ سا گروپ بناتے رہتے ہیں — میں جانتا ہوں، کوئی دو برس پہلے ایک شعری مجموعہ کی اشاعت کے بعد ایک گروپ بنا، نئے نقاد پیدا کیے گئے، اِدھر اُدھر مضامین چھپے اور اب؟ نہ وہ گروپ رہا اور نہ اس شعری مجموعے کی اہمیت۔

میں کچھ نئے لوگوں سے خائف ہوں۔ کمبخت اتنا اچھا لکھتے ہیں کہ بعض اوقات گھبرا جاتا ہوں۔ ڈرتا ہوں، کہیں پیچھے نہ رہ جاؤں — جب کبھی کوئی نیا پرچہ آتا ہے اور اس میں انور سجاد کا افسانہ موجود نہیں ہوتا تو مجھے بے پناہ خوشی ملتی ہے۔ سوچتا ہوں، یہ شخص خاموش رہے تو اچھا ہے۔ اتنے ڈھیر سارے افسانہ نگار موجود ہیں لیکن جیسے بھی ہیں، اچھے یا بُرے، مجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن انور سجاد سے واقعی خوف آتا ہے — ہندوستان کے نئے شاعروں میں کبھی کبھی میرے خوف کا

سبب عادل منصوری بن جاتا ہے۔

'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' کی اشاعت اُردو افسانے کی دنیا میں ایک ہلچل تھی۔ اَنگنت پڑھنے والوں نے مجھے خطوط لکھے، مختلف شہروں میں ادیبوں اور پڑھنے والوں نے کہانی پر گھنٹوں بحث کی۔ لوگوں نے دریافت کیا: ''مین را نئے افسانہ نگار ہیں یا بلراج مین را نے مین را کے نام سے لکھنا شروع کر دیا؟'' سردار جعفری نے مختلف ادبی نشستوں میں مختلف version دیے۔ 'تحریک' مارچ ۱۹۶۷ء کا شمارہ مارکیٹ سے غائب ہو گیا۔ سہیل عظیم آبادی کے اوپر تلے کئی خطوط ملے اور مجھے انھیں اپنا پرچہ بھیجنا پڑا۔ اور کہانی پڑھنے کے بعد انھوں نے مجھے طویل خط لکھا۔

اس دوران سردار جعفری کیا سوچ رہے تھے — سردار جعفری نئے اُردو افسانے کا 'مطالعہ' کر رہے تھے۔

'گفتگو' کے تیسرے شمارے میں سردار جعفری نے 'ہم قلم' کے نام سے ایک مقالہ بعنوان 'جدیدیت کی حقیقت' لکھا ہے — سردار جعفری کو یہ مضمون 'ہم قلم' کے نام سے اس لیے لکھنا پڑا کہ اس شمارے میں ان کا ایک اور مقالہ 'نئی شاعری کی غلط طرف داری' بھی شامل ہے۔ اگر دونوں سردار جعفری کے نام سے چھپتے تو ممکن ہے، پڑھنے والے کہتے کہ بڑھا سٹھیا گیا ہے۔

ارباب اقتدار کا زر خرید 'ہم قلم'، 'گفتگو' کے تیسرے شمارے کے صفحہ ۱۵۷ پر لکھتا ہے:

''افسانہ کیا تصور پیش کرتا ہے، وہ نئی شاعری سے زیادہ نئے افسانے میں اُبھر کر آ رہا ہے۔ ثبوت میں بلراج مین را (ساکن دہلی) کی ایک کہانی کافی ہے: 'کوئی روشنی، کوئی روشنی' (مطبوعہ 'فنون' لاہور۔ اپریل مئی ۱۹۶۴ء)۔''

ثبوت میں بلراج مین را کی ایک کہانی کافی ہے — سردار جعفری کا یہ جملہ یوں تو یہ ظاہر کرتا ہے کہ انھوں نے نئے اُردو افسانے کا مطالعہ کیا ہے اور اب ایک نمائندہ کہانی کا انتخاب کیا ہے لیکن حقیقت میں انھوں نے تمام نئے اُردو افسانہ نگاروں کو تو کیا، مکمل طور پر بلراج مین را کو بھی نہیں پڑھا ہے۔ اس کہانی کا انتخاب محض سہل پسندی ہے — 'فنون' کے سترہ صفحات پر پھیلی ہوئی اس کہانی کے کئی پیراگراف سردار جعفری نے نقل کیے ہیں۔

جعفری میری کہانی کے بارے میں لکھتے ہیں: ''کردار کا نام گیان ہے (اس کے سارے خط و خال بلراج مین را کے سے ہیں) عمر ۲۷ سال۔ وہ جسم کے لیے ایک سو ساٹھ روپے کی نوکری اور ذہن کی زندگی کے لیے افسانہ نگاری کرتا ہے۔ وہ 'بھارت کے چالیس کروڑ — جانور، احمق یا سوئے ہوئے آدمیوں میں سے ایک ہے، جو اپنی منزل، اپنی زندگی کو پہچاننے کی جستجو کر رہے ہیں۔'

(گویا اپنی منزل، اپنی زندگی کو پہچاننے کی جستجو حیوانیت اور حماقت ہے۔)''

سردار جعفری اپنی بات کہنے کے لیے کہانی کے جملوں کو کس طرح مسخ کرتے ہیں، اس کا ثبوت یہ ہے کہ 'فنون' کے صفحہ ۱۱۷ پر میری کہانی 'کوئی روشنی، کوئی روشنی' یوں شروع ہوتی ہے:

''نام : گیان

عمر : ۲۷ سال

کام : جسم کی زندگی کے لیے ایک سو ساٹھ روپے کی نوکری اور ذہن کی زندگی کے لیے افسانہ نگاری۔

ہمیں، مجھے اور آپ کو، گیان کے اندر باہر جھانکنے کے لیے چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہنا ہے اور حد درجہ محتاط ہو کر کہ وہ بھارت کے چالیس کروڑ ـــــ (اس ڈیش میں آپ جانور، احمق یا سوئے ہوئے آدمی، کچھ بھی بھر سکتے ہیں) میں سے ایک ہے۔ لیکن وہ ان چند سو (اگر سو کم ہیں تو ہزار سہی) اکائیوں میں سے بھی ایک ہے جو اپنی منزل، اپنی زندگی کو پہچاننے کی جستجو کر رہے ہیں۔''

ہندوستان کا ہر نودولتیہ اپنی بات کہنے کے لیے حقیقت کو اس طرح مسخ کرتا ہے۔

سردار جعفری ایک جگہ کہانی یوں نقل کرتے ہیں: ''ان میں ایک کردار کا نام 'درد' ہے جس کی عمر ۳۷-۳۸ سال ہے۔ وہ اپنی 'تخلیق' ان عورتوں کے 'پیٹ میں چھوڑتا رہتا ہے' (کیا زبان ہے) 'جن کے ہاں بچے نہیں ہوتے'۔ اسے ٹی ہاؤس تک آنے میں دیر اس لیے ہوئی کہ کہیں پنڈت جواہر لال نہرو تقریر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مینن کو نشانہ بنانے والے سیاسی مچھندر ہیں... جب درد کہتا ہے کہ 'میں نہرو کی تقریر سن رہا تھا' تو گیان کہتا ہے کہ 'ابھی تمھاری عمر سیکھنے کی ہے... اپنے عہد کی ہر حماقت کو وِٹنس کرو'، اور پھر درد کے اس فقرے پر 'جن کے ہاں بچے نہیں ہوتے انھیں بچے بانٹ رہا ہوں' گیان کہتا ہے کہ 'واہ درد صاحب مزا آ گیا... اور بیس سال بعد حرامیوں کا لشکر انقلاب لائے گا' ـــ کیا اس کے بعد بھی یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے کہ جدیدیت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے؟''

میری کہانی کا مندرجہ بالا حوالہ سردار جعفری نے کہانی کے جس ٹکڑے سے لیا ہے، وہ ٹکڑا میں جوں کا توں نقل کر رہا ہوں۔ یہ ٹکڑا 'فنون' لاہور کے صفحہ ۱۲۱-۱۲۲ سے لیا گیا ہے:

''شام کے چھ بجے ہیں۔

گیان ٹی ہاؤس میں اپنے مخصوص صوفے کی جانب بڑھتا ہے، جہاں اس

کے دوست بیٹھے ہیں۔

'آج تم لیٹ ہو گئے!'

'یار آج کام زیادہ تھا۔'

'ہم سمجھے کہ تم نہرو کی تقریر سننے گئے ہو!'

گیان تعجب سے کہتا ہے: 'نہرو کی تقریر؟'

'ہاں! باہر ایل آئی سی پلاٹ پر ہو رہی ہے...!'

گیان اُٹھتا ہے— سامنے ایل آئی سی پلاٹ پر مختصر سے ہجوم میں پنڈت نہرو کی آواز اُبھر رہی ہے:

'مینن کو نشانہ بنانے والے سیاسی مچھندر ہیں...'

گیان اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہتا ہے: 'یار! یہ شخص اپنا علاقہ بھی کنٹیمنیٹ (contaminate) کر رہا ہے...'

تینوں مسکراتے ہیں۔

پارلیمنٹ اسٹریٹ دُور سے درد داخل ہوتا ہے۔ تینوں چلاتے ہیں۔

'درد صاحب کہ درد صاحب...!'

درد ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہتا ہے: 'کیا حال ہے بچو؟'

گیان منہ بنا کر کہتا ہے: 'درد صاحب، کل آپ کشتیاں دیکھنے چلے گئے اور آج آپ لیٹ آئے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں...!'

درد بھی منہ بنا کر کہتا ہے: 'اچھے بچے روٹھا نہیں کرتے... میں نہرو کی تقریر سن رہا تھا...'

'تقریر؟'

'ہاں بچو، ابھی تمھاری عمر سیکھنے کی ہے... اپنے عہد کی ہر حماقت کو ڈنس کرو...'

چاروں بھر پور قہقہے کا پٹاخہ چھوڑتے ہیں۔

درد پھر کہتا ہے: 'میں صبح دو گھنٹے ورزش کرتا ہوں... گیان، تم میرے بازو دیکھو اور راکیش، تم ذرا میری ران چھوؤ... ہے نا لوہا... دیوار میں گھونسا مار کر دیوار نہ گرا دی تو نام نہیں۔'

گیان کہتا ہے: 'تو آپ 'تخلیق' چھوڑنے کے بعد پہلوان بن رہے ہیں...

ہم نے تو سوچا تھا کہ جب آپ چت ہوں گے، ہم آپ کا جنازہ دھوم دھام سے اُٹھائیں گے لیکن آپ تو ہم سب کو ٹھکانے لگا کر ٹھنڈے ہوں گے...!'

'اللہ قسم درد صاحب!' راکیش کہتا ہے: 'آپ کی صحت دیکھ کر تو مجھے شرم آتی ہے... آپ ۳۷-۳۸ سال کی عمر میں دارا سنگھ! اور ہم لوگ ہیں کہ ۲۶-۲۷ سال میں ہڈیوں کے ڈھانچے!'

گیان کہتا ہے: 'درد صاحب! آخر یہ چکر کیا ہے...؟'

'گیان، تم سمجھتے کیوں نہیں؟... سنو!...' گیان کے کان میں درد کہتا ہے:

'جن کے ہاں بچے نہیں ہوتے، انھیں بچے بانٹ رہا ہوں... کیوں؟'

'واہ درد صاحب، مزا آ گیا... اور بیس سال بعد حرامیوں کا لشکر انقلاب لائے گا... زندہ باد... جوشی!' گیان چلاتا ہے اور درد کے بازو کو زور سے دباتے ہوئے جوشی سے کہتا ہے: 'جوشی، ہمارے لیے پلین کافی، درد صاحب کے لیے دو انڈوں کا آملیٹ اور کریم کافی...'

سردار جعفری کا حوالہ اور میری کہانی کا ٹکڑا آپ نے پڑھ لیا ہے — کیا سردار جعفری کی تنقیدی صلاحیتوں کا بھانڈا چوراہے پر نہیں پھوٹا ہے۔ کیا یہ محسوس نہیں ہوتا کہ سردار جعفری ذہنی طور پر شدید بیمار تھے جب انھوں نے یہ مضمون لکھا — وہ میرے جملے توڑ مروڑ کر کہتے ہیں، ''کیا زبان ہے؟'' اور درد کے الفاظ گیان کے منہ میں ڈال دیتے ہیں۔

میں جعفری صاحب سے پوچھتا ہوں، ''یہ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ جدیدیت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے؟ محمود ہاشمی نے، بلراج کومل نے، شمس الرحمٰن فاروقی نے یا حسن کمال نے۔''

میں نے کبھی نہ لکھا ہے، نہ کہا ہے کہ جدیدیت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ نے میری کہانیاں پڑھی ہوتیں، آپ نے میرے سلسلے میں کبھی یہ نہ لکھا ہوتا۔

جب میں درد سے کہلواتا ہوں، ''اپنے عہد کی ہر حماقت کو ڈِنس کرو۔'' میں جانتا ہوں کہ جنوب مشرقی ایشیا میں اور افریقہ میں مغربی جمہوریت کا سب سے بڑا تاجر نہرو ہمیں لے ڈوبے گا — آپ نے تو خود اس 'حماقت' کی موت دیکھی تھی اور پھر آپ نے اسی 'حماقت' کا تعویذ بنا کر اپنے بائیں بازو پر باندھ لیا — یہ آپ کا کردار ہے، آپ کو مبارک۔ ہمارے میدان میں آنے سے پہلے کسی ڈاکٹر سے مشورہ لیجیے۔

آخر میں سردار جعفری اپنے مقالے میں گیان کی ڈائری کا ایک ورق نقل کرتے ہیں۔ جو چار دسمبر کی تحریر ہے اور گیان کی زندگی کا 'خاکہ' ہے — یہ خاکہ، یہ کربناک تحریر اس آدمی کی ہے جس کی آنکھیں تھکن کے مارے دھندلا گئی ہیں — اس تحریر کی تیزی و تندی ہماری سمجھ میں تبھی آ سکتی ہے، جب ہم پوری کہانی کی رفتار سے واقف ہوں۔ گیان پانچ دسمبر کو مرتا ہے اور پانچ دسمبر کے چند گھنٹے ایک پوری کہانی ہے جو 'کوئی روشنی، کوئی روشنی' کا دوسرا حصہ ہے۔ دوسرے حصے کی آخری چند سطریں پڑھیے:

''طوفان تھم گیا۔

اس کے اندر آگ شانت ہوئی۔

بادل چھائے ہوئے تھے مگر شانت تھے۔ بجلی بھی تھک کر سو گئی تھی۔ دُور تک، تاحد نظر، اس کے دل کی دھڑکن سے لرزتی ہوئی خاموشی پھیلی ہوئی تھی اور بڑے طوفان کی آمد کا اشارہ کر رہی تھی۔

اس نے مرکب بنانا چاہا مگر کچھ بھی باقی نہ رہا تھا — وہ تھا اور کالے، گھنے، انتشار پسند بادلوں سے سہمی ہوئی ویرانی۔

بادل آہستہ سے گرجے، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

بادلوں نے چنگھاڑنا شروع کیا، اس کا دل بیٹھنے لگا۔

اور پھر اچانک بجلی تڑپ کر اس پر لپکی اور اسے ڈس گئی۔

صبح سورج کی پہلی کرن نے گاؤں سے بہت پرے اونچے ٹیلے پر حسرت بھری نظروں سے ایک سنہری لاش دیکھی۔''

اس کہانی کے چند اور اہم ٹکڑے۔

''... یہ لوگ... یہ ملک... یہ اَن وانٹڈ اوپینین... زندگی ہے کہ لطیفہ... اور تو اور موت بھی ایک لطیفہ ہے... اور یہ لطیفہ بھی چند روز بھونڈے اور بھنبھناتے ہوئے لہجوں میں سرکولیٹ ہوتا ہے اور پھر ہمیں اس سے گھن آنے لگتی ہیں... یہ پیشہ ور لیڈروں کا ملک، یہ گورنریاں، یہ پرموشنیں، یہ ہم تم... یہ جینے کے لیے بہانے، مکروہ، کالے، سڑے ہوئے بہانے... میں پاگلوں کی طرح بول رہا ہوں۔ تم سوچ رہے ہو گے کہ بے ربط، مہمل، واہیات جملے، یہی کچھ میری زندگی میں باقی رہ گیا ہے... پیارے، یہ میری زبان ہے جو میری روح بھی ہے۔ میں نے اس زبان میں

کھایا ہے، پیا ہے، اس زبان میں سوچا ہے... میری زبان کے گلے پر چھری چل رہی ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتا، بس اپنی نظروں میں گرتا چلا جا رہا ہوں... میں پاگل ہوں، مگر مجھے اپنا پاگل پن اچھا لگتا ہے کہ یہ میں نے مستعار نہیں لیا ہے، میں نے اسے جنم دیا ہے..."

یہ گیان کی آواز ہے۔

"اخبار کی صورت دیکھے بہت دن ہو گئے ہیں۔ جانے کون سے صوبے کی گورنری کس کو ملی ہے اور کس کو نہیں ملی ہے۔ اس کو نہیں تو اس کو ملی ہوگی اور اگر اس کو نہیں تو اس کو..."

یہ گیان کی تحریر ہے۔

گیان کا سفر جسے میں نے جیا ہے اور گیان کی موت جسے میں نے جھیلا ہے، میری قوت ہے۔ کیا آپ نے "کوئی روشنی، کوئی روشنی" کے بعد کی میری تخلیقات پڑھی ہیں؟

سردار جعفری لکھتے ہیں: "اس سے زیادہ لاکردار، مردم بیزار اور انسانیت سوز ادب کا تصور نہیں کیا جا سکتا اور یہ مردم بیزاری اور انسانیت سوزی آج کے عہد کی استحصالی طاقتوں کے لیے بہت کام کی چیز ہے۔ کیونکہ یہ صرف مایوسی اور ہراس پیدا کرتی ہیں اور انسانوں سے زندہ رہنے اور اپنے انسانی حقوق کی حفاظت اور جدوجہد کرنے کا حوصلہ چھین لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے شعر و ادب کے سر پر ایشیائی اور افریقی آزادی کے دشمنوں اور اشتراکیت اور ترقی پسندی کے مخالفوں کا دستِ شفقت رکھا ہوا ہے۔"

میں صرف اپنی طرف سے جواب دوں گا۔ اگر سردار جعفری People's Paper "Patriot" کے کالموں پر باقاعدگی سے نظریں دوڑاتے ہیں تو انھیں علم ہوگا کہ میرے سلسلے میں ان کے الزامات صحیح نہیں ہیں۔ میری تخلیق اور میرے عمل میں تضاد نہیں ہے، یہ جعفری صاحب کی آنکھوں کا میلا پن ہے۔

سردار جعفری نے 'جدیدیت کی حقیقت' میں میری کہانی 'کوئی روشنی، کوئی روشنی' کو ملوث کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ انھیں 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' کے سلسلے میں خاصی ندامت اُٹھانی پڑی ہے۔ اب انھوں نے جھینپ مٹانے کی کوشش کی ہے لیکن انھیں مزید ندامت اُٹھانی پڑے گی۔

میں نے گذشتہ دنوں 'آدیش' میں لکھا تھا کہ ہم نے اینٹی کمیونسٹ پولیٹکل سائنٹسٹ گوپال

مقتل کائی ہاؤس میں قیمہ ہوتے دیکھا ہے۔ گوپال مثل افسر شاعر کی کتاب کی رسمِ افتتاح کے بارے میں رپورتاژ لکھتا ہے اور امریکی بمباری کو جھیلتے ہوئے اٹھتر سالہ ہوچی منھ کو نظر انداز کرتا ہے۔ سردار جعفری ٹورسٹ کارپوریشن کے لیے فیچر لکھتا ہے اور دنیا بھر کے انقلابی نوجوانوں سے بے خبر ہے — میرا خیال ہے، سردار جعفری اور گوپال مثل جب برسوں پہلے ایک دوسرے سے جدا ہوئے، ان کا جدا ہونا نظریاتی اختلاف کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ دونوں نے یہ فیصلہ کیا تھا (ہوگا) کہ اب ایک ہی سمت چلنے سے دونوں کا 'گذارہ' نہیں ہوسکتا، اس لیے ایک اس طرف چلا جائے، دوسرا اس طرف چلا جائے اور سماجی رتبہ، دولت اور شہرت سمیٹتا جائے۔ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب دونوں پھر ایک ساتھ کھڑے ہوں گے چاہے ایسا ظاہر نہ ہو۔ اور اب دونوں ایک ہیں۔

ممکن ہے وہ وقت جلد آئے جب جدیدیوں کے ہجوم اور شور و غل کے درمیان سردار جعفری اور ان کے حواری لمپ پوسٹوں کے ساتھ بندھے ہوں اور ایک آواز کہے، پہلا پتھر وہ مارے، جس نے کوئی گناہ نہیں کیا — اس وقت پہلا پتھر میں ماروں گا۔

OO

ابلاغ کسے کہتے ہیں؟

محمّد عمر میمن

مارچ کے 'تحریک' میں ایک افسانہ 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' اوراس سے متعلق سردار جعفری صاحب اور مصنف کے خطوط شامل ہیں۔ انھیں کی بابت چند خیالات پیش کررہا ہوں۔

میری دانست میں جعفری صاحب کے خط کا بنیادی نکتہ 'مسئلہ ابلاغ' ہے اوراس سے متصل ان کے احباب کی 'کم فہمی یا نافہمی' کا مسئلہ بھی جس کا انھوں نے صراحتاً ذکر کیا ہے۔ مصنف کی کہانی جعفری صاحب نہ سمجھ سکے۔ بالفاظ دیگر مصنف اپنے محسوسات (کم از کم) جعفری صاحب تک پہنچانے میں ناکام رہا۔ جعفری صاحب نے کہانی واپس کردی۔ اس کا حق انھیں یقیناً ہے۔ سوال یہ ہے کہ کہانی اپنے احباب کورائے زنی کے لیے دینے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا جعفری صاحب کو اپنی فہم وفراست پر اعتماد نہیں رہا؟ کیا وہ ایسی ہر تحریر کو اپنے پرچے کے لیے قابل اعتنا سمجھیں گے جو ان کی سمجھ سے ماوراء لیکن ان کے احباب کی فہم کے دائرے میں ہو؟ ان کے خط کا 'ابلاغ' تو یہی کچھ ہے۔ اس صورت میں ان کا بنیادی اعتراض (یعنی ابلاغ کی کمی) اپنے لب ولہجہ کی اختیاری سنجیدگی کا آپ ہی پردہ در بھی ہے۔

جعفری صاحب نے حتی المقدور اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان کی رائے کہانی پر حرف نہ لائے۔ یہ عمل یقیناً ان کی اعلیٰ تربیت کا غماز ہے مگر اب کیا کیا جائے کہ خط کی پوری فضا وضاحتاً اس طرف اشارہ کناں ہے کہ انھوں نے اوران کے دوستوں نے تحریر پر 'عدم ابلاغ' کا فیصلہ صادر فرما دیا ہے۔ یہ حق انہیں کس نے دیا؟ یا یہ لوگ ایسی ہر تحریر کو جوان کے مخصوص نظریات سے عاری ہو، 'ابلاغ' کے المیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

محسوس ہوتا ہے 'ابلاغ' بجائے خود ایک concept کی حیثیت سے جعفری صاحب تک پہنچنے میں ناکام رہا ہے۔ کیا دو جمع دو برابر چار کو جعفری صاحب 'ابلاغ' کا نام دیتے ہیں۔ غالب کا بھی

ایک 'ابلاغ' تھا، جسے خودان کی شکایت آمیز زبان میں ان کے ہمعصر کم سمجھتے تھے۔ میراجی کی بابت کیارائے ہے؟ Van Gogh کا بھی ایک 'ابلاغ' تھا۔ 'ابلاغ' سے تو پرندے بھی عاری نہیں۔ انسانی ذہن متضاد نفسیاتی قوتوں سے معمور ہے۔ اسی تناسب سے اس کا اظہار اپنے عمیق معانی نیز ہزار رنگ رکھتا ہے۔ روز مرّہ کی زبان ہم بآسانی یوں سمجھ لیتے ہیں کہ کہی گئی بات ہمارے تجربے کے دائرے میں شامل ہوتی ہے۔ اگر کوئی بات ہمارے ادراک سے ماوراء جاپڑتی ہے تو اس لیے کہ ہماراذاتی تجربہ کہنے والے کے مخصوص تجربے سے کسی سطح پر ہم آہنگ اور بغل گیر نہیں۔ ہماری نافہمی اس بات کی دلیل نہیں کہ کہی گئی بات ابلاغ سے عاری ہے۔ اگر کچھ ثابت ہوتا ہے تو بس اتنا کہ کہی گئی بات جس مخصوص ابلاغ کی متحمل اور جس مخصوص انداز کی متقاضی ہے اس سے مشابہ کوئی چیز ہمارے کشکول میں نہیں۔

مثلاً Samuel Beckett (اس نام سے جعفری صاحب اوران کے رفقا ضرور واقف ہوں گے) کے ڈرامے Waiting For Godot کی نمائش جب مغربی یوروپ کے شہروں میں شروع ہوئی تو بارہانہایت sophisticated ناظرین کے ہاتھوں سے صبروضبط کا دامن جاتا رہا۔ بات فساد تک جاپہنچی۔ اس کے برعکس، یہی ڈرامہ جب ۱۹رنومبر ۱۹۵۷ء کو San Quentin Penitentiary کے چودہ سومجرمین کے سامنے پیش کیا گیا جو وہاں مختلف میعاد کی سزا بھگت رہے تھے تو — اے عجب! پردہ اُٹھا۔ ڈرامے کی ابتدا ہوئی اور جس چیز کے ادراک سے مغربی یوروپ کے نہایت شائستہ اور مہذب تماشہ بین عاجز رہے تھے، ان سزایافتگان نے بلاکسی دقت کے فوری طور پر سمجھ لیا۔ نتیجہ میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان چودہ سومجرمین میں سے ہرایک کا ذاتی تجربہ کسی نہ کسی نقطہ اور سطح پر ڈرامے کی مرکزی کیفیت اور جزوی کیفیات سے مشابہ تھا۔ یہاں یہ بھی ذکر ہوجائے کہ جب Alan Schneider نے (جو مذکورہ ڈرامے کی پہلی امریکی پیشکش کا ہدایت کار تھا) بیکٹ سے پوچھا، Godot کون ہے اوراس کے کیا معنی ہیں، تو اسے یہ جواب ملا: ''اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں نے ڈرامے میں اس کا اظہار کردیا ہوتا۔'' یادش بخیر، اگر میری یادداشت صحیح ہے تو عرصہ ہوا کراچی کے ایک روزنامے میں سید ذوالفقار علی بخاری صاحب کی آپ بیتی خودان کی زبانی قسط وار نکل رہی تھی۔ اس میں مذکور تھا کہ ایک بار بخاری صاحب نے T.S. Eliot سے ان کی ایک نظم کا مفہوم پوچھنے پر جو جواب پایا وہ بیکٹ کے جواب سے مشابہ تھا۔

ایزرا پاؤنڈ ہوں یا ایلیٹ، بیکٹ، Ionesco، Adamov، Genet یا Alain Robbe

Grillet اور ان کا اسکول جسے 'منفی ناول' سے موسوم کیا جاتا ہے، اور یا پھر غالب ہوں یا میراجی، سب پر 'عدم ابلاغ' کا مقدمہ کسی نہ کسی دور میں چلا ہے۔ 'ابلاغ' کا بڑے سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اسے روایت کا پابند کردیا جائے۔ غالب کی چند روزہ ہزیمت کی وجہ جہاں دقتِ معانی تھی وہاں یہ بدعت بھی کہ مرد ہنر 'مہر نیمروز'، 'ماہ نیم ماہ' اور ایسی دوسری ترکیبات وضع کررہا تھا جو اُردو ادب میں خصوصاً شعری روایت میں unprecedented تھیں۔

ایک جاندار ذہن کو اپنی بے چارگی کا عرفان سب سے پہلے (یعنی قارئین کی روایت پسندی اور تنگ نظری سے پہلے) زبان کی بندھی ٹکی معنویت اور الفاظ کے کہنہ لیکن روایتی تلازمات کے سبب سے ہوتا ہے۔ اوّل تو جذبہ اپنی آفریدگاہ (یعنی قلب) سے زبان کی سرحد تک آتے آتے اپنے original معنی پچاس فیصدی کھو بیٹھتا ہے اور خالق کا دل یہ دیکھ کر خون ہوجاتا ہے کہ جس انداز میں اس نے جذبہ کو محسوس کیا تھا وہ کاغذ تک آتے آتے اپنی قامت میں نصف سے کم رہ گیا ہے اور دوم یہ المیہ مستزاد کہ جو الفاظ اس نے بڑی محنت سے انتخاب کے بعد استعمال کیے ہیں، اس کے ماسوا دیگر اذہان میں اپنے روایتی تلازمات کی آمیزش سے کچھ کے کچھ نظر آتے ہیں۔ اسی المیہ کی بازگشت شیلے کی ان سطروں میں گونج رہی ہے:

> One word is too often profaned / For me to profane it
> One feeling is too often disdained / For thee to disdain it

اور آج بھی مختلف ادیب مثلاً Adamov، Ionesco وغیرہ زبان کی تنگی کے کہنہ المیہ سے دوچار ہیں اور اس کی سنجیدگی کے پیشِ نظر اپنی تحریروں میں باقاعدہ مسئلہ ابلاغ کی بحث کی ہے۔ Ionesco کا ڈرامہ La Lec, on مسئلہ ابلاغ اور اس کے المیہ سے بڑی حد تک وابستہ ہے۔ اور Adamov کے ڈرامے L. Aveu میں ہم اس عبارت سے دوچار ہوتے ہیں:

> The words in our aging vocabularies are like very sick people. Some may be able to survive, others are incurable.

ابلاغ سے پہلے زبان کا مسئلہ ہمارے سامنے ہے۔ جب ہم زبان پر ہی اعتماد کے قابل نہیں تو 'ابلاغ' کی طعنہ زنی بجائے خود ایک عظیم قہقہہ ہے۔

ہمارے دانشوران بالائی سطروں میں مذکورہ ان تمام اور ان جیسے تمام ناموں کی ذہنی

صلاحیت کے معترف ہوں گے۔ اس لیے نہیں کہ یہ اعتراف خود اپنی عرق ریزی کا نتیجہ ہے بلکہ اس لیے کہ ہمارے ادب کی چونکہ یہ بھی ایک روایت ہے کہ احباب اگر کسی ادیب یا شاعر پر مہر ثبت کردیں تو بلا چون و چرا اسے قبول کرلیا جائے۔ تان ٹوٹتی ہے تو آ کر ان نوجوانوں پر جو اپنے تجربے کی راہبری میں اپنے سنگ میل خود منتخب کرتے ہیں۔ یہ کچھ کہتے ہیں تو رد کر دیے جاتے ہیں، اس پر 'عدم ابلاغ' کا لیبل مستزاد۔ اور پھر بجائے خود یہ بات کافی مشکوک ہے کہ جعفری صاحب اور ان کے رفقائے کار نے واقعی نہایت خلوص سے 'پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ' کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ ہماری روایت میں داخل نہیں کہ کسی نسبتاً نوجوان کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یا اس پر وقت صرف کیا جائے۔ روایت پرست اور روایت شکنی! از بے نصیب۔

۶۳ء یا ۶۴ء کی بات ہے، میں نے اپنے افسانہ 'بجلی بسنت' احمد ندیم قاسمی صاحب کو بھیجا۔ انھوں نے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ افسانہ ٹھیک ٹھاک لیکن ساری مشکل یہ ہے کہ ان کی ادارت کی context میں بلائے جان بن جائے گا۔ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ افسانہ کا ابہام کسی قابل اعتراض interpretation کے تحت انھیں لے ڈوبے گا۔ میں نے افسانہ 'سویرا' کو بھیج دیا۔ نوخیز مدیر نے اپنی کاروباری زبان میں لکھا کہ اگر چھپ گیا تو ان پر مقدمہ چل جائے گا۔ مجھے تھوڑی سی ہنسی ضرور آئی۔ یہی افسانہ بعد میں 'سیپ' کراچی میں چھپا۔ ان سرپھرے نوجوانوں کو جو 'سیپ' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے ہیں ایسا کوئی تعرض نہ تھا۔ انھیں مواد سے بحث تھی، نتائج سے نہیں۔ ابھی تک تو ان لوگوں پر مقدمہ نہیں چلا۔ اپنی کہانی کے حوالے سے مجھے اپنی خودنمائی منظور ہے نہ صلیب پر چڑھ کر لوگوں کی ہمدردی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس سنجیدگی اور ذمہ داری کی توقع سرد و گرم چشیدہ افراد سے کی جانی چاہیے، ان کے رویئے کی عدم بلوغت اور اپنے منصب سے بدعہدی کے پیش نظر نہیں کی جاسکتی۔

آمدم برسر مطلب: کسی تحریر کے لیے یہ ضروری نہیں کہ سب کی سمجھ میں آ سکے اور یکساں طور پر آ سکے، نہ ہی کسی تصنیف کی poliinterpretability اس کے ابلاغ سے عاری یا سقیم ہونے کی دلیل ہے۔ عام آدمی ابلاغ کا رونا روئے تو بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔ جعفری صاحب اور ان کے احباب یا clique جن میں محترمہ قرۃ العین حیدر صاحبہ کی صلاحیت کا میں کسی نہ کسی حد تک ضرور معترف ہوں، عام آدمی کی طرح بات کرنے لگیں تو واقعی یہ امر قابل افسوس ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ سب لوگ کسی تحریر کو سمجھ ہی سکیں۔ ہاں اس کی توقع ان سے بجا طور پر کی جاسکتی ہے کہ عام آدمی

اوران کے رویے میں فرق ضرور ہونا چاہیے۔ خصوصاً جبکہ ان رفقا میں سے کئی ایک تو باقاعدہ درد کی منزل سے گزر کر آگے بڑھے ہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ موجودہ خوش بختیوں کے ہجوم میں اپنے سفر کی اولین صعوبتوں کی ساری یاد بھلا بیٹھے ہیں۔ جنھیں شکم سیری میسر نہیں، وہ جانتے ہیں کہ بھوک انسان کا پیدائشی حق نہیں بلکہ یہ شکم سیروں کی ان کے خلاف باقاعدہ سازش ہے۔ چنانچہ وہ مساوات کا علم بلند کرتے ہیں جس کے خلاف وہ کل تک نعرہ زن تھے۔ کس قدر خوبصورت المیہ ہے جنھیں یوروپ کی تاریخ سے واقفیت ہے، ان سے یہ بات مخفی نہیں کہ جاگیردارانہ نظام (Estate Society) کا آواگون جب ایسی سوسائٹی میں ہوا جو طبقات سے عبارت تھی۔ Class Society تو اس کی کامیابی Tiers Etat کی بغاوت کی رہین منت تھی جنھیں جاگیردارانہ نظام کے دور میں روٹی میسر نہ تھی، اب بڑی حد تک وسطی طبقہ میں شامل ہو کر Gros Bourgeois یا Petit Bourgeois بن چکے تھے۔ ذہنیت میں اگر کچھ تبدیلی ہوئی تھی تو اتنی کہ پہلے مٹھی بھر جاگیرداروں کا روٹی اور قوت پر تسلط تھا اور اب متسلطین کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ اپنے وقت میں دونوں ایک ہی سازش کے پروردہ تھے۔

کہانی اتنی مشکل تو نہیں۔ اگر مجھے تنگ نظری اور parochialism عزیز ہوتے تو یہاں کہانی کا حشر نشر کر کے اس کے مفہوم تک (جیسا کہ میں سمجھ سکا ہوں) ان اصحاب کی راہنمائی کر دیتا۔ مشکل یہ ہے کہ میں کسی بھی تخلیق کو محض ایک interpretation تک محدود کر دینے کا قائل نہیں۔ جاندار تحریر کا وصف یہی ہونا چاہیے کہ مختلف صلاحیتوں کے لوگ مختلف انداز میں اسے سمجھ سکیں۔ مختلف احباب کی جداگانہ آرا بجائے خود جعفری صاحب کو کہانی کے merit کا قائل کر دینے کے لیے کافی تھیں۔

(مندرجہ ذیل عبارت اس مفروضہ کی روشنی میں لکھ رہا ہوں کہ کہانی فی الواقع جعفری صاحب نے چند احباب اور بیس پچیس عام قارئین کو دی اور انھوں نے وہی سب کہا جس کا ذکر جعفری صاحب نے اپنے خط میں کیا ہے۔)

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست! عادل منصوری صاحب کہانی نہ سمجھ سکے لیکن نصف اوّل کی خوبی کے معترف ہیں۔ اگر جعفری صاحب یہ جملہ لکھنے سے قبل اس کے منطقی ابلاغ پر غور کر لیتے تو انھیں یہ منصوری صاحب کی نظموں، غزلوں کی طرح نظر آتا جن پر عام قارئین ابہام نتیجتاً ابلاغ کا فتویٰ صادر کر سکتے ہیں۔

اگر منصوری صاحب کے جملے کا ابلاغ ان سے پوشیدہ نہیں تو کہانی کا ابلاغ کوئی ایسی دشوار بات نہیں۔ عام قارئین کے لیے تو ایسے مصرعے ''کس کے پیلے دانت چھت پر چل رہے ہیں'' اور ''میری ویران ہتھیلی میں نئی گھاس اُگے'' یقیناً ابلاغ سے عاری ہوں گے۔

حسن کمال صاحب کے مطابق کہانی میں آزادی سے پہلے اور بعد کا ہندوستان ہے۔ ندا فاضلی صاحب اسے جنسی طور پر ناآسودہ نوجوان کی کہانی سے تعبیر کرتے ہیں (اس سے زیادہ کیا چاہیے)۔ یہ اصحاب کہانی کو جس طور پر سمجھ رہے ہیں، اپنے تجربے کے آئینہ میں سمجھ رہے ہیں۔ اگر اس میں 'ابلاغ' کی کمی کی شکایت کی جائے تو پھر کہانی میں آزادی سے پہلے اور بعد کے ہندوستان کی گنجائش رہتی ہے، نہ جنسی اعتبار سے ناآسودہ نوجوان کے تجربات کی۔ (ابلاغ سے جعفری صاحب کی مراد اگر یہ ہے کہ سب کسی تحریر کی معنویت کو یکساں طور پر سمجھ سکیں یا باتفاق اس میں عدم معنویت کے شاکی ہوں تو یہ الگ مسئلہ ہے۔) کچھ کہا جا سکتا ہے تو یہی کہ ابلاغ جس حقیقت کا غماز ہے وہ یارانِ طریقت کی رگِ جمالیات اور درمیانہ طبقوں کی مخصوص ذہنیت پر بارگراں ہے (ایک لحاظ سے کم از کم حسن کمال، ندا فاضلی اور کسی حد تک عادل منصوری میں صلاحیت کے کچھ نہ کچھ جراثیم ضرور خوابیدہ ہیں)۔

کرشن چندر اور جعفری صاحبان کو میں دانستہ بحث سے خارج کر رہا ہوں کہ اگر کچھ کہوں گا تو ان کی شان میں گستاخی کے مترادف ہوگا۔ اور کہ اب سے پچاس سال بعد لوگ آپ ہی فیصلہ کر لیں گے کہ ان کہنہ خداؤں کی کس قدر ضرورت ہے۔ ہاں کرشن چندر کے ضمن میں اتنا ضرور ہو جائے کہ یہ وہی تھے، جن کے یہاں میراجی اپنی عبارت کے تمام تر طلسم اور اپنے جسم کی تمام تر غلاظت ('غلاظت' کو براہِ کرم منفی اور مثبت دونوں معنی سے عاری سمجھا جائے کہ مجھے فیصلہ صادر کرنے کا کوئی حق نہیں اور میں اسے value - neutral انداز میں استعمال کر رہا ہوں) کے ساتھ مہینوں مقیم رہے تھے۔

رہیں محترم قرۃ العین حیدر صاحبہ، تو میں ماننے کے لیے تیار نہیں کہ کہانی ان کی دسترس سے باہر کی بات تھی۔ جس ذہنی صلاحیت کی وہ حامل ہیں اس کی رو سے کچھ نہ کچھ ان کی سمجھ میں ضرور آنا چاہیے تھا۔ یا تو کہانی انھوں نے سرے سے پڑھی ہی نہیں اور جعفری صاحب ان کے نام کو بالکل اس طرح استعمال کر رہے ہیں جس طرح بعض ملکی تجار دیسی اشیاء پر Made in England کا لیبل استعمال کرتے ہیں، یا پھر انھوں نے جعفری صاحب کے ساتھ نہایت حسین پیرائے میں

نہایت حسین ظرافت فرمائی ہے۔ یا اگر یہ سب کچھ نہیں تو پھر انھوں نے محض اپنے ایک رفیق کار کی خوشنودی کے لیے اپنا منصب فراموش کر دیا ہے۔ اپنی زندگی کے پاکستانی ایام تو وہ نہ بھولی ہوں گی۔ 'آگ کا دریا' کا واقعہ ان کے ذہن میں آج بھی تازہ ہوگا۔ لوگوں کی اوٹ پٹانگ تعبیرات اور ان کے رویہ کی تندی انھیں آج بھی یاد ہوگی۔ اپنے ناول پر چند ایک تبصرے پڑھ کر انھیں ہنسی تو ضرور آئی ہوگی۔ غالباً یہی اسباب تھے جو چند ثقافتی ترجیحات کی آمیزش سے اس درجہ شدید ہوئے کہ انھوں نے ملک چھوڑ دینے کا فیصلہ کر ڈالا۔ Jean Paul Sartre کو اپنے ملک کی بہت سی policies سے اتفاق نہیں لیکن نااتفاقی نے انھیں فرانس چھوڑ دینے پر کبھی آمادہ نہیں کیا۔ غالباً سقراط کا بھی یہی کچھ مسلک تھا۔ یہ الگ بحث ہے۔ اس سے قطع نظر مسئلہ یہ ہے کہ اگر چند لوگوں کی پست ذہنی اور سہل نگاری ان کو کبیدہ خاطر کر سکتی ہے تو ایک ہم مشرب کے ضمن میں خود ان کی سہل نگاری کا آخر کیا جواز ہو سکتا ہے؟

یہ مسئلہ ابلاغ و بلاغ کا نہیں۔ سیدھی سی بات ہے heirarchy اور موجودہ مصنف اس heirarchy کے ادنیٰ سے ادنیٰ مقام پر بھی ان بزرگواران کو نظر نہیں آتا یا اگر آتا بھی ہے تو یہ اس کے وجود کے منکر ہیں۔ دیدہ دانستہ شتر مرغ کی مثال بہت پرانی ہے۔ یہ شکاری کو دیکھ کر اپنا سر ریت میں چھپا دیتا ہے کہ خود شکاری کو نہ دیکھنے کی صورت میں شکاری کی نظر بھی اسے نہ دیکھ سکے گی۔ کتنی صدیوں سے بیچارا شتر مرغ خود اپنی naive معصومیت کا شکار ہے!

بات گھوم پھر کر قدما کی شقاوت اور تنگ نظری تک جا پہنچتی ہے۔ آخر یہ سب لوگ اس قدر ہراساں کیوں ہیں؟ اگر نئے لکھنے والوں میں جوہر کی کمی ہے تو آپ مرکھپ جائیں گے۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ کیا ضروری ہے کہ اپنی شکست کی آواز دوسروں کی موت کی خواہاں بھی ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ اپنے نقطۂ نظر کی حمایت دیگر نظریات کے وجود سے نظریں بچائے۔ کبھی کبھی میں Hemingway کی بابت سوچتا ہوں تو کم از کم اس کی خودکشی کے عمل میں مجھے نہایت خلوص اور دیانتداری نظر آتی ہے۔ اگر ہمارے چند نامی گرامی قلمکار کشمیر کے مرغزاروں میں حسن و عشق اور انسانیت کی لاش دفن کر چکنے اور بمبئی کے بازاروں میں حسیناؤں سے پیشہ کروا چکنے کے بعد لکھنے کے لیے کوئی موضوع نہیں پاتے تو ہیمنگ وے کا خلوص ان کی رہنمائی کر سکتا ہے— پیرس کی ایک سنسان گلی میں آدھی رات کے اندھیروں میں کسی نے چند سکوں کی چاہت میں Beckett کے پھیپھڑے میں چاقو اُتار دیا۔ خوش نصیب تھا، بچ گیا۔ بدنصیب تھا، پکڑا گیا۔ ہسپتال

سے اُٹھ کر بیکٹ جیل خانے پہنچا اور اپنے قاتل سے پوچھا: ''کیوں بھلے مانس، آخر مجھ غریب پر نظرِ کرم کی وجہ؟''

''JE NE SAIS PAS, MONSIEUR!'' (مجھے نہیں معلوم، جناب) جواب تھا۔

کیا واقعی جعفری صاحب اور ان کے رفقا اتنے ہی معصوم ہیں؟ ادب کم از کم اتنی لاتحاشہ معصومیت کا متحمل نہیں ہوسکتا!

OO

ایک اور ناپسندیدہ کہانی

میرے سامنے اوپندر ناتھ اشک کا ایک خط کھلا پڑا ہے۔ یہ خط جو ۲۶ رجون ۶۸ء کو لکھا گیا، رمیش بخشی کے نام ہے، جس نے حال ہی میں 'آویش' (Aawesh) کی پہلی جلد مرتب کی ہے۔ اشک کا خط 'آویش' ہی سے متعلق ہے — 'آویش' میں میری ایک تحریر 'تمیں برس لمبی گلی سے دُور، بہت دُور، کھلے آسمان تلے نئی کالونی' شامل ہے — اوپندر ناتھ اشک 'آویش' میں مطبوعہ مختلف تخلیقات کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے کے بعد انکشاف کرتے ہیں:

"لیکن اس سب کو تم نے اپنے اور بلراج مین را کے لیکھ چھاپ کر دھو دیا ہے۔ میں بلراج مین را کو نہیں جانتا۔ ایک بار اسے ٹی ہاؤس میں دیکھا بھر ہے۔ دلی میں جتنے لوگوں سے بات ہوئی، سبھی نے کہا کہ وہ سی. آئی. اے. کا ایجنٹ ہے۔ اس کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ جب ہندوستان اور پاکستان میں لڑائی ہو رہی تھی تو اس کے یہاں کوئی ودیشی ایجنٹ انٹلیکچوئل ٹھہرا تھا جو تت کال پاکستان سے بلاوا آنے پر ہوائی جہاز سے چلا گیا۔ شاید یہی امپریشن دھونے کے لیے اس نے یہ لیکھ لکھا ہے۔ پر اس سے یہ امپریشن اور بھی گہرا ہوتا ہے۔ اگر وہ سی. آئی. اے. کا ایجنٹ نہیں ہے تو دوسرے کو گالیاں دینے کی بجائے اسے کچھ بہتر لکھنا چاہیے۔ وہ امپریشن اپنے آپ ڈھل جائے گا۔"

اس سے پیشتر کہ اوپندر ناتھ اشک کا جھٹکا کروں، اگست ۶۵ء کی اپنی ایک تحریر 'دیوندر ستیارتھی کے ساتھ ایک دن' کا ایک مکالمہ نقل کرتا ہوں۔ میری یہ تحریر 'تحریک' کے ۶۶ء کے کسی شمارے میں شائع ہوئی تھی اور ہندی میں اس کا ترجمہ 'اَنیما' کلکتہ کے مارچ ۶۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا:

'میں نے پوچھا، اوپندر ناتھ اشک کا کیا رول رہا ہے؟'

'اوپندر ناتھ اشک بھی بیوپاری ہیں اور کرشن چندر کی کاربن کاپی۔'

'اشک ہندی میں کہتے اور کہلواتے ہیں کہ اُردو میں ان کا درجہ منٹو اور بیدی کے برابر ہے۔ یہ کہاں تک صحیح ہے؟'

'یہ غلط ہے۔ اشک کو اُردو میں اس طرح سے کوئی نہیں جانتا۔'

'اشک یہ بھی کہتے اور کہلواتے ہیں کہ ایک ہی تھیم پر لکھی گئی ان کی کہانی 'ابال' منٹو کی کہانی 'بلاؤز' سے بہتر ہے۔'

اُبال بہت معمولی کہانی ہے اور **بلاؤز** کے ساتھ اس کا ذکر محض پروپیگنڈہ ہے۔'

میں اس مکالمے میں دیوندر ستیارتھی سے مخاطب ہوں۔

اوپندر ناتھ اشک ۲۶ رجون ۱۹۶۸ء کو لکھتے ہیں: ''میں بلراج مین را کو نہیں جانتا۔ ایک بار اسے ٹی ہاؤس میں دیکھا بھر ہے'' — اشک کے ساتھ میری ایک بھرپور ملاقات ہو چکی ہے۔ یہ ملاقات ۶۶ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت تک 'دیوندر ستیارتھی کے ساتھ ایک دن' اُردو یا ہندی میں شائع نہیں ہوا تھا — میں نے اس ملاقات کو بھرپور ملاقات اس لیے کہا ہے کہ اشک اور میں پہلی ہی ملاقات میں خوب کھل کھیلے تھے۔ اگر اشک صرف یہ لکھتے ''میں بلراج مین را کو نہیں جانتا'' میں اس ملاقات کا ذکر نہ کرتا کہ ایسا ہو سکتا ہے، بھرپور ملاقات ذہن سے اُتر گئی ہو اور نہ بھی اُتری ہو، یہ ضروری نہیں، بھرپور ملاقات پہچان بن گئی ہو۔ لیکن اشک نے لکھا ہے: ''ایک بار اسے ٹی ہاؤس میں دیکھا بھر ہے''، اس لیے مجھے انھیں ننگا کرنے کے لیے اس ملاقات کا ذکر کرنا پڑ رہا ہے۔

۱۹۶۶ء میں راجندر سنگھ بیدی کی بیٹی کی شادی تھی۔ اِروِن روڈ پر گول ڈاکخانے کے قریب وسیع و عریض گراسی پلاٹ پر بہت بڑا شامیانہ تنا ہوا تھا۔ میں، بھوشن بن مالی اور شکتی پال کیول بعد دوپہر بیدی صاحب کے ہاں پہنچے کہ بیدی صاحب نے بھوشن کی زبانی کہلوایا تھا، ہم جلد آئیں، گپ شپ رہے گی۔ شامیانے میں بیدی، اشک (میں اشک کو پہچانتا تھا) اور کچھ غیر ادیب موجود تھے۔ اشک سے تعارف ہوا تو میں نے اشک سے کہا کہ وہ سماجی حقیقت نگاری اور کوری حقیقت نگاری کے سلسلے میں کچھ کہیں — میرا اشارہ سماجی حقیقت نگاری کے شاہکار **ابال** اور کوری حقیقت نگاری کے مظہر **بلاؤز** کی جانب تھا — اشک اور میں اُلجھ گئے اور خاصی اونچی آواز میں، زہریلے لفظوں میں بات ہوئی۔ ایک بار تو تیز و تند آواز نے سارے بندھن توڑ ڈالے اور بیدی صاحب سڑک پار فلیٹ سے لپکتے ہوئے آئے۔ اشک نے بیدی سے کہا: سب کچھ ہو گیا ہے، صرف ہاتھا پائی کی کسر باقی ہے۔ اور بیدی صاحب نے کہا: دیکھا اُردو کی نئی پود۔ اشک نے شدید

ترین گفتگو کے دوران میرے جملوں کی تاب نہ لاکر مجھ سے پوچھا۔ مین را صاحب، آپ شادی شدہ ہیں؟ میں نے اپنے مخصوص لہجہ میں جواب دیا: کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں شادی کے بعد آپ جیسا ہو جاؤں گا — اشک کی کمر ٹوٹ گئی — ہم تقریباً دو گھنٹے اُلجھے رہے تھے اور پھر ایک ساتھ ٹیکسی لے کر ٹی ہاؤس پہنچے تھے (جب ہم ٹی ہاؤس پہنچے، اشک کی کم بختی، مُدرا راکشس نکر گیا — مُدرا راکشس نے اشک کی کھال کھینچ لی)۔

اشک نے مجھے ایک بار ٹی ہاؤس میں دیکھا بھر اور یہ انھیں یاد رہا لیکن وہ بھرپور ملاقات بھول گئے — ریاکاروں کی تحریر خود ان کی ریاکاری کا پردہ چاک کیا کرتی ہے — اشک اپنے خط کا یہ جملہ کاٹ نہ پائے، ''ایک بار اسے ٹی ہاؤس میں دیکھا بھر ہے''، کہ وہ جھوٹ در جھوٹ کے بھنور میں بُری طرح گرفتار تھے — اگر انھوں نے یہ جملہ کاٹ دیا ہوتا، انھیں شرمسار ہونا نہ پڑتا، جیسا اب انھیں ہونا پڑ رہا ہے۔

بیدی صاحب کے ہاں اشک کو مجھ سے خاصی تکلیف پہنچی تھی اور پھر اُردو اور ہندی میں 'دیوندر ستیارتھی کے ساتھ ایک دن' کی اشاعت سے ان کے دل میں کانٹا پھنس گیا — وہ کہتے ہیں: ''دلی میں جتنے لوگوں سے بات ہوئی، سبھی نے کہا کہ وہ سی. آئی. اے. کا ایجنٹ ہے۔'' ان 'جتنے لوگوں' کے ذرا نام لیجیے — اور ایک جملہ سنیے: ''الٰہ آباد میں جتنے لوگوں سے بات ہوئی، سبھی نے کہا کہ اوپندر ناتھ اشک کے اپنے لڑکے کے ساتھ جنسی تعلقات ہیں —'' اشک اور میرے جملے کے معنی ایک ہی ہیں۔ دونوں جملے صداقت سے دور ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرا جملہ اشک کی اندھی آنکھوں اور بہرے کانوں کے لیے ہے۔

اشک لکھتے ہیں: ''اس کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ جب ہندوستان اور پاکستان میں لڑائی ہو رہی تھی تو اس کے یہاں کوئی ودیشی ایجنٹ انٹلیکچوئل ٹھہرا تھا جو تت کال پاکستان سے بلاوا آنے پر ہوائی جہاز سے چلا گیا'' — کہاں پڑھا تھا؟ پاکستان ٹائمز میں یا ہندوستان ٹائمز میں؟ پراودا میں یا نیویارک ٹائمز میں یا پیپلز ڈیلی میں؟ یا بھنگ کی پکوڑی میں؟ نام لیجیے اس موتری کا جہاں یہ خبر آپ نے پڑھی تھی — اگر یہ خبر اپنے گھر کی موتری میں پڑھی ہے تو آپ کے گھر کی موتری کو کون کون استعمال کرتا ہے؟ — میں نے لفظ 'موتری' استعمال کیا ہے حالانکہ یہاں لفظ 'ذہن' مناسب ہے۔ جب ہندوستان اور پاکستان میں لڑائی ہو رہی تھی، میرے یہاں غیرملکی ایجنٹ ٹھہرا ہوا تھا جو فوراً پاکستان سے بلاوا آنے پر ہوائی جہاز سے چلا گیا۔ کہاں چلا گیا؟ سنیے! کہاں چلا گیا؟ وہ یہاں سے الٰہ آباد گیا اور الٰہ آباد سے لاہور چلا گیا۔ لاہور پہنچ کر اس نے ادبِ لطیف کی

ادارت سنبھالی کہ سیّد قاسم محمود یہ کرسی چھوڑ چکا تھا۔ ادارت سنبھالتے ہی اس شخص نے ادب لطیف کا خاص نمبر نکالا (٦٦ء میں) اور اداریہ لکھا[1]

"ہمارا جرم صرف یہ تھا (اور ہے) کہ ہم نے کشمیر کے شگفتہ پھولوں، شفاف جھیلوں اور نیلی دھند میں لپٹی ہوئی پہاڑیوں پر ان کا حق تسلیم نہیں کیا، جن کی بغل میں چھری اور منہ میں رام رام ہے۔ اس جرم کی پاداش میں وہ ہمارے ہنستے بستے لاہور اور زندگی کی جولانیوں سے بھرپور سیالکوٹ کو اپنے فوجی بوٹوں تلے روندنے آئے اور اب بیٹھے اپنے زخم چاٹ رہے ہیں۔

ہمارے سرحدی دیہات کی ماؤں، بہنوں کی آبرو لٹی اور ہمارے جوان لہو میں نہا گئے۔

ہم پوچھتے ہیں اتنے بڑے ظلم پر 'انصاف پسند' کرشن چندر کے قلم کی سیاہی کیوں خشک ہو گئی۔ راجندر سنگھ بیدی نے کیوں نہیں کہا "اپنے دکھ مجھے دے دو" پنجاب کے دیہات پر قیامت ٹوٹی اور پنجابی افسانہ نگار بلونت سنگھ کے کان پر جوں تک کیوں نہیں رینگی۔ اشتراکیت کا حامی اور سامراج کا دشمن سردار جعفری چپ چاپ فلمی نگارخانوں میں کیوں گم رہا۔ 'دنیا کے شہری' اور ویت نام پر خون کے آنسو رونے والے بلراج مین را کی آنکھوں پر پٹی کیوں بندھ گئی[2]۔"

میں نے مندرجہ بالا اداریہ کا استعمال یہاں اس لیے کیا ہے کہ اوپندر ناتھ اشک نے اپنے خط میں کہا ہے، ہندوستان پاکستان کی لڑائی کے دوران کسی غیر ملکی ایجنٹ کا میرے ہاں قیام تھا جو پاکستان سے بلاوا آنے پر ہوائی جہاز سے چلا گیا — یہ اداریہ جو پاکستانی نقطۂ نظر سے لکھا گیا ہے اور جو احمقانہ حد تک نام نہاد قومیت کا اعلان کرتا ہے، کم از کم یہ تو ظاہر کرتا ہے کہ سانحۂ ستمبر (ہندوستان پاکستان میں لڑائی نہیں) کے بارے میں میری کیا رائے ہے اور میں ویت نام کی جنگ آزادی کے بارے میں کیا سوچتا ہوں۔

'آدیش' میں مطبوعہ میری تحریر کے پیش نظر اشک نے انکشافات تو کیے لیکن وہ اسی تحریر کا

---

[1] یہ چند جملے جو ایک شخص کے 'سفر کی داستان' ہے، قاری تک میری بات پہنچا دیتے ہیں — میں قاری سے معذرت کے ساتھ بظاہر ان نیز ہے جملوں کو سیدھا لکھ رہا ہوں کہ اوپندر ناتھ اشک میری بات سمجھ لیں — اشک صاحب، میں نے صرف اتنی بات کہی ہے کہ میرے ہاں نہ کوئی آیا اور نہ بلاوا آنے پر کہیں گیا۔

[2] یہ اداریہ ذکاء الرحمٰن اور ناصر زیدی کے نام سے چھپا ہے جو ٦٦ء میں 'ادب لطیف' کے مدیران تھے۔

ایک فٹ نوٹ نظر انداز کر گئے۔ فٹ نوٹ یوں ہے: ''ہندی کے ایک لنٹھ (چغد) افسانہ نگار جو ایک پرچہ چھوڑ کر آج کل چھاپے خانے کا کاروبار کر رہے ہیں، کو یہ تکلیف تھی کہ میں سانحۂ ستمبر کے دوران پاکستانی ادیبوں کے ساتھ خط و کتابت کر رہا تھا، امریکہ کے توسط سے۔ جن crisis کا سامنا ہمیں کرنا پڑا ہے، اگر میاں، ان سے دوچار ہونا پڑتا تو مر گئے ہوتے — نوکری حاصل کرنے اور نوکری چھوڑنے کی داستان سے تم نے کچھ نہ کچھ سیکھا ہوگا'' — اس لنٹھ افسانہ نگار نے اپنی تکلیف کا اظہار ہندی کے رنگ برنگے، جہازی، سرمایہ دار ہفتہ وار جریدے میں کیا تھا — اس لنٹھ افسانہ نگار نے اپنی احمقانہ حد تک نام نہاد قومیت کا اعلان کرنے کے لیے مجھے پاکستانی ایجنٹ یا پاکستان نواز کہا اور اوپندر ناتھ اشک نے نام نہاد ترقی پسندوں سردار جعفری اور کرشن چندر کی وفاداری میں اور اپنی دیرینہ تکلیف کے پیش نظر مجھے سی. آئی. اے. کا ایجنٹ کہا — ہماری قومی زبان کے ایک نوجوان اور ایک بوڑھے ادیب کی ذہنی حالت کا اندازہ کیجیے۔

اس سے پیشتر کہ یہ کہوں، میرے ہاں کون، کب ٹھہرا ہے، اشک کے خط کے آخری چند جملوں کے سلسلے میں کچھ کہنے کی اجازت دیجیے۔

اشک نے اتنا کہا ہے کہ میں سی. آئی. اے. کا ایجنٹ ہوں اور یہ امپریشن دھونے کے لیے میں نے 'آویش' میں کچھ لکھا ہے، جس سے امپریشن اور بھی گہرا ہوتا ہے اور اگر میں سی. آئی. اے. کا ایجنٹ نہیں ہوں تو دوسروں کو گالیاں دینے کے بجائے کچھ بہتر لکھوں — میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ میرا المیہ یہ ہے کہ مجھے ہر احمقانہ تحریر کا جواب دینا پڑ رہا ہے — اشک کے آخری چند جملے صرف اتنی بات کہتے ہیں کہ میں نے 'آویش' میں کچھ لکھا ہے جس میں دوسروں کو گالیاں دی گئی ہیں۔ اس سے مجھے اختلاف ہے۔ وہ تفصیل سے لکھیں، میں تفصیل سے جواب دوں گا۔

میرے ہاں کون، کب ٹھہرا؟

آج تک میرے گھر کی سیڑھیوں پر صرف تین غیر ملکی شخصوں کے قدم پڑے ہیں — پہلا شخص تھا جرمن نژاد کینیڈین وولف جو ۶۷ء میں جولائی اگست کے دوران غالباً تین ہفتے میرے ہاں رہا۔ وولف میرے دوست عزیز الحق سے Vancouver میں ملا تھا اور میری عزیز الحق سے دوستی لاہور میں ہوئی تھی — وولف دلّی میں میری وجہ سے بیسیوں دوستوں سے ملا، اینٹی کمیونسٹ پولیٹیکل سائنٹسٹ گوپال متل سے بھی اور روس نواز مارکسسٹ انور عظیم سے بھی۔ بائیس سال وولف انتہا پسند انقلابی ہے اور چی گوارا کی طرح کام کرنا چاہتا ہے۔ اس کی سیاسی سوجھ بوجھ اور اس کی تاریخ کی اسٹڈی قیامت کی ہے جس کے سہارے اس نے گوپال متل کو رُلا رُلا دیا — اس

کی شہادت اَنگنت لوگ دے سکتے ہیں۔ وولف پاکستان، ایران، ترکی اور یوروپ کے راستے لوٹ گیا تھا۔ کون جانے، اب وہ کہاں ہے۔

دوسرا شخص ایک انگریز بزرگ بیکسٹر ہے۔ یہ شخص آج سے برسوں پہلے کرشنا مینن اور رجنی پام دت کے ساتھ انڈیا لیگ میں کام کر چکا ہے، ذہنی طور پر لیفٹ کمیونسٹ ہے۔ اس وقت ہندوستان ہی میں ہے— اشک نے بیدی کے ہاں مجھ سے پوچھا تھا: ''مین را صاحب! آپ شادی شدہ ہیں؟'' ۲۷ رستمبر کو میری شادی ہے۔ یہ جملے اشک کا دعوت نامہ ہیں۔ وہ آئیں اور بیکسٹر بھی یہیں ہوگا۔ اشک نے 'امرودوں' کا جو خوانچہ زمانہ پہلے، اُردو بازار میں لگایا تھا اور جسے بعد میں وہ ہندی مارگ پر لے گئے اور جہاں انھوں نے 'امرود' بیچ کر نام پیدا کیا، بیکسٹر اس خوانچے کو تین منٹ میں اُلٹ دے گا۔

تیسرا شخص ایک نوجوان اطالوی ہے جو نیپلز یونیورسٹی کے لیے جدید اُردو اور ہندی کہانی پر کام کر رہا ہے۔ یہ شخص گذشتہ دنوں میرے ہاں آیا تھا۔ اور ایک گھنٹہ بات چیت کرنے کے بعد لوٹ گیا۔ میرے ذہن سے اس شخص کا نام اُتر گیا ہے۔

مجھے اتنا اور کہنا ہے کہ ہمارا Intelligence Bureau اشک اور ایسے ہی دوسرے ادیبوں سے سی. آئی. اے. کے ایجنٹوں کے سلسلے میں معلومات حاصل کرے اور اگر یہ ادیب کچھ نہ کہہ سکیں تو ان لوگوں کو سرِ راہ برہنہ کر کے ان کے چوتڑوں پر ہنٹر لگائے جائیں۔

OO

ایک غیر رسمی گفتگو

دیوندر ستیارتھی کے ساتھ ایک دن[1]

کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ آپ گھر سے نکلتے ہیں اور ستیارتھی آپ کو گلی کے نکڑ پر نظر آتا ہے۔ آپ شام کو کافی ہاؤس پہنچتے ہیں اور ستیارتھی آپ کو کاؤنٹر کے قریب نظر آتا ہے۔ آپ بہت رات گئے گھر کا راستہ پکڑتے ہیں اور ستیارتھی آپ کو کسی اسٹال کے باہر نظر آتا ہے اور پھر یوں ہوتا ہے کہ آپ لحاف میں گھستے ہیں، آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ ستیارتھی آپ کے ساتھ ہے۔

کبھی آپ ستیارتھی، کے ساتھ ایسا آدمی دیکھتے ہیں جو آپ کے لیے حد درجہ کا احمق ہے اور جس کا ایک منٹ کا ساتھ بھی آپ کو گوارا نہیں۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ستیارتھی اس احمق شخص سے گھل مل کر باتیں کررہا ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ ستیارتھی کو اپنی حیثیت تک کا احساس نہیں۔ کبھی آپ ستیارتھی کے ساتھ کسی ایسے وی آئی پی کو بے تکلفی سے باتیں کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جس کے پاس دو گھڑی بیٹھنے کو آپ کا من ترستا ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ ستیارتھی نظر نہیں آتا، مہینوں نظر نہیں آتا۔ آپ کہہ نہیں سکتے کہ ستیارتھی شہر میں ہے یا شہر میں نہیں ہے، شہر سے باہر ہے، تو کہاں ہے؟

ستیارتھی کو پانا جتنا آسان ہے، اتنا ہی مشکل بھی ہے۔

اُردو ادب کے قاری نے ستیارتھی کو آسانی سے پایا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اُردو ادب کے قاری نے بھی ستیارتھی کو اب تک نہیں پایا ہے۔ ایک لچر، گھسی پٹی کہانی کو پایا ہے جو ستیارتھی کو پہنا دی گئی ہے۔ (ایک گھٹیا کہانی میں نے بھی ستیارتھی کو پہنائی تھی — 'پرشارتھی' جو کراچی کے 'سات رنگ' میں چھپی تھی) اس لچر، گھسی پٹی کہانی کو گڑھنے والے اُردو کے بہت سے کہانی کار اور بہت سے شاعر ہیں اور ستیارتھی ہے کہ ایک بے پناہ بے نیازی سے اب تک لچر، گھسی پٹی کہانی کو پہنے ہوئے ہے۔

---

[1] ۲۹ راگست ۱۹۶۵ء، مقام قرول باغ، نئی دہلی۔ (حاضرین: دیوندر ستیارتھی، وبانی، محمود ہاشمی، سریندر پرکاش)

جب 'ادبِ لطیف' کو نیا رنگ رُوپ دینے کی تیاریاں شروع ہوئیں، اس وقت ستیارتھی میرے ذہن میں تھا۔

ستیارتھی نے پچھلے دو تین برسوں میں کئی کہانیاں لکھی ہیں — چند بے پناہ کہانیاں سننے کا مجھے اتفاق بھی ہوا ہے۔ 'یہ قربتیں یہ دوریاں'، 'گومتی کی پیاس'، اور 'منٹو' ('منٹو' اتنی تیز کہانی ہے کہ سننے والا اندر باہر سے ہل جاتا ہے)۔ ستیارتھی کو لکھنے کا جنون ہے لیکن چھپنے کی رتی بھر خواہش نہیں۔

ستیارتھی سے ملاقات ہوئی اور میں نے نئے 'ادبِ لطیف' کے بارے میں کہا۔ ستیارتھی نے تعاون کا وعدہ تو کر لیا، لیکن پھر یوں ہوا کہ آپ ایسے غائب ہوئے کہ جس سے پوچھوں، یہی کہے، دیکھا نہیں۔

اور پھر سریندر پرکاش، جو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے قبر میں سے مردہ باہر نکال لاتا ہے، میری مدد کو آیا — ''ستیارتھی یہ اتوار ہمارے ساتھ گذاریں گے!''

ستیارتھی کے کھچڑی بال چپڑے ہوئے تھے، سنورے ہوئے تھے اور کندھوں سے ذرا اوپر تک جھول رہے تھے۔ پیشانی دمک رہی تھی اور پرانی اور میلی عینک سے ڈھکی ہوئی آنکھیں ہمیشہ کی طرح اُداس تھیں۔ قریب قریب سفید گھنی مونچھوں اور گھنی داڑھی میں چھپی ہوئی گلابی ہونٹوں کی ہلکی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ ستیارتھی نے اچکن کی طرز کا گھٹنوں تک لمبا راسلک کا، کریم کلر کا کوٹ پہنا ہوا تھا جس کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ کوٹ کے نیچے کھدر کا سفید کرتا تھا جس کے سارے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ کرتے کے نیچے بنیان نہ تھی؛ گورا بدن تھا، جو نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے کھدر کا پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ کوٹ کرتا اور پاجامہ — کوئی چیز آئرن نہیں ہوئی تھی اور اتفاق سے اُجلی تھی۔ موزوں سے بے نیاز پیروں میں براؤن جوتا تھا جس کے تسمے کھلے ہوئے تھے۔ (غالباً ستیارتھی انڈرویر قسم کی چیزوں کے عادی نہیں ہیں — ایک زمانہ ہوا، ستیارتھی نے مجھ سے کہا تھا: ''میں انڈر ہینڈ ٹیکس کھیلنا نہیں جانتا!'')

سریندر کے گھر سے مدراس کیفے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے ایک بات نوٹ کی کہ ستیارتھی قدم اٹھاتے نہیں، ان کے قدم سڑک کی چھاتی پر گھسٹتے ہیں۔

مدراس کیفے اجمل خاں روڈ پر ہے (اجمل خاں روڈ کو ہم پنجابی لوگ انارکلی کہتے ہیں — لاہور سے ہمارا عشق جوں کا توں ہے!)

ہم دائیں بائیں پھیلی ہوئی تین منزلہ عمارتوں کے بیچ مدراس کیفے کے لان میں بیٹھ گئے — ٹین کی فولڈنگ کرسیاں اور سفید وزنی پتھر کی چکنی اور ٹھنڈی سطح والی میزیں۔ سر پر مدھو مالتی اور انگور کی بیلیں اور اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے مدراسی۔

ہم نے ناشتے کے لیے اِڈلی سانبھر منگوانا چاہا لیکن ہم دیر سے پہنچے تھے اور اِڈلی ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے سانبھر منگوایا — ارہر کی دال کا تیز و تند سانبھر، اڑد کی دال کا ہری مرچ اور ادرک ملا وَڑا اور ناریل کی چٹنی۔

اور پھر سریندر نے اپنا خاص جملہ پھینکا، ''ہو جائے پھر گفتگو!''

سریندر کے اس جملے پر مجھے ہمیشہ عزیز الحق (پاکستان کا نوجوان ناقد) یاد آ جاتا ہے جو آج کل لاہور کی محفلوں سے دور کناڈا میں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ بھی بات شروع کرنے سے پہلے کہا کرتا تھا، ''ہو جائے کچھ!''

یوں ہم نے ستیارتھی کو گھیرے میں لیا۔

میں نے کہا، ''ستیارتھی صاحب، قصہ یہ ہے کہ آپ کی شخصیت پر ایک لفظ کا پہرا ہے — فراڈ! ہر وہ شخص جسے اُردو افسانے سے ذرا بھی دلچسپی ہے، آپ کو فراڈ کی حیثیت سے جانتا ہے۔ مجھے یاد ہے، چند سال پہلے ارون روڈ پر پنجابی ادب کی محفل میں کرشن چندر نے آپ کو فراڈ کہا تھا۔ جب میں نے پڑھنا شروع کیا تھا، یہ بات میرے ذہن میں پہلے سے موجود تھی... لیکن ادھر چند برسوں میں ڈھنگ سے پڑھنے کے بعد اور اچھی طرح جاننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ فراڈ والا قصہ بکواس ہے۔ ان چند برسوں میں میری بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہوئی ہے، میں نے بہت سے ادیبوں کی تخلیقات پڑھی ہیں اور ان کی زندگی کے بارے میں پڑھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بہت سے فراڈ اُردو ادب میں موجود ہیں، لیکن آپ کے بارے میں اب مجھے ایسا محسوس نہیں ہوتا — میں چاہتا ہوں، آج آپ اس سلسلے میں تفصیل سے بات کریں۔''

میں نے ستیارتھی کی طرف دیکھا — پرانی اور میلی عینک کے پیچھے ان کی اُداس آنکھیں کچھ اور اُداس ہو گئی تھیں۔ وہ کافی سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ حیران نہیں تھے، شاید اس لیے کہ وہ ہمیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ لوگ unpredictable ہیں اور ویسے بھی ان کے لیے ایسی بات کا جواب دینے کا یہ پہلا موقع تھا۔

انھوں نے دھیمے دھیمے اپنی باریک آواز میں کہنا شروع کیا: (منٹو نے گھنی داڑھی اور گھنی مونچھوں کے جال میں سے نکلتی ہوئی اس آواز کے بارے میں کہا تھا — جیسے گھونسلے میں چڑیاں

چچہارہی ہوں۔)

''پہلی بات یہ ہے کہ کرشن چندر نے مجھے پنجابی ادب کی محفل میں فراڈ نہیں کہا تھا، 'مہابور' کہا تھا اور اس کا تحریری ثبوت موجود ہے۔ یہ کرشن چندر کا ایک فراڈ تھا جس کے بارے میں آگے چل کر کہوں گا... فراڈ مجھے پہلی بار منٹو نے کہا تھا، اور بڑی محبت سے کہا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں بیدی کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ ان دنوں 'ساقی' میں میرا افسانہ 'کنگ پوش' چھپا تھا اور انھیں دنوں منٹو کا 'خوشیا'۔ میں نے منٹو کو پہلا خط لکھا تھا اور اسے مبارکباد پیش کی تھی۔ میں نے لکھا تھا، کاش، میں 'خوشیا' ہوتا! پھر مجھے منٹو کا خط ملا تھا، پہلا اور آخری خط۔ منٹو نے لکھا تھا کہ وہ 'ہمایوں' میں میرے مضمون (لوک گیتوں کے بارے میں) پڑھتا رہا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ وہ میری نظم بن کر میرے ساتھ نگری نگری یاترا کرے...! میری حیثیت ایک مسافر کی رہی ہے۔ میں اسی لباس میں نگری نگری گھوما ہوں، اَنگنت لوگوں سے ملا ہوں — ان لوگوں سے بھی جو دنیاوی تعلیم سے کوسوں دور ہیں اور ان سے بھی جو پڑھ لکھ کر بہت بڑی سماجی حیثیت حاصل کر چکے ہیں لیکن میری یاترا میں کسی کی حیثیت کے کوئی معنی نہیں ہیں.... جب میں دلی پہنچا، میں منٹو سے ملنے انڈر ہل روڈ پر آل انڈیا ریڈیو کے دفتر میں چلا گیا۔ میں اور منٹو باتیں کر رہے تھے کہ ایک صاحب، اڈوانی، جو منٹو کے باس تھے آ دھمکے۔ اڈوانی نے مجھے دیکھتے ہی انگریزی میں کہا، ''ستیارتھی! تم مجھ سے ملنے آئے ہو؟'' میں نے کہا، ''نہیں، میں منٹو سے ملنے آیا ہوں۔'' اڈوانی نے پھر ذرا زور دے کر اور منٹو کو گھورتے ہوئے مجھ سے کہا، ''نہیں، تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔'' اب میں نے کہا، ''ویسے آپ کون صاحب ہیں!'' اڈوانی نے کہا، ''اڈوانی۔'' میں نے کہا، ''اچھا مسٹر اڈوانی، میں منٹو سے فارغ ہو کر آپ سے ملنے آؤں گا۔'' مسٹر اڈوانی ایک بیوروکریٹ تھے اور منٹو ان کا ماتحت۔ حالانکہ میں اڈوانی کو پہلے سے جانتا تھا لیکن میری فقیرانہ زندگی میں ایک بیوروکریٹ کا کہاں گزر؟ میرے سامنے تو منٹو بیٹھا تھا، ایک کہانی کار۔ لیکن منٹو کی ٹریجڈی یہ تھی کہ وہ کہانی کار کے علاوہ ایک بیوروکریٹ کا ماتحت تھا... یہاں ایک بات اور سنیے، ان دنوں میرے لوک گیتوں کے مجموعے کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی اور اس کے کاپی رائٹ کے لیے مجھے بارہ سو روپے پیش کیے جا رہے تھے۔ یہ سب باتیں منٹو کے سامنے ہو رہی تھیں۔ میں کاپی رائٹ دینے کے خلاف تھا۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنے کی ہے کہ ان دنوں بارہ سو روپے ایک معنی رکھتے تھے۔ میں کہتا تھا کہ کاپی رائٹ دینے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ کاپی رائٹ تو بھارت ماتا کے ہیں، گیت میرے نہیں

ہیں۔ ہاں میں نے گھوم گھوم کر اکٹھے کیے ہیں اور انھیں معنی دیے ہیں۔ منٹو کے گھر میں نے یہ بات کہی تھی۔ اس وقت منٹو نے کہا تھا کہ ستیارتھی تم بہت بڑے فراڈ ہو۔ دراصل میرا رویہ ان سب لوگوں کی سمجھ سے پرے تھا۔ کاپی رائٹ دینے کے میرے انکار پر یہ سالے سب چڑھ گئے تھے ایک طرح سے۔ ہوسکتا ہے، مجھے منٹو سے اس کے احساسِ کمتری نے فراڈ کہلوایا ہو، لیکن میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ منٹو نے پیار سے ہی کہا تھا۔ میں منٹو کو ہمیشہ پیار کرتا رہا ہوں اور اب بھی منٹو مجھے بہت یاد آتا ہے۔ لیکن اب اسے کیا کہا جائے، اس زمانے میں جملے چل جایا کرتے تھے۔ منٹو کا جملہ چل گیا اور اسے کاندھا دینے والے احساسِ کمتری کے مارے سارے ادیب تھے جو چھوٹی چھوٹی نوکریوں کے چکر میں، چھوٹی موٹی شہرتوں کے چکر میں قدم قدم پر سمجھوتوں کے شکار ہو جاتے تھے...

ایک اور واقعہ سنیے۔ چند سال بعد میری کتاب 'میں ہوں خانہ بدوش' چھپی اور میں پہلی بار پطرس سے ملنے گیا۔ یہ ملاقات راشد نے ارینج کی تھی۔ اس سے پہلے پطرس سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی کیونکہ میں ریڈیو کی نوکری کے چکر سے باہر تھا۔ پطرس سے ملاقات ہوئی۔ پطرس اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، بیچ میں میز تھی اور پطرس کے سامنے میں بیٹھا ہوا تھا اور راشد... مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ نوکریوں کے آداب اس بری طرح آدمیوں کو مجروح کرتے ہیں۔ اس کمرے میں اس وقت راشد کی حیثیت بالکل معمولی تھی۔ میں نے پطرس کو اپنی کتاب 'میں ہوا خانہ بدوش' دی جس کے شروع میں ٹیگور کے ساتھ میری تصویر چھپی ہوئی تھی۔ یہ بات اپنے آپ میں بہت متاثر کرنے والی تھی۔ چاہے متاثر ہونے والا ریڈیو کا سب سے بڑا افسر ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے راشد کو دیکھا اور پطرس سے کہا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ریڈیو کا ڈائریکٹر جنرل ہوں اور آپ ہیں دیوندر ستیارتھی۔ اب میرا یہ جملہ نہ چل سکا کیونکہ میں نوکریاں نہیں دلوا سکتا تھا لیکن پطرس کا یہ جملہ چل گیا جو انھوں نے اس ملاقات میں ٹیگور کے ساتھ میری تصویر دیکھ کر کہا تھا، ''خضاب سے پہلے اور خضاب کے بعد۔'' میری کہانی 'نئے دیوتا'[1] میں منٹو پر یہ چوٹ ہے کہ منٹو جو بہ ظاہر بہت بڑا انقلابی ذہن ہے ریڈیو کی نوکری حاصل کرنے پر بہت خوش ہے، نہ صرف خوش ہے بلکہ اس خوشی میں شراب کی دعوت بھی دیتا ہے... ریڈیو کی نوکری اس زمانے کی سب سے بڑی لعنت تھی... اس نوکری نے بہت سے ادیبوں کے کردار کو ڈانواڈول کیا تھا... فراڈ اس لیے چل گیا کہ غمِ روزگار اور

---

[1] 'نئے دیوتا' ادبِ لطیف کے سن ۴۲ء کے سالانہ خصوصی شمارے میں چھپی تھی، اس شمارے میں منٹو کی 'کالی شلوار'، عصمت چغتائی کی 'تل'، کرشن چندر کی 'پرانے خدا'، غلام عباس کی 'آنندی'، اور مشہور فلم اداکار بلراج ساہنی کی کہانی 'واپسی وواپسی' بھی شامل تھی۔

غمِ شہرت کے مارے ادیب میرا نگری نگری گھومنا، لوک گیت اکٹھے کرنا اور میرا پہناوا اور ہر بڑے چھوٹے سے میری بات چیت کا ڈھنگ، سب باتوں کو اپنی تسلی کے لیے ڈھونگ سمجھ بیٹھے۔ ٹیگور کے ساتھ میری تصویر انھیں میری شرارت لگی... اور ٹیگور اور گاندھی جی کے میرے نام خط اور امرتا شیرگل سے میری ملاقات... یہ لوگ بہت چھوٹے تھے، کردار کے بہت چھوٹے تھے اور جن لوگوں کے ساتھ مجھے چلنا تھا وہ ابھی نہیں آئے تھے۔''

ستیارتھی کی مدھر آواز کی ندی کبھی سکون سے، کبھی تیزی سے بہہ رہی تھی اور اس ندی میں 'ہمایوں' کے کاتب عبدالجلیل سے لے کر 'ہمایوں' کے مدیر حامد علی خاں اور اس زمانے کے اور بہت سے لوگوں کو بہتے دیکھا، ندی کے پار اُترتے دیکھا اور ندی میں ڈوبتے دیکھا۔ وہ لوگ بھی ڈوبے جو اناڑی تھے اور وہ لوگ بھی ڈوبے جو تیرنا جانتے تھے۔

محمود ہاشمی نے کہا: ''ستیارتھی صاحب، اس زمانے کے تمام ادیبوں کی تخلیقات ہمارے سامنے ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس زمانے کے ادیبوں میں ذہانت تھی، جیسے منٹو۔ کچھ لوگ اوسط ذہانت کے تھے لیکن ایک بڑی تعداد ایسے ادیبوں کی تھی جو احمق تو نہیں تھے لیکن ذہین بھی نہیں تھے۔ پھر بھی اس زمانے میں ہر شخص کا نام چمکا۔ یہ عجیب و غریب بات ہے۔ میرا خیال ہے، اس زمانے میں لوگ افسانہ نگاری کے علاوہ 'انڈر ہینڈ گیمس' بھی کھیلتے تھے، لکھتے کم تھے یا لکھتے گھٹیا تھے لیکن شہرت پانے کے لیے ان کی چالاکی کا کوئی جواب نہیں۔ اس سلسلے میں آپ کچھ کہیے۔''

ستیارتھی نے کہا: ''آپ کا خیال صحیح ہے۔ اس زمانے میں ہر شخص چالاک بننے کے چکّر میں تھا، راجندر سنگھ بیدی کو چھوڑ کر۔''

محمود نے پھر کہا: ''ستیارتھی صاحب، آپ نے اُردو کہانی کا ہر دور دیکھا ہے، ہر شخص کو سمجھا ہے... آپ کو کسی ایک نام سے دلچسپی نہیں رکھنی چاہیے۔''

ستیارتھی چند لمحے خاموش رہے اور پھر انھوں نے کہا: ''اب آپ کہلوانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے... اس زمانے میں بہت اچھے افسانے لکھے گئے اور اچھے خاصے لوگ پیدا ہوئے لیکن یہ بات بھی ہے کہ وہ دور چالاکیوں کا دور تھا... انہی دنوں 'ایشیا میگزین' میں میرا ایک مضمون چھپا۔ 'ایشیا میگزین' بہت بڑی چیز تھی۔ آپ کو تعجب ہوگا اور مجھے اس وقت تعجب ہوا تھا، ان دنوں کرشن چندر نے مجھے خط لکھا تھا کہ 'ایشیا میگزین' کے ساتھ کچھ ان کا سلسلہ بھی ہو جائے۔ اگیے نے بھی ان دنوں مجھ سے اس سلسلے کے بارے میں کہا تھا اور میں نے اگیے اور 'ایشیا میگزین' کی مدیرہ شری متی امرسین کی ملاقات اریجنج کی تھی۔ اب اگیے بین الاقوامی شخصیت بن بیٹھا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ

پروہت کی حیثیت تو پروہت کی سی ہی رہتی ہے... راجندر سنگھ بیدی کے پہلے مجموعہ 'دانہ و دام' کا پیش لفظ ہنس راج رام نگری نے لکھا ہے لیکن یہ پیش لفظ حقیقت میں بیدی نے خود لکھا تھا۔ بیدی کی زبان کے بارے میں ایک دلچسپ بات سنیے۔ بیدی کے افسانے 'ادبِ لطیف'، 'ساقی' اور 'ادبی دنیا' میں چھپا کرتے تھے لیکن 'ہمایوں' میں نہیں چھپے تھے۔ ایک بار میں نے حامد علی خاں سے بیدی کے افسانوں کے بارے میں کہا تو انھوں نے کہا کہ بیدی کی زبان بہت گھٹیا ہے۔ میں نے کہا کہ زبان درست کی جاسکتی ہے۔ حامد علی خاں 'ہمایوں' کے مدیر نے کہا کہ بیدی کا اظہار بھی گھٹیا ہے... بیدی کو ڈاک خانہ کی نوکری چھوڑنے پر میں نے ہی مجبور کیا تھا... بیدی نے نوکری چھوڑ دی اور اب بہت کام کرنے تھے۔ ایک کام فیض کی دعوت کرنا تھا جس کے لیے بیدی نے تین سو روپیہ کا بجٹ بنایا تھا۔ کمرے کو سجانا، کباڑی بازار سے بینت کی کرسیاں خرید کر ان پر رنگ کروانا۔ ان دنوں ایسے کام کرنا بہت ضروری ہو گیا تھا... کافی عرصہ بعد 'ساقی' کے مدیر شاہد احمد دہلوی نے میری ایک کتاب چھاپنی چاہی اور کہا کہ بیدی نے 'گوکھ جلی' کے چار سو روپے لیے ہیں اور کرشن نے 'شکست' کے چھ سو روپے۔ میں نے کہا کہ شاہد صاحب، سات سمندر ہوتے ہیں اور ہفتے کے سات ہی دن، اس طرح کا معاملہ ہو جائے۔ شاہد صاحب نے اسی وقت سات سو روپے کا بیئرر چیک کاٹ دیا اور ہم نے پہلی بار ریڈیو خریدا، کمرے کے سائز کا قالین خریدا اور بینت کی کرسیاں۔ اور بیدی سے کہا کہ یہ کرسیاں اس بازار سے نہیں خریدی گئی ہیں... کئی سال بعد شاہد صاحب سے کراچی میں ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ شاہد صاحب، آپ کا سات سو روپے کا مقروض ہوں۔ میری کتاب اب تک نہیں چھپی ہے۔ بیدی نے اپنی کتاب 'گوکھ جلی' اور کرشن چندر نے 'شکست' کہیں اور سے چھپوا لی۔''

دیوندر ستیارتھی ماضی، ماضی قریب اور حال تینوں زمانوں میں بے تکلفی سے گھوم رہے تھے۔

''ساحر لدھیانوی سے میری بے تکلفی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے اس کی شاعری پسند تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم دونوں امریتا پریتم پر مرتے تھے۔ چودھری نذیر نے اختر اور رینوی کے کہانی کے مجموعے 'منظر اور پس منظر' کے کاپی رائٹ پانچ سو روپے میں خرید لیے تھے اور میں نے غصے میں ایک کہانی 'اگلے طوفانِ نوح تک' لکھی تھی اور چودھری نذیر کو، بہت رات گئے سڑک کے کنارے لیمپ پوسٹ کی مدھم روشنی میں سنائی تھی، اس خوف کے ساتھ کہ ابھی چودھری نذیر مجھے گھونسا جڑ دے گا۔''

''منٹو نے مجھے کہا تھا کہ کس طرح اس نے کرشن چندر کی محبوبہ کے کپڑے اُتروا کر اسے واپس بھیج دیا تھا۔'' (اس واقعہ کا پورا ذکر نذیر چودھری کی ادارت میں لاہور سے نکلنے والا جریدہ 'سویرا' میں شائع نصیر انور کے مضمون 'موجِ سراب' میں موجود ہے۔)

محمود ہاشمی نے پوچھا: ''کیا اس زمانے میں کرشن چندر نے کوئی لڑکی بھگائی تھی؟''
''میں نے سنا تھا، لیکن میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ستیارتھی نے جواب دیا۔
میں نے کہا: ''ثمینہ خاتون سے لے کر سلمیٰ صدیقی تک کرشن چندر کا کردار ڈانواڈول رہا ہے۔''
ستیارتھی بولے: ''دراصل کرشن چندر شروع سے اب تک افسانہ نگاری ہو یا زندگی، ایک کاروباری آدمی رہا ہے۔ کرشن little talent کا آدمی ہے۔ زندگی اور ادب کے ہر محاذ پر کرشن کو کامیابی اس لیے ملی ہے کہ کرشن نے ہر جگہ سمجھوتا کیا ہے۔ جنگ ہو یا بنگال کا قحط، فسادات ہوں یا آزاد ہندوستان، اس شخص کا رویہ ہمیشہ کاروباری رہا ہے۔ کرشن چندر کے بارے میں اتنا سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کرشن چندر نے مجھے کہا تھا، اے مہابور! اپنے سکھ مجھے دے دو! میرے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ عملی زندگی گزارنے کے باوجود کرشن چندر کو اب تک سکھ نہیں ملا اور ایک مسافر کے سکھوں کی اسے خواہش ہے...''
محمود ہاشمی نے پوچھا: ''ستیارتھی صاحب، میرا خیال ہے، کرشن چندر کئی افسانوں میں آپ سے متاثر ہیں۔''
ستیارتھی نے ذرا دم لے کر کہا: ''یہ بات میں کرتے ہوئے جھجکتا ہوں لیکن جبکہ آپ نے ایسا محسوس کیا ہے میں بھی کہہ سکتا ہوں 'زندگی کے موڑ پر'، 'گرجن کی ایک شام' اور 'پانی کا درخت' نام کی کہانیوں میں کرشن چندر میری تحریر سے متاثر ہیں... یہاں سے اس بات سے ہٹ کر ایک اور بات، 'گرہن' کہانی میں جو لوک گیت شامل ہے، وہ میں نے بیدی کو دیا تھا...''
میں نے پوچھا: ''کیا آپ کسی دور کی اپنی کسی تحریر پر شرمندہ ہیں... عصمت چغتائی تو شرمندہ ہیں۔'' (بھوپال کانفرنس میں عصمت چغتائی اپنی کئی کہانیوں پر شرمندہ ہوئی تھیں اور انھوں نے ان کہانیوں کو رد کیا تھا۔)
''نہیں۔''
میں نے پوچھا: ''اپندر ناتھ اشک کا کیا رول رہا ہے؟''
''اپندر ناتھ اشک بھی کاروباری ہیں اور کرشن چندر کی کاربن کاپی۔''
اشک ہندی میں کہتے اور کہلواتے ہیں کہ اُردو میں ان کا درجہ منٹو اور بیدی کے برابر ہے۔ یہ کہاں تک صحیح ہے؟
''یہ غلط ہے۔ اشک کو اُردو میں اس طرح سے کوئی نہیں جانتا۔''
اشک کہتے اور کہلواتے ہیں کہ ایک ہی تھیم پر لکھی گئی ان کی کہانی 'ابال' منٹو کی کہانی 'بلاؤز'

سے بہتر ہے۔

'ابال' بہت معمولی کہانی ہے اور 'بلاؤز' کے ساتھ اس کا ذکر محض پروپیگنڈہ ہے۔

میں نے پوچھا: ''سن چھتیس سے پچپن تک کے ان افسانوں کے نام لیجیے جو آپ کے نزدیک بڑے افسانے ہیں۔'' (میں نے پچپن کی قید اس لیے لگائی تھی کہ منٹو کی موت کے ساتھ ایک دور ختم ہو گیا۔)

ستیارتھی نے کہا: '''نیا قانون' اور 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' — یہ افسانے ایک بڑے ادیب کے بڑے سفر کی کہانی ہیں اور ابتدا اور انتہا۔ 'ہماری گلی'، 'دو فرلانگ لمبی سڑک'، 'دس منٹ بارش میں'، 'قتل' (اس کہانی پر عصمت شرمندہ ہیں اور اسے رد کر چکی ہیں) 'آخری کوشش' اور 'گڈریا' — 'گڈریا' اردو کے چند بڑے افسانوں میں ایک ہے اور چند سال پہلے میں نے اس افسانے کے بارے میں کرشن سے کہا تھا تو وہ خاموش رہے تھے کہ انھوں نے یہ افسانہ نہیں پڑھا ہے۔''

بانی نے پوچھا: ''نئے لوگوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

ستیارتھی نے کہا: ''میں نئے لوگوں کا قائل ہوں۔ نئے لوگوں نے موسیقی، تصویر کشی اور ادب کی سبھی حدیں توڑ دی ہیں... نئے لوگوں کے یہاں بڑی وسعت ہے... میں خود اپنے آپ کو ایک ملک کا شہری نہیں سمجھتا، یہ صرف اتفاق ہے کہ میں ہندوستان کا شہری ہوں اور یہاں سے میری وفاداری وابستہ ہے لیکن میں نئے لوگوں کی طرح یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرا کام بڑا ہے، ملک کی سرحدوں سے بڑا! We don't write in a particular language, we write in gesture... نئے لوگوں کے یہاں کمرشیل چکر نہیں ہے اور اس کی مجھے خوشی ہے اور میری یہ دُعا ہے کہ نئے لوگوں میں کوئی کرشن چندر پیدا نہ ہو...''

تھوڑی دیر بعد، جب ہم سریندر کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے، ستیارتھی ہمیں گرودوارہ روڈ کے ایک کباڑی کی دکان پر نظر آئے۔

OO

گوشۂ دیوندر ستیارتھی

کنفیوژن

ترقی پسند : منٹو

نئے دیوتا : دیوندر ستیارتھی

پرشارتھی : مین را

جاگتی آنکھوں کا خواب : شمیم حنفی

کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ آپ گھر سے باہر نکلتے ہیں اور ستیارتھی آپ کو گلی کے نکڑ پر نظر آ جاتا ہے؛ آپ لنچ کے لیے دفتر سے کینٹین کی اور بڑھتے ہیں اور ستیارتھی آپ کو سائیکل اسٹینڈ کے قریب دکھائی دیتا ہے؛ آپ شام کو کافی ہاؤس پہنچتے ہیں اور ستیارتھی آپ کو کسی کاؤنٹر کے پاس کھڑا ہوا ملتا ہے؛ آپ بہت رات گئے گھر کا راستہ پکڑتے ہیں اور ستیارتھی آپ کو کسی بند دکان کے چبوترے پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے؛ اور پھر یوں ہوتا ہے کہ ستیارتھی ڈھونڈنے پر بھی نظر نہیں آتا، مہینوں نظر نہیں آتا؛ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ وہ شہر میں ہے یا نہیں ہے؛ شہر میں نہیں ہے تو کہاں ہے؟ اور ہے بھی کہ نہیں اور اگر نہیں ہے تو پھر کیوں نہیں ہے...؟

پاس کی دوری

دیوندر ستیارتھی

یہ قربتیں، یہ دوریاں

ستیارتھی کو پانا جتنا آسان ہے، اتنا ہی مشکل ہے...
(لوگ کہتے ہیں کہ) اُردو کہانی کے قاری نے ستیارتھی کو آسانی سے پایا ہے...

میں سمجھتا ہوں کہ اُردو کہانی کے قاری نے ستیارتھی کو اب تک نہیں پایا ہے—اس نے تو بس ایک لچر، گھسی پٹی کہانی کو پایا ہے جو ستیارتھی کو پہنا دی گئی ہے (ایسی ہی ایک کہانی میں نے بھی ستیارتھی کو پہنائی تھی)، اور ستیارتھی ہے کہ اِک بے پناہ بے نیازی سے اب تک اس لچر، گھسی پٹی کہانی کو پہنے ہوئے ہے...

بلراج مین را: پانچ ستمبر، ۱۹۶۵ء

راجندر سنگھ بیدی کے نام

۲۵ر جنوری، ۱۹۸۴ء : چار بجے شام

لنکنگ روڈ، بمبئی

انور سجاد نے کہا: ''بیدی صاحب، مجھے کرشن چندر کی غیر موجودگی دکھ دے رہی ہے... ''

بیدی صاحب خاموش رہے— بیدی صاحب شدید طور پر علیل ہیں۔

میں نے کہا: ''تم برسوں پہلے منٹو سے ملے تھے، اور اب برسوں بعد بیدی صاحب سے مل رہے ہو...! تمھیں دکھ ہے کہ تم نے کرشن چندر کو نہیں دیکھا ہے اور بمبئی میں تمھارا یہ احساس شدید ہو گیا ہے...!''

برسوں پہلے لاہور پہنچنے پر مجھے شدید احساس تھا کہ منٹو شہر میں نہیں ہے، دنیا میں نہیں ہے۔

انور سجاد نے منٹو اور بیدی صاحب کو دیکھا ہے، کرشن چندر کو نہیں...

میں نے بیدی صاحب اور کرشن چندر کو دیکھا ہے، منٹو کو نہیں...

اور ہم دونوں نے دیوندر ستیارتھی کو دیکھا ہے...

اس نصف صدی کی بے پناہ آوارگی کے بعد ہمیں دیوندر ستیارتھی تھکے تھکے سے نظر آتے ہیں...!

بلراج مین را

نام : دیو اندر ستّا
قلمی نام : دیوندر ستیارتھی
جنم : ۲۸ رمئی ۱۹۰۸ء
مقام : بھدوڑ (ضلع سنگرور)، پنجاب
ملازمتیں : ۱۹۲۸ء: پروف ریڈر: ویدک نیترالیہ، اجمیر
مئی ۱۹۴۶ء سے فروری ۱۹۴۸ء تک: نائب مدیر: انڈین فارمنگ، نئی دہلی
مارچ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۶ء تک: مدیر: ہندی 'آج کل'، دہلی

پہلی مطبوعہ تحریر: 'پنجابی گرام ساہتیہ': لوک گیتوں پر ایک مقالہ: ہندی: ماہنامہ 'ہنس'، الہ آباد: نومبر ۱۹۳۱ء

اردو میں پہلی مطبوعہ تحریر: 'ظنی کی ماں': 'ہندو ویکلی، لاہور: ۱۹۳۲ء: اس غیر سنجیدہ تحریر کی اشاعت میں ستیارتھی کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔

پہلی اُردو کہانی: 'اور بانسری بجتی رہی' نومبر یا دسمبر، ۱۹۴۰ء: لاہور: یہ کہانی 'ادبِ لطیف' لاہور میں چھپی تھی، اور بعد میں ستیارتھی کے دوسرے افسانوی مجموعے کا عنوان بھی بنی۔

پہلی مطبوعہ اُردو کہانی: 'کنگ پوش': ۱۹۴۱ء: 'ساقی'، دِلّی: اس کہانی کو محمد حسن عسکری نے 'میرا پسندیدہ افسانہ' میں بھی شامل کیا تھا؛ 'کنگ پوش' کی اشاعت کے سلسلے میں ستیارتھی کو پندرہ روپے معاوضے کے طور پر ملے تھے۔

پہلی کتاب: 'گِدّھا': پنجابی (گورمکھی رسم الخط میں): ۱۹۳۶ء، امرتسر: 'ایشیا میگزین' میں ایک مضمون کی اشاعت کے سبب ستیارتھی کو ایک سو پچاس ڈالر معاوضہ ملا تھا؛ اس بڑی رقم کے کارن 'گِدّھا' کی اشاعت ممکن ہو سکی۔

اُردو کتابیں: 'نئے دیوتا'، 'اور بانسری بجتی رہی'... (افسانے)
'میں ہوں خانہ بدوش' اور 'گائے جا ہندوستان' (لوک گیتوں سے متعلق)

فراڈ مجھے پہلی بار منٹو نے کہا تھا، اور بڑی محبت سے...
اس زمانے میں جملے چل جایا کرتے تھے، منٹو کا جملہ چل گیا...

میں منٹو کو ہمیشہ پیار کرتا رہا ہوں، اور اب بھی منٹو مجھے بہت یاد آتا ہے...

'زندگی کے موڑ پر'، 'گرجن کی ایک شام' اور 'پانی کا درخت' افسانوں میں کرشن (چندر) میری تحریر سے متاثر ہے۔

کرشن چندر کے بارے میں اتنا سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں...

کرشن چندر زوال کی علامت ہے...

'گرہن' افسانے میں جو لوک گیت شامل ہے، وہ میں نے بیدی کو دیا تھا...

بیدی کو ڈاک خانے کی نوکری چھوڑنے پر میں نے مجبور کیا تھا...

بیدی کی عظمت میں کچھ تھوڑا بہت میرا بھی ہاتھ ہے...

۲۹ر اگست، ۱۹۶۵ء: دیوندر ستیارتھی کے ساتھ ایک دن، چند اقتباسات:

چودھری (نذیر احمد) صاحب جراثیم اور وٹامن کو ہم معنی الفاظ سمجھتے تھے...

نیا قانون اور ٹوبہ ٹیک سنگھ، یہ افسانے ایک بڑے ادیب کے بڑے سفر کی کہانی ہیں، اور ابتدا اور انتہا...

گڈریا اُردو کے چند بڑے افسانوں میں ایک ہے...

ہماری گلی، دو فرلانگ لمبی سڑک، دس منٹ بارش میں، تِل، آخری کوشش (بڑے افسانے ہیں)...

یہ لوگ (پانچویں دہائی کے ہم سفر) بہت چھوٹے تھے، کردار کے بہت چھوٹے تھے، اور جن لوگوں کے ساتھ مجھے چلنا تھا وہ ابھی نہیں آئے تھے...

میں نئے لوگوں کا قائل ہوں... نئے لوگوں نے موسیقی، تصویر کشی اور ادب کی سبھی حدیں توڑ دی ہیں...

کاش میں خوشیا ہوتا...

OO

فکشن: حقیقت

ترقی پسند : ساقی، دلّی:۱۹۴۱ء

جوگندر سنگھ: راجندر سنگھ بیدی

ہرندر ناتھ ترپاٹھی: دیوندر ستیارتھی

نئے دیوتا : ادبِ لطیف، لاہور:۱۹۴۲ء

نفاست حسن: سعادت حسن منٹو

مولانا نور حسن آرزو: چراغ حسن حسرت

پُرشارتھی : (۱۹۶۰ء): سات رنگ، کراچی: فروری، ۱۹۶۱ء

پُرشارتھی: دیوندر ستیارتھی

گاڑی بھر راستہ: دیوندر ستیارتھی کی ایک کہانی، اس کہانی میں بلراج مین را کا 'نقشہ' کھینچا گیا تھا — جن پتھ کافی ہاؤس میں کہانی سننے کے بعد مین رانے کہا تھا: ''نقشہ کھینچنا کیا مشکل ہے؟ کل میں بھی آپ کا نقشہ کھینچ کر لاؤں گا...! اور اگلے ہی روز مین را 'پرشارتھی' لے کر کافی ہاؤس میں پہنچ گیا تھا۔

اطلاعاً: دیوندر ستیارتھی کے بعد بلراج مین را دوسرا ادیب ہے جو کئی افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا موضوع بنا ہے؛ افسانہ نگاروں میں دیوندر ستیارتھی، انور عظیم، بلراج کومل، کیول سوری، فیاض رفعت، کنور سین، یوگیش گپت اور سریندر پرکاش شامل ہیں۔

— اور بقول اگر سین نارنگ، اگر بلراج مین را نہ ہوتا تو سریندر پرکاش کے لیے خام مواد اکٹھا کرنا اور کہانی لکھنا مشکل ہو جاتا...

رائٹرز گروپ: مخمور جالندھری مرحوم نے اس انجمن کی تشکیل کی تھی۔

یہ قربتیں، یہ دوریاں: دیوندر ستیارتھی کی ایک خوبصورت کہانی جو جواں مرگ مصور شیلیز مکرجی سے متعلق ہے اور اب تک غیر مطبوعہ ہے، کم از کم اُردو کی حد تک۔

کیول سوری: باقر مہدی کا سابق جگری دوست۔ کبھی چالو قسم کی کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ ایک اچھی کہانی، 'کرب اَنا کا'۔

ھوس: 'ہوس کی اولاد' ۱۹۵۹ء: 'سویرا'، لاہور (۱۹۶۰ء)

سحر: 'سویرا'، لاہور۔

مائی راماں: 'مائی تلساں': 'سویرا'، لاہور (۱۹۶۰ء)

چودھری: چودھری نذیر احمد مرحوم

رامے: حنیف رامے

جاگتی آنکھوں کا خواب: شمیم حنفی (۲۹/اگست ۱۹۸۱ء)

OO

کنفیوژن

میں جن دنوں دہلی گیا، منٹو کی ایک کہانی کا بڑا چرچا تھا — اس کا نام تھا 'ترقی پسند' — چرچا اس کا یوں تھا کہ منٹو نے وہ دیوندر ستیارتھی اور بیدی پر لکھی تھی۔ چونکہ بیدی میرے بہت نزدیک تھا، اس لیے پہلی فرصت میں میں نے منٹو کی وہ کہانی پڑھ ڈالی۔ کہانی میں جو قصہ درج تھا وہ مجھے معلوم تھا، کیونکہ بیدی مجھے بتا چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ لوک گیت لکھتے لکھتے ستیارتھی ایک دم افسانہ لکھنے لگا تھا۔ نئے ادیب یا شاعر کو اپنے افسانے یا شعر سنانے کا مرض ہوتا ہے۔ ستیارتھی کو بھی تھا۔ ہوسکتا ہے کہ دوسروں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہو۔ بہرحال وہ اپنے کنبے سمیت راجندر سنگھ بیدی کے ہاں مہمان ہو گئے اور صبح شام افسانے سنانے لگے۔

بیدی اس وقت پوسٹ آفس میں کلرک تھا اور لاہور چھاؤنی میں رہتا تھا۔ دو کمرے اس کے پاس تھے۔ جگہ زیادہ نہیں تھی، پھر ستیارتھی کی موجودگی میں خلوت کا میسر آنا بھی مشکل — بیدی تھکا ہارا شام کو گھر آتا تو ستیارتھی ایک افسانہ سنانے کے لیے تیار رہتے۔ سن کر نہ صرف رائے لیتے بلکہ تصحیح چاہتے۔ اسی میں رات کو دیر ہو جاتی۔ صبح اٹھتا تو اسے تصحیح شدہ افسانہ سننا پڑتا — مہینہ بھر ستیارتھی وہاں رہے اور بیدی اپنے بیوی بچوں سے بات کرنے کو ترس گیا۔ منٹو کی کہانی 'ترقی پسند' کا پلاٹ یہی ہے۔ صرف آخر میں منٹو نے ذرا افسانوی پیچ دے دیا ہے کہ ترپاٹھی ('ترقی پسند' میں ستیارتھی کا بدل) اپنے میزبان سے کچھ ایسا چمٹتا ہے اور اس کے وقت کا ہر لمحہ کچھ اس طرح لے لیتا ہے کہ وہ غریب اپنی بیوی سے پیار کرنے کے لیے بھی غسل خانہ ہی بہتر جگہ خیال کرتا ہے۔

کہانی اچھی ہے۔ اس میں چٹخارہ بھی ہے لیکن منٹو نے اس سے کہیں زیادہ اچھے افسانے لکھے ہیں۔ مجھے کہانی پڑھنے میں دلچسپ لگی۔ لیکن چونکہ بیدی کی ذاتی زندگی سے ایک واقعہ (بیدی کے منہ سے سنا ہوا) منٹو نے قلم بند کر دیا، اس لیے مجھے بُرا لگا۔ میرے خیال میں اسے لکھنے کا حق بیدی کو تھا۔ یا پھر منٹو کو بیدی سے کہہ دینا چاہیے تھا کہ دیکھو یار، میں اس واقعہ پر افسانہ لکھ رہا ہوں۔ تمھیں لکھنا ہو، تو میں نہ لکھوں، ورنہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن منٹو ایسے افسانہ نگار کو اتنا

صبر کہاں۔ خیال آیا تو اسے قلم بند کر دیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس ذاتی واقعہ کو لکھنے سے دو دو دوستوں میں شکر رنجی کی دیوار کھڑی ہو سکتی ہے۔

دوستوں کے درمیان دیوار نہ کھڑی ہوئی بلکہ انھوں نے منٹو کے خلاف ایک مشترکہ محاذ قائم کر لیا اور جس طرح منٹو نے اپنی کہانی میں بیدی اور ستیارتھی کے عادات واطوار، شکل وشباہت اور ذاتی زندگی کا مذاق اُڑایا تھا، اسی طرح ان دونوں نے مل کر ایک افسانہ لکھا اور منٹو کی ذاتی زندگی اور اس کی خامیوں کو اُجاگر کر دیا۔ کہانی ستیارتھی کے نام سے شائع ہوئی۔ انھوں نے ہی لکھی بھی تھی۔ بیدی نے اس پر نظرثانی کرتے ہوئے کچھ ایسے پتے لگائے کہ کہانی، جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، بے حد اچھی اُتری۔ نام ہے — نئے دیوتا۔

"اتنی بھی کیا خوشی ہے۔ میں سوچ رہا تھا، اتنا تو نفاست حسن (نئے دیوتا میں سعادت حسن کا بدل) پہلے بھی کما لیتا ہوگا۔ ڈیڑھ سو روپے کے لیے اس نے اپنی آزادی بیچ دی اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے۔ اس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں۔ پھر یہ نوکری اس نے کیسے کر لی — غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں، زندگی کی ہتک کی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بنتا رہتا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اس جالے میں پھنستے چلے جاتے ہیں — ان خیالات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جالے میں پھنس گیا اور اس خوشی میں یار دوستوں کو دعوت دے رہا ہے..."

اور یوں شروع کر کے نئے دیوتا کے لکھنے والوں نے نفاست حسن (یعنی سعادت حسن) کی حرکات وسکنات، عادات واطوار، سنکی پن، شراب نوشی، چڑچڑاہٹ، انانیت اور سنک، پرورش، جنس نگاری اور دوسری کمزوریوں کا کچھ ایسے لطیف پیرائے میں مذاق اُڑایا کہ منٹو بلبلا اُٹھا۔

نئے دیوتا کے شائع ہوتے ہی لاہور اور دلّی کے ادبی حلقوں میں ایک شور برپا ہو گیا۔ چونکہ منٹو اپنے اچھے سے اچھے دوست کی عزت کسی وقت بھی اُتار کر رکھ دیتا تھا اور اپنے سامنے کبھی کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا اس لیے یار دوستوں کو اچھا موقع ہاتھ آیا۔ دوست احباب جب اکٹھے ہوتے، کسی نہ کسی بہانے اس کہانی کا، یا ستیارتھی کا یا بیدی کا ذکر کر کے اسے چھیڑتے — منٹو اس کہانی کا ذکر آتے ہی کس طرح چڑ جاتا؛ دنیا جہان کا مذاق اُڑاتے ہوئے، مذاق کیے جانے پر کس طرح سیخ پا ہو جاتا، اس کا ایک واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے۔

لنچ کا وقت تھا، لوگ کھانا وغیرہ کھا کر کرشن کے کمرے میں اکٹھے ہوئے تھے۔ غپ ہو رہی تھی۔ کرشن اپنی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا سب کی سن رہا تھا۔ اس کے سامنے کی کرسی پر منٹو پاؤں اوپر

کیے، گھٹنوں کو بانہوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا۔ راشد، قدوس اور دوسرے پروگرام اسسٹنٹ منٹو کی کرسی کے گرد گھیرا بنائے کھڑے تھے (اختر الایمان اور میرا جی شاید اس وقت ریڈیو میں نہیں تھے، یا شاید تھے، مجھے یاد نہیں)۔ حفیظ جاوید نیچے دری پر دیوار سے پیٹھ لگائے، گھٹنے پر ٹانگ رکھے، ادھ لیٹے، ادھ بیٹھے، خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے۔ میں ذرا دیر سے پہنچا تھا۔ کمرے میں جگہ نہ تھی، اس لیے کونے میں پڑے ریکارڈوں کے اونچے چیسٹ پر ٹانگیں نیچے کو لٹکائے بیٹھ گیا تھا۔ تبھی جانے کس نے اور جانے کیسے ستیارتھی کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ نہایت گھٹیا افسانہ نگار ہے۔

دوسرے نے کاٹا: ''لیکن نئے دیوتا تو اس نے خوب کہانی لکھی ہے۔''

''واہ!'' کرشن نے سر اور دایاں ہاتھ ایک ساتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن اسی وقت اس کی نگاہیں منٹو سے چار ہوئیں جو ستیارتھی کا نام سنتے ہی چوکنا ہو بیٹھا تھا اور کرشن کا اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا اور نگاہیں پھر جھک گئیں۔

تب کسی نے (منٹو کو بتاتے ہوئے) کہا: ''ارے یار، ستیارتھی کیا کھا کر ویسا افسانہ لکھے گا، وہ تو بیدی کا لکھا ہوا ہے۔''

''بیدی کا تو نہیں۔'' تیسرے نے کہا، ''لکھا تو ستیارتھی ہی کا ہے۔ بیدی نے تو اس میں پتے لگائے ہیں اور کہانی دو آتشہ ہو کر نکلی ہے...''

''ہم نے سنا فیض کا بھی ہاتھ ہے...''

اس وقت منٹو نے پاؤں نیچے کیے اور سب کی آوازوں کو جیسے اپنی آواز کی کرختگی میں ڈبوتے اور اپنی بڑی بڑی آنکھیں جیسے گڑھوں سے نکالتے ہوئے کہا: ''بیدی اور فیض کیا اس میں تاثیر کا ہاتھ ہے۔ تبسم کا ہاتھ ہے۔ سنت سنگھ سیکھوں اور موہن سنگھ کا ہاتھ ہے، منٹو از این انسٹی ٹیوشن...''

تب مجھے نہ جانے کیا سوجھا۔ منٹو کو بات ختم کرنے کا موقع دیے بغیر میں نے کہا: ''اپنے بارے میں یار سب کو غلط فہمی ہوتی ہے۔ وہ شیام لال کپور تھانہ، گورو گھنٹال کا ایڈیٹر، وہ بھی اپنے آپ کو انسٹی ٹیوشن سمجھا کرتا تھا...''

میں نے شیام لال کا ذکر کیا تھا کہ دوستوں نے زور کا قہقہہ بلند کیا، لیکن اس سے پہلے کہ میں بات پوری کرتا یا قہقہہ خاموش ہوتا، منٹو جھنجھلا کر اُٹھا اور اس نے غصہ سے پاگل ہو کر دو تین غلیظ گالیوں کے ڈھیلے میری طرف پھینک دیے۔

اوپندر ناتھ اشک: 'منٹو میرا دُشمن'، ۵/اپریل ۱۹۵۵ء

۲۹ رجنوری، ۱۹۸۴ء: کافی ہاؤس، نئی دلی۔

دیوندر ستیارتھی: نئے دیوتا، ترقی پسند کا ردِ عمل نہیں تھی... اب آپ مانیں یا نہ مانیں، یہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں... ترقی پسند میں جو کہانی درج ہے، وہ بیدی نے منٹو کو بتائی تھی...

نئے دیوتا لکھنے کے بعد میں نے بیدی کو سنائی تھی؛ وہ چپ رہا تھا... ان دنوں محمد دین تاثیر بیمار تھے اور گھر پر ہی پڑے رہتے تھے؛ میں انھیں نئے دیوتا سنا رہا تھا کہ فیض آ گئے؛ انھوں نے بھی کہانی سنی اور 'ادبِ لطیف' کے سالنامے کے لیے رکھ لی... ہوا یوں تھا کہ میں بابا پیارے لال بیدی (فلم اسٹار کبیر بیدی کے والد) کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا؛ راجندر سنگھ بیدی سے پہلی ملاقات ہوئی تو اس نے مجھے اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی — اب کہتے ہوئے اچھا نہیں لگتا لیکن سچ یہ ہے کہ ان دنوں یہ تمام لوگ میرے نام سے مرعوب تھے — بیدی بہت کمزور آدمی تھا، ہنستا تک نہ تھا، اور مجھے مذہبی آدمی سمجھتا تھا — بات کرتے کرتے میں بھٹک جاتا اور کہیں کا کہیں پہنچ جاتا؛ اس دھرتی کے موسم، اس دھرتی کے رنگ، اس دھرتی کے باسی، میرے ہر اور کہانیاں تھیں۔ میری ہر بات پر بیدی کہتا 'یہ تو کہانی ہے...!' اور میں کہانی لکھ ڈالتا — ان دنوں میں نے بہت سی کہانیاں لکھیں اور بیدی کو سنائیں...

(ستیارتھی میرے/ ہمارے بزرگ دوست ہیں، بزرگ ہم سفر ہیں؛ ان کی بات پر شک کرنا مجھے دکھ دیتا ہے؛ میں ان کی بات مان لیتا ہوں کہ نئے دیوتا، ترقی پسند کا ردِ عمل نہیں تھی؛ منٹو ہی کی طرح انھوں نے اپنے قریب سے خام مواد چنا تھا اور کہانی لکھی تھی؛ اب اس کا کیا کیا جائے کہ نئے دیوتا اوپندر ناتھ اشک کے ھنگامہ خیز مضمون منٹو: میرا دشمن کی طرح ایک منصوبہ بند تحریر نظر آتی ہے — ب م)

OO

ترقی پسند

منٹو

جوگندر سنگھ کے افسانے جب مقبول ہونا شروع ہوئے تو اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بلائے اور ان کی دعوت کرے۔ اس کا خیال تھا کہ یوں اس کی شہرت اور مقبولیت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔

جوگندر سنگھ بڑا خوش فہم انسان تھا۔ مشہور ادیبوں اور شاعروں کو اپنے گھر بلا کر اور ان کی خاطر تواضع کرنے کے بعد جب وہ اپنی بیوی امرت کور کے پاس بیٹھتا تو کچھ دیر کے لیے بالکل بھول جاتا کہ اس کا کام ڈاک خانے میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ اپنی تین گزی پٹیالہ فیشن کی رنگی ہوئی پگڑی اُتار کر جب وہ ایک طرف رکھ دیتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کے لمبے لمبے کالے گیسوؤں کے نیچے جو چھوٹا سا سر چھپا ہوا ہے، اس میں ترقی پسند ادب کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس احساس سے اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب قسم کی اہمیت پیدا ہو جاتی اور وہ یہ سمجھتا کہ دنیا میں جس قدر افسانہ نگار اور ناول نویس موجود ہیں، سب کے سب اس کے ساتھ ایک نہایت ہی لطیف رشتے کے ذریعے منسلک ہیں۔

امرت کور کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اس کا خاوند لوگوں کو مدعو کرنے پر اس سے ہر بار یہ کیوں کہا کرتا ہے: ''امرت، یہ جو آج چائے پر آرہے ہیں، ہندوستان کے بڑے شاعر ہیں... سمجھیں؟ بہت بڑے شاعر... دیکھو ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر باقی نہ رہے...''

آنے والا کبھی ہندوستان کا بڑا شاعر ہوتا تھا یا بہت بڑا افسانہ نگار۔ اس سے کم پائے کا آدمی تو وہ کبھی بلاتا ہی نہیں تھا — دعوت میں اونچے اونچے سروں میں جو باتیں ہوتی تھیں، ان کا مطلب وہ آج تک نہ سمجھ سکی تھی۔ ان گفتگوؤں میں 'ترقی پسندی' کا ذکر عام ہوتا۔ اس 'ترقی پسندی' کا مطلب بھی امرت کور کو معلوم نہیں تھا۔

ایک دفعہ جوگندر سنگھ ایک بہت بڑے افسانہ نگار کو چائے پلا کر فارغ ہوا اور اندر رسوئی میں آ کر بیٹھا تو امرت کور نے پوچھا: ''یہ موئی ترقی پسندی کیا ہے؟''

جوگندر سنگھ نے پگڑی سمیت اپنے سر کو ایک خفیف سی جنبش دی اور کہا: ''ترقی پسندی...؟ اس کا مطلب تم فوراً ہی نہ سمجھ سکوگی۔ ترقی پسند اس کو کہتے ہیں جو ترقی پسند کرے۔ یہ لفظ فارسی کا ہے۔ انگریزی میں ترقی پسند کو ریڈیکل کہتے ہیں... وہ افسانہ نگار یعنی کہانیاں لکھنے والے جو افسانہ نگاری میں ترقی چاہتے ہیں، ان کو ترقی پسند افسانہ نگار کہتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں جن میں میرا نام بھی شامل ہے...''

جوگندر سنگھ عادتاً انگریزی لفظوں اور جملوں کے ذریعہ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کی یہ عادت پک کر اب طبیعت بن گئی تھی۔ چنانچہ اب بلا تکلف وہ ایک ایسی انگریزی زبان میں سوچتا تھا جو چند مشہور انگریزی ناول نویسوں کے اچھے اچھے چست فقروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ عام گفتگو میں وہ پچاس فیصد انگریزی الفاظ اور انگریزی کتابوں سے چنے ہوئے فقرے استعمال کرتا تھا۔ افلاطون کو وہ ہمیشہ پلیٹو کہتا تھا اور ارسطو کو ارسٹوٹل۔ سگمنڈ فرائیڈ، شوپنہار اور نطشے کا ذکر وہ اپنی ہر معرکے کی گفتگو میں کیا کرتا تھا — لیکن عام بات چیت میں وہ ان فلسفیوں کا نام نہیں لیتا تھا اور بیوی سے گفتگو کرتے وقت تو وہ اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ انگریزی لفظ اور یہ فلسفی اس کی گفتگو میں نہ آنے پائیں۔

جوگندر سنگھ سے جب اس کی بیوی نے 'ترقی پسندی' کا مطلب سمجھا تو اسے بہت مایوسی ہوئی، کیونکہ اس کا خیال تھا، 'ترقی پسندی' کوئی بہت بڑی چیز ہوگی جس پر بڑے بڑے شاعر اور افسانہ نگار اس کے خاوند کے ساتھ مل کر بحث کرتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اس نے یہ سوچا کہ ہندوستان میں صرف تین چار ترقی پسند افسانہ نگار ہیں تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ یہ چمک دیکھ کر جوگندر سنگھ کے مونچھوں بھرے ہونٹ ایک دبی دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ کپکپائے:

''امرت، تمھیں یہ سن کر بہت خوشی ہوگی کہ ہندوستان کا ایک بہت بڑا آدمی مجھ سے ملنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اس نے میرے افسانے پڑھے ہیں اور بہت پسند کیے ہیں...''

امرت کور نے پوچھا: ''یہ بڑا آدمی کون ہے؟ کیا آپ ہی کی طرح کہانیاں لکھنے والا ہے۔؟''

جوگندر سنگھ نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے اپنے دوسرے ہاتھ کی پشت پر تھپتھپاتے ہوئے کہا: ''یہ آدمی جو کوئی بھی ہے، افسانہ نگار ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی جو اس کی نہ مٹنے والی شہرت کا باعث ہے، کچھ اور ہی ہے...''

''اس کی خوبی کیا ہے؟''

''وہ ایک آوارہ گرد ہے!''

''آوارہ گرد؟''

''ہاں، وہ ایک آوارہ گرد ہے۔ اس نے آوارہ گردی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا ہے۔ وہ ہمیشہ گھومتا رہتا ہے، کبھی کشمیر کی ٹھنڈی وادیوں میں، کبھی ملتان کے تپتے ہوئے میدانوں میں، کبھی لنکا میں، کبھی تبت میں...''

امرت کور کی دلچسپی بڑھ گئی: ''مگر وہ کرتا کیا ہے؟''

''وہ گیت اکٹھے کرتا ہے... ہندوستان کے ہر صوبے کے گیت... پنجابی، گجراتی، مرہٹی، پشاوری، کشمیری، مارواڑی... ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں، ان کے جتنے گیت اس کو ملتے ہیں، وہ اکٹھے کر لیتا ہے...''

''اتنے گیت اکٹھے کر کے وہ ان کا کیا کرتا ہے؟''

''... کتابیں چھاپتا ہے، مضمون لکھتا ہے... تاکہ دوسرے بھی یہ گیت سن سکیں۔ انگریزی زبان کے کئی رسالوں میں اس کے مضمون چھپ چکے ہیں۔ گیت اکٹھے کرنا اور ان کو سلیقے کے ساتھ پیش کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے... وہ بہت بڑا آدمی ہے امرت، بہت بڑا آدمی! دیکھو، اس نے مجھے کیسا خط لکھا ہے!'' یہ کہہ کر جوگندر سنگھ نے اپنی بیوی کو وہ خط پڑھ کر سنایا جو ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے اس کو اپنے گاؤں سے بھیجا تھا۔

اس خط میں ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے بڑی میٹھی زبان میں جوگندر سنگھ کے افسانوں کی تعریف کی تھی اور لکھا تھا:

''آپ ہندوستان کے ترقی پسند افسانہ نگار ہیں...'' جب یہ فقرہ جوگندر نے پڑھا تو بول اُٹھا: ''او دیکھو ترپاٹھی صاحب بھی لکھتے ہیں کہ میں ترقی پسند ہوں...''

جوگندر سنگھ نے پورا خط سنانے کے بعد ایک دو سیکنڈ اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر اثر معلوم کرنے کے لیے پوچھا: ''کیوں...؟''

امرت کور اپنے خاوند کی تیز نگاہی کے باعث کچھ جھینپ سی گئی۔ پھر مسکرا کر کہنے لگی:

''... مجھے کیا معلوم؟ بڑے آدمیوں کی باتیں بڑے آدمی ہی سمجھ سکتے ہیں...''

جوگندر سنگھ نے اپنی بیوی کی اس ادا پر غور نہ کیا۔ وہ دراصل ہرندر ناتھ ترپاٹھی کو اپنے یہاں بلانے اور اسے اپنے یہاں کچھ دیر ٹھہرانے کی بابت سوچ رہا تھا: ''امرت، میں کہتا ہوں کہ ترپاٹھی صاحب کو دعوت دی جائے۔ کیا خیال ہے تمھارا، لیکن میں سوچتا ہوں، کیا پتا وہ انکار کر دے... بہت بڑا آدمی ہے نا، ممکن ہے، وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے۔''

ایسے موقعوں پر جوگندر سنگھ بیوی کو اپنے ساتھ شامل کر لیتا تھا کہ دعوت کا بوجھ دو آدمیوں میں بٹ جائے۔ چنانچہ جب اس نے 'ہماری' کہا تو امرت کور نے جو اپنے خاوند کی طرح بے حد

سادہ لوح تھی، ہرندرناتھ ترپاٹھی میں دلچسپی لینا شروع کردی حالانکہ اس کا نام بھی اس کے لیے ناقابل فہم تھا اور یہ بات بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ ایک آوارہ گرد گیت جمع کرکے کیسے بہت بڑا آدمی بن سکتا ہے؟ جب اس نے خاوند سے یہ سنا تھا کہ ہرندرناتھ ترپاٹھی گیت اکٹھے کرتا ہے تو اسے اپنے خاوند ہی کی ایک بات یاد آ گئی تھی کہ ولایت میں کچھ لوگ تیتریاں پکڑنے کا کام کرتے ہیں اور یوں کافی روپیا کماتے ہیں۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ شاید ترپاٹھی صاحب نے گیت جمع کرنے کا کام ولایت کے کسی آدمی سے سیکھا ہوگا۔

جوگندر سنگھ نے پھر اندیشہ ظاہر کیا: ''ممکن ہے، وہ ہماری اس دعوت کو خوشامد سمجھے۔''

''اس میں خوشامد کی کیا بات ہے... اور بھی تو کئی بڑے آدمی آپ کے پاس آتے ہیں... آپ ان کو خط لکھ دیجیے۔ میرا خیال ہے، وہ آپ کی دعوت ضرور قبول کرلیں گے۔ اور پھر ان کو بھی تو آپ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ ہاں، یہ تو بتایئے، کیا ان کے بیوی بچّے ہیں؟''

''بیوی بچّے... ؟'' جوگندر سنگھ اُٹھا اور ہرندرناتھ ترپاٹھی کو خط لکھنے کا مضمون انگریزی زبان میں سوچتے ہوئے بولا: ''ہوں گے، ضرور ہوں گے... ہاں، ان کے بیوی بچّے ہیں۔ میں نے ان کے ایک مضمون میں پڑھا تھا۔ ان کی بیوی بھی ہے اور ایک بچّی بھی ہے...''

خط کا مضمون جوگندر سنگھ کے دماغ میں مکمل ہو چکا تھا۔ دوسرے کمرے میں جاکر اس نے چھوٹے سائز کا پیڈ نکالا (جس پر وہ خاص آدمیوں کو خط لکھا کرتا تھا) اور ہرندرناتھ ترپاٹھی کے نام اُردو میں دعوت نامہ لکھا۔ یہ دعوت نامہ اس مضمون کا اُردو ترجمہ تھا جو اس نے اپنی بیوی سے گفتگو کرتے وقت انگریزی میں سوچا تھا۔

تیسرے روز ہرندرناتھ ترپاٹھی کا جواب آیا— جوگندر سنگھ نے دھڑکتے ہوئے دل سے لفافہ کھولا۔ جب اس نے پڑھا کہ اس کی دعوت قبول کرلی گئی ہے تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

امرت کور دھوپ میں چھوٹے بچے کے کیسوں میں دہی ڈال کر مل رہی تھی کہ جوگندر سنگھ لفافہ ہاتھ میں لیے اس کے پاس پہنچا: ''انھوں نے ہماری دعوت قبول کرلی ہے... کہتے ہیں، وہ لاہور یوں بھی ایک ضروری کام سے آرہے تھے۔ اپنی تازہ کتاب چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں... اور ہاں، انھوں نے تم کو پرنام لکھا ہے...''

امرت کور کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ اتنے بڑے آدمی نے جس کا کام گیت اکٹھے کرنا ہے، اس کو پرنام کہا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا بیاہ ایسے آدمی سے ہوا ہے جس کو ہندوستان کا ہر بڑا آدمی جانتا ہے۔

سردیوں کا موسم تھا۔ دسمبر کے پہلے دن تھے— جوگندر سنگھ صبح سات بجے بیدار ہو گیا لیکن

دیر تک بستر میں آنکھیں کھولے پڑا رہا۔ اس کی بیوی امرت کور اور اس کا بچہ، دونوں لحاف میں لپٹے ہوئے پاس والی چارپائی پر پڑے تھے۔ اس نے سوچنا شروع کیا: ترپاٹھی صاحب سے مل کر اسے کتنی خوشی حاصل ہوگی۔ خود ترپاٹھی صاحب کو بھی یقیناً اس سے مل کر بڑی مسرت ہوگی کیونکہ وہ ہندوستان کا جواں افکار افسانہ نویس اور ترقی پسند ادیب ہے۔ ترپاٹھی صاحب سے وہ ہر موضوع پر گفتگو کرے گا۔ گیتوں پر، دیہاتی بولیوں پر، افسانوں پر اور تازہ جنگی حالات پر۔ وہ ان کو بتائے گا کہ ایک کلرک ہونے پر بھی وہ کیسے اچھا افسانہ نگار بن گیا۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ڈاک خانے میں چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنے والا انسان طبعاً آرٹسٹ ہو...

جوگندر سنگھ کو اس بات پر بہت ناز تھا کہ ڈاک خانے میں مزدوروں کی طرح چھ سات گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی وہ اتنا وقت نکال لیتا ہے کہ ایک ماہانہ پرچہ بھی مرتب کرتا ہے اور دو تین پرچوں کے لیے ہر ماہ ایک ایک افسانہ بھی لکھتا ہے — دوستوں کو ہر ہفتے جو لمبے چوڑے خط لکھے جاتے تھے، ان کا ذکر الگ رہا۔

دیر تک وہ بستر میں لیٹا ہرندر ناتھ ترپاٹھی سے اپنی پہلی ملاقات کے لیے ذہنی تیاریاں کرتا رہا — جوگندر سنگھ نے اس کے افسانے اور مضمون پڑھ رکھے تھے۔ اس کا فوٹو بھی دیکھ رکھا تھا۔ کسی کے افسانے پڑھ کر اور فوٹو دیکھ کر وہ عام طور پر یہ محسوس کرتا تھا کہ اس نے اس آدمی کو اچھی طرح جان لیا ہے لیکن ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے معاملے میں اس کو اپنے اوپر اعتبار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہرندر ناتھ ترپاٹھی اس کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ جوگندر سنگھ کے افسانہ نگار دماغ میں بعض اوقات وہ ایک ایسے آدمی کی صورت میں پیش ہوتا جس نے کپڑوں کے بجائے اپنے جسم پر کاغذ لپیٹ رکھے ہوں۔ اور جب جوگندر سنگھ کاغذوں کے متعلق سوچتا تو اسے انارکلی کی وہ دیوار یاد آجاتی جس پر سینما کے اشتہار اوپر تلے اتنی تعداد میں چپکے ہوئے تھے کہ دیوار پر ایک اور دیوار بن گئی تھی — بستر پر لیٹا وہ دیر تک سوچتا رہا کہ اگر ہرندر ناتھ ترپاٹھی ایسا ہی آدمی نکل آیا تو اس کو سمجھنا بہت دشوار ہو جائے گا، مگر پھر اس کو اپنی ذہانت کا خیال آیا تو اس کی مشکلیں آسان ہو گئیں اور وہ اُٹھ کر ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے لکھا تھا کہ وہ خود جوگندر سنگھ کے مکان پر چلا آئے گا کیونکہ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکا ہے کہ اسے لاری سے سفر کرنا ہے یا ٹرین سے — جوگندر سنگھ کی حد تک تو یہ بات قطعی طور پر طے تھی کہ وہ سوموار کو چھٹی لے کر سارا دن اپنے مہمان کا انتظار کرے گا۔

نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر جوگندر سنگھ دیر تک رسوئی میں اپنی بیوی کے پاس بیٹھا رہا۔ دونوں نے چائے دیر سے پی تھی، اس خیال سے کہ شاید ترپاٹھی آجائے لیکن جب ترپاٹھی دیر تک

نہ آیا تو انھوں نے کیک وغیرہ سنبھال کر الماری میں رکھ دیے اور خالی چائے پی کر مہمان کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

جوگندر سنگھ رسوئی سے اُٹھ کر کمرے میں آیا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے داڑھی کے بالوں میں لوہے کے چھوٹے چھوٹے کلپ اٹکانے شروع کیے کہ بالوں کو جما سکے تو دروازے پر دستک ہوئی۔

ادھ کھلی داڑھی کے ساتھ، اسی حالت میں اس نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا۔ جیسا کہ اس کو معلوم تھا، سب سے پہلے اس کی نظر ہرندر ناتھ ترپاٹھی کی سیاہ گھنی داڑھی پر پڑی جو اس کی اپنی داڑھی سے بیس گنا بڑی تھی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

ہرندر ناتھ ترپاٹھی کے ہونٹوں پر جو بڑی بڑی مونچھوں کے اندر چھپے ہوئے تھے، مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس کی ایک آنکھ جو قدرے ٹیڑھی تھی، کچھ اور ٹیڑھی ہو گئی۔ اس نے اپنی لمبی لمبی زلفوں کو ایک طرف ہٹا کر اپنا ہاتھ جو کسی کسان کا ہاتھ معلوم ہوتا تھا، جوگندر سنگھ کی طرف بڑھایا۔

جوگندر سنگھ نے اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت محسوس کی۔ اس کا چرمی تھیلا دیکھا جو حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوا تھا۔ وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکا: ''ترپاٹھی صاحب، آپ سے مل کر مجھے بے حد خوشی حاصل ہوئی ہے...''

ہرندر ناتھ ترپاٹھی کو آئے پندرہ روز ہو چکے تھے — اس کی آمد کے تیسرے ہی روز اس کی بیوی اور بچی بھی آ گئی تھیں۔ دونوں ترپاٹھی کے ساتھ ہی گاؤں سے آئی تھیں مگر دو روز کے لیے مزنگ میں اپنے ایک دور کے رشتے دار کے پاس ٹھہر گئی تھیں اور چونکہ ترپاٹھی نے اس رشتہ دار کے پاس ان کا زیادہ دیر تک ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا تھا، اس لیے اس نے انھیں اپنے پاس یعنی جوگندر سنگھ کے یہاں بلوا لیا تھا۔

پہلے چار دن بڑی دلچسپ باتوں میں صرف ہوئے — ہرندر ناتھ ترپاٹھی سے اپنے افسانوں کی تعریف سن کر جوگندر سنگھ بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک مکمل افسانہ جو غیر مطبوعہ تھا، ترپاٹھی کو سنایا اور داد حاصل کی۔ دو نامکمل افسانے بھی سنائے جن کے متعلق ترپاٹھی نے اچھی رائے کا اظہار کیا — ترقی پسند ادب پر بحثیں ہوئیں، مختلف افسانہ نگاروں کی فنی کمزوریاں نکالی گئیں، نئی اور پرانی شاعری کا مقابلہ کیا گیا۔ غرضیکہ پہلے چار دن بڑی اچھی طرح گزرے اور جوگندر سنگھ اس کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی گفتگو کا انداز جس میں بیک وقت بچپنا اور بڑھاپا تھا، جوگندر سنگھ کو بہت پسند آیا۔ اس کی لمبی داڑھی جو اس کی اپنی داڑھی سے بیس گنا بڑی تھی، اس کے خیالات

پر چھا گئی۔ اس کی کالی زلفیں جن میں دیہاتی گیتوں کی روانی تھی، ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگیں — چٹھیوں کی دیکھ بھال کرنے کے دوران میں بھی ترپاٹھی کی یہ زلفیں اسے نہ بھولتیں۔

چار دن میں ترپاٹھی نے جوگندر سنگھ کو موہ لیا۔ وہ اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کی ٹیڑھی آنکھ بھی اس کو خوبصورت نظر آنے لگی بلکہ اس نے سوچا: اگر ان کی آنکھوں میں ٹیڑھا پن نہ ہوتا تو چہرے پر یہ بزرگی کبھی پیدا نہ ہوتی...

ترپاٹھی کے بڑے بڑے ہونٹ جب اس کی گھنی مونچھوں کے پیچھے ہلتے تو جوگندر سنگھ محسوس کرتا جیسے جھاڑیوں میں پرندے بول رہے ہیں — ترپاٹھی ہولے ہولے بولتا تھا۔ بولتے بولتے جب وہ اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتا، جوگندر سنگھ کے دل کو بہت راحت پہنچتی۔ وہ سمجھتا، اس کے دل پر پیار سے ہاتھ پھیرا جا رہا ہے۔

چار روز تک جوگندر سنگھ ایسی ہی فضا میں رہا — اسے اگر وہ اپنے کسی افسانے میں بیان کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا۔

پانچویں روز ایکا ایکی ہرندر ناتھ ترپاٹھی نے اپنا چرمی تھیلا کھولا، ڈھیروں افسانے نکالے اور جوگندر سنگھ کو سنانا شروع کر دیے — دس روز تک متواتر وہ افسانے سناتا رہا۔ اس دوران میں اس نے جوگندر سنگھ کو کئی کتابیں سنا دیں۔

جوگندر سنگھ تنگ آ گیا — اسے افسانوں سے نفرت ہو گئی۔ ترپاٹھی کا چرمی تھیلا جس کا پیٹ بنیوں کی توند کی طرح پھولا ہوا تھا، اس کے لیے ایک عذاب بن گیا — ہر روز شام کو ڈاک خانے سے لوٹتے ہوئے اس بات کا کھٹکا لگا رہتا کہ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے ترپاٹھی کا سامنا کرنا پڑے گا، اِدھر اُدھر کی چند باتیں ہوں گی، پھر وہ چرمی تھیلا کھولا جائے گا اور اسے ایک یا دو طویل افسانے سننے پڑیں گے...

جوگندر سنگھ ترقی پسند افسانہ نگار تھا۔ یہ ترقی پسندی اس کے اندر نہ ہوتی تو وہ صاف لفظوں میں ترپاٹھی سے کہہ دیتا: "بس بس، ترپاٹھی صاحب... بس بس، اب مجھے آپ کے افسانے سننے کی طاقت نہیں رہی..."

مگر وہ سوچتا: نہیں نہیں، میں ترقی پسند ہوں، مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے... دراصل یہ میری کمزوری ہے کہ اب اس کے افسانے مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ان میں ضرور کوئی نہ کوئی خوبی ہو گی... اس کے افسانے پہلے تو مجھے خوبیوں سے بھرے ہوئے نظر آتے تھے۔ میں... میں متعصب ہو گیا

ہوں...

ایک ہفتے سے زیادہ عرصے تک جوگندر سنگھ کے ترقی پسند دماغ میں یہ کشمکش جاری رہی۔ وہ سوچ سوچ کر اس حد تک پہنچ گیا جہاں سوچ وچار ہو ہی نہیں سکتا۔ طرح طرح کے خیال اس کے دماغ میں آتے مگر وہ ٹھیک طور پر ان کی جانچ پڑتال نہ کرسکتا۔ اس کی ذہنی افراتفری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی اور وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے ایک بہت بڑا مکان ہے جس میں بے شمار کھڑکیاں ہیں۔ اس مکان کے اندر وہ اکیلا ہے اور آندھی آ گئی ہے۔ کبھی اس کھڑکی کے پٹ بجتے ہیں کبھی اس کھڑکی کے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ اتنی کھڑکیوں کو ایک دم کیسے بند کرے۔

جب ترپاٹھی کو اس کے یہاں آئے بیس روز ہو گئے تو اسے بے چینی محسوس ہونے لگی— ترپاٹھی شام کو اسے نیا افسانہ سناتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے بہت سی مکھیاں اس کے کانوں کے پاس بھنبھنا رہی ہیں— وہ کسی اور ہی سوچ میں غرق ہو جاتا۔

ایک روز ترپاٹھی نے اسے اپنا ایک اور تازہ افسانہ سنایا جس میں کسی عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کا ذکر تھا— اس کے دل کو دھکا سا لگا: پورے اکیس دن میں اپنی بیوی کے پاس سونے کے بجائے ایک لم دڑھیل کے ساتھ ایک ہی لحاف میں سوتا رہا ہوں— اس احساس نے اس کے دل و دماغ میں ایک لمحہ کے لیے انقلاب پیدا کر دیا: یہ کیسا مہمان ہے کہ جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا ہے۔ ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اور... اور... اس کی بیوی... اس کی بچی... سارا گھر ہی اُٹھ کر چلا آیا ہے، ذرہ بھر بھی خیال نہیں کرتے کہ مجھ غریب کا کچومر نکل جائے گا... ڈاکخانہ کا ملازم، پچاس روپے ماہوار تنخواہ، آخر کب تک ان کی خاطر تواضع کرتا رہوں گا اور پھر افسانے کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتے... انسان ہوں، کوئی لوہے کا ٹرنک تو نہیں جو ہر روز اس کے افسانے سنتا رہوں... اور... اور کس قدر غضب ہے کہ میں بیوی کے پاس تک نہیں گیا... سردیوں کی راتیں ضائع ہو رہی ہیں...

اکیس دنوں کے بعد وہ ترپاٹھی کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے لگا۔ اب اس کو ترپاٹھی کی ہر چیز معیوب نظر آنے لگی۔ اس کی ٹیڑھی آنکھ جس میں جوگندر سنگھ پہلے خوبصورتی دیکھتا تھا، اب صرف ایک ٹیڑھی آنکھ تھی۔ اس کی کالی زلفوں میں بھی اب جوگندر سنگھ کو وہ ملائمی دکھائی نہیں دیتی تھی اور اس کی داڑھی دیکھ کر اب وہ سوچتا تھا کہ اتنی لمبی داڑھی رکھنا بہت بڑی حماقت ہے۔

جب ترپاٹھی کو اس کے یہاں پچیس دن ہو گئے تو ایک عجیب و غریب کیفیت اس کے اوپر طاری ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو اجنبی سمجھنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کبھی کسی جوگندر سنگھ کو جانتا تھا مگر اب وہ اسے نہیں جانتا۔ اپنی بیوی کے متعلق وہ سوچتا: جب ترپاٹھی چلا جائے گا تو سب

ٹھیک ہو جائے گا... میری نئے سرے سے شادی ہو گی... میں پھر اپنی بیوی کے ساتھ سو سکوں گا اور...

اس کے آگے جب وہ سوچتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور اس کے حلق میں کوئی تلخ سی چیز پھنس جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ دوڑا دوڑا اندر جائے اور امرت کور کو جو کبھی اس کی بیوی ہوا کرتی تھی، گلے سے لگا لے اور رونا شروع کر دے—مگر ایسا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی کیونکہ وہ ترقی پسند افسانہ نگار تھا۔

کبھی کبھی جوگندر سنگھ کے دل میں یہ خیال دودھ کے اُبال کی طرح اُٹھتا کہ ترقی پسندی کا لحاف جو اس نے اوڑھ رکھا ہے، اُتار پھینکے اور چلانا شروع کر دے: ترپاٹھی، ترقی پسندی کی ایسی کی تیسی... تم اور تمھارے اکٹھے کیے ہوئے گیت بکواس ہیں... مجھے اپنی بیوی چاہیے... تمھاری خواہشیں تو ساری کی ساری گیتوں میں جذب ہو چکی ہیں، میں ابھی نوجوان ہوں، میری حالت پر رحم کرو... ذرا غور تو کرو، میں جو ایک منٹ بھی اپنی بیوی کے بغیر نہیں سو سکتا تھا، پچیس دنوں سے تمھارے ساتھ ایک ہی لحاف میں سو رہا ہوں... کیا یہ ظلم نہیں...؟

جوگندر سنگھ بس کٹ کر رہ جاتا—ترپاٹھی اس کی حالت سے بے خبر ہر شام اسے تازہ افسانہ سناتا اور اس کے ساتھ لحاف میں سو جاتا۔

جب ایک مہینہ گزر گیا تو جوگندر سنگھ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا—موقع ڈھونڈ کر وہ غسل خانہ میں اپنی بیوی سے ملا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اور اس ڈر کے مارے کہ کہیں ترپاٹھی کی بیوی نہ آ جائے، اس نے جلدی سے بیوی کا بوسہ لیا جیسے ڈاک خانے میں لفافے پر مہر لگائی جاتی ہے اور کہا: ''آج رات تم جاگتی رہنا۔ میں ترپاٹھی سے یہ کہہ کر باہر جا رہا ہوں، رات کے ڈھائی بجے لوٹوں گا... لیکن میں جلدی آ جاؤں گا، بارہ بجے... بارہ بجے میں ہولے ہولے دستک دوں گا۔ تم چپکے سے دروازہ کھول دینا اور پھر ہم... ڈیوڑھی بالکل الگ تھلگ ہے لیکن تم احتیاط کے طور پر وہ دروازہ جو غسل خانے کی طرف کھلتا ہے، بند کر دینا...''

بیوی کو اچھی طرح سمجھا کر وہ ترپاٹھی کے پاس گیا اور اسے ڈھائی بجے لوٹنے کی اطلاع دے کر گھر سے باہر نکل گیا۔

بارہ بجنے میں چار سرد گھنٹے باقی تھے جن میں سے دو گھنٹے تو اس نے سائیکل پر ادھر ادھر گھومنے میں کاٹ دیے۔ اسے سردی کی شدت کا بالکل احساس نہ ہوا، اس لیے کہ بیوی سے میل کرنے کا خیال ہی کافی گرم تھا۔

دو گھنٹے سائیکل پر گھومنے کے بعد وہ اپنے مکان کے پاس والے میدان میں بیٹھ گیا۔ اس

نے محسوس کیا کہ وہ رومانی ہو گیا ہے۔ جب اس نے سرد رات کی دھندیالی خاموشی کا خیال کیا تو
اسے یہ خاموشی جانی پہچانی نظر آئی۔ ٹھٹھرے ہوئے آسمان پر تارے چمک رہے تھے جیسے پانی کی
موٹی موٹی بوندیں۔ انجن کی چیخ خاموشی کو توڑتی تو جوگندر سنگھ کا افسانہ نگار دماغ سوچتا کہ خاموشی
برف کا بہت بڑا ڈھیلا ہے اور انجن کی چیخ وہ میخ ہے جو خاموشی کے سینے میں کھب گئی ہے...

بہت دیر تک جوگندر سنگھ ایک نئے قسم کے رومان کو اپنے دل و دماغ میں پھیلاتا رہا اور رات
کی اندھیاری خوبصورتیوں کو گنتا رہا — ایکا ایکی چونک کر اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو بارہ بجنے
میں دو منٹ باقی تھے۔ اس نے گھر کا رُخ کیا اور دروازے پر ہولے سے دستک دی۔ پانچ سیکنڈ گزر
گئے، دروازہ نہیں کھلا۔ ایک بار پھر دستک دی۔

دروازہ کھلا۔ جوگندر سنگھ نے ہولے سے کہا: "امرت..." اور نظریں اُٹھا کر اس نے
دیکھا — امرت کور کے بجائے ترپاٹھی کھڑا تھا۔

اندھیرے میں جوگندر سنگھ کو ایسا معلوم ہوا جیسے ترپاٹھی کی داڑھی لمبی ہو گئی ہے اور زمین کو چھو
رہی ہے۔ اور پھر اس کو ترپاٹھی کی آواز سنائی دی: "تم جلدی آ گئے، چلو یہ بھی اچھا ہوا... میں نے
ابھی ابھی ایک افسانہ مکمل کیا ہے، آؤ سنو...!"

OO

Fraud : One who or that which is not what is purported.

ایک مکالمہ (دیوندر ستیارتھی کے ساتھ ایک دن):

اوپندر ناتھ اشک ہندی میں کہتے ہیں اور کہلواتے ہیں کہ اُردو میں ان کا درجہ منٹو، بیدی اور کرشن کے برابر ہے۔ یہ کہاں تک صحیح ہے؟

یہ غلط ہے۔ اشک کو اُردو میں اس طور پر کوئی نہیں جانتا!

اشک یہ بھی کہتے ہیں اور کہلواتے ہیں کہ ایک ہی موضوع پر لکھا گیا ان کا افسانہ اُبال منٹو کے افسانے بلاؤز سے بہتر ہے!

اُبال بہت معمولی افسانہ ہے اور بلاؤز کے ساتھ اس کا ذکر محض پروپیگنڈہ ہے!

OO

نئے دیوتا

دیوندر ستیارتھی

گاجر کے گرم حلوے کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک اُٹھا تھا اور اگر کسی دعوت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ہر کھانا نہایت سلیقے سے تیار کیا جائے اور معمولی معمولی چیز میں بھی ایک نیا ہی ذائقہ پیدا کر دیا جائے تو بلاشبہ دہلی کی وہ دعوت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

اتنی بھی کیا خوشی ہے— میں سوچ رہا تھا: اتنا تو نفاست حسن پہلے بھی کما لیتا ہوگا؟ ڈیڑھ سو روپے کے لیے اس نے اپنی آزادی بیچ دی، اور اب خوش ہو رہا ہے۔ وہ تو شروع ہی سے باغیانہ طبیعت کا آدمی مشہور ہے؛ اس کے افسانے ترقی پسند ادب میں نمایاں جگہ پاتے رہے ہیں؛ پھر یہ نوکری اس نے کیسے کر لی؟ غریبوں پر ظلم ڈھائے جاتے ہیں، زندگی کی ہتک کی جاتی ہے، سرمایہ دارانہ نظام مکڑی کی طرح برابر اپنا جالا بنتا رہتا ہے اور غریب کسان مزدور آپ سے آپ اِس جالے میں پھنستے چلے جاتے ہیں؛ ان خیالات کا مالک آج خود مکھی کی طرح اس جالے میں پھنس گیا اور خوشی میں یاروں دوستوں کو دعوت دے رہا ہے— مگر میں نے اپنے خیالات کا اثر چہرے پر ظاہر نہ ہونے دیا۔

دعوت میں کئی ادیب شریک تھے۔ میں سوچنے لگا: ہندوستان کی آزادی کے متعلق ان ہیٹ پہننے والے ادیبوں سے زیادہ مدد کی امید نہ رکھنی چاہیے اور براؤننگ کا یہ خیال کہ ''چند چاندی کے سکّوں کے عوض وہ ہمیں چھوڑ گیا!'' میرے ذہن میں پھیلتا چلا گیا: ان رجعت پسندوں کو یہ گمان کیسے ہو گیا کہ وہ ترقی پسند ادب کا چرچا کر کے سننے والوں کی آنکھوں میں دھول ڈال سکتے ہیں؟ کہاں ترقی اور آزادی کا حقیقی نصب العین اور کہاں یہ چاندی کی غلامی! نفاست حسن کے گورے چہرے پر ہنسی ناچ رہی تھی۔ سچ پوچھو تو یہ ہنسی مجھے بڑی بھیانک لگ رہی تھی۔

گاجر کا حلوا سچ مچ تھا بہت لذیذ اور میرے خیالات پر حاوی ہو رہا تھا— مقناطیس اتنا قریب ہو اور لوہ چون کے ذرے کھنچے نہ چلے آئیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مطلب یہ کہ اگر یہ حلوا

نہ ہوتا تو میں نے نفاست حسن کو اور بھی زیادہ تنقیدی زاویے سے دیکھا ہوتا۔

بہتوں کے ناموں سے میں ناآشنا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کئی چہرے میرے لیے نئے نہ تھے۔ خاص ناآشنا چہروں میں مولانا نور حسن آرزو کو تو اس سے پہلے میں نے کبھی فوٹو میں بھی نہ دیکھا تھا۔ ان کی آواز مجھے پیاری لگی۔ بہت جلد میں نے ان کی فصاحت کا لوہا مان لیا۔ یہ محسوس ہوتے بھی دیر نہ لگی کہ انھیں ایسی ایسی دلیلوں پر عبور حاصل ہے کہ موقع پڑنے پر وہ اپنے حریف کو گھاس کے تنکے کی طرح اپنی راہ سے اُڑا سکتے ہیں۔ عمر میں وہ کوئی بوڑھے نہ تھے، ادھیڑ ہی تھے اور نئے زمانے سے بس اتنا ہی رشتہ رکھتے تھے کہ سرکاری نوکری کی وجہ سے انھوں نے پاجامے اور شیروانی کو خیرباد کہہ کر انگریزی وضع کا سوٹ پہننا شروع کر دیا تھا۔

برف میں لگی ہوئی گنڈیریوں کے ڈھیر پر سب ادیب دوست بڑھ بڑھ کر ہاتھ مار رہے تھے۔ جونہی گنڈیری کا گلاب میں بسا ہوا رس حلق سے نیچے اُترتا، مولانا آرزو کی آنکھوں میں ایک نئی ہی چمک آ جاتی۔

اب جو میں نے دھیان دیا اور غور سے سنا تو پتا چلا، نفاست حسن کہہ رہا تھا: ''... یہ گنڈیریاں خاص طور پر مولانا کے لیے منگوائی گئی ہیں!''

''خوب...!'' مولانا بولے: ''اور گاجر کا حلوا بھی شاید میرے ہی لیے بنوایا گیا ہے...''

''جی ہاں...!'' نفاست حسن کی بیباک نگاہیں مولانا کی شوخ آنکھوں میں گڑ کر رہ گئیں۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اسے اپنے محکمے میں نوکری دلانے میں مولانا کا بہت ہاتھ تھا مگر نفاست حسن ایسا آدمی نہ تھا کہ احسان مندی کو تصور میں بھی لا سکے۔ اس کا خیال تھا کہ خود وقت کی کروٹ کی بدولت ہی وہ یہ نوکری حاصل کر سکا ہے، اور گاجر کا لذیذ حلوا اور گلاب میں بسی ہوئی گنڈیریاں مولانا کا احسان اُتارنے کے خیال سے ہرگز پیش نہیں کی گئی ہیں۔

مولانا ادھر بہت موٹے ہو گئے تھے۔ وہ حیران تھے کہ ہندوستان کے سب سے بڑے شہر میں لگاتار کئی سال گزارنے کے باوجود نفاست حسن نے اپنی بیٹھک میں ایک آدھ بڑی کرسی رکھنے کی ضرورت اب تک کیوں محسوس نہیں کی ہے۔ بڑھئیوں نے ابھی بڑی کرسیاں بنانا ترک تو نہیں کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نئے زمانے میں اب لوگ کبھی اتنے موٹے نہ ہوا کریں گے— اپنی گول گول گھومتی ہوئی آنکھیں انھوں نے میری طرف پھیر دیں اور میں نے دیکھا کہ ان میں غرور اور غم گلے مل رہے ہیں اور وہ بیتے وقتوں کو پھر سے واپس آتا دیکھنے کے لیے بےقرار ہو رہے ہیں۔

دھیرے دھیرے محفل چھدری ہوتی گئی۔ نئے دوست یہ خیال لے کر لوٹے کہ نفاست

حسن ایک نشاط پسند اور دوست نواز آدمی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ رسمی تکلفات کا کوئی بڑا حامی نہیں ہے۔ یہ بھی ٹھیک۔ دوستی ہونی چاہیے آزاد نظم سی، قافیہ اور ردیف کی قید سے آزاد۔

مولانا برابر جمے ہوئے تھے۔ مجھ سے مخاطب ہوکر بولے: "صاحب، سومرسٹ مام کا مطالعہ کیا ہے آپ نے؟"

انھوں نے یہ بات اس لہجے میں پوچھی تھی کہ مجھے گول مول جواب پر اُترنا پڑا: "صاحب، کہاں تک مطالعہ کیا جائے؟ اَن گنت کتابیں ہیں اور اَن گنت مصنف... خیر، اب میں سومرسٹ مام کا خیال بھی رکھوں گا..."

"تو یہ کہیے نا کہ آپ نے سومرسٹ مام کی کوئی کتاب نہیں پڑھی..."

میں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا: "جی ہاں، یہی سمجھ لیجیے!"

"تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ اب تک آپ نے یونہی عمر ضائع کی ہے..."

اس پر نفاست حسن بگڑ اٹھا۔ گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ پتا چلا کہ مولانا نے نفاست حسن کو چڑانے کے لیے سومرسٹ مام کا تذکرہ کیا تھا — ایک دن نفاست حسن نے یہی سوال مولانا سے کیا تھا، اور جب مولانا نے میری ہی طرح بات ٹالنی چاہی تھی تو وہ کہہ اٹھا تھا: "تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ اب تک آپ نے یوں ہی عمر ضائع کی ہے..."

ادھر مولانا نے انگریزی ادب سے ربط بڑھانا شروع کر رکھا تھا مگر نفاست حسن بدستور یہی سمجھتا تھا کہ یہ صرف ایک دکھاوا ہے اور انگریزی ادب کے نئے رجحانوں سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ جب بھی وہ ان کے ہاتھ میں کوئی انگریزی کتاب دیکھتا، اس کے ذہن میں طنز جاگ اُٹھتی جیسے سانپ کے سر میں زہر جاگ اٹھتا ہے: اس دکھاوے کی آخر کیا ضرورت ہے...؟ بیہودہ دکھاوا...! نیا رنگ تو سفید کپڑے ہی پر ٹھیک چڑھتا ہے!

مولانا بڑی سادہ اور پُر اثر زبان میں شعر کہتے تھے۔ مضامین بھی لکھتے تھے۔ افسانہ نگاری کے باب میں انھوں نے کوئی کوشش نہ کی تھی۔ ہاں جب کوئی واقعہ سناتے تو یہی گمان ہوتا کہ کوئی کہانی جنم لے رہی ہے، اور اگر اس وقت کوئی شخص ان کی تعریف کر دیتا تو وہ ان کی نگاہ میں بہت اونچا اُٹھ جاتا۔ داد پا کر ہی وہ داد دے سکتے ہوں، یہ بات نہ تھی۔ اکثر وہ 'معاوضے' کے بغیر بھی نوجوان ادیبوں کی پیٹھ ٹھونکتے رہتے تھے۔ ان کی یہ سرپرستانہ طبیعت نفاست حسن کے نزدیک وہ عیب تھا جس کی وجہ سے، جیسا کہ اس کا خیال تھا، نہ وہ پرانے دور کی نمائندگی کرنے میں کامیاب ہوئے تھے اور نہ نئے دور ہی سے رشتہ جوڑ سکے تھے۔

جب بھی نفاست حسن ان کے خلاف بس اُگلتا، مجھے یوں محسوس ہوتا: ادب کا نیا دورا پنے سے پہلے دور کی ہتک کر رہا ہے۔ یہ تو اپنی ہی ہتک ہے۔ سطحی طور پر اس کا گھناؤنا پن آنکھ سے کتنا ہی اوجھل رہے مگر جب یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ادب ایک ارتقائی چیز ہے تو کوئی بھی ادیب اپنا یہ وطیرہ جاری نہیں رکھ سکتا۔

ہاں، تو سومرسٹ مام والا مذاق نفاست حسن نہ سہار سکا۔ بولا: ''بس بس چپ رہیے، اتنی زبان مت کھولیے...''

نفاست حسن کی زبان پر رندہ چلنے کا گمان ہوتا تھا۔ مولانا نے قدرے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور بولے: ''اتنے گرم کیوں ہوتے ہو میاں؛ عمر ہی میں سہی، میں تمھارے والد کے برابر ہوں...''

''بس بس، یہ شفقت اپنے ہی پاس رکھیے۔ مجھے نہیں چاہیے یہ کمینی شفقت... یہ سرپرستانہ شفقت... بڑے آئے ہیں میرے والد...! اتنی زبان درازی!''

مولانا نے اب تک یہی سمجھا تھا کہ وہ مذاق ہی کی سرحد پر کھڑے ہیں لیکن معاملہ تو دوسرا ہی رنگ اختیار کر چکا تھا۔ ان کے چہرے پر غصے کی تہہ چڑھ گئی۔ بولے: ''ایک سرے سومرسٹ مام کی خاطر کیوں میری ہتک کرنے پر تلے ہو میاں...؟ کمبخت سومرسٹ مام...!

بات تو تو مَیں مَیں کی شکل اختیار کر گئی۔ مجھے تو یہی خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں دونوں ادیب ہاتھا پائی پر نہ اُتر آئیں۔

نفاست حسن اس دن میزبان تھا اور گھر پر آئے ہوئے کسی مہمان کی شان میں ہر طرح کی زبان درازی سے اسے پرہیز کرنا چاہیے تھا اور پھر یہ مہمان کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ اس کا ہمعصر ادیب تھا۔ عمر میں اس سے بڑا اور زبان دانی میں کہیں بڑھ کر۔ میں سوچنے لگا کہ سومرسٹ مام پر نفاست حسن اتنا کیوں فدا ہے؟ وہ بھی مولانا کی طرح ایک آدمی ہی تو ہے، کوئی فرشتہ نہیں ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ نفاست حسن کے کمرے میں پڑی ہوئی ہلکے بھورے رنگ کی ہر کرسی سے ہر لحاظ سے مولانا زیادہ قیمتی تھے۔ نفاست حسن اتنا گرم کیوں ہو گیا تھا؟ وہ شاید اپنے مہمان کو کرسی سے اُٹھا دینا چاہتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مولانا کی طنز ذرا تیکھی تھی مگر تھی تو آخر یہ طنز ہی۔ اور اس کا جواب اگر طنز ہی سے دیا جاتا تو اس قدر دلخراش مظاہرہ تو نہ ہوا ہوتا۔

سومرسٹ مام آخر کیا لکھتا ہو گا؟ کیا اسے اپنے وطن انگلستان میں بھی نفاست حسن جیسا کوئی عاشق زار نصیب ہوا ہو گا؟ تب مجھے یہ شک گزرا کہ نفاست حسن کے بہت سے جملے جنھیں وہ موقع

بے موقع نہایت شان سے اپنی گفتگو اور تحریر میں نگینوں کی طرح جڑنے میں ہوشیار سنار بن چکا ہے، ضرور ولایت کی کسی فیکٹری سے بن کر آئے ہیں، یہ نگینے اس کی اپنی تخلیق ہرگز نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ پہلے پہل کب سومرسٹ مام کے قلم نے اس پر جادو سا کر دیا تھا — اور کیا یہ جادو کبھی ختم بھی ہو جائے گا؟

ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا تھا: ''عورت کس وقت سندر لگتی ہے؟''

مجھے کوئی جواب نہ سوجھا تھا۔ میں نے کہا تھا: ''آپ ہی بتلایئے...''

وہ بولا تھا: ''ہاں تو سنو! جب وہ تین دن سے بخار میں مبتلا ہو... اور اس کے ہاتھوں کی رگیں نیلی پڑ جائیں، تب عورت کتنی سندر لگتی ہے، کتنی سندر!''

''آپ بھی دیوتا ہیں، میاں!''

اب میں نے سوچا، شاید یہ نگینہ بھی سومرسٹ مام کی فیکٹری سے بن کر آیا ہو۔

میں نے نفاست حسن کو مخاطب کر کے کہا: ''خفگی چھوڑو میاں! سومرسٹ مام تو ایک دیوتا ہے...''

وہ بولا: ''اور میں؟''

''آپ بھی دیوتا ہیں میاں!''

میں نے اسے بتایا کہ دیوتاؤں میں تین بڑے دیوتا ہیں: برہما، وشنو اور شو۔ اپنی اپنی جداگانہ اہمیت کے باعث وہ بے حد ممتاز بن گئے ہیں۔ برہما جنم دیتا ہے، وشنو پرورش کرتا ہے اور شو ٹھہرا موت کا ناچ ناچنے والا، نٹ راج!

نفاست حسن کا دھیان ادھر میری طرف کھنچ گیا، ادھر مولانا کی آنکھوں میں غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب وہ میری بات میں دلچسپی لے رہے تھے۔ میں نے بتایا کہ ہر ادیب مختلف وقتوں میں برہما، وشنو اور شو ہوتا ہے۔ جب ایک شخص ایک چیز لکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، میں اسے برہما کہنا پسند کروں گا۔ وہ جب اس چیز کو سنبھال سنبھال کر رکھتا ہے، ہر ممکن اصلاح کرتا ہے، اس وقت وہ وشنو کا ہم پلّہ ہوتا ہے۔ اور جب وہ اپنے ہی ہاتھ سے کسی تحریر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے، وہ سو فیصدی شو کا رُوپ دھار لیتا ہے۔

مولانا بولے: ''بہت خوب! آپ کا تخیل مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔''

میں نے جھٹ سے کہا: ''میرا تخیل؟ نہیں مولانا نہیں، یہ میرا تخیل نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ یہ میرا طبع زاد خیال نہیں ہے...''

''تو کس کا خیال پیش کر رہے ہیں آپ؟''

''بمبئی کی پی. ای. این. سوسائٹی میں بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو نے میری تقریر کے بعد صدارتی تقریر کرتے ہوئے یہ خیال پیش کیا تھا...''

''بہت خوب...! تو بلبلِ ہند نے آپ کی تقریر کی صدارت کی تھی...! ہاں، تو اب کوئی طبع زاد خیال سنائیے...!''

''طبع زاد...؟ طبع زاد کی بھی خوب کہی! مجھے تو سرے سے یہی شک ہو رہا ہے کہ طبع زاد نام کی کوئی چیز ہوتی بھی ہے یا نہیں؟''

نفاست حسن بوکھلایا: ''کیا کہہ رہے ہو میاں؟ سنیے میں ایک خیال پیش کرتا ہوں: جونہی صبح کی پہلی کرن آنکھیں ملتی ہوئی دھرتی پر اُتری، پاس کی کچی دیوار انگڑائی لے رہی تھی!''

مولانا نے حیرت سے کہا: ''دیوار انگڑائی لے رہی تھی؟''

میں نے بیچ بچاؤ کرتے ہوئے کہا: ''اس وقت نفاست حسن ایک برہما ہیں، مولانا!''

''برہما؟''

''جی ہاں، برہما... اور نہ جانے کب تک وہ وِشنو بنے ہوئے یہ خیال سنبھال کر رکھیں گے... اور پھر ایک دن وہ شِو بن جائیں گے اور خود اپنے ہاتھوں سے اس خیال کا گلا گھونٹ ڈالیں گے۔ انھیں خود اپنی تخلیق پر ہنسی آئے گی... صرف ہنسی، اس دھیان سے کہ ان کا خیال سو فیصدی طبع زاد خیال نہیں ہے... اور اگر یہ سچ مچ ان کا سو فیصدی طبع زاد خیال ہے، تب بھی انھیں شرم آئے گی...''

نفاست حسن چاہتا تو جھٹ میرے خیال کی تردید کر دیتا مگر وہ چپ بیٹھا رہا۔ شاید وہ کچھ جھینپ سا گیا تھا، اور اپنے کمتری کے جذبے کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

مولانا بولے: ''برہما، وِشنو اور شِو کے متعلق آج میں کچھ اور بھی سننا چاہتا ہوں...''

میں نے کہا: ''سنیے... وِشنو اور شِو کے ہزاروں مندر ہیں لیکن برہما کا ایک بھی مندر نہیں ہے کہیں...''

''برہما کا ایک بھی مندر نہیں؟''

''جی نہیں! سنیے تو بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ ایک بار وِشنو اور برہما میں یہ مقابلہ ہو گیا کہ کون پہلے شِولنگ کی گہرائی اور اونچائی کا پتا لا سکتا ہے۔ وِشنو جڑ کی طرف چل پڑا اور برہما چوٹی کی طرف۔ برہما اوپر چڑھتا گیا مگر شِولنگ کی چوٹی کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اوپر سے چنبیلی کا ایک پھول

گرتا ہوا آ رہا تھا۔ برہما نے پوچھا: 'کدھر سے آ تا ہوا؟' پھول بولا: 'شولنگ کی چوٹی سے۔' برہما نے پوچھا: 'کتنی دور ہے چوٹی؟' پھول نے کہا: 'دور بہت دور... ' برہما چنبیلی کے ہمراہ واپس ہوا۔ راستے میں اس نے پھول کو اتنا سا جھوٹ بولنے کے لیے رضامند کرلیا کہ وہ وشنو کے سامنے کہہ دے کہ وہ دونوں شولنگ کی چوٹی سے آ رہے ہیں۔ مگر شو تو ٹھہرا انتریامی۔ برہما اور چنبیلی کو بڑی بھاری سزا دی گئی... رہتی دنیا تک برہما کا کہیں مندر نہ بنے گا، چنبیلی کسی مندر میں پوجا میں نہ چڑھائی جائے گی...''

نفاست حسن بولا: ''مگر یہ تو نیا زمانہ ہے۔ اب تو شاید برہما کا بھی مندر بن جائے کہیں۔ اور میرا یقین ہے کہ اگر برہما پر کوئی پھول چڑھے گا تو وہ بلاشبہ چنبیلی کا پھول ہی ہوگا...''

نفاست حسن نے یقیناً اس وقت یہی سوچا ہوگا کہ وہ ایک برہما ہی ہے کیونکہ اس کے پبلشر نے اس کے افسانوں کا ضخیم مجموعہ شائع کرنے سے ابھی تک گریز ہی کیا ہے مگر جونہی اس کی کتاب شائع ہوگی، اس کی شہرت کا حقیقی مندر تعمیر ہوتے دیر نہ لگے گی، اور اس مندر میں چنبیلی کے پھول ہی چڑھائے جائیں گے...

نفاست حسن کو اپنے متعلق جو غلط فہمیاں تھیں، ان کو رکھنے میں اس کے دو چار گہرے دوستوں کا بھی ہاتھ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اوشا کے گھونگھٹ کھولنے سے پہلے کی ساری سیاہی اور سرخی، اندھیارے اور اُجالے کی گنگا جمنی سرگوشیاں، اس کی طبع میں بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ اور اگر اس نے شروع میں روسی افسانوں کے ترجموں میں اپنی اُٹھتی جوانی کا زور لگانے کے بجائے طبع زاد افسانے لکھنے میں سرگرمی دکھائی ہوتی تو آج اس کا نام صف اوّل کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں شمار ہوتا۔ اگر یہ سو فیصدی طبع زاد افسانہ نگار سو فیصدی وسیلہ ساز بھی ہو گیا ہوتا تو یقیناً وہ ہندوستان بھر کے افسانوی ادب کی چوٹی پر نظر آئے گا۔

ایک بار دوستوں نے اسے بتایا تھا کہ وہ بڑا صاف گو ہے، چنانچہ سپنوں میں بھی یہ خیال اس کا تعاقب کرنے لگا کہ واقعی وہ بڑا صاف گو ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو سو فیصدی طبع زاد افسانہ نگار کو زندگی کے مطالعے میں حقیقی مدد دے سکتی ہے۔ جب اس نوکری کے لیے اس نے درخواست بھیجی تو اس سے پوچھا گیا کہ اس نے کس مضمون میں اپنا علم پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے، بلا جھجک اس نے لکھ بھیجا کہ اس نے اپنی بیشتر زندگی بیسواؤں کا مطالعہ کرنے میں گزاری ہے۔ گو اس صاف گوئی سے کہیں زیادہ کسی کی سفارش ہی نے اسے یہ نوکری دلائی تھی مگر وہ برابر نئے ملنے والوں کے روبرو اپنی صاف گوئی کا ذکر بڑے فخر سے کیا کرتا۔ صاف گوئی، سو فیصدی صاف گوئی! میں نے

سوچا: شاید اس صاف گوئی کی سرحد نے ابھی گھر کی دیواروں تک پاؤں نہ پھیلائے ہوں گے۔ گھر میں آ کر تو اکثر بڑے بڑے ترقی پسند ادیب بھیگی بلّی بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ اس کی ترقی پسندی بڑی حد تک عریاں جنسی بیان سے گھری رہتی تھی مگر کچھ عرصے سے اس کے ذہن میں یہ وہم سما گیا تھا کہ وہ کسی بھی جاندار یا بے جان شے کے گرد اپنے افسانے کو گھما سکتا ہے۔ اپنے ایک افسانے میں اس نے ایک پتھر کی سرگذشت بیان کی تھی جو ایکا ایکی کسی کنواری کی اُٹھتی مچلتی ہوئی چھاتی سے ٹکرانے کے لیے بے قرار ہو اٹھا تھا۔ آدمی بدستور آدمی ہے۔ مگر پتھر اب پتھر نہیں ہے۔ یہ بات اس نے بڑی گہرائی سے لکھی تھی۔ نفسیات کی سرحدیں اب سکڑی نہ رہیں گی۔ پتھر اب پتھر ہی نہیں ہے، نہ بجلی کا کھمبا بجلی کا کھمبا ہی۔ وہ چاہتا تو اپنے سگریٹ کیس میں بھی دل ڈال دیتا اور اس کے گرد نفسیات کا باریک جال بن دیتا۔

اس کی زبان نہ بہت مشکل تھی نہ بہت آسان۔ یہاں وہاں نئی نئی تشبیہیں بھی حاضر رہتی تھیں۔ ابھی اسے کسی کا پھولا ہوا تھیلا دیکھ کر حاملہ عورت کے پیٹ کا دھیان آ گیا ہے تو ابھی کسی کی ذہنی کمزوری اسے اس دوشیزہ سی نظر آئی جو آندھی میں اپنی ساری سنبھالنے سے قاصر ہو۔ کسی کے بول سوڈے کے بلبلے تھے تو کسی کی ناک چینی کی پیالی کی ٹھونٹھی جیسی۔

شام ہو چلی تھی۔ نفاست حسن اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتا ہوا چھجے پر آ گیا۔ نکلسن روڈ پر قریب ہی کے ٹیلر ماسٹر کی دکان کے برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ چھجے پر کھڑا نفاست حسن پلٹتے ہوئے بولا: ''مولانا، چلو لگے ہاتھوں سردار جی ہی سے ملتے آئیں...!''

میں حیرانی سے دُبکا بیٹھا تھا۔ میں نے سوچا، یہ سردار جی کون ہیں جن سے ملنے کے لیے نفاست حسن اتنا مشتاق نظر آتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ صرف اپنے فرق برائے فرق کے نظریہ کے مطابق ہی مجھ سے بھی لمبی داڑھی والے کسی شخص سے ملنا چاہتا ہے حالانکہ خود اس کے چہرے پر داڑھی تو داڑھی، مونچھ تک کا نشان ہر دوسرے تیسرے دن مونڈ دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بھی اس نے ایک ادیب کی مونچھوں کو محض اس لیے پسند کیا تھا کہ وہ مونچھیں مولانا نے ناپسند کی تھیں۔ اگر مولانا نے ان مونچھوں کی تعریف میں ایک آدھ بات کہہ دی ہوتی تو اس نے کہا ہوتا: ''مولانا، آپ کی اندھادھند پسند کی تو حد ہو چکی ہے، لاحول ولاقوۃ... آپ نے بھی آدمیوں میں خوب آدمی چنا...''

یہ سردار جی کون ہیں؟ یہ سوال میرے ذہن میں پھیلتا چلا گیا۔ ان سے متعارف ہونے کی

میری خواہش دیکھ کر نفاست حسن نے مجھے بھی اپنے ہمراہ لے لیا۔ وہ ایک عجیب مستی کے عالم میں سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا۔ اپنے پاؤں کو وہ ضرورت سے زیادہ زور سے زمین پر پھینکتا تھا اور پھٹ پھٹ کی آواز سے شور پیدا کرتا ہوا پڑوسیوں کے آرام میں مخل ہو رہا تھا۔ اس قسم کی حرکت کو وہ آزادی تصور کرتا تھا اور اسے کسی قیمت پر بھی کھونے کو تیار نہ تھا۔

ایک بڑے لمبے چوڑے بازار میں گھومتے گھامتے ہم آخر سردار جی کی دکان پر پہنچ گئے۔ پتا چلا کہ نفاست حسن اسم با مسمّٰی ہے کیونکہ شراب کی دکان جہاں اس نے سردار جی سے ملاقات کا وقت مقرر کیا تھا، سخت بدبودار جگہ تھی۔ میز پر سنگ مرمر کی سلوں پر سوڈا اور وہسکی جمی ہوئی تھی اور ہماری نشست گاہ کے قریب ہی ٹوٹے ہوئے آبخوروں کا انبار لگا ہوا تھا۔ بغل میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ٹانگیں ایک بوسیدہ الماری کے اوپر ٹکائے، منہ پوری طرح کھولے بیہوش پڑا تھا۔ آبخوروں کے اتنا قریب ہونے کی وجہ سے اس کا کھلا ہوا منہ ایک آبخورہ ہی تو دکھائی دیتا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے مجھے گمان ہوا کہ نفاست حسن اسی شخص سے ملنے آیا ہے، گویا اپنے آپ سے، اپنے سندر نام سے انصاف کرنے آیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد نفاست حسن نے اپنی کرخت آواز میں، جس سے ہمیشہ کی طرح خواہ مخواہ رندہ چلنے کا گمان ہوتا تھا، پکارا: ''او میاں جماں... !لاؤ تو سردار جی کو... !''

میاں جماں ایک جھاڑن سے بوتل صاف کر رہا تھا۔ دن کے وقت وہ اسی جھاڑن سے سڑک پر سے اُڑ کر آنے والی گرد کو شیشوں میں پڑی ہوئی پیسٹری پر جھاڑا کرتا تھا، یا آبخوروں کے درمیان تنے ہوئے جالوں کو صاف کرتا رہتا تھا— کچھ دیر بعد جماں نے وہسکی کی ایک بوتل اور سوڈے کی دو بوتلیں میز پر لا رکھیں۔

مجھے سردار جی کی شخصیت سے واقف ہوتے دیر نہ لگی مگر میں بدستور افسانوں کی دنیا میں گھوم رہا تھا۔ پھر میں نے بے محل ہی نفاست حسن سے پوچھا: ''آپ کے افسانوں کی تعداد تو خاصی ہوگئی ہوگی؟''

اس وقت تک وہ سوڈا اور وہسکی دونوں کو ملا چکا تھا۔ میں نے سردار جی سے متعارف ہونے سے انکار کر دیا تو اس نے اور مولانا نے گلاس ٹکرائے اور اپنے منہ سے لگا لیے۔ ایک گھونٹ حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے نفاست حسن بولا: ''میں افسانے وغیرہ کبھی اکٹھے نہیں کرتا۔ میرے افسانے کبوتر کے بچّے ہیں، جنھیں میں لکھتا ہوں۔ میں کہتا ہوں: او کبوتر کے بچّو! اُڑ جاؤ اور وہ اُڑ جاتے ہیں...''

اس تشبیہ کے انداز کی میں نے بہت تعریف کی۔ سچ پوچھو تو اس وقت میرے ذہن میں

آئین اسٹائن کا نظریۂ اضافیت نمایاں ہو گیا تھا۔ ہر چیز کو دوسری چیز سے نسبت ہے۔ افسانے کو کبوتر کے بچے سے، فاحشہ عورت کی مسکراہٹ کو بدرو میں پھٹتے ہوئے بلبلے سے، صبح کی پہلی کرن کو انگڑائی لیتی ہوئی دیوار سے، نفاست حسن کو چرخے سے...

اس وقت میں نے سوچا کہ یہ تشبیہیں، نادر اور دور از کار تشبیہیں، اس عظیم الشان ادیب کے دماغ میں پیدا کہاں سے ہوتی ہیں؟ پھر مجھے فوراً ہی خیال آیا، یہ تو ایک سیدھا سادہ سائمل ہے۔ خود نفاست حسن نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ اسے قبض کی شکایت کبھی نہیں ہوتی۔ بعض مصنف تو سخت قبض میں مبتلا نظر آتے ہیں، بے چارے بہت زور لگا کر لکھتے ہیں۔ میں نے سوچا، نفاست حسن ہر روز رات کو دودھ کے ساتھ اطریفل زمانی کھاتا ہے اور وہ پتھر، بلبلے، رگھبیر پہلوان، کتاب، میز، کرسی، قلم، دوات، ہر چیز پر لکھ کر ان کے مجموعوں کے نام دوڑو، بھاگو، رووٴ، پیٹو رکھ سکتا ہے — میں بہت دیر تک ان افسانوں کی دنیا میں نہ رہ سکا۔ اس وقت تک دونوں ادیب وہسکی کی بوتل آدھی کے لگ بھگ ختم کر چکے تھے۔ معاً ان کے خیال میں قسم قسم کی شراب کو ملا کر پینے کی دھن سمائی چنانچہ میاں جماں نے بہت سی بوتلوں سے ایک ایک پیگ بنایا، پھر ایک بوتل میں یہ سب جمع کر کے ان کے سامنے بوتل رکھ دی — مولانا شراب میں اپنے آپ کو گھور رہے تھے، شاید انھوں نے اسی لیے نفاست حسن کی ادبی جولانیوں کو سراہنا چاہا۔ ملی جلی شرابوں کا پیگ حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے انھوں نے نفاست حسن کو ایک تھپکی دی اور بولے: ''شاباش برخوردار! لکھے جاؤ...''

نفاست حسن جو سردار جی کے مکان کی فضا سے بہت مانوس تھا اور جو بغیر بوکھلائے بہت سے پیگ پی سکتا تھا، بولا: ''بس بس مولانا! یہی ایک بات ہے جو مجھے سرے سے ناپسند ہے۔ اس بیہودہ سرپرستی کی مجھے چنداں ضرورت نہیں۔ آپ کی مدح و ذم کی مجھے مطلق پروا نہیں۔ سمجھے آپ؟ اگر آپ نے میرے افسانے پڑھے ہیں تو اس سے میرا کچھ سنور نہیں گیا، اگر نہیں پڑھے ہیں تو میرا کچھ بگڑ نہیں گیا...''

مولانا کو اس بے جا گفتگو سے سخت حیرت ہوئی۔ اپنے میزبان کے کندھے تھپکتے ہوئے بولے: ''برخوردار! اگر تم افسانہ نگاری کے بجائے مٹی کا تیل بھی بیچا کرتے تب بھی میرے دل میں تمھاری ایسی ہی عزت ہوتی...''

دونوں ادیب آپس میں سنجیدگی سے گفتگو کر رہے تھے مگر میں اس ماحول میں بوکھلا سا گیا۔ پھر مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں شراب پی رہا ہوں... وہ دونوں تو پرہیزگار ہیں۔

ایک اور پیگ حلق سے نیچے اُتارنے کے بعد نفاست حسن نے پاپڑ کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالا اور

کہا: ''مولانا میں لکھنا چاہتا ہوں... بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں... کبھی کسی چیز سے میری تسلی نہیں ہوتی...''

ابھی نفاست حسن نے گفتگو ختم بھی نہ کی تھی کہ مجھے خیال آیا کہ تسلی کیسے ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے افسانے تو کبوتر کے بچے ہیں اور جب تک وہ کبوتر کے بچے رہیں گے، وہ پھر اُڑ جائیں گے، آخر نفاست حسن نے کوئی چھتنارا بھی تو قائم نہیں کیا ہے کہ وہ اسی پر کبھی کبھی آ کر بیٹھ جایا کریں اور اپنے گذشتہ مالک کو دیکھ لیا کریں... وہ بیچارے تو بے شمار آوارہ روحوں کی طرح ایک لایعنی آسمان میں پر پھڑ پھڑاتے پھرتے ہیں...

نفاست حسن اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا: ''بس ایک چیز لکھ لوں، ایک چیز، تو میری تسلی ہو جائے گی۔ اس کے بعد میں مر بھی جاؤں تو کوئی غم نہیں کہ میں نے زندگی میں ایک بڑا کام تو کر لیا ہے...''

مولانا کے اور میرے حقیقی اور قیاسی نشے ہرن ہو گئے۔ ہماری دونوں کی توجہ اس افسانے کا پلاٹ سننے کے لیے نفاست حسن کے پتلے اور نحیف چہرے کی طرف اُٹھ گئی۔

نفاست حسن بولا: ''میں ان دنوں بمبئی میں رہتا تھا۔ میرے کمرے اور غسل خانے کے درمیان ایک بند دروازہ تھا... اس بند دروازے میں ایک درز تھی۔ بس، اسی درز سے میں کنواری لڑکیوں کو بھی نہاتے ہوئے دیکھتا تھا اور ادھیڑ عمر کی اور بوڑھی عورتوں کو بھی... اس کے علاوہ جوان مردوں کو بھی... آہ! انسان غسل خانے میں جو حرکتیں کرتا ہے، وہ...''

میں اس کی بات سمجھ نہ سکا، لیکن میرے سامنے آئین اسٹائین کا نظریۂ اضافیت تھا، اس لیے میں نے چنداں پروا نہ کی اور سنتا چلا گیا۔ نفاست حسن بولا: ''بس غسل خانے میں نہانے والیوں اور نہانے والوں کے متعلق میں لکھ کر مر جاؤں تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوگا... اس افسانے کا نام رکھوں گا: ایک درز میں سے...!''

نفاست حسن کی اس بات پر مجھے بہت ہنسی آئی: اگر میں نفاست حسن کا تذکرہ لکھ کر مر جاؤں تو زندگی میں کوئی حسرت نہ رہے گی۔

مولانا جو نفاست حسن کی 'بے تکیوں' کو بڑے غور سے سن رہے تھے، کچھ نہ بولے۔

نہ جانے نفاست حسن کو کیوں محسوس ہوا کہ اس نے مولانا کی ہتک کی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا دایاں گال مولانا کے سامنے پیش کیا۔ مولانا نے تبرکاً ایک بوسہ لے لیا۔ اس کے بعد نفاست حسن نے بایاں گال پیش کیا۔ مولانا کے نزدیک اب تبرک کا مسئلہ نہیں رہا تھا

لیکن انھوں نے بوسہ پھر لیا۔

میں ان کی باہمی لڑائی کا منتظر تھا لیکن اچانک مولانا نے اُٹھ کر بڑے خلوص سے چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''دیکھو بھائی، اب تم مانو گے کہ میں سومرسٹ مام ہوں... ''

نفاست حسن نے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''میں سومرسٹ مام ہوں... ''

مولانا نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے: ''میں سومرسٹ مام ہوں... '' پھر نفاست حسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: ''تم سومرسٹ مام ہو... ہم دونوں سومرسٹ مام ہیں... جو ہے سومرسٹ مام ہے، جو نہیں ہے وہ بھی سومرسٹ مام ہے... سومرسٹ مام بھی سومرسٹ مام ہے...!

OO

آخری لفظ

منوں مٹی کے نیچے پہنچتے ہی منٹو نے پھر سوچا کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا۔

خدا نے منٹو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: ''وہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' تم نے لکھا ہے؟''

منٹو نے کہا: ''لکھا ہے تو کیا ہوا...؟ اگر تم سے بیالیس برس آٹھ مہینے اور سات دن ادھار لیے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم میری کہانی کے اچھے ناقد بھی ہو سکتے ہو... ہٹا دیہ اپنا ہاتھ۔''

خدا کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ آئی۔ اس نے منٹو کے کندھے پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا: ''جا تیرے سب گناہ معاف کیے۔'' اور پلٹ کر چلا گیا۔

چند لمحوں کے لیے منٹو بالکل خاموش رہا۔ وہ اس تعریف سے بالکل خوش نہ ہوا۔ وہ بیزار رنجیدہ اور ملول اور خفا خفا سا نظر آنے لگا: ''— کیا سمجھتا ھے؟ مجھے ہراساں کرتا ھے... اس نے مجھے صرف بیالیس برس، آٹھ مھینے اور سات دن ادھار دیے تھے، میں نے تو سوگندھی کو صدیاں دی ھیں...''

— دیوندر ستیارتھی: ۱۸ر جنوری ۱۹۶۱ء

○○

پُرشارتھی

مین را

میرے من میں ہنسی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور بوجہ ضبط میرے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی؛ مجھے خبر نہیں کہ کس طرح ہنسی کے سمندر کی ایک لہر چھلک کر میرے لبوں سے اُچھل گئی اور بس ایک جھٹکے سے رُک گئی۔

ڈرائیور نے گردن موڑتے ہوئے اور میری جانب دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا: ''مسٹر، ابھی ایکسیڈنٹ ہوجاتا...!''

میں اکیس نمبر کی بس میں سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میری غیر متوقع ہنسی کی شدید لہر نے یکایک ڈرائیور کی توجہ میری طرف کھینچ لی اور ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا— مجھے شرمندگی کا احساس ہوا اور میں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کی۔

بات ہی ایسی ہوئی تھی کہ مجھے من ہی من میں ہنسی آئے جارہی تھی اور کبھی کبھی میرے لبوں سے چھلک بھی جاتی تھی؛ ذرا قابو پاکر سوچتا تھا تو کھچڑی بالوں کی لٹوں، مونچھوں اور داڑھی سے گھرا ہوا پرشارتھی کا ستا ہوا چہرہ میری نظر کے سامنے آجاتا تھا اور ہنسی کی لہر شدید ہوجاتی تھی۔

پرشارتھی سے میرا تعارف تقریباً دو برس پہلے ایک شاعر دوست کے توسط سے ہوا تھا؛ اس تعارف سے پہلے ہی میں پرشارتھی کو بہت اچھی طرح سے جانتا تھا— اگر آپ اُردو کہانی سے واجبی سی دلچسپی بھی رکھتے ہیں تو آپ پرشارتھی سے بخوبی متعارف ہیں؛ آپ آسام کے جنگلوں میں ہوں، راجستھان کے صحراؤں میں ہوں یا پنجاب کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں، پرشارتھی کی شخصیت کے بارے میں ہر اونچی نیچی بات آپ کے یعنی اُردو کہانی کے قاری کے علم میں یقیناً ہوگی: آوارگی اور لوک گیتوں کی ان تھک تلاش؛ کہانیاں لکھنے کی لت اور کہانیاں سنانے کی علّت؛ چےخف کی کہانی گـــریف والا مشہور لطیفہ: منٹو اور دیگر ادیبوں کے ہاتھوں بار بار ذلّت؛ ایک جیتی

جاگتی کہاوت۔ پھر پرشارتھی کا حلیہ: کیمرہ جمع تھیلا جمع پانڈولپیاں جمع ٹیگور کا چغہ جمع ٹیگور کی داڑھی اور پطرس کا جملہ: خضاب سے پہلے، خضاب کے بعد۔ آپ نے پرشارتھی کو نہ بھی دیکھا ہو تب بھی آپ پہلی ہی بار اسے دیکھ کر پہچان لیں گے کہ اُردو کا مشہور اور بدنام کہانی کار پرشارتھی آپ کی نظروں کی زد میں ہے— آپ کے لیے اُردو کہانی کا باخبر قاری ہونا شرط ہے— اور اگر شامتِ اعمال آپ نے مارے ادب نوازی کے پرشارتھی کو سلام کر ڈالا تو وہ فوراً ہی کوئی کہانی داغ دے گا، اور یوں اپنے وجود اور اپنی جیتی جاگتی کہاوت کی تصدیق کر دے گا۔

میں نے پرشارتھی کو دیکھا بھی بہت پہلے تھا: میں یونیورسٹی میں نیا نیا داخل ہوا تھا، اور ابھی مجھے داخل ہوئے دس بارہ دن ہی گزرے تھے کہ ایک دن لال قلعہ بس اسٹاپ سے ایک درویش صورت مہاشے بس پر چڑھے؛ میں نے فوراً پہچان لیا کہ ہمارے اُردو کے مشہور کہانی کار پرشارتھی صاحب ہیں— پرشارتھی گردن جھکائے کھڑا تھا کہ کوئی بھی سیٹ خالی نہیں تھی؛ میں عقیدت کے مارے کھڑا ہو گیا اور اسے اپنی سیٹ دے دی؛ اس نے بڑی مدھر آواز میں شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گیا— اس کے بعد وہ تقریباً ہر تیسرے چوتھے دن نظر آ جاتا؛ وہ اولڈ سیکریٹریٹ کے بس اسٹاپ پر اتر جاتا اور میں آگے یونیورسٹی کی طرف بڑھ جاتا— میں پرشارتھی سے متعارف تھا اور اس کے بارے میں کافی کچھ پڑھ چکا تھا؛ میرے دل میں اس کے لیے بڑی عزت تھی؛ میں سوچتا تھا: منٹو نے پرشارتھی کے ساتھ جیسا بھی سلوک کیا ہو، پرشارتھی پھر بھی پرشارتھی ہے...

ایک بات میرے ذہن میں ہر وقت رہتی تھی: پرشارتھی ہمارے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اس احساس اور دبدبے کے کارن میں پرشارتھی سے بات کرنے سے ڈرتا تھا، اور پرشارتھی کے بارے میں پڑھی ہوئی باتوں کو نظر انداز کر دیتا تھا کہ ہم پڑھنے والوں کا ان باتوں سے کیا لینا دینا— کئی بار میں نے اپنے غیر ادب نواز دوستوں کو بس میں اشارتاً کہا کہ دیکھو تمھیں فخر کرنا چاہیے، تمھارے ہم سفر اُردو کے بہت بڑے کہانی کار پرشارتھی ہیں...!

وہ دبی زبان میں صرف اتنا کہا کرتے: ''نہیں یار، یہ تو کوئی سیاسی اُچکا لگتا ہے...!''

کچھ مدت بعد مجھے اقتصادی مشکلات کے کارن یونیورسٹی چھوڑنا پڑی، اور یوں پرشارتھی کا انجانا ساتھ بھی چھوٹ گیا لیکن ایک زمانے تک مجھے پرشارتھی کے انجانے ہم سفر ہونے کا شدید احساس رہا۔

کوئی چار برس بعد دلّی کے چھوٹے اور بڑے ادیبوں میں میرا بھی اُٹھنا بیٹھنا ہو گیا اور یوں ایک شاعر دوست کے توسط سے پہلی بار میرا پرشارتھی سے باقاعدہ تعارف ہوا۔ پانچ سات

ملاقاتوں اور نشستوں کے بعد ہی میرے محسوسات کو بُری طرح جھٹکے لگنے لگے۔

پرشارتھی کی غیر موجودگی میں سب چھوٹے اور بڑے ادیب سنجیدگی سے ادب اور ادیبوں کے مسائل پر نرم و گرم گفتگو کرتے؛ کبھی کسی ناول پر بحث کرتے، کبھی کسی نئے رجحان پر بات چیت ہوتی؛ مگر پرشارتھی کی موجودگی میں کوئی سنجیدہ نہ رہتا یا رہ نہ سکتا؛ اس کی موجودگی میں سب لوگ واہیات اور ذلیل باتیں کرتے، اور حد تو یہ ہے کہ سب باتیں پرشارتھی ہی کے بارے میں ہوتیں — وید مصور بتاتا کہ کس طرح اس نے ایک دن نشے کے عالم میں پرشارتھی کی داڑھی نوچ ڈالی تھی... اور پرشارتھی اپنی نسوانی آواز میں کہتا: ''نہ جانے وید کو اس دن کیا ہو گیا تھا...؟'' اور سب بھرپور قہقہہ لگاتے — پرشارتھی لحہ بھر کے لیے عینک کے پیچھے سے حیرانی سے جھانکتا اور پھر خود بھی قہقہے کی نوعیت سمجھے بغیر ہنسنے لگتا۔

اور تو اور، پرشارتھی کی موجودگی میں لطیفے گھڑے جاتے اور چٹخارے لے لے کر سنائے جاتے: ایک صاحب کہتے: ''تبادلے کے بعد ایک آرٹسٹ امرتسر سے دلی آیا؛ اس نے رہتک روڈ پر ایک مکان پسند کیا اور مالک مکان کو ایڈوانس کرایہ دینے لگا؛ مالک مکان کو جب پتہ چلا کہ اس کا کرایہ دار آرٹسٹ ہے تو اس نے کہا: 'جناب، ہمارے پڑوس میں ایک بہت بڑے آرٹسٹ رہتے ہیں؛ وہ کہانیاں لکھتے ہیں؛ ان سے مل کر آپ کو بہت خوشی ہوگی...' آرٹسٹ نے پوچھا: 'کون صاحب پڑوس میں رہتے ہیں...؟' مالک مکان نے کہا: ''پرشارتھی صاحب...!'' آرٹسٹ نے مالک مکان کے ہاتھوں سے ایڈوانس کرایہ چھینتے ہوئے کہا: 'جوانی میں اُس کمبخت کے ہاتھوں برباد کر چکا ہوں، اب میں اپنا بڑھاپا خراب کرنا نہیں چاہتا...!''

قہقہے کس کس طور اُڑتے اور پھٹتے، اور کہ پرشارتھی کیوں ان قہقہوں کی بے نام اور بے وقت لذت میں شریک ہوتا، یہ بات نہ تب میری سمجھ میں آئی تھی، نہ اب میری سمجھ میں آتی ہے۔

میرے ذہن میں پرشارتھی کا ایک بت موجود تھا، بہت بڑا بت — پرشارتھی کی درگت نے مجھے بُری طرح جھنجھوڑا، اور میری سوچ اُلٹنے لگی: مجھے منٹو اور دوسرے ادیبوں پر غصہ آنے لگا تھا جو پرشارتھی کا مذاق اُڑاتے رہے تھے؛ پرشارتھی کا مذاق تو ہرا یرا غیرا اُڑا سکتا ہے، اور اُڑاتا ہے، پھر منٹو کو کیا سوجھی تھی؛ کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ پرشارتھی اس کے مذاق کے قابل بھی نہ تھا۔

جہاں تک پرشارتھی کے کہانیاں سنانے کا تعلق ہے، اس سے زیادہ اور کیا لکھا جا سکتا ہے کہ دلی میں ہر تیسرے آدمی نے پرشارتھی سے نہ صرف کہانی سنی ہے بلکہ پرشارتھی کو کہانیاں پر بھاؤ بھی دیے ہیں جو اس کی بھاری بھرکم پرچوں میں چھپی ہوئی کہانیوں میں موجود ہیں؛ اور بقول شخصے

اس کی کہانیوں میں ننانوے فی صدی مواد کہانیاں سننے والوں کا ہوتا ہے — مصیبت یہ ہے کہ یہی مجھے پرشارتھی کا المیہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نام، یہ شخصیت، یہ کہاوت بڑی جان پڑتی ہے لیکن بڑی ہے نہیں؛ اب اسے کیا کہیں کہ کوئی بھی شہری فخر سے یہ نہیں کہتا، کہہ نہیں سکتا کہ اس نے پرشارتھی سے کہانی سنی ہے۔

پرشارتھی نے انھی دنوں ایک کہانی گاڑی بھر راستہ لکھی اور رائٹرز گروپ میں پڑھی؛ کہانی خاصی طویل تھی اور معمولی۔ میرے دوست کیول سوری نے بحث کا آغاز کیا اور کہا: ''آج سے چند برس پیشتر قصّہ پہلے درویش کا، قصّہ دوسرے درویش کا لکھا جاتا تھا اور خوب پڑھا جاتا تھا؛ یہ کہانی بھی اسی طرز کی کامیاب مزاحیہ کہانی ہے۔''

کیول سوری کی چالاکی یہ تھی کہ اس نے پرشارتھی کی جن ریشن گیپ سے متعلق سنجیدہ مگر ناکام کوشش کو مزاحیہ کہانی کی لپیٹ میں لے لیا تھا، اور یوں تمام بحث مزاحیہ کہانی ایسی ہوتی ہے اور ایسی نہیں ہوتی کے چکر میں اُلجھ کر رہ گئی، اور پرشارتھی کو گاڑی بھر راستہ کی نوک پلک درست کرنے کا مسالا نہ مل سکا۔

گاڑی بھر راستہ کے بعد پرشارتھی نے ایک اور کہانی یہ قربتیں، یہ دوریاں لکھی؛ اس کہانی کا المیہ یہ ہوا کہ کبھی یہ یہ قربتیں، یہ دوریاں سے رنگ پیار مانگتے ہیں بنی اور کبھی بلیک کافی؛ پھر یہ کہانی پاس کی دوری بن گئی؛ اور آخر میں پھر یہ قربتیں، یہ دوریاں میں تبدیل ہوگئی — کہانی کا ایک کردار ہے آندرے پال؛ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، آندرے پال فرانسیسی ہے؛ آندرے پال کے تعلق سے کہانی میں فرانس کا تھوڑا سا اور خام سا ذکر موجود ہے۔

کیول سوری نے کہا: ''پرشارتھی صاحب، آندرے پال سے کسی جگہ یہ کہلوا دیجیے کہ ہر آدمی کے دو ملک ہوتے ہیں، ایک اس کا اپنا ملک اور دوسرا فرانس...!''

پرشارتھی نے ایک ہزار ایک شکریہ ادا کیا اور جملہ نوٹ کرلیا — یہ کہانی جلد ہی کسی بھاری بھرکم پرچے میں شائع ہوگی اور یہ جملہ آپ خود دیکھ سکیں گے۔

گھر لوٹتے سے کیول نے مجھ سے کہا: ''مین را، یہ ہے ہمارا بڑا افسانہ نگار، منٹو اور بیدی کا ہم عصر...!''

پھر ہم نے ادیبوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ کیول سوری کہتا: ''سالے سب ڈفر ہیں، چور ہیں... بھنڈی بازار کے لوگ ہیں... جملہ تو ان کے سر پر سے گزر جاتا ہے اور انھیں خبر تک نہیں

ہوتی... سالوں نے اب تک لفظوں سے کندھا نہیں رگڑا ہے... صدیوں پرانے ٹنگے ہوئے میلے ذلیل ٹاٹ کے اُدھر رہتے ہیں... لکھیں گے کیا، ٹاٹ تو نوچ کر پھینک نہیں سکتے...!''

میری سمجھ کے مطابق، پرشارتھی کو الگ کرنے کے بعد، کیول سوری کی بات درست تھی اور ہے۔

بہت بار ایسا ہوا کہ ٹی ہاؤس میں یا کافی ہاؤس میں ہم نے پورے گروہ کو پرشارتھی کا مذاق اڑاتے دیکھا لیکن ہم دور کی میز پر بیٹھے رہے۔

ایک دن پرشارتھی ہماری میز پر آن بیٹھا؛ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا: ''آپ دونوں نہ ہمارے پاس بیٹھتے ہیں اور نہ ہمیں اپنے پاس بیٹھنے دیتے ہیں...!''

میں خاموش رہا۔

کیول سوری نے کہا: ''پرشارتھی صاحب، ہماری صحبت راشن کارڈ پر ملتی ہے...!''

پرشارتھی یا تو کیول سوری کے جملے کی واضح کاٹ کو سمجھ نہ سکا یا پھر انجانا بنا رہا؛ اس نے کہا: ''اور راشن کارڈ...؟''

کیول سوری کھڑا ہو گیا: ''راشن کارڈ کا دوسرا نام ذہانت ہے پرشارتھی صاحب...!'' پھر اس نے میرا بازو تھام کر مجھے ایک جھٹکے سے کھینچا، اُٹھایا اور ہم پرشارتھی کو وہیں چھوڑ، باہر نکل گئے۔

میں نے پرشارتھی کے ساتھ کبھی کوئی ناشائستہ بات نہیں کی تھی؛ میرے ذہن میں اس کا بت ٹوٹ چکا تھا اور میری دانست میں اتنا کافی تھا۔

ان دنوں میں نے بھی کچھ کچھ لکھنا شروع کر دیا تھا اور یہ بات کیول سوری کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا — انہی دنوں میں نے اپنی تیسری کہانی ھوس لکھی اور سحر کو بھیج دی؛ سال بھر بعد وہ کہانی سحر میں چھپ گئی اور میرے جاننے والے کچھ حیران ہوئے اور کچھ پریشان — سب لوگ میری کہانی کی 'تیز و تند' تھیم پر بات چیت کر رہے تھے کہ پرشارتھی آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا: ''آخر کس کی کہانی کے بارے میں لے دے ہو رہی ہے؟''

ایک دوست نے میری طرف اشارہ کیا؛ پرشارتھی نے تعجب سے میری جانب دیکھا اور کہا: ''اچھے چھپے رستم نکلے یار!''

''پرشارتھی صاحب، آپ کی مائی راماں کے پہلو میں مین را کی کہانی چھپی ہے!''

پرشارتھی نے حیرانی سے کہا: ''لیکن مائی راماں تو سحر میں آ رہی ہے...!'' اسے یقین نہ آیا کہ سحر بہت بڑا پرچہ تھا۔

ایک دوسرے دوست نے کہا: ''مین را کی کہانی سحر ہی میں چھپی ہے...!''

پرشارتھی نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا: ''کیا سحر آ گیا...؟''
میں اس بات چیت سے جھنجلا رہا تھا؛ میں نے بمشکل جواب دیا: ''جی ہاں، کوئی تین دن ہوئے...!''
پرشارتھی نے کہا: ''تعجب ہے...! میرے پاس کیوں نہیں آیا...؟ چودھری کو سخت خط لکھوں گا... یہ سب رائے کا کیا دھرا ہے...! خیر... '' پھر پرشارتھی مجھ سے مخاطب ہوا: ''آپ نے مائی راماں پڑھی...؟'' آپ نے سنی تو نہ ہوگی کہ میں نے لاہور میں لکھی تھی... میں نے مائی راماں کے پروف بھی لاہور میں پڑھے تھے... ہاں تو کیسی لگی مائی راماں...؟''
جھنجلاہٹ تھی یا جانے کیا تھا کہ میں نے، جس نے کبھی پرشارتھی سے کوئی سخت بات نہیں کی تھی؛ کہہ دیا یا میرے منہ سے نکل گیا: ''پرشارتھی صاحب، معاف کیجیے گا، بات کچھ بنی نہیں...!''
میرے تین چار برسوں کے برتاؤ کے پیش نظر میری بات پرشارتھی کے لیے شاید غیر متوقع تھی، شاید اس نے یہ سوچا کہ سحر میں کہانی کی اشاعت نے مجھ سے وہ غیر متوقع جملہ کہلوایا ہے؛ اسے تو خود محفلوں میں نشانہ بننے کا چسکا پڑ چکا تھا مگر اس دن شاید اس کی توقعات بُری طرح مجروح ہوگئی تھیں — اس نے قدرے تیز آواز میں کہا: ''آپ کو ٹیبل ٹاک تک کے آداب کا علم نہیں...!''
مجھے واقعی کچھ ہوگیا تھا؛ میں نے اپنے آپ پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا: ''پرشارتھی صاحب، اگر آداب یہی ہیں کہ میں آپ کی معمولی کہانی کو لاجواب کہوں تو واقعی مجھے آداب کا کوئی علم نہیں...!''
سب لوگ چپ ہوگئے تھے اور سنگین حالات سے لذت حاصل کر رہے تھے — آخر ایک دوست نے لہجے کو پُر اثر بناتے ہوئے کہا: ''مین را، تم سمجھتے ہو کہ تمھارے ریمارک سے پرشارتھی صاحب کا دل ٹوٹ جائے گا اور وہ لکھنا چھوڑ دیں گے...؟''
میں حیران ہوں کہ مجھے کیا ہوگیا تھا؛ میں نے جواب دیا: ''نہیں، جب ان کا دل پچھلے پچیس برسوں میں نہیں ٹوٹا ہے تو اب بھلا کیا ٹوٹے گا...! تعجب تو مجھے اس بات پر ہو رہا ہے کہ جو بات مجھے کرنی چاہیے تھی، وہ بات پرشارتھی صاحب نے کی...! پرشارتھی صاحب بڑے ادیب ہیں اور میں نے ابھی لکھنا شروع کیا ہے... ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں ان کے پاس جاتا اور کہتا: 'میری کہانی سحر میں چھپی ہے، آپ نے پڑھی ہوگی، اپنی قیمتی رائے سے نوازیے...' اور اگر وہ کہتے کہ بات کچھ بنی نہیں تو میرا دل ٹوٹ جاتا... مگر ہوا اس کے بالکل برعکس...!''
پرشارتھی نے پھر تیز آواز میں کہا: ''آپ کہیے کہ مائی راماں کیسے معمولی کہانی ہے؟''

میں نے پرشارتھی سے کہا کہ یہ وقت کوئی لمبی چوڑی بحث کا نہیں ہے، اور کہ میں پھر کبھی ان سے تفصیل سے بات کروں گا، اور کہ ابھی مجھے شراب پینے جانا ہے، مگر پرشارتھی ٹس سے مس نہ ہوا۔

اس نے کہا: ''نہیں صاحب، میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں... میں آپ کے ساتھ چلوں گا... آپ آدھی رات تک شراب پیتے رہیے، مجھے کوئی اعتراض نہیں... لیکن آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ مائی راماں کیسے معمولی کہانی ہے...؟''

میرا دھان پان سا جسم اور پرشارتھی کا یہ بڑا ڈیل ڈول؛ اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے میرا بازو تھام رکھا تھا۔ دھیرے دھیرے سب دوست کھسک گئے اور میری جان مصیبت میں پھنس گئی۔

آخر ہم کافی ہاؤس سے اُٹھے اور ٹی ہاؤس کی طرف چل دیے — میرا بازو پرشارتھی کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں تھا — میں ڈر بھی رہا تھا، اور بمشکل اپنی ہنسی بھی ضبط کر رہا تھا؛ پرشارتھی کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

راستے میں گوپال مشرل گئے اور ہمارے ساتھ ہو لیے — اس دوران مجھے ایک بات سوجھی۔

ٹی ہاؤس پہنچ کر میں نے بیرے کو تین کپ خوب گرم کافی لانے کو کہا اور ٹائلٹ جانے کا بہانہ کر کے پیچھے کے راستے سے باہر نکل گیا۔

ڈرائیور کی بات سن کر میں قدرے سنجیدہ ہوا اور ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

گھر پہنچا تو ماں نے کہا: ''کھانا لاؤں...؟''

میں نے کہا: ''نہیں... مجھے پہلے مائی راماں پڑھنی ہے...!''

کوئی دو گھنٹے کے بعد ایک مدھری آواز نے مجھے پکارا: ''مین را صاحب...!''

میں مائی راماں پڑھ چکا تھا اور تیار ہو چکا تھا؛ میں نے کہا: ''آیئے، پرشارتھی صاحب...!''

OO

('سات رنگ'، کراچی: ۱۹۶۳ء)

جاگتی آنکھوں کا خواب

شمیم حنفی

ملاقات سے پہلے پرشارتھی کے بارے میں جو کچھ سنا اور پڑھا تھا اس سے ہمیشہ بس ایک گمان ہوا: یہ کہ وہ سچ مچ کی کوئی شخصیت نہیں، ایک خواب ہے جو میں جاگتی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں — دھوپ بھری چٹیلی دوپہروں سے ہلکان، اس شہر ناپرساں کی تھکن سے چور مگر اپنی چال میں مخمور سڑکوں پر اسے آتے جاتے دیکھا تو اس کے ہونے کا یقین آیا، اور محسوس ہوا کہ میں خواب نہیں، پرشارتھی کو دیکھ رہا ہوں۔

اس کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی ہے؛ اس کے سفید گچھیلے بال اور بھرواں لہریا داڑھی اس کی اپنی قامت کی طرح طویل ہے؛ اس کے ماتھے پر سلوٹوں کے گہرے نشان ایک لمبی یاترا کے تجربوں کا عنوان ہیں — کھدر کے کبھی بے داغ اور کبھی میلے کرتے پاجامے میں اور زرد سلک کے چغے میں ملفوف، فائلوں اور کاغذوں کا ایک بھاری پلندہ سنبھالے ہر صبح وہ گھر سے نکلتا ہے، اس اطمینان کے ساتھ جیسے اس کے گھر کے آگے بھی اسی کے گھر بسے ہوئے ہیں، اور اسے کسی پرائی جگہ نہیں جانا ہے۔

یہ جگہ کوئی بھی ہو سکتی ہے: کسی دوست کا کمرہ، کوئی گلی، کوئی محلّہ، کوئی چائے خانہ یا کوئی ویرانہ؛ کافی ہاؤس یا آرٹ گیلری، یا پھر کوئی بھری پری شاہراہ یا شاپنگ سینٹر — اسے تو نہ خریداری کرنی ہوتی ہے اور (اِکا دُکا دنوں کو چھوڑ کر) نہ ہی لازمی طور پر کسی سے ملنا ہوتا ہے؛ پھر بھی وہ اسی پابندی کے ساتھ گھر سے نکلتا ہے، گھنٹوں چلتا ہے اور پھر اسی حماقت کے ساتھ گھر لوٹ آتا ہے گویا زندگی کا ایک اور قرض اس نے چکا دیا ہو۔

اصل میں ستیارتھی کا ہر سفر گھر سے گھر تک کا سفر ہوتا ہے؛ وہ سفر بھی کہ جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ گھر سے نکلا، سبزی فروش کے چبوترے تک پہنچا، اور اِس پل بیوی نے بھاؤ پوچھا، اُس پل وہ ہزاروں میل دور آسام میں تھا (پنجاب اور آسام کا درمیانی فاصلہ؟ گھر سے گھر تک کا فاصلہ!) —

ہمارے چاروں طرف سڑکوں کا جو جال بچھا ہوا ہے، اور یہ سڑکیں جو ایک بستی کو دوسری بستی سے، ایک دنیا کو دوسری دنیا سے قطع کرتی ہیں، ان کے بھید اس عہد کے ادیبوں میں شاید سب سے زیادہ ستیارتھی نے سمجھے ہیں؛ ایسا نہ ہوتا تو پچھتاوا یا بے حصولی جو ہر سفر کا مقدر بنتی ہے، ستیارتھی کی آنکھوں میں کب کی ڈیرے جما چکی ہوتی — اس نے دھوپ اور دھول سے دوستی کی مگر اس کی روح رواں اجالی رہی؛ اس نے سفر میں زندگی کی، پھر بھی اس کی آنکھیں روشن رہیں؛ نہ چہرہ سنولایا، نہ پلکوں میں کالک جمی — باہر کی دنیا سے ایسی مکمل، بھرپور اور بے لوث ہم آہنگی ستیارتھی کی زندگی میں سفر کو قیام کا مترادف ٹھہراتی ہے؛ اس طرح وہ ماسوا کا اثبات اور اپنی نفی کا ارتکاب نہیں کرتا بلکہ اپنی طینت کی تصدیق کرتا ہے: وہ ہر مظہر میں اپنے رُوپ کا عکس دیکھتا ہے؛ ہر منظر کے حوالے سے خود کو پہچانتا ہے؛ ہر لمحے کے تحرک میں اپنا شمار کرتا ہے۔

اس نے نہ تو اپنے آپ کو تیاگا ہے، نہ ہی اپنی دنیا کو؛ مگر اس نے تعلق اور لاتعلقی کے تضاد کو مسمار ضرور کیا ہے — بیس برسوں کی لمبی جاترا کے بعد وہ واپس آیا تو گھر بھی جما ہوا تھا اور دروازے بھی اس کی خاطر کھلے ہوئے تھے۔

اس عرصے میں وہ کیسے کیسے جہانوں سے گزرا، کیا کیا تماشے دیکھے، کن کن لوگوں سے ملا اور کہاں کہاں یہ محسوس کیا کہ عمر کا کوئی لمحہ اچانک رُک گیا ہے، مجھے نہیں معلوم۔ ستیارتھی سے پوچھا جائے تو شاید یہی جواب ملے گا: میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا...!

لوک گیتوں پر اُردو میں اپنی کتاب کا نام اس نے میں ھوں خانہ بدوش رکھا تھا، گویا کہ گھر اس کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنا، اس کے کاندھوں پر سوار رہا؛ چنانچہ ستیارتھی کی جن کہانیوں میں سفر کے اس طویل تجربے کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں، وہاں بھی اس کی حیثیت مسافر کے بجائے ایک میزبان کی ہوتی ہے — گجرات، آسام، بنگال، مدھیہ بھارت، راجستھان، کشمیر اور پنجاب اس کی کہانیوں میں اپنے صنعتی شہروں، تہذیبی مراکز اور اداروں کا کوئی حوالہ نہیں دیتے بلکہ اپنی روح کا انکشاف کرتے ہیں جو خارجی تبدیلیوں کی زد پر آکر بھی تبدیل نہ ہو سکی اور مختلف زمانوں کی تماشا گاہ میں ایک ابدی حال کے رس میں ڈوبی دکھائی دیتی ہے — کنیا کماری سے کشمیر تک، سری لنکا سے بیر بھوم اور برما تک وہ جہاں بھی گیا، گھر اس کے ساتھ رہا۔ ایسا نہ ہوتا تو شہر دلی کی بستی قرول باغ کے ایک گھر میں قدم رکھنے کے بعد وہ مہینوں باہر نہ نکلتا۔ سستاتا اور سفر نامہ لکھتا؛ مگر وہ تو دوسرے ہی دن سے پھر دلی کی سڑکوں پر اسی طرح مارا مارا پھرنے لگتا ہے اور دیکھنے والے بھی اسے اس طور پر دیکھتے ہیں جیسے وہ کہیں گیا ہی نہیں تھا۔

سماجی طور پر اسے ستیارتھی کی زندگی کا المیہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ نہ تو اس کا کہیں جانا خبر بن سکا، نہ لوٹ کر آنا؛ اگر وہ دنیادار آدمی ہوتا تو ہر سفر پر جانے سے پہلے اپنے منصوبوں کی ہوا باندھتا؛ حکومت سے (یا کسی غیر ملکی سفارت خانے سے) اس منصوبے کی سرپرستی اور اپنے اہل خانہ کی کفالت کا طلب گار ہوتا؛ کسی خبر رساں ایجنسی کی وساطت سے لوگوں کو مطلع کرتا کہ لوک گیت ہماری دھرتی کی آتما کا ایک ساکار روپ ہیں اور ان کی جانب توجہ میں اس کی اپنی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ گاندھی جی؛ ٹیگور، مدن موہن مالویہ اور سروجنی نائیڈو کی تحریک بھی شامل ہے؛ پھر وہ ان کے خطوط کی مصدقہ نقلیں بطور سند پیش کرتا اور پھول مالائیں گلے میں ڈالے بڑے تام جھام سے گھر سے نکل پڑتا؛ اس کے بعد جب وہ ہزار دو ہزار لوک گیت شکار کر کے شاداں و فرحاں لوٹ کر آتا تو ایک پریس کانفرنس میں بتاتا کہ اس نے سفر میں کیا کیا دکھ جھیلے ہیں؛ اور کہ علم و آگہی کا جو انمول خزانہ وہ لایا ہے، اب اس کے تحفظ اور تقدس کی ذمہ داری قوم کے سر ہے — مگر ستیارتھی نے نہ تو اپنی محنت کا مول کسی سے مانگا، نہ اس محنت کا پھل؛ اس نے تو احمد شاہ بخاری کے زمانے میں بھی جو گیت ریڈیو کو فراہم کیے تھے، ان کا کاپی رائٹ اپنانے سے بھی یہ کہہ کر انکاری ہو گیا کہ یہ حق ملکیت اگر کسی کو پہنچتا ہے تو وہ اس دیس کی دھرتی ہے: آندھرا کی لال دھرتی، مدھیہ بھارت کی بھوری دھرتی، بنگال کی سلونی دھرتی اور کشمیر کی زعفران زار دھرتی — دھرتی کے یہ روپ صرف دینا جانتے ہیں، کسی سے کچھ مانگتے نہیں۔

اس زمانے میں بھی، جب ستیارتھی اپنی ایک بیٹی کے بیاہ کا بندوبست کر رہا تھا اور جہاں تہاں سے کچھ پیسے جوڑنے کی ضرورت آن پڑی تھی، اس نے ایک ترجمے کا پراجیکٹ یہ کہہ کر ادھورا چھوڑ دیا کہ اس سے اس کی آزادی میں بادھا پڑتی ہے؛ بیاہ کا کیا تھا، جوں توں ہو گیا مگر ستیارتھی اپنی آزادی کا سودا کرنے پر رضامند نہ ہوا۔

یہ آزادگی بہ حیثیت ادیب ستیارتھی کو خاصی مہنگی پڑی ہے — مالی نفع نقصان کی بات الگ رہی کہ اس میدان میں اچھے بھلے ہوش مند قسم کے لوگوں کو بھی غبی پایا گیا ہے اور بعضے واجبی عقل رکھنے والوں کو اقتصادیات کے باب میں جینئس دیکھا گیا ہے؛ عقلِ معاش شاید تعقل کا ایک مخصوص خود مکتفی شعبہ ہے؛ برنرڈ شا، ایلیٹ یا اور تو اور اپنے بعض جغادری ترقی پسند اور جدیدیے جو اس میدان میں بھی پیش پیش رہے، ان کا شمار منتخبات میں کرنا چاہیے — ستیارتھی نے اس محاذ پر تو مات کھائی ہی، آپ اپنے انتخاب اور ارادے سے اپنی آزادگی کے سبب اپنی تخلیقی شخصیت کو بھی وہ اس طور پر گراں قیمت نہ دکھا سکا، جس کا اسے حق پہنچتا تھا۔ ایک عام اندازے کے مطابق اس نے

ڈھائی سے پانچ لاکھ تک لوک گیت جمع کیے ہیں؛ اَن گنت کہانیاں لکھی ہیں؛ ناول اور نظمیں الگ؛ اس نے ہندی، اُردو، پنجابی اور انگریزی میں جتنے صفحے سیاہ کیے ہیں، ان سے سرسری گزرنے کی سعادت بھی بہتیرے لکھنے والوں کو میسر نہیں آئی؛ مگر اس ساری کوشش وکاوش اور جانکاہی کا صلہ کیا ہے؟ سفر، مستقل مدام سفر۔ اتنی چالاکی اس نے ضرور کی کہ شہرت اور گمنامی، سفر اور قیام کے بیچ کی لکیر مٹادی — ازمنہ قدیم کے گیت کاروں، مغنیوں اور مصوروں اور مجسمہ سازوں کی طرح جو اپنے خاکستر سے اپنا جہان پیدا کرتے تھے اور گھڑی بھر کے لیے بھی یہ نہ سوچتے تھے کہ جریدۂ عالم پر اپنا دوام کسی بہانے ثبت کرتے جائیں۔

ستیارتھی نے نہ صرف یہ کہ تمنا کے سفر میں کسی احتیاج اور مصلحت کو آڑے نہ آنے دیا، اس نے اپنی شخصیت کو بھی اپنا حجاب نہ بننے دیا؛ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ستیارتھی شیشے کا بنا ہوا آدمی ہے جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے — ستیارتھی کو سمجھنے کے لیے تاریخ، فلسفہ، ادب اور تنقید پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ وہ جو کچھ بھی ہے، حرف حرف، نقطہ نقطہ اپنے آپ میں لکھا ہوا ہے۔ اور اس معاملے میں وہ یہاں تک محتاط ہے کہ مبادا اظہار کچا یا ادھورا رہ جائے، اس خیال سے اپنے لکھے کو بھی اپنے سے الگ ہو کر بار بار پڑھتا ہے، کاٹتا ہے، مٹاتا ہے، توڑتا ہے اور جوڑتا ہے۔ اس کے مسودوں کی بناوٹ خود کو مٹا مٹا کر بنانے کے اسی عمل کا عکس ہے۔ بادی النظر میں یہ ایک طرح کی پرفیکشنزم ہے مگر غور سے دیکھیں تو پتا چلے گا کہ فطرت بھی تو اپنی تعمیر اور اظہار کے سفر میں یہی کچھ کرتی ہے اور بناؤ بگاڑ کے ایسے مراحل سے گزرتی ہے۔ یہ جستجو ہے اس مکمل، بے ریا اور بیساختہ آزادی کی جس کی راہ میں اتفاقات اور دل اور دماغ کے لمحاتی ارتعاشات بھانت بھانت کی دیواریں کھڑی کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک صفحے پر ایک جملے کے ایک لفظ کو وہ اتنی بار لکھتا اور بدلتا ہے کہ مسلسل چیپی پر چیپی کاغذ کے ورق کو ایک گتے میں تبدیل کر دیتی ہے (محمد حسین آزاد بھی یہی کرتے تھے، جبھی تو ان کا لفظ لفظ اس درجہ حواس آلودہ اور شخصیت آزمودہ ہے)۔ اس معاملے میں ستیارتھی کا رویہ اس مغنی کا ہے جو برسوں کے ریاض کو بھی ایک سُر یا ایک لے کی دریافت کے لیے کافی نہیں سمجھتا اور ایک عمر اپنے آپ کو صیقل کرنے میں گزار دیتا ہے۔

ایسا نہ ہوتا تو وہ خود پر کب کا قانع ہو چکا ہوتا اور عظمت و امتیاز کی قبا پہنے کسی گوشے میں جم کر بیٹھ گیا ہوتا۔ ادب، علم اور فن کے معاشرے میں کمال کا آخری نقطہ وہی ہے جس کے بعد مزید کمال کی گنجائش نہ رہ جائے اور جو زوال کا نقطۂ آغاز بن جائے۔ بنگال کی بھوکی پیڑھی نے ٹیگور کو ہدف

اسی لیے بنایا کہ ٹیگورازم نے ایک شرعی نظام کی صورت اختیار کر لی تھی جہاں چون و چرا کا سوال ختم ہو جاتا ہے۔ ٹیگور کی آتما تو بد مذاقیوں کی اس بھیڑ میں کہیں پیچھے رہ گئی، ان کی شخصیت کا خارجی مظہر اور نظر کی گرفت میں آنے والے لاحقے ان کی خوبصورت زلفوں، سپید ریش اور نرم ریشمی قباؤں سمیت ایک ادارے میں تبدیل ہو گئے۔ یہ ٹیگورازم کے ہاتھوں ٹیگور کی ہزیمت کا اعلانیہ تھا۔ اسے ایک طرح کی خودکشی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ستیارتھی نے بھی یہ وضع اپنائی مگر خود ہی اس کا پردہ بھی یہ کہتے ہوئے چاک کر دیا کہ لمبے کیش اور داڑھی اور جوگیا باتا، یہ سب کے سب اس کی مادی ضرورتوں اور تخلیقی مقاصد کے تابع تھے؛ اس طرح بھیک آسانی سے مل جاتی تھی؛ بلا ٹکٹ سفر کرنا سہل ہو جاتا تھا اور گاؤں کے سادہ لوح مرد عورت لڑکے لڑکیاں اپنے گیتوں کی پٹاری کھولنے پر جلد آمادہ ہو جاتے تھے۔

چنانچہ ستیارتھی کا سب سے بڑا حریف خود ستیارتھی ہے جس نے اپنی ذات پر دھند کی کوئی تہہ باقی نہ رہنے دی۔ نوعمر ادیبوں اور طالب علموں اور عام آدمیوں کے مجمعے میں بھی وہ اپنی فائلوں اور کاغذات کا پلندہ، اپنے کٹے پھٹے مسودوں کی زنبیل کھول کر بیٹھ جاتا ہے، سڑک کے کسی موڑ پر، کسی چائے خانے میں، کسی دکان کے شیڈ میں، کسی پارک کے گوشے میں، اور اس کے حوصلوں نے مخاطب کے ظرف کی پروا کیے بغیر خود کو جہاں تہاں یوں بے نقاب کیا کہ دیکھنے والے اس کے حوصلوں کی وسعت کو بس اپنے ظرف کا ہم پلّہ سمجھ بیٹھے۔ ستیارتھی ان کے لیے برابر کا یا بازار کا آدمی بن گیا جسے کہیں بھی گھیرا جا سکتا ہے، جس سے بے تکلف ہوا جا سکتا ہے، جس پر ہنسا جا سکتا ہے۔

معلوم نہیں خلوت نشینی ستیارتھی کو اپنے طور پر ختم کر دیتی یا راس آتی، مگر اتنا طے ہے کہ ستیارتھی اگر اس درجہ سہل الحصول اور ٹرانس پیرینٹ قسم کا آدمی نہ ہوتا تو کم از کم اس کی سماجی اور مادی حیثیت اس کی موجودہ حیثیت سے بہت مختلف ہوتی۔ قصہ مشہور ہے کہ شیکسپیر کے ڈراموں کے ایک عدیم المثال اداکار نے ایک روز صبح کی سیر میں ایک خستہ حال شخص کو دیکھا جو بڑی بے تکلفی سے یہ کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا: ہم ایک دوسرے کے رفیق رہے ہیں: جناب نے جس کھیل میں ہیرو کا رول کیا تھا، اسی میں حقیر نے مرغ بن کر بانگ دی تھی! ستیارتھی نے charm of distance کے معنی پر شاید کبھی غور ہی نہیں کیا۔ یہ رویہ عظمت اور برگزیدگی کی اس قبیل سے علاقہ رکھتا ہے جو اپنی نفی سے اپنا اثبات کرتی ہے — ستیارتھی بڑا تھا، لوگوں کے ظرف چھوٹے تھے۔

بچپن میں ایک بزرگ کھدر پوش کبھی کبھار ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ ہمیشہ بہت لمبے

دیے، بنے سنورے، متین اور سنجیدہ؛ یوں بھی غیر معمولی دکھائی دیتے تھے؛ پھر پتا چلا کہ یہ پنڈت رام نریش ترپاٹھی ہیں، ہندی کے مشہور کوی۔ گاندھی جی کے آدیش پر ستیارتھی اور پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے لوک کلا اور لوک گیتوں کو سمجھنے سمجھانے اور محفوظ کرنے کا ارادہ شاید ایک ہی زمانے میں باندھا تھا، مگر ترپاٹھی جی اس ارادے اور عمل کی مادی قدر و قیمت کا شعور بھی رکھتے تھے، اسی لیے ادبی اور سماجی حلقوں میں ان کی طرف عام رویہ مرعوبیت اور احترام کا رہا؛ کئی اہم مناصب ان کے سپرد کیے گئے اور دنیاوی اعتبار سے ترپاٹھی جی نے ایک معزز اور محفوظ زندگی گزاری۔ ستیارتھی کے نام اب سے لگ بھگ چالیس برس پہلے ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا:

میں بھی کبھی گھمکّو تھا، پر اب تو باہر کی بہ نسبت بھیتر کا وزن اتنا بڑھ گیا ہے کہ ملنے جلنے کی خواہش نہیں ہوتی۔

باہر کا وزن ڈھویا جا سکتا ہے، بھیتر کا نہیں۔

بہت ہی خوش قسمت لوگ ہوں گے، جن میں ایک آپ ہیں، جن میں بھیتر کا بھار کم ہوتا ہے۔

گرام گیتوں کے سلسلے میں جس راہ پر چلنے کی آرزو میں برسوں سے کر رہا تھا، اسے تو آپ نے ناپ ڈالا۔ گیتوں کے بارے میں میری آرزو ضرور مٹ گئی، پر گھومنے کی آرزو تو بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

آپ کا حوصلہ مبارک؛ آپ کی سچی لگن تاریخ کا حصہ بن گئی ہے؛ میں آپ کو پرنام کرتا ہوں۔

آپ کے مضامین، میں ماہانہ رسالوں میں جہاں پاتا ہوں، بڑی دلچسپی سے سب پڑھ جاتا ہوں۔ آپ نے گرام ساہتیہ کو سمجھا بھی خوب ہے اور اس کے اظہار کی آپ میں صلاحیت بھی قابل تعریف ہے۔ آپ کی جاترا کا دلچسپ بیان اور گیتوں کا مجموعہ کتابی شکل میں پڑھنے کی شدید خواہش ہے۔

میں نے ۱۹۲۵ء میں گیت جمع کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ اس لوہے جیسی حقیر شے کو آپ نے چھو کر سونا بنا دیا۔

اتنے بڑے دیس میں ہزاروں مرتبین کے اُٹھ کھڑے ہونے کی میری للک اب بجھ گئی۔ ہزاروں ستارے چاہے نہ اُٹھیں، ایک چاند کا ظہور کافی ہے۔

اس دیس میں آپ ہی پہلے اور آخری ہوں گے۔ اتنی محنت کون کرے گا؟

مقتل

ترپاٹھی کے اس خط سے ان کے اور ستیارتھی کے رویوں کا فرق، مقصد کے اشتراک کے باوجود، صاف ظاہر ہے۔ اس وقت یہ خیال یوں آیا کہ مقصد آگاہی کے باوجود ہمارے معاشرے میں ہر عمل اپنی قیمت رکھتا ہے یا کم سے کم اس قیمت کا شعور۔ ترپاٹھی جی یہ رمز سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے لوک گیتوں کے مطالعے اور فراہمی نیز اپنی ذات اور زندگی کے مابین فاصلہ قائم رکھا؛ اس کے برعکس ستیارتھی نے لوک گیت جمع کرنے کے بجائے اس زندگی کو جینے اور اس ہوا میں سانس لینے کی جستجو کی، جس کی کوکھ سے یہ گیت جنم لیتے ہیں؛ سو اس نے اپنی زندگی اور ان گیتوں کی زندگی کے درمیانی فاصلے کو بھی کبھی قبول نہ کیا اور دونوں میں بے دریغ ہم آہنگی کی تلاش کی۔ یہ تلاش بھی نہ ہوتی اور اس کی نوعیت محض علمی، نظریاتی اور سماجی ہوتی تو گیت شاید پھر مل جاتے، مگر ستیارتھی کتب خانوں کے شیلف یا اکیڈمیز کے عہدوں میں ڈوب گیا ہوتا؛ تشنہ کامانِ شوق اس کے آستانے پر سرِ نیاز جھکاتے اور اسے پلکوں پر بٹھاتے — اچھے بھلے آدمی کا کام اسی طرح تمام ہوتا ہے؛ کیا قیامت ہے کہ پھر انھیں ماتمی بھی نہیں ملتے۔

ستیارتھی کاروبارِ جہاں کے معاملے میں جیسا بھی ہو، اتنا ضرور جانتا ہے کہ عشق میں خواری اور خرابی کا درجہ کم نہ ہوگا، اور یہ کہ بعض رُسوائیاں شہرتوں سے زیادہ وقیع ہوتی ہیں۔ بھلے وقتوں میں اس نے ایک گھر بنا لیا تھا، شاید بُرے دنوں کی آزمائشوں کے ڈر سے؛ مگر ستیارتھی کے برے دن بھی اس کے بھلے وقتوں کی ترکیب کا حصہ ہیں؛ چنانچہ ایک کی قیمت پر دوسرے کو اختیار کرنے کے بجائے اس نے دونوں کو بٹ کر ایک کر لیا۔ زندگی کا جو ڈھب اوّل روز اپنایا تھا، اسی کو اب تک بڑی احتیاط سے سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ رویہ آگے بھی عجوبہ سمجھا جاتا تھا، آئندہ بھی لوگوں کو حیران کرتا رہے گا؛ شاید اسی لیے منٹو نے ستیارتھی کو فراڈ کہا تھا کہ جس ماحول میں فراڈ معمول بن چکا ہو، وہاں ستیارتھی عام مصلحتوں اور معمولات سے یکسر آزاد ایک ایسے معمول کا پابند رواں دواں ہے، جس پر ایک عجوبے کا گمان ہوتا ہے — فراڈ کے ایک غیر رسمی معنی عجوبے کے بھی ہیں۔

یاد آتا ہے، کوئی دو برس پہلے منٹو کی پچیسویں برسی کی شام، لودی کالونی کے ایک فلیٹ میں مین رانے ایک مختصر سی تقریب کا اہتمام کیا تھا؛ کچھ یار دوست جمع تھے۔ ستیارتھی نے چھیوں سے گراں بار ایک چھوٹی سی کاپی اپنے پلندے سے نکالی اور منٹو پر اپنا مضمون سنانے لگا۔ ذاتی باتوں اور ملاقاتوں کا ذکر مضمون میں مفصل تھا اور ستیارتھی رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر یہ کہانی اس طرح سنا رہا تھا، جیسے تحت اللفظ میں کسی گیت کے بول دوہرا رہا ہو؛ لہجہ بڑی حد تک غیر جذباتی مگر سریلا کہ ستیارتھی کی آواز میں گھونگھرو بندھے ہوئے ہیں۔ مضمون تمام ہوتا تھا کہ یار لوگ پنجے جھاڑ کر

ستیارتھی کے پیچھے پڑ گئے۔ یہ تو یاد نہیں آتا کہ کس نے کیا کہا، البتہ ایک لفظ بار بار اُبھرا: فــــراڈ۔ ستیارتھی صرف ہنستا رہا۔ عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں جھلمل جھلمل کر رہی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی — منٹو نے بہت لفظوں کو نئے معنی دیے ہیں، فراڈ کو ایک نیا مفہوم دینے میں ستیارتھی نے بھی منٹو سے تعاون کیا ہے — گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی اس درجہ ٹرانس پیرینٹ دکھائی دے تو کھوٹ کا خیال ہما شما کو ہونا عین مطابق فطرت ہے۔ وہ جس نے ڈھائی سے پانچ لاکھ تک لوک گیت جمع کیے اور پچاس سے زیادہ کتابیں لکھیں اور ہزاروں میل کا سفر کیا اور جس کے پاؤں بھی تھکن سے عاری نظر آتے ہیں، اسے آدمی سے زیادہ کچھ اور بن جانا چاہیے تھا۔ اس پر ستیارتھی کا بس نہ چلا کہ اپنے حواس کی سرحدیں عبور کرنے کے لیے پہلے اپنی عنصری سادگی کو مسمار کرے؛ سو وہ فــــراڈ ٹھہرا! اس لفظ پر ہنسنے کی قوت اسی لیے وہ اپنے حریفوں سے زیادہ رکھتا ہے۔

اپنے آپ پر ہنسنے کی صلاحیت ہی ہر بیرونی اثر سے ستیارتھی کا دفاع کرتی ہے؛ ایک لحاظ سے اپنی شخصیت کے تحفظ کا وسیلہ بھی اس نے اپنی اسی صلاحیت کو بنا رکھا ہے۔ اپنے بارے میں سخت سے سخت بات سننے اور اس سے مزہ لینے کا ایسا سلیقہ اور حوصلہ میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے۔ ایک کہانی کار کی حیثیت سے ستیارتھی کی سرشت کا یہ پہلو اسے ایک خاص امتیاز بخشتا ہے: یہ ایک سچے تخلیقی آدمی کی سرشت ہے جو زندگی کے کسی بھی مظہر، بشمول حماقت کو غیر اہم یا اپنی ذات سے کمتر نہیں گردانتی۔ اس کے ناولوں اور کہانیوں کی فنی قدر و قیمت کے تعین کا یہ موقع نہیں ہے مگر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اپنے تمام معاصرین کے مقابلے میں ستیارتھی نے اپنی تخلیقی شخصیت کو ہر غیر تخلیقی سروکار سے بچانے کی غیر معمولی قوت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی ذات نہ مفاہمتوں سے آلودہ ہوئی، نہ ترغیبات سے مغلوب: اس نے نہ تو کسی تصنع کو منہ لگایا، نہ امتیاز کی کسی کیفیت کا شکار ہوا۔ وہ نہ تو اپنی کامرانیوں پر مغرور ہوا، نہ اپنی نارسائیوں پر افسردہ۔ ایک اتھاہ گم شدگی، ایک نیم فلسفیانہ قلندری اور جذب کی ایک معصومانہ کیفیت ہر آن اسے گھیرے میں لیے رہتی ہے، شاید اسی لیے دوسروں کے ردِ عمل کی پروا کیے بغیر وہ اپنی چال چلتا جاتا ہے، اس احساس سے یکسر آزاد کہ ہر سفر کی ایک منزل بھی ہوتی ہے۔ اس کی آوارہ گردی جینے کا ایک اسلوب اور جذبے کا ایک طور بن گئی ہے: چنانچہ دلی کی سڑکوں پر وہ یونہی اکیلا بھٹک رہا ہو یا کسی اجتماع میں شریک، راہ و مقام کے وجود سے بے نیاز وہ اپنے آپ میں گم دکھائی دیتا ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ دوسروں کو اپنے تجربے میں شامل دیکھنے کی طلب کھو بیٹھا ہے، مگر اس واقعے کے باوجود کہ بعض اوقات وہ اپنے احباب حتیٰ کہ

اجنبیوں کے سامنے بھی اپنے مسودوں کا جال بچھا کر بیٹھ جاتا ہے اور انھیں اپنی بپتی سناتا ہے۔ میں نے ایسے موقعوں پر بھی جہاں اسے دو چار یا دس بیس سامع بآسانی ہاتھ آ سکتے ہیں، سب سے الگ تھلگ، خاموش اور اپنی سوچ میں مست دیکھا ہے۔ ایک شام نئی دلی کی ایک آرٹ گیلری میں رام چندرن کی ڈرائنگز اور تصویروں کی ایک نمائش میں جہاں مختلف ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے شاعر، ادیب، صحافی، مصور خوش گپیاں کر رہے تھے، ستیارتھی سب سے بے پروا گیلری کے ایک گوشے میں اپنا بستہ سنبھالے تصویروں کے ساتھ دیوار پر آویزاں ایک انگریزی نظم نقل کرنے میں مصروف تھا: Five ways to kill a man۔ بہت دیر بعد اس نے دھندلی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا، میرے قریب آیا، پھر اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں پوچھا: ''یہ چینی مہیلا کون ہے؟''

''رام چندرن کی بیوی!'' میں نے کہا۔

پھر وہ چپ چاپ اس خاتون کی طرف بڑھ گیا اور بغیر کسی رسمی تعارف، جھجک یا معذرت کے بہ زبان انگریزی یوں گویا ہوا: ''مجھے آپ کے انتخاب پر کوئی حیرت نہیں ہے... میں بھی اگر عورت ہوتا تو رام چندرن کے پریم جال میں پھنس گیا ہوتا!''

اس خاتون کو تو اس بات پر خوشی ہوئی ہی، بعد میں رام چندرن نے بھی یہ اعتراف کیا کہ اس شام اس سے زیادہ دل خوش کن تبصرہ اس کی تصویروں پر کوئی دوسرا نہ تھا۔

اصل میں تصویر ہو، شعر ہو، کہانی ہو یا سنگیت، ستیارتھی ہر تجربے کو اپنے حواس کے حوالے سے قبول کرتا ہے، تعبیر اور منطق کی موشگافیوں سے دور اور محفوظ رہتے ہوئے۔ زندگی کے عام اور معمولی اور مانوس تجربوں اور رنگوں کے تئیں بھی اس کا رویہ یہی رہتا ہے۔ مانوس، بظاہر غیر اہم اور زندگی کے معمولات میں شامل سچائیوں کی تہہ میں انوکھے ذائقوں کی یہی جستجو ستیارتھی کو عام انسانی دکھوں اور مسرتوں کے دروازے تک لے جاتی ہے اور ایک شہر طلسمات کے تماشے کا پردہ اٹھاتی ہے۔

اسی لیے، جن راستوں پر چلتے، بھٹکتے، ٹھٹھکتے ہوئے ایک جگ بیت گیا، ستیارتھی آج بھی انھی راستوں پر بھٹک رہا ہے۔ آنکھوں میں کتنی دھوپ مٹی اور پاؤں کتنے گھایل ہوئے، یہ کسی اور کو معلوم ہو تو ہو، ستیارتھی اس بات سے ایک دم بے خبر ہے اور ابھی بھی سفر میں ہے۔

OO

The Altar : Balraj Manra

(Translated from the original in Urdu by Muhammad Umar Memon)

to Kewal Suri

'شعور'

(پہلی کتاب)

ٹالسٹائی

لینن

فرائڈ

گاندھی

آئن اسٹائن

ہوچی منھ

پکاسو

ماؤزے تنگ

... اور اب ہماری اس صدی کی ایک اور بڑی شخصیت کی موت...

چارلی چپلن

پیدائش: ۱۶/اپریل ۱۸۸۹ء

وفات: ۲۵/دسمبر ۱۹۷۷ء

چارلی چپلن کے نام

مقتل

'شعور'

(دوسری کتاب)

ژاں پال سارتر کے نام

'شعور' (دوسری کتاب) سارتر کے انتقال سے پہلے، اپریل ۱۹۸۰ء میں سارتر کے نام معنون کی گئی تھی۔

شعور

(تیسری کتاب)

عزیز احمد کے نام

دشعور

(چوتھی کتاب)

صفیہ[۱] آپا کے نام

۱ منٹو کی بیوی

"شعور"

(پانچویں کتاب)

دستوئیفسکی کے نام

دشعور

(چھٹی کتاب)

راجندر سنگھ بیدی کے نام

'دستاویز'

(ہندی: پانچ جلدیں: بہ اشتراک شرددت)

موپاساں کے نام

سو برس پہلے جس کے بس جسم کو موت آئی تھی

'دھیان یاترا'

ناصر کاظمی

(ہندی: بہ اشتراک شرد دت)

شیلندر کے نام

تمھیں نے کہا تھا: 'دن کا ہے دوُجا نام اُداسی...'

'گرتے ہوئے درخت'

شرون کمار ورما

اپریل ۱۹۶۷ء

مین را

تمھارے لیے

اس احتجاج کے ساتھ

کہ تم کم لکھتے ہو...

کیوں...؟

آخر کیوں...؟

'چوراہا'

انور سجاد

۱۹۸۶ء

بلراج مین را کے نام

... But man is in question! So when will it be a question of man himself? Will someone in the world raise his voice?
For man is in question, in his human presence: and the eye's enlargement over the loftiest inner Seas!
Make haste ! make haste ! testimony for man.

WINDS
(Canto III - 4)
Saint-John Purse

The Postman's Fear

Prisoners everywhere
Send me all you have
Fear screams and boredom
Fishermen of all beaches
Send me all you have
Empty nets and sea-sickness

Peasants of every land
Send me all you have
Flowers rags
Mutilated breasts
Ripped-up out nails
To my address ... any cafe
Any street in the world
I'm preparing a huge file
About human suffering
To present to God
Once it's signed by the lips of the hungry
And the eyelids of those still waiting
You wretched everywhere
What I fear most is
God could be illiterate.

– Muhammad Al-Naghut

(فسان: سریندر پرکاش: شاعر، بمبئی، ۱۹۹۱ء)

۳۰ رمئی ۱۹۸۸ء

بلراج مین را کے نام

اب جہاں بھی ہیں، وہیں تک لکھو روداد سفر
ہم تو نکلے تھے کہیں اور ہی جانے کے لیے

(ندا فاضلی)

'کہانی کے پانچ رنگ'

شمیم حنفی

(مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دسمبر ۱۹۸۳ء)

بلراج مین را کے نام

'وشواس گھات'

اپنے پیارے دوستوں

ساقی فاروقی
بلراج مین را
اور
محمود ہاشمی
کے نام

جتیندر بلو

اُفق

تاریخ کے ہر عہد کا اپنا مزاج اور ضمیر ہوتا ہے!

مزاج اور ضمیر؟ مطلب!

بجا سوال ہے۔ مزاج اور ضمیر تو دو لفظ ہیں۔ لفظ تو بہت ہیں۔ اَن گنت۔ کوئی بھی دو، دس، بیس لفظ لے لیجیے۔ فرق کیا پڑتا ہے۔ مگر جب لفظ زبان یا قلم سے ادا ہوں، اس طرح کہ ان کا مطلب بھی ساتھ ہی سننے یا پڑھنے والے تک پہنچ جائے تو ترسیل کا حق ادا ہوتا ہے۔ تب الفاظ زبان بن جاتے ہیں۔ زبان مہذب انسان کی پہچان ہے۔ کسی سے اس کی زبان چھین لیجیے، وہ گونگا ہو جائے گا۔ یہ 'کسی' فرد بھی ہو سکتا ہے اور گروہ بھی۔ ایک خاص تہذیب ایک خاص گروہ میں پروان چڑھتی ہے اور اس کی پہچان بن جاتی ہے۔ اس اجتماعی پہچان میں اس خاص گروہ کے فرد کی پہچان بھی شامل ہوتی ہے۔ جب اس 'پہچان' سے کسی فرد کو پہچانا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس کے وسیلے سے وہ گروہ بھی پہچانا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ فرد اس خاص گروہ کا حصہ ہے۔ جس طرح اس خاص فرد کی تہذیب اس خاص اجتماعی تہذیب کا حصہ ہے۔ اسی جزو وکل کے باہمی رشتے کا اظہار انسان کی روحانی شخصیت کے خط و خال متعین کرتا ہے۔ تہذیب سے انسان شروع نہیں ہوتا بلکہ انسان سے تہذیب شروع ہوتی ہے۔ تہذیب ہی نہیں تاریخ بھی۔ تہذیب بھی تاریخ کی دین ہے۔ تاریخ ہے کیا اگر یہ انسان کی سماجی ارتقائی دستاویز نہیں؟ تہذیب ہے کیا اگر یہ انسان کے روحانی ارتفاع کا مظہر نہیں؟ اس مظہر کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ صرف فکر و فلسفہ؟ صرف دانشوری و شاعری؟ صرف رقص و موسیقی؟ یا اور بھی کچھ؟ ان تمام سوالوں میں لفظ 'صرف' باطل ہے کیونکہ تہذیب ایک سماجی کل کے حرکت و عمل کا بالیدہ تر اظہار ہے جن میں وہ تمام عوامل شامل ہیں جو انسان کی تخلیقیت کی ضمانت ہیں۔ یہ تخلیقیت روز مرّہ کے پیداواری عمل میں بھی ڈھل جاتی ہے اور جب روحانی ارتفاع کی طرف رُخ کرتی ہے تو سنگیت، شاعری، مصوری اور رقص میں نمو کی قوت بن کر رچ جاتی ہے اور ان تمام عوامل کے امتزاج باہم سے، اس تلاش و جستجو کا سراغ ملتا ہے جو انسان کو انفرادی طور

پر، اور اجتماعی طور پر، ایک منزل سے دوسری منزل تک (جو ہمیشہ اگلی منزل ہوتی ہے) ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک (جو ہمیشہ اگلا مرحلہ ہوتا ہے) لے جاتی ہے۔ اس کے قوانین جو سماجی قوانین ہیں، سفر کے ایک خاص مرحلے کے مزاج کو اپنے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ یہی ایک خاص عہد کا مزاج کہلاتا ہے۔ ہر عہد کی قدر مشترک ہے، آزادی کی تلاش جو انبساط کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ انسانی تمدن کے حرکت و عروج کی تاریخ کی تہ میں یہی ناگزیر قانون کام کر رہا ہے۔ یہ کائنات میں 'بیکراں' ہو جانے کی خواہش کی تہ میں کام کرنے والا قانون ہے۔ انسان سماجی جانور ہے، اس لیے اس کی 'بیکرانی' کی خواہش ان حدوں سے ٹکراتی ہے جو پیداواری رشتوں کی تابع ہیں اور جن کا اظہار سیاسی محرکات میں اور ان محرکات کی منظم پناہ گاہوں میں (جن کو سیاسی اداروں اور ان کی ماں جائی ایجنسیوں کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) ہوتا ہے۔ اب اگر ہمارے عہد کے مزاج کی شناخت ہوگی تو ان ہی اداروں کے تجزیاتی پس منظر میں ہوگی اور اسی دائرے میں اس بات کا بھی تعین ہوگا کہ جب ہم اس عہد کے ضمیر کی دہائی دیتے ہیں تو اس سے، خواہ وہ انفرادی ضمیر کی بات ہو یا اجتماعی ضمیر کی، ہماری کیا مراد ہوتی ہے؟

ہر عہد کے مزاج کا تعین اس غالب تحریک سے ہوتا ہے جو بنیادی طور پر سماجی تبدیلی کی تحریک ہوتی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں، ہر شعبے کی خصوصیات کے مطابق، اس تحریک کے مظاہر بھی مختلف ہوتے ہیں۔ یہ تبدیلی اپنی نوعیت میں صرف ارتقائی نہیں بلکہ انقلابی بھی ہوتی ہے۔ زمان و مکاں کی حدود کے اندر دو انقلابی نقطوں کے درمیان، تاریخ کا ارتقائی سلسلہ، اپنے فکر و عمل میں، اپنی خصوصیات کے فیض سے، اس دور کا مزاج کہلاتا ہے۔ اور اس خاص دور میں سماجی تبدیلی کی غالب تحریک سے وابستگی، بلکہ عملی اور فکری وابستگی، اس دور کا انفرادی اور اجتماعی ضمیر بن جاتی ہے۔ تاریخی شعور، فکری بصیرت اور نظریاتی وابستگی کے بغیر ضمیر کی دہائی کے معنی ہیں، جبلی انسان کی اندھی قوتِ شناخت پر اعتماد! لیکن کیا یہ کافی ہے؟ خندقی انسان کے ضمیر اور نیوکلیائی اور خلائی دور کے سماجی انسان کے ضمیر میں کوئی ارتقائی فرق ہے یا آج بھی دشت و صحرا کے قدیم انسان کی روشن ضمیری سے کام چل سکتا ہے؟ کیا خیر و شر یا سود و زیاں کا تصور مابعد الطبیعاتی تصور ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ خیر و شر یا سود و زیاں کا تصور زمانی اور مکانی تصور ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک سماجی تصور ہے اگرچہ بعض 'اخلاقی' تاویلات اس کو مابعد الطبیعاتی سرحدوں کا اسیر بنا دیتی ہیں۔ ہم ارضی لوگ ہیں اور ہم اس وقت ان ہی حدود کے اندر رہ کر بات کر رہے ہیں۔

اس گفتگو کی عصری معنویت صرف اس وقت آشکار ہو سکتی ہے جب ہم اس تصور کو اپنے

وقت اور حالات کی سان پر رکھ کر دیکھیں۔ لوہے کو پہلے آگ میں تپانا پڑتا ہے، پھر اس پر ہتھوڑے سے چوٹیں لگائی جاتی ہیں۔ بہت چنگاریاں اُڑتی ہیں، تب جا کر کہیں لوہا فولاد بنتا ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے (اور سنا بھی گیا ہے) کہ جب ادیبوں اور فنکاروں کی بحث ہوتی ہے تو کوئی جغادری یا غیر جغادری 'فنکار' (اگر وہ کسی جلسے میں ہے تو مائک میں منہ گھسا کر، اور اگر اپنے یا کسی اور کے ڈرائنگ روم میں ہے تو چھلکتے ہوئے گلاس میں منہ چھپا کر) بحث کے دوران یکا یک اعلان کرتا ہے: ''میں کچھ نہیں جانتا۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میرا ضمیر صاف ہے!'' ضمیر تو صاف ہوگا۔ اب کر لیجیے آپ جو کچھ کر سکتے ہوں۔ اس سلسلے میں ژاں پال سارتر کا بیان کیا ہوا واقعہ یاد آتا ہے (یہ واقعہ 'ادب کیا ہے' میں نظر آ جائے گا)۔ سارتر کا ایک ہمعصر ادیب تھا، فرانسیسی۔ بڑی انقلابی اور طوفانی باتیں کیا کرتا تھا۔ لیکن ایک وقت آیا جب فیشن کا یہ اُبال جاتا رہا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس کا باپ اچانک مر گیا جو فرانسیسی صنعت کار تھا۔ بیٹے نے پہلی فرصت میں باپ کا کاروبار سنبھال لیا اور ڈھرے پر لگ گیا، اسی جوش و خروش سے۔ پھر اس نے پیرس کی ایک خوش حال 'سوشیالائٹ' سے شادی کر لی جس کا بے حد وفادار شوہر بننے میں اسے زندگی کا لطف آ گیا۔ ''ہاں کسی دوسرے شہر جا کر اس سے تھوڑی سی بے وفائی ہو جاتی ہو'' تو بات دوسری ہے۔ بورژوا اخلاقیات میں اس کی گنجائش ہے۔ جب اس کی دانش ورانہ سرکشی گھس پٹ کر برابر ہو گئی تو اس نے کچھ عرصے بعد سارتر کو بھی 'زمانہ سازی' کے گر سکھانے کی کوشش کی، اس لیے کہ اس وقت تک اس کو اپنے فن پر عبور حاصل ہو چکا تھا۔ ایسے استاد کی کسی بھی ریاکار سماج میں کمی نہیں ہے۔ آدرش کچھ اور کرتوت کچھ! جزئیات میں فرق ہو سکتا ہے، مثلاً، ممکن ہے وہ دانشور صنعت کار کا بیٹا نہ ہو، کسی کوتوال کا بیٹا ہو، اور شادی اس نے کسی صنعت کار کی بیٹی سے نہ کی ہو بلکہ بفیض شادی خود صنعت کار بن گیا ہو۔ اس قسم کی جزئیاتی تبدیلیاں تو ہو سکتی ہیں۔ اصل بات یہ نہیں ہے بلکہ وہ بات ہے جو سارتر نے یہ واقعہ بیان کر کے آخر میں کہی ہے: ''آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں اس قسم کے رویے کے بارے میں کیا سوچتا ہوں — یہ مبتذل اور رکیک قسم کی بے ایمانی ہے اور کچھ بھی نہیں۔''

یہ ''مبتذل اور رکیک قسم کی بے ایمانی'' بہروپیوں کی 'فنکاری' کا سرچشمہ ہے جو ایک قسم کی 'حرام کاری' ہے۔

یہ تو ضمنی باتیں ہیں جن سے مسئلے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مرکزی نکتہ اس بحث کا یہ ہے کہ ہر عہد میں، اور اس عہد کی بنیادی آویزش میں، 'ضمیر' افراد کی بنیادی وابستگیوں اور طرفداریوں کی وجہ سے بیچ سے کٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے — ایک سچ کا ضمیر اور ایک جھوٹ کا ضمیر۔ ایک حق کا

ضمیر اور ایک باطل کا ضمیر — اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ژاں پال سارتر کی پیش کی ہوئی مثال کو یاد رکھیں۔ یعنی ایک ضمیر ژاں پال سارتر کا ہے اور دوسرا اس 'دانشور' کا جو صنعت کار ہے۔ دونوں کی وابستگیاں مختلف ہیں، اخلاقیات مختلف، قدریں مختلف، آدرش مختلف اور آدرشوں کو حقیقت بنانے کے رویے مختلف! یہ ذہنی رویہ بھی ہے اور عملی رویہ بھی۔ ایک 'خود جوازیت' کا رویہ ہے (یعنی جو کچھ ہے، جیسا بھی ہے، اسے برقرار رہنا چاہیے) اور دوسرا رویہ ہے تبدیلی اور انقلاب کا۔ یہ فرق محض ذات کا نہیں، محض دو شخصیتوں کا نہیں بلکہ ایک خاص سماجی نظام سے وابستگی، جبر و ستم کے نظام سے وابستگی اور اس کو بدل کر عدل و انصاف کا نظام قائم کرنے والی قوتوں سے وابستگی کے فرق کا ہے۔ ان دو وابستگیوں کے فرق کے اظہار میں ہی ضمیر کا سچا امتحان ہوتا ہے اور اس کی اصلیت کی پہچان بھی — (کچھ ہی عرصہ پہلے جب ہماری قوم کو پہلی بار اندرونی طور پر ہنگامی حالات کا تجربہ ہوا تو معلوم ہوا کہ اجتماعی معنوں میں ضمیر کی تقسیم کس طرح ہوتی ہے اور اس کو انفرادی ضمیر فروشی سے، جس کے اظہار میں دانشور، ادیب اور شاعر بھی پیش پیش تھے، کتنا سہارا ملتا ہے۔ ایک وہ ہیں جو اپنے طبقاتی مفاد کی بقا اور توسیع کے لیے گناہ کرتے ہیں، دوسرے وہ بھی ہیں جو گمراہ کن نعروں اور لن ترانیوں سے اس گناہ کا جواز پیش کرتے ہیں۔ بیچنے والے اور خریدنے والے، بکنے والے اور خریدنے والے۔ کیا دونوں کا ضمیر ایک ہے؟ ساتھ ہی، یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہنگامی دور میں صورت حال کا شدید اور نمایاں اظہار ہوتا ہے یعنی یہ مرض کی علامت ہے، مرض نہیں۔ جس طرح خون فاسد پھوڑوں کی شکل میں جسم پر نمایاں ہوتا ہے، اسی طرح سماجی امراض قوم کے جسم پر سیاسی آتشک کی شکل میں پھوٹ بہتے ہیں لیکن عذاب کا یہ سلسلہ یہیں شروع نہیں ہوتا، نہ یہیں ختم ہوتا ہے۔ جس طرح، کہتے ہیں، ''جنگ سیاست کی توسیع ہے، جو مختلف وسائل کے ذریعہ جاری رکھی جاتی ہے''، اسی طرح ایمرجنسی یا مارشل لا طبقاتی تضادات کی بحرانی سیاست کا اظہار ہے۔ طاعون کے چوہوں کی طرح سماجی عذاب کے یہ عناصر جوتوں اور جیبوں میں چھپے رہتے ہیں اور اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ اس استعارے سے ایمرجنسی اور اس سے پہلے اور بعد کے حالات کے صحیح ادراک میں مدد ملتی ہے) — یہ فرق اس وقت شروع ہوا جب اسپارٹکس نے پہلی بار اپنے وجود کو پہچانا اور اس کی آزادی کے خواب دیکھے۔ اسپارٹکس نے آزادی کے جو خواب دیکھے تھے، وہی اس کے ضمیر کا اعلان تھے۔ ایک ضمیر زارشاہی کا تھا اور دوسرا 'پوتیومکن' کے معمولی جہازیوں کا جنھوں نے اپنے خون سے ۱۹۰۵ء کے انقلاب کی تاریخ لکھی۔ ایک ضمیر لینن کا تھا اور دوسرا وہائٹ گارڈ کے انقلاب دشمن قزاقوں کا۔ ایک ضمیر بھگت سنگھ کا تھا اور

دوسرا جنرل ڈائر کا — ہمارے دور میں، ضمیر کا یہ اعلان گرامچی کی نظریاتی آویزشوں میں ہی نہیں بلکہ مسولینی کے فاشزم سے اس کے تصادم میں بھی ہوتا ہے۔ ایک ضمیر ان کا تھا جنھوں نے ریش تاخ میں آگ لگائی اور دوسرا بریخت کا جس نے 'آرتورواوئی' جیسا ڈرامہ لکھا اور زندگی کے بہترین ماہ و سال جلاوطنی میں کاٹ دیے اور جس نے اپنی جلاوطنی کو اپنے تخلیقی عمل سے تھئیٹر کے عہد آفریں فن میں ڈھال دیا۔ ایک ضمیر ہٹلر کا تھا اور دوسرا اَن گنت بے نام اور بے چہرہ یہودیوں کا جو نیشنل سوشلزم کے جہنم میں جل کر راکھ ہو گئے۔ ایک ہی عہد میں دریائے یانگ سی کے ایک طرف چیانگ کائی شیک کا ضمیر تھا اور دوسری طرف چینی انقلابیوں کا۔ ایک ہی عہد میں ایک طرف ہو چی منہ کا ضمیر تھا اور دوسری طرف ہزاروں میل دور وھائٹ ہاؤس میں بیٹھے ہوئے جمہوری صدر کا جس کے حکم سے ویت نام کی سرزمین پر نیپام بموں کی بارش ہو رہی تھی — ان میں سے سچا ضمیر کون تھا؟ وہ جو اپنے وقت کے تاریخی مزاج کا نقیب تھا یا وہ جو اس نقیب کو خون میں ڈبو دینے کے وحشیانہ جتن کر رہا تھا؟

یہ مثالیں بڑے بڑے تاریخی تصادموں کا نشان بن گئی ہیں، اس لیے لفاظی کے پیچھے چھپے ہوئے تضادات اور خود فریبی کی شناخت میں ان تاریخی مثالوں سے مدد ملتی ہے۔ زندگی کے مسخ آئینہ خانے میں مسخ نقوش کو پہچاننے کے لیے عرشِ بریں کے خداؤں کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے اسی زمین پر ہوتا ہے۔

صورتِ حال کیا ہے؟

صورتِ حال یہ ہے کہ اکثر تہذیبی اور ادبی حلقوں میں سچے فنی اظہار کی کاوش اور تلاش کی جگہ خودستائی اور خود فریبی کے بت کدوں نے لے لی ہے۔ اچھے افسانے، اچھی شاعری اور اچھی تنقید کی جگہ سائیکوفینسی نے لے لی ہے۔ خود ہی آئینہ اور خود ہی عکس کا اصول ادبی احتساب کا کلیہ بن چکا ہے۔ یہ بڑا پیچ دار گورکھ دھندا ہے۔ اس دھندے کو چلانے کے لیے سرکاری سرپرستی اور حلقہ بندی کے ادارے ہیں۔ ان کی فصیلیں بہت اونچی ہیں۔ ان فصیلوں کے اندر کھوٹے سکے چلتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کو میڈیوکریٹی کا راج کہتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس راج سنگھاسن ہے، ان کے اردگرد مصاحبوں کے گروہ ہیں جو حالات کے مطابق چولے بدلتے ہیں۔ یہ سیمینار کرتے ہیں، مشاعرے کرتے ہیں، پارٹیاں دیتے ہیں، در در شعر و شاعری بانٹتے پھرتے ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخباروں میں ان کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔ پبلک میڈیا، میڈیوکریٹی اور فن سوز فن کاری کی کمیں گاہیں ہیں۔ انھوں نے مفاد پرستی کے بہت سے پنجرے بنا رکھے ہیں جو کھلی

ہوا میں غیر مرئی تاروں سے لٹک رہے ہیں۔ پنجرے بھی غیر مرئی ہیں۔ ان پنجروں میں الیوژن کے طوطے اپنی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔ ان میں کچھ طوطے جدید ادب کی بات کرتے ہیں، کچھ ترقی پسند ادب کی۔ کبھی کبھی وہی جو جدید ادب کی بات کرتے ہیں، ترقی پسند ادب کی بات کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کا اُلٹ بھی ہوتا ہے۔ اور کچھ لوگ سرکاری تمغوں کی مدد سے اس عہد کے مزاج اور اپنے ضمیر کی بات کرتے ہیں — تماشا بڑا پر فریب ہے۔

اس عہد کا مزاج کیا ہے؟

ہر زمانے میں جبر و استحصال کے خلاف ابتدائی اور علامتی سرکشی سے لے کر خوں آشام بغاوتوں اور مسلح یلغار تک کا سلسلہ رہا ہے۔ اس بغاوت کو سب سے پہلے اسپارٹکس نے اپنے خون کی زبان دی تھی۔ اس زبان کو ہر زمانے نے اپنا پرچم بنایا جو شکاگو تک پہنچتے پہنچتے لہو کی قندیلوں میں بدل گیا۔ آج کے زمانے کا باغی ان قندیلوں کی روشنی میں اپنی منزل کی تلاش کر رہا ہے۔ یہ روشنی طبقاتی جدوجہد میں فتح کے راستے بھی دکھاتی ہے اور فنی اظہار کے بھی کیونکہ یہ رویہ صرف پرچم برداری کا نہیں بلکہ تخلیقی فکر و فن کا بھی ہے، اس لیے آج بھی فیصلہ ان ہی قندیلوں کی روشنی میں ہوگا۔ اسی روشنی میں نقابیں تار تار ہوں گی اور مسخ چہرے پہچانے جائیں گے۔ اس روشنی سے صرف وہ خوف زدہ ہوں گے جو اصطلاحوں کو، خواہ وہ 'جدید' ہوں یا 'انقلابی' خیرہ کن خلعتوں کی طرح استعمال کرتے ہیں اور جن میں وہ اپنی عیاری اور ریاکاری کو محفوظ سمجھتے ہیں — وقت کے ہاتھ بہت لمبے اور مضبوط ہیں۔ الفاظ کے چیتھڑے تو کیا وہ خود فریبی کے زرہ بکتر بھی تار تار کر سکتے ہیں۔ یہی ہاتھ اس عہد کے مزاج داں ہیں۔ اور جو اس مزاج کا نقیب ہے، وہی اس عہد کے فنکار کا ضمیر ہے۔ وقت کا ضمیر خود فریبی اور چالاکی کے ملبے میں نہ کبھی دبائے دبا ہے، نہ اب دبائے دبے گا۔

اسی یقین سے اس عہد کی تلاش اور فنکاری کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہی ہمارے عہد کی جمالیات کا سرچشمہ ہے — جو تاریخی شعور بھی ہے اور تخلیقی وابستگی بھی۔

OO

('شعور': دوسری کتاب: ۱۹۷۹ء)

URDU F MAINRA B
Mainrā, Balrāj.
Maqtal
Dihlī : Mauḍarn
Pablishing Hā'ūs, 2007.